رجسٹرڈ نمبر ل ۲۶۱

[illegible] اسلامیہ دہلی

خاتون

نمبر ۱	بابت ماہ جنوری ۱۹۱۱ء	جلد ۶

اڈیٹر شیخ محمد عبداللہ بی اے۔ ایل ایل بی سکرٹری تعلیم نسواں اسکشن

فہرست مضامین

مطبع فیض عام علی گڈھ میں طبع ہوا
محمد عبدالسلام پرنٹر

شیخ عبداللہ بی اے پبلشر
یکم جنوری سنہ ۱۹۱۱ء

خاتون ۵۳

۱۔ یہ رسالہ ۴۰ صفحے کا علی گڈھ سے ہر ماہ میں شائع ہوتا ہے اور اسکی سالانہ قیمت (عہ ۱) اور ششماہی عہ ہے

۲۔ اس رسالہ کا صرف ایک مقصد ہے، یعنی مستورات میں تعلیم پھیلانا اور پڑھی لکھی مستورات میں علمی مذاق پیدا کرنا۔

۳۔ مستورات میں تعلیم پھیلانا کوئی آسان بات نہیں ہے اور جب تک مرد اس طرف متوجہ نہونگے مطلق کامیابی کی امید نہیں ہوسکتی، چنانچہ اس خیال اور ضرورت کے لحاظ سے اس رسالہ کے ذریعہ مستورات کی تعلیم کی اشد ضرورت اور بے بہا فوائد اور مستورات کی جہالت سے جو نقصانات ہو رہے ہیں اُس کی طرف مردوں کو ہمیشہ متوجہ کرتے رہینگے۔

۴۔ ہمارا رسالہ اس بات کی بہت کوشش کریگا کہ مستورات کے لیے عمدہ اور اعلیٰ لٹریچر پیدا کیا جائے جس سے ہماری مستورات کے خیالات اور مذاق درست ہوں اور عمدہ تصنیفات کے پڑھنے کی اُن کو ضرورت محسوس ہو تاکہ وہ اپنی اولاد کو اس بڑے لطف سے محروم رکھنا جو علم سے انسان کو حاصل ہوتا ہے معیوب تصور کرنے لگیں۔

۵۔ ہم بہت کوشش کرینگے کہ علمی مضامین جہانتک ممکن ہو سلیس اور بامحاورہ اُردو زبان میں لکھے جائیں۔

۶۔ اس رسالہ کی مدد کرنیکے لیے اسکو خریدنا گویا اپنی آپ مدد کرنا ہے اگر اس کی آمدنی سے کچھ بچیگا تو اس سے غریب اور یتیم لڑکیوں کو وظائف دیکر اُستانیوں کی خدمت کے لیے تیار کیا جائیگا

۷۔ تمام خط وکتابت و ترسیل زر بنام اڈیٹر خاتون علی گڈھ ہونی چاہیے۔

۵۱۳

خاتون

جاپان کی لڑکیاں

ہمارے نوجوان، جوشیلے، کارکن اور لائق دوست سید خورشید علی صاحب جو تعلیم نسواں کے زبردست حامی اور اس کی ترقی کے بہت بڑے ہمدرد ہیں، آج کل ہندوستانی لڑکیوں کے لیے ایسی کتابیں تیار کرنے میں مصروف ہیں جو انکے نصاب میں داخل ہو سکیں اور اس کام کو انہوں نے بہت عمدہ اور مناسب طریقہ سے شروع بھی کر دیا ہے۔ اس وقت جو کتاب وہ ترجمہ کر رہے ہیں اس میں سے مضمون جسکا عنوان اوپر درج ہے انہوں نے خاتون میں درج کرنے کے لیے بھیجا ہے؛ ہم اسکو شکریہ کے ساتھ شائع کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ خداوند عالم ہمارے لائق دوست کو اپنے مقصد میں باحسن وجوہ کامیاب کرے اور اُن کی اس کوشش کو ملک اور قوم کے لیے مفید اور مقبول کرے۔

ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس موقع پر سید صاحب موصوف کا خط بھی درج کر دیں جس سے ناظرین کو معلوم ہو جائیگا کہ کس محنت اور کوشش کے ساتھ وہ نصاب کی تیاری میں مصروف

ہیں وہ لکھتے ہیں۔

"میں آجکل لڑکیوں اور عورتوں کے لیے کتابوں کا ایک ایسا سلسلہ لکھنے کی فکر میں ہوں جو تاریخ اور جغرافیہ کے نصاب کا کام دے۔ اس کوشش میں مجھے کسی قدر کامیابی بھی ہوئی ہے اور بہت کچھ میٹریل مجھے مل چکا ہے، انگلستان و امریکہ کے خاص نسوانی مدارس کے نصاب میں نے منگوائے ہیں اور دو ایک لائق فاضل خواتین کی مدد اور مشورہ سے میں اس کام کو شروع کرنے کے قابل ہو چکا ہوں خدا کرے کہ مجھے اس میں کامیابی ہو اور ہماری ہمقوم بہنوں کے لیے ایک کارآمد نصاب تیار ہو سکے،

اس کوشش میں میں نے بہت سی کتابیں دیکھی تھیں جنمیں ایک سیریز "پیپلس اینڈ پلیسز ریڈرز" بھی تھا جو ابھی حال میں انگلستان میں شائع ہوا ہے اس سلسلہ میں سولہ کتابیں تیار کی گئی ہیں۔ جن میں سے ہر جلد دنیا کے کسی مشہور مقام و ملک سے تعلق رکھتی ہے ایک جلد جاپان کے متعلق تھی جسکو میں نے ترجمہ کرنا شروع کیا ہے۔ یہ کتاب عورتوں کے لیے بہت دلچسپ ہوگی اسکا مصنف جان فنامور نامی مشہور مصنف ہے جس کی اس قسم کی تصنیفات انگلستان کے زنانہ مدارس میں کثرت سے رائج ہیں،

اس سلسلہ کی تمام جلدیں ایک ہی شخص کی لکھی ہوئی نہیں ہیں بلکہ اس کے پبلشر آدم چارلس بلیک نے مختلف لوگوں کو مختلف دنیا کے حصوں میں بھیجکر اس اس حصہ کے حالات تمدنی، معاشرتی وغیرہ بہت دلکش پیرایے میں قلمبند کرائے ہیں میرا قصد ہے کہ اس کتاب جاپان کے اختتام کے بعد جو چھپنی شروع ہو گئی ہے۔ اس سلسلہ میں سے چند اور جلدوں کا ترجمہ بھی کر ڈالوں جو میں نے اول ہی سے انتخاب کر لی ہیں۔

الغرض "جاپان کی لڑکیاں" کے عنوان سے جو مضمون معہذا حاضر خدمت ہوتا ہے یہ اُسی کتاب جاپان کا ایک باب ہے۔ تقریباً نصف کتاب کا ترجمہ میں نے کر لیا ہے اور ساتھ کے ساتھ چھپوانا بھی شروع کر دیا ہے۔ اگرچہ افسوس ہے کہ تصویروں کا

اہتمام ممکن ہیں"۔

اڈیٹر

جاپان میں لڑکوں کی زندگی لفظ **اطاعت** سے بہت کچھ وابستہ ہوتی ہے۔ مگر لڑکیوں کی زندگی تو اطاعت ہی اطاعت ہے۔ زمانہ شیرخوارگی ہی سے لڑکیوں کو اپنے کسی رشتہ دار کی فرماں برداری کا فرض سکھایا جاتا ہے۔ جاپان کے ہر خاندان اور ہر مکان میں ایک بڑی پرانی کتاب بہت کثرت سے پڑھی جاتی ہے۔ ہر لڑکی کو اُسے ازبر کرنا پڑتا ہے۔ اس کتاب کا نام آن۔ را۔ ڈائی گاکو" یعنی عورتوں کے لیے اعلیٰ تعلیم" ہے۔ لڑکیوں اور عورتوں کے اخلاق کے متعلق یہ ایک قانون ہے۔ یہ کتاب اس مضمون سے شروع ہوتی ہے کہ ہر عورت کے ذمہ تین قسم کی اطاعت فرض ہوتی ہے۔ پہلے جبتک شادی نہوئی ہو اپنے باپ کی اطاعت کرے۔ دوسرے جب شادی ہو چکے اپنے خاوند اور اپنے بزرگوں کی فرماں برداری کرے۔ تیسرے جب بیوہ ہوجائے تو اپنے فرزند کی تابعدار رہے۔

تین سال کی عمر تک مختلف عجیب وغریب وضع پر لڑکیوں کا سر منڈایا جاتا ہے۔ مگر اس عمر کے بعد بال اپنے حال پر چھوڑ دیے جاتے ہیں۔ سات سال کی عمر تک ان کو نرم و نازک ریشم کی پتلی سی" **اوبی**" پہنائی جاتی ہے جو عالم طفولیت کا پٹکا ہوتا ہے لیکن سات برس کے بعد دبیز اور چوڑا چکلا پٹکا "ادبی" استعمال کیا جاتا ہے۔ اسکے بعد لڑکیوں کا لباس ہر حیثیت سے عورتوں کے لباس کا سا بن جاتا ہے۔ اس وقت سے وہ **موزمی** یعنی جاپانی لڑکی بن جاتی ہے جو دنیا کی سب سے زیادہ بھڑکیلی اور خوش و خرم ننھی مخلوق ہوتی ہے۔ وہ کبھی قدآور نہیں ہوتی کیونکہ جاپانی عورتوں کا زیادہ سے زیادہ اونچا قد چار فٹ آٹھ انچہ ہوتا ہے۔ اگر کوئی عورت پانچ انچ لنبی ہوجائے تو وہ دیوقامت سمجھی جاتی ہے۔

جاپان میں عورتوں کے لیے نہایت زرق برق کا بھڑکیلا لباس اور شوخ وچمکدار رنگ پہننے کا یہی وقت ہوتا ہے شادی کے بعد سادہ لباس پہنا جاتا ہے۔ جاپانی لڑکیوں کی حجامت

کا باہم مل کر کسی میلے یا تہوار وغیرہ کے موقع پر آہستہ آہستہ قدم اُٹھانا بالکل وہی منظر پیش کرتا ہی جیسا ایک بے انتہا خوبصورت اور دلفریب پھولوں کے تختہ کو ہلا دینے سے نظر آتا ہی۔ یہ لڑکیاں عجیب عجیب بھڑکیلے رنگوں اور بیش قیمت ریشم کے کی مونو پہنتی ہیں۔ ان کے کی مونو کمخواب اور زربفت کے بھی ہوتے ہیں۔ گلابی، پیازی، نیلگوں، سبز سرخ وغیرہ انواع واقسام کے شفاف و چمکدار رنگ کے کی مونو جن پر استادانہ نقش و نگار ہوتا ہی استعمال کیے جاتے ہیں۔ ان کے کنارے غضب کے دلفریب ہوتے ہیں، قوس وقزح کے تمام رنگوں کو عجیب موزونیت اور پاکیزہ مذاقی کے ساتھ ان میں استعمال کیا جاتا ہی۔ اگر کبھی ترشح ہونے لگے اور یہ لڑکیاں اپنے رنگ برنگ کے زردوزی بیش قیمت کی مونو کو سمیٹ لیں تو بالکل خشخاش کا ایک تختہ کھلا ہوا دکھائی دیتا ہی۔ کی مونو کا اندرونی لباس جو ایک نہایت شوخ گلنار رنگ کا لہنگا ہوتا ہی عجب انداز سے نظر آنے لگتا ہی۔

یہ زمانہ جاپانی لڑکیوں کے لیے صرف زرق برق لباس پہننے کا ہی نہیں ہوتا بلکہ میلوں تماشوں میں شریک ہونے اور مندروں وغیرہ میں جانے کا بھی یہی وقت ہوتا ہی۔ سارا بناؤ سنگار اسی عمر میں کیا جاتا ہی اور خوب ہنسی خوشی کے ساتھ وقت بسر ہوتا ہی۔ جب ان لڑکیوں کی شادی ہو جاتی ہی تو پھر مسرت وانبساط کا دروازہ ایک طول طویل مدت کے لیے ان پر بند ہو جاتا ہی جاپان میں بیوی کے فرائض بڑے سخت ہیں اور بیچاری کو ہر آن سخت مصروف رکھتے ہیں۔ مشقت و مصروفیت کا یہ کٹھن زمانہ اسوقت تک ختم نہیں ہونے پاتا جب تک کہ اسکے لڑکے کی شادی نہ ہو جائے۔ بہو کے آجانیکے بعد ساس اپنے تمام فرائض اور خانہ داری کی ذمہ داریاں اسکے سپرد کرکے خود چھٹکارا حاصل کرتی ہی۔ اسکے بعد پھر اسکو چین اور سُکھ نصیب ہوتا ہی، اور وہ مندروں تماشوں میلوں وغیرہ میں جانے اور تفریحی مشاغل میں خوب جی کھول کر حصہ لینے لگتی ہی۔

جاپان میں شادیاں جلد ہو جاتی ہیں۔ سولہ سترہ برس[۱] کی عمر میں لڑکیاں بیاہ دیجاتی ہیں

[۱] یہاں انگلستان کیساتھ مقابلہ کیا گیا ہی جہاں اس عمر میں شادیاں بہت کم ہوتی ہیں ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی اسی عمر میں شادیاں رائج ہیں۔ مترجم

اگر کوئی لڑکی بیس سال کی عمر کو پہنچ جائے اور اُس وقت تک اُس کی شادی نہ ہو چکی ہو تو نہایت منحوس سمجھی جاتی ہے، شادی کے ساتھ ہی لڑکیاں اپنے تمام عزیزوں اور رشتہ داروں سے موڑ لیتی ہیں اور اُن سے بالکل قطع تعلق کر دیتی ہیں اور شوہر کے کنبہ میں شریک ہو جاتی ہیں۔ اس امر کا اظہار عجیب اور نہایت موثر پیرایہ میں اس طرح کیا جاتا ہے کہ شادی کے موقع پر دُلہن کو سفید کیمونو پہننا پڑتا ہے جو ماتمی رنگ ہے۔ اسکے علاوہ جب لڑکی میکے سے روانہ ہو جاتی ہے تو گھر میں آگ جلائی جاتی ہے۔ کیونکہ اسی طرح کا عمل مُردہ کو دفن کر چکنے کے بعد بھی کیا جاتا ہے۔ ان تمام باتوں سے یہ جتانا منظور ہوتا ہے کہ لڑکی اس وقت سے اپنے والدین اور اعزا و اقربا کے حق میں مر چکی اور اب اسکے بعد اس کی تمام زندگی اسکے شوہر اور سسرال والوں کی خدمت میں بسر ہوگی۔

شادی کے رسوم بہت مختصر اور سادہ ہوتے ہیں۔ اس کی نہ تو زیادہ تشہیر کی جاتی ہے اور نہ کوئی مذہبی رسم ادا ہوتی ہے۔ سب سے بڑی رسم جسپر شادی کا دار و مدار ہے یہ ہے کہ دلہا اور دُلہن کو تین مختلف پیالیوں سے جن میں دو دو ٹونٹیاں لگی ہوتی ہیں ترتیب کے ساتھ یکے بعد دیگرے تین تین دفعہ ساکی پلاتے ہیں۔ ساکی ایک قسم کی شراب ہوتی ہے جسکو چاولوں سے تیار کیا جاتا ہے یوں ساکی نوش کرنے سے یہ مطلب ہوتا ہے کہ آیندہ زندگی میں دونوں میاں بیوی رنج و راحت میں ایک دوسرے کے شریک رہیں گے۔ یہی ایک شادی کی اصل اور بہت اہم رسم ہے،

شادی کے ساتھ ہی بیچاری نوجوان بیوی عمدہ عمدہ لباس اور ہنسی خوشی کے مشاغل کو خیرباد کہتی ہے۔ اب اسکو زیادہ تر ہلکے فاختئی رنگ کی پوشاک پہننی پڑتی ہے۔ بھوری اور ہلکی بادامی رنگت بھی اکثر استعمال کیجاتی ہے۔ جاپان کے مخصوص بھڑکیلے، نظر فریب نقش و نگار کا اگرچہ ان کے لباس میں پتہ نہیں ہوتا مگر تاہم ان کی یہ سادہ پوشاک بھی ضرور خوبصورت ہوتی ہے۔ ان بیچاریوں کو صبح سویرے سب سے پہلے اُٹھنا پڑتا ہے۔ نیند سے بیدار ہونے کے ساتھ ہی اولاً یہ گھر کی تمام کھڑکیاں جو رات بھر بند رکھی جاتی ہیں کھولتی ہیں اور پردوں وغیرہ کو ہٹا دیتی ہیں، یہ کام نوکروں

کے کرنے کے نہیں ہوتے بلکہ بیوی کو بذات خود کرنے پڑتے ہیں۔ اگر شوہر کے ساتھ اسکے
ماں باپ بھی رہتے ہوں تو پھر ان کی خدمت بڑی مستعدی اور تن دہی سے بجالانی پڑتی ہے
ہر بیاہی ہوئی لڑکی کا یہ فرض سمجھا جاتا ہے کہ وہ اپنی ساس اور سسر کی کنیز بنی رہے۔ ان کی تمام
ضرورتوں کو نہایت جاں فشانی کے ساتھ پورا کرنا اسکے لیے عزت کا باعث اور بالکل لونڈی
کی طرح رہنا اسپر لازمی ہے۔ اسی لیے یہ ضروری بات ہے کہ ان خورد سال دلہنوں کو جو اطاعت و
فرماں برداری میں زندگی بسر کرتی اور اپنی ساس کے اشاروں پر چلنے کی عادی ہوتی ہیں جب
ساس بننا نصیب ہوتا ہے تو پھر یہ اپنے بیٹوں کی بیویوں پر خوب جی کھول کر ظلم و ستم کرتی ہیں
بہو کے آتے ہی تمام قیود سے چھوٹ کر خود تو بڑے آرام و آسودگی میں ہو جاتی ہیں اور اس غریب کے
کٹھ پتلی کی طرح نچاتی ہیں۔

غرضکہ شادی کے روز سے ساس بننے تک لڑکیوں کی جاپان میں بڑی ذلت و خواری
کے ساتھ سخت مصیبتوں میں زندگی بسر ہوتی ہے۔ جب لڑکے کا بیاہ ہوتا ہے تو پھر ساس کی تمام مصیبتیں
اور ذلتیں اس نئی نویلی دلہن کے حصہ میں منتقل ہو جاتی ہیں۔ اب اسکو نہ تو پو پھٹتے ہی بیدار ہونے
کی ضرورت ہے اور نہ گھر کے دروازے کھڑکیاں وغیرہ کھولنے کی حاجت۔ وہ اب مزے سے
جب تک جی چاہے خوب پاؤں پھیلا کر سوسکتی ہے اب بیٹے کی نوجوان بیوی سے حسب خواہ
اپنی خدمت کرا سکتی ہے جہاں دل چاہے جاسکتی ہے۔ مسرت و تفریح کے کسی موقع کو جانے نہیں
دیا جا سکتا اور گویا پھر از سر نو زندگی کا لطف حاصل کیا جاتا ہے۔

اس میں بہت کچھ شبہ ہے کہ آیا عورتوں کی یہ موجودہ حالت جاپان میں مغربی رسم و
رواج اور مغربی خیالات کے زبردست سیلاب کا مقابلہ بھی کر سکیگی۔ آجکل جاپان میں مغربی
تہذیب اور تمدن کا بڑا زور ہے۔ اگرچہ اس وقت ان دقیانوسی قوانین کو جن کی ہر خاندان پر حکومت
ہے بہت کم صدمہ پہونچا ہے مگر یہ ضروری ہے کہ جاپان کی موجودہ نسل کی روشنخیال لڑکیاں اپنے
خاوندوں کے دوست احباب اور اعزا و اقربا کی بے مزہ غلامی میں اپنی زندگی کا بہترین حصہ

اس بُری طرح گزار دینے کے خلاف بہت جلد ایکا کر بیٹھیں لیکن تاہم اس وقت تو جاپان کے بہت بڑے حصہ میں قدیم طریقے بڑی شدت سے رائج ہیں وران کی بہت سختی کے ساتھ پابندی کی جاتی ہے۔

پہلے دنوں شادی کے بعد ہر عورت کا جہاں تک ممکن ہو اپنی صورت کو بگاڑ کر نہایت بدشکل بن جانا ضروری تھا اور اس رسم پر بڑی مستعدی سے عمل ہوتا تھا۔ اس سے یہ غرض ہوتی تھی کہ وہ کسی اپنے گھر کے سوا باہر والے کو اپنی جانب مائل کرنا نہیں چاہتی۔ قاعدہ کے مطابق انکو اپنے دانت بھی سیاہ کر دینے پڑتے جس سے ہنسی کے وقت ایک عجیب مکروہ اور بھیانک صورت بن جاتی تھی۔ یہ رسم اب بالکل کم ہوگئی ہے۔ تاہم بڑی تعداد ایسی عورتوں کی اب بھی موجود ہے جنھوں نے مروجہ قاعدہ کے مطابق اپنے دانت سیاہ کر ڈالے تھے۔

جب کوئی عورت جاپان میں بیوہ جاتی ہے تو پھر اسکو انتہا درجہ کی اندوہ ناک ورملول صورت کے ذریعہ سے رنج کا اظہار کرنا پڑتا ہے۔ وہ اپنا سر منڈا دیتی ہے اور حد سے زیادہ ماتمی وضع کا لباس پہنکر حزن وملال کی تصویر بن جاتی ہے۔ اسی لیے یہ کہا گیا ہے کہ ایک جاپانی لڑکی بہشتی چڑیا کی طرح ہوتی ہے جاپانی بیوی فاختہ کی ہوبہو ہوتی ہے اور جاپانی بیوہ کوّے کی شکل رکھتی ہے۔

مترجمہ

سید خورشید علی۔ از حیدرآباد۔ دکن

کرشمۂ فطرت

پروا اور پچھوا ہوا چلنے کا سبب

ہندوستان کے ہر حصے میں ہوا پورب کی طرف سے چلتی ہے یا پچھم کی طرف سے اُتر یا دکن سے کبھی نہیں چلتی۔ اسکا سبب یہ ہے کہ پورب میں سمندر کا ایک بڑا حصہ جسکو خلیج بنگالہ کہتے ہیں واقع ہے اور پچھم میں بحیرہ عرب۔ دکن کی طرف سمندر ہے تو سہی

مگر بہت چھوٹا حصہ۔ اسکا اثر زیادہ نہیں ہو سکتا۔ اور یہی وجہ ہی کہ دکن کی طرف ہندوستان کا ملک پتلا چلا گیا ہی۔ سمندر کے قریب زمین کا بہت ہی چھوٹا اور پتلا حصہ واقع ہی۔ غرض دکن کی طرف زمین اور سمندر دونوں ہی بہت چھوٹے ہیں۔ اُن کا اثر ہَوا کے حرکت دینے میں اتنا کم ہی کہ محسوس نہیں ہوتا۔ اس لیے دکن کی طرف سے ہَوا نہیں چلتی۔ اُتّر کی طرف تو ہمالیہ پہاڑ کی دیوار کھڑی ہی۔ اسکے دوسری طرف ریگستان ہیں اور قریب میں کوئی سمندر نہیں۔ گذشتہ نمبروں میں بیان ہو چکا ہی کہ ہوا کے چلنے کے لیے زمین اور سمندر دونوں کا ہونا لازمی ہی۔ اسلیے اُتّر کی طرف سے بھی ہوا نہیں چل سکتی۔ تو اب صرف دو سمتیں پورب اور پچھم ہی رہگئیں وہیں سے ہندوستان کے مختلف حصوں میں ہَوا چلیگی یعنی پُروا ہوگی یا پچھوا۔

جو حصے خلیج بنگالے کے قریب ہیں اُن میں اکثر پُروا ہَوا چلتی رہیگی۔ مثلاً کلکتہ اور ڈہاکے میں پُروا ہوا چلتی رہے گی اور جو بحیرہ عرب کے قریب ہیں مثلاً بمبئی و کراچی ان میں ہوا پچھوا چلتی ہے اور جو حصے درمیان میں ہیں اُن میں کبھی پُروا اور کبھی پچھوا مثلاً دہلی، علیگڈہ آگرہ وغیرہ میں کبھی پورب کی طرف سے اور کبھی پچھم کی طرف سے ہوا چلتی ہی۔ بارش ہَوا پر منحصر ہی جس طرف کی ہَوا ہوگی اُسی طرف سے بارش ہوگی۔

پُروا ہَوا سے بارش نسبتاً زیادہ

اُن حصوں میں جو خلیج بنگالہ اور بحیرہ عرب سے قریب قریب برابر فاصلے پر ہیں قاعدہ کے بموجب دونوں طرف سے برابر بارش ہونی چاہیے۔ مگر دیکھا جاتا ہی کہ ان مقامات میں بارش زیادہ تر پورب ہی کی طرف سے ہوتی ہی۔

اسکا سبب یہ ہی کہ ہندوستان کے مشرق کی طرف تمام پہاڑ ہیں اور مشرق کی طرف کا شمالی حصہ بھی ہمالیہ سے رُکا ہوا ہی۔ برخلاف اسکے مغربی اور شمالی مغربی حصہ اس طرح پہاڑوں سے رُکا ہوا نہیں ہی۔ اس لیے خلیج بنگالہ کی بخارات سے بھری ہوئی ہَوائیں باہر نہیں جانے پاتی اور سمٹ کر ہندوستان کے اندرونی حصوں میں دور تک پہنچتی ہی۔ مگر بحیرہ عرب کی بخارات سے بھری ہوئی ہَوا اِدہر اُدہر پھیل جاتی ہی۔ اس لیے اسکا اثر ہندوستان کے اندرونی

حصوں میں دور تک نہیں پہنچتا۔ اسی وجہ سے بارش اکثر پُروا ہوا ہی سے ہوتی ہے۔

ملک کی ساخت کا اثر بارش پر

میں پہلے کہہ آیا ہوں کہ خلیج بنگالے کی بخارات سے بھری ہوئی ہوا کو ہمالیہ پہاڑ روک لیتا ہے۔ اسی سبب سے مشرقی و مغربی بنگال اور آسام میں جو خلیج بنگالہ اور ہمالیہ کے درمیان واقع ہیں بہت زیادہ بارش ہوتی ہے۔ وہاں برسات کے موسم میں تمام ملک میں پانی ہی پانی نظر آتا ہے۔ سڑکیں بیکار ہوجاتی ہیں آمد و رفت کشتیوں اور جہازوں کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔ اسی سبب سے وہاں کی آب و ہوا مرطوب ہے۔ وہاں کے

آب و ہوا کا اثر طرز معاشرت پر

باشندوں کی عام غذا چاول و مچھلی ہونے کی وجہ یہی ہے کہ بارش کثرت سے ہوتی ہے غلے میں دھان ہی ایسی چیز ہے کہ جو اس قدر مرطوب زمین میں پیدا ہو سکتا ہے۔ پانی کی کثرت کے سبب سے مچھلی کا افراط کے ساتھ ملنا ظاہر ہے۔ کچھ تو آب و ہوا کا اور کچھ عام غذا کا جو نسبتاً نرم ہے یہ اثر ہے کہ وہاں کے باشندے عموماً ایسے جسیم اور طاقتور نہیں ہوتے جیسے میدانوں اور خشک آب و ہوا کے باشندے۔ اکثر گمان کیا جاتا ہے کہ یہ وہاں کی آب و ہوا ہی کا اثر ہے جو وہاں کے باشندے اچھی عقل اور سمجھ کے ہوتے ہیں جسکے سبب سے وہ بڑی بڑی علمی ترقیاں کرتے ہیں۔

تعلیم میں سبقت کا اثر

اصل میں اسکا سبب یہ ہے کہ انگریزی تعلیم وہاں ہندوستان میں سب جگہ سے پہلے پھیلی۔ وہاں کے لوگوں نے اس زمانے میں انگریزی تعلیم حاصل کر لی جب اور جگہ انگریزوں کا اثر نہیں پہنچا تھا۔ اور سب کے سب جہالت میں پڑے ہوئے تھے۔ ورنہ عام طور پر یہ اصول ہے کہ جس قوم کی صحت جسمانی اعلیٰ درجہ کی ہو اور اسکے سبب سے دل و دماغ عمدہ اور پورے طور پر نشو و نما پائے ہوئے ہوں۔ وہ قوم ہر ایک بات میں اوروں سے اچھی ہوگی۔

دنیا میں سب سے زیادہ بارش کا مقام

یوں تو عام طور سے ہی تمام بنگال میں کثرت سے بارش ہوتی ہے۔ مگر اسکے ایک مقام چراپونجی میں جو آسام میں واقع ہے دنیا میں سب سے زیادہ بارش ہوتی ہے۔ سال بھر میں چار سو انچ سے کچھ زائد ہوجاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مقام ہمالیہ

دامن میں ایسی جگہ واقع ہی جہاں خلیج بنگالہ کی بخارات سے بھری ہوئی ہوا اگر کہیں آگے نہیں جاسکتی، اس ہوا کے تمام بخارات مینھ کی صورت میں اسی جگہ زمین پر گرتے ہیں۔ یہ صورت کسی اور جگہ دنیا میں نہیں ہی اسی لیے یہاں کی برابر اور کہیں بارش نہیں ہوتی۔ بنگال سے جس قدر شمال و مغرب کی طرف چلتے جاؤ اُسی قدر بارش کی مقدار کم ہوتی جائے گی۔ یہانتک کہ سندھ میں جو خلیج بنگالہ کا انتہائی شمال و مغربی گوشہ ہی۔ ہندوستان میں سب سے کم بارش ہوتی ہی۔

سندھ میں بارش کم ہوتی ہے

اس کی کئی وجہ ہیں سب سے بڑی تو یہ کہ سندھ ریگستان ہی۔ وہاں کی آب و ہوا نہایت خشک ہی ہوا ہیں سے پانی کے بخارات کو جذب کرلیتی ہی۔ دوسرے یہ کہ اُسکا فاصلہ خلیج بنگالہ کے سمندر سے ہندوستان کے اور مقاموں کی نسبت سب سے زیادہ ہے، تیسرے اگرچہ وہ ایک سمندر یعنی بحیرہ عرب سے بہت نزدیک ہے۔ مگر بخارات کی بھری ہوئی ہوا کو روکنے کے لیے اسکے آس پاس کوئی پہاڑ نہیں ہی۔

بارش کی ناپ

بارش کی ناپ کے کئی طریقے ہیں اُن میں سب سے زیادہ آسان یہ ہی کہ ایک چوڑے مونھ کی نلی یا کوئی اور برتن جو اوپر نیچے سے بالکل یکساں ہو کسی کھلی جگہ میں ایسے موقع پر رکھدو جہاں سوائے بوندوں کے پانی کے زمین پر بہتے ہوئے پانی کا ایک قطرہ بھی اس نلی یا برتن میں جانے کھلی جگہ اس لیے ہونی چاہیے تاکہ کسی جگہ اور کسی طرف سے مینہ کی بوندوں کے لیے روک نہو اسکے لیے کھلی ہوئی چھت بہت موزوں جگہ ہی بارش ہو چکنے کے بعد ناپ لو کہ کے انچ اونچائی تک اس برتن میں پانی جمع ہوگیا ہی بس اتنے ہی انچ بارش ہوئی اور اور طریقے ہیں اور عمدہ آلات ہیں جن کے ذریعے اندازہ زیادہ صحت کے ساتھ ہوسکتا ہی۔ مگر اس طریقہ سے بھی جو بیان ہوا قریب قریب صحیح اندازہ ہوجاتا ہی۔

اسکا حال تو تم نے سُن لیا کہ دنیا میں سب سے زیادہ بارش کہاں اور کیوں ہوتی ہی اب ذرا اس طرف بھی متوجہ ہو جیسے جہاں بارش بالکل ہوتی ہی نہیں۔

صحرائے افریقہ

یہ مقام افریقہ کا صحرا ہی۔ صحرا مصر کے جنوب میں براعظم افریقہ کے مشرق سے

مغرب تک چلا گیا ہی۔ اسکا طول تقریباً تین ہزار میل اور عرض ایک ہزار میل تمام قطعہ ریت سے بھرا ہوا ہی۔ اس میں ندی نالے یا پہاڑ نام کو نہیں سینکڑوں کوس کے فاصلہ پر کہیں کہیں کھجور کے کچھ درخت نظر آجاتے ہیں۔ اس جگہ بہت تھوڑی مقدار میں کسی قدرتی چشمے سے پانی بھی بہتا ہوا نظر آجاتا ہی۔ ایسے مقاموں کو نخلستان کہتے ہیں۔ نخلستان کے معنی درختوں کی جگہ۔

نخلستان

صحرا اور سمندر یہ بات ثابت ہوگئی ہی کہ کسی زمانے میں یہ صحرا سمندر کا حصہ ہوگا کسی بڑے قدرتی انقلاب سے اس سمندر کے حصے کا پانی کسی اور طرف چلا گیا اور اسکو خشک اور ویران کر گیا۔ اول اول جب پانی یہاں سے ہٹا ہوگا تو اُس کی صورت ایسی نہ ہوگی جیسی کہ اب ہی ہزارہا برس کی گرمی اور خشکی نے سمندر کی تہ کی تمام چیزوں کو جو اس قطعہ میں باقی رہگئی ہونگی خشک ریت کی صورت میں تبدیل کر دیا ایسے واقعات چھوٹے پیمانے پر ہمارے دیکھنے میں اکثر آتے رہتے ہیں۔

سمندر کا راستہ بدلنا ایک مقام کو ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں دریا لہریں مارتا ہوا چلا جا رہا ہی۔ کچھ عرصے بعد اگر اتفاق سے ہمارا گذر وہاں ہوجاتا ہی تو دیکھتے ہیں کہ وہ مقام ایک ریتلا میدان ہی اور دریا اُس مقام سے ہٹ کر دور بہہ رہا ہی۔ وہ ریتلا میدان ایک چھوٹا سا صحرا ہی۔

دریا کے راستے بدلنے کے کئی سبب ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ زلزلے کے سبب سے دریا کے راستے کی کسی مقام کی سطح بہت اونچی ہوجائے تو دریا کا پانی ادہر آکر رکیگا اور پھر کسی دوسری طرف بہنے لگیگا۔ دوسرے بعض دریا اپنے ساتھ ریت مٹی بکثرت لاتے ہیں وہ ریت مٹی اُن مقاموں پر جہاں دریا کی تیزی کم ہوتی ہی آہستہ آہستہ بیٹھتی رہتی ہی اور کچھ مدت میں ایک پشتہ سا ہوجاتی ہی اُس وقت دریا وہاں سے ہٹ کر بہنے لگیگا۔ تیسرے دریا میں بے شمار ندی نالے ادہر اُدہر سے آکر ملتے ہیں۔ اگر کوئی ندی نالہ کسی طرف سے آکر ملا اور اُسکا زور دریا کی روانی سے زیادہ ہے تو وہ دریا کے راستے کو بدل دیگا۔

غرض ایسے انقلاب روزمرّہ ہوتے رہتے ہیں کہ کوئی تری کا حصہ خشکی ہوگیا اور کوئی

خشکی کا قطعہ پانی میں غرق ہوگیا مگر ایسا بڑا انقلاب جس سے اتنا بڑا سمندر کا حصہ (جواب صحرا ہے) خشکی ہوگیا۔ سوائے زلزلے کے اور کسی طرح ممکن نہیں۔

زلزلہ باعث انقلاب

زمین کے چاروں طرف پانی ہی پانی ہے۔ اسکے مختلف حصوں کے نام انسان نے مختلف رکھ لیے ہیں۔ ورنہ اصل میں سب سمندر ایک ہی ہیں۔ یہ تحقیق نہیں کہ دنیا کے کس حصہ میں اور کب زلزلہ آیا تھا جس کے سبب سے افریقہ کے اُس حصّے کا پانی جہاں اب صحرا ہے کہیں ادھر چلا گیا اور نہ یہ معلوم کس طرف گیا مگر یہ ضرور ہے کہ دنیا کی خشکی کا ایک تقریباً اُتنا ہی بڑا قطعہ سمندر ہوگیا ہوگا جس وقت یہ سمندر کا حصہ خشکی ہوا ہوگا۔

صحرا کو سمندر بنانا

فرانس کے ایک فاضل انجنیر نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ اس صحرا کے مشرقی جانب کے سمندر سے پانی کاٹ کر اس صحرا میں ڈال دیا جائے اور اُسکو پھر سمندر کر دیا جائے تاکہ پھر جہازوں کے ذریعے آمد و رفت ہو سکے۔ کیونکہ موجودہ صورت میں کسی طرح آمد و رفت ہو ہی نہیں سکتی۔ ایسا ہو سکتا تھا کیونکہ سمندر کا کنارہ صحرا کے کنارے سے اونچا ہے۔ مگر اسکے ساتھ ہی یہ خیال ہوا کہ جب اتنے بڑے خشکی کے قطعہ کو سمندر بنایا جائیگا تو سمندر کا اتنا ہی بڑا حصہ خشک ہو جائیگا

ناکامی اور چونکہ سمندروں کا حال اچھی طرح تحقیق نہیں ہے اس لیے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ کونسا حصّہ خشک ہوگا۔ اگر فرض کرو کہ یورپ کے سمندروں کا کوئی حصہ خشک ہوجاتا تو یورپ بالکل تباہ و برباد ہوجاتا کیونکہ پھر وہاں بارش ہی نہیں ہوتی۔ ہاں اگر بحر شمالی یا جنوبی کا پانی خشک ہوجائے تو چنداں ہرج نہیں۔ کیونکہ وہاں آبادی ہی نہیں۔ مگر چونکہ تحقیق نہ ہو سکا اس لیے اس تجویز پر عمل نہ ہوا۔ مگر ایک چھوٹے پیمانے پر اسکا عمل درآمد کیا گیا ہے۔

نہر سویز

عرب کا ریگستان بھی اس صحرا کا ایک حصہ ہے۔ یہ دونوں ریگستان پہلے ایک خشکی کے قطعے سے جسکو خاکنائے سویز کہتے تھے ملے ہوئے تھے۔ اس خاکنائے کے شمال و جنوب کی طرف دو سمندر ہیں۔ اس بیچ کے قطعے کو نہر بنا دیا ہے اور نہر کے ذریعہ سے دونوں سمندروں کو ملا دیا ہے اس نہر کے ذریعہ سے ایک سمندر سے دوسرے سمندر میں جہاز آسکتا ہے اسکا نام نہر سویز ہے۔

یہ قریب نوّے میل کے لمبی ہے۔

اس نہر سے پہلے یورپ کے جہاز افریقہ کے گرد ہوکر ہندوستان میں آتے تھے اب نہایت آسانی ہوگئی ہے۔ ہزار ہا میل کے بجائے سینکڑوں رہ گئے خلیفہ ہارون رشید کے زمانے میں بھی اس قطعہ کو نہر بنانے کی تجویز کی گئی تھی مگر انجنیروں کو غلطی سے یہ معلوم ہوا کہ ایک سمندر کی سطح دوسرے سمندر کی سطح سے اونچی ہے اس سبب نہر نہیں بن سکتی۔ اس سے تقریباً چھ سو برس کے بعد فرانس کے انجنیر نے ثابت کردیا کہ دونوں کی سطح برابر ہے۔ غرض کہ اس کارِ عظیم کا سہرا ایک فرانس کے باشندے کے سر رہا۔ اگر اس زمانہ میں یہ نہر ہوجاتی تو عرب اور مصر کو خصوصاً اور تمام مشرقی ممالک کو عموماً تجارتی اور تمدنی لحاظ سے وہی عروج ہوجانا ممکن تھا جو آج یورپ والوں کو ہے۔

بارش نہ ہونے کے اسباب

اب میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس صحرا میں بارش کیوں نہیں ہوتی۔ اسکا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ یہاں کی ہوا اس قدر گرم خشک ہے کہ سمندر کی بخارات سے بھری ہوئی ہوا جب یہاں آتی ہے تو اس کی تمام تری یہاں کی ہوا جذب کرلیتی ہے۔ اور پھر اس ہوا میں تری نام کو نہیں ہے۔ اس صحرا میں اگر مشک میں پانی بھر کر رکھا جائے تو وہ چند گھنٹوں میں خشک ہوجائیگا۔ یہی سبب ہے کہ اس صحرا میں انسان کا گذر نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اس میں تو پانی کہیں ملتا نہیں اور جو پانی ساتھ ہو وہ بھی خشک ہوجاتا ہے۔ قریب قریب یہی حال عرب کے ریگستان کا ہے یہ ریگستانی سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوا بلکہ ایران کے شمال سے ہوتا ہوا وسط ایشیا تک پہنچتا ہے۔ وہاں اسکا نام صحرائی گوبی یا شامو ہے۔ سندھ اور مارواڑ کا ریگستان بھی اسی کا حصہ ہے۔ اس بڑے عظیم الشان ریگستان کے تمام حصوں میں کسی زمانہ میں سمندر ہوگا۔

یہ بھی ثابت ہوچکا ہے کہ ہمالیہ پہاڑ جو قریب پانچ میل کے بلند ہے۔ کسی زمانہ میں سمندر کے نیچے تھا تو اس طرح سے صحرائی افریقہ عرب وایران۔ وسط ایشیا اور ہندوستان کے شمالی حصے کا بھی پانی سے ڈھکا ہوا ہونا بعید از قیاس نہیں ہے۔

اول اول پانی تھا | بعض فلاسفروں نے ثابت کیا ہے کہ دنیا میں اوّل اوّل پانی ہی پانی تھا۔ رفتہ رفتہ زلزلہ وغیرہ قدرتی اسباب سے خشکی ظاہر ہوتی گئی۔ انہی قدرتی اسباب سے ملکوں کی صورتیں بدلتی رہتی ہیں۔ ملک کا کوئی حصہ کبھی سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔ اور کبھی سمندر سے کوئی جزیرہ نکل آتا ہے۔

ملکوں کی ساخت اور دریاؤں کے متعلق آیندہ پرچے میں لکھوں گا۔

صغیر علی فریدآبادی
ہلکر کالج۔ اندور

قرون اولیٰ کی حق گوئی و حق پسندی

اگرچہ وحشیانہ آزادی وبیباکی عرب عربا کی طبیعتوں میں قدیم سے متوارث چلی آتی تھی مگر اسلام کی تعلیم سے جبتک کہ خودمختار سلطنتوں کے سیلاب نے اسکو گدلا اور مکدر نہیں کیا ان کی یہ جبلی خصلت تہذیب وشایستگی کے زیور سے آراستہ ہوگئی تھی اور آزادی کا جوہر حق گوئی وحق پسندی کے قالب میں ڈہل گیا تہا یہی وجہ تھی کہ خلفا کی غلطیوں پر گرفت کی جاتی تھی اور وہ معقول اعتراض سُنکر خاموش ہوجاتے تھے عمر فاروق پر جب کوئی اعتراض کرتا تھا اور کہتا تھا کہ "اے عمر! خدا سے ڈر" تو وہ اُسکا شکریہ ادا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ خدا اُسکا بھلا کرے جسنے ہمارے عیب سے ہم کو آگاہ کیا"

ایک دفعہ اُنہوں نے ایک معمر آدمی کو جبکہ وہ اپنے گھر کے اندر شراب ونغمہ میں مشغول تہا، سخت نفریں کی۔ اُسنے کہا "اے امیرالمومنین! تیری حرکت اس سے بھی زیادہ قابل نفریں ہے، تو نے تجسس کیا، حالانکہ خدا تجسس کرنے سے منع کرتا ہے، پھر تو گھر میں بغیر اذن کے چلا آیا، حالانکہ خدا نے اس کی ممانعت کی ہے۔ عمر فاروق نے کہا "بیشک تو سچ کہتا ہے" اور

وہاں سے نہایت ندامت اور افسوس کے ساتھ یہ کہتے ہوئے باہر نکلے کہ ثکلت عمر امہ ان لم یغفر لہ ربہٗ یعنی عمر کی ماں اسکو رو دیو اگر خدا اسکا قصور معاف نہ کرے۔

قرونِ اولیٰ کی تاریخ میں اس قسم کی مثالیں شمار و احصاء سے خارج ہیں اور جس طرح مردوں کی آزادی و حق گوئی کی مثالیں جابجا ملتی ہیں اسی طرح عورتوں کی بھی ایسی مثالوں کی کچھ کمی نہیں ہے یہاں ہم کتاب **عقد الفرید** سے چند حکایتیں اُن عورتوں کی نقل کرتے ہیں جو جنگ صفین میں بنی ہاشم کی طرف دار تھیں اور عین جنگ کے موقع پر اہل شام کے برخلاف نہایت جوش و خروش کے ساتھ خطبے پڑھتی تھیں اور جنگ کے خاتمہ کے بعد جب امیر معاویہ سے اُن کی گفتگو ہوئی تو اُنھوں نے نہایت آزادی کے ساتھ اپنے دلی خیالات ظاہر کیے اور جس بات کو وہ اپنے نزدیک حق جانتی تھیں اُس کے ظاہر کرنے سے امیر شام کا رعب و داب اُن کو مانع نہیں آیا۔

ازاں جملہ شعبی سے روایت ہے کہ بنی ہلال کی ایک عورت بکارہ نام نے امیر معاویہ کے روبرو جبکہ وہ مدینہ میں تھے حاضر ہونے کی اجازت چاہی چنانچہ اسکو اجازت دیگئی۔ بکارہ اُس وقت معمر ہوگئی تھی اُس کی بینائی میں فرق آگیا تھا قویٰ ضعیف ہوگئے تھے اور بدن میں رعشہ تھا، دو خادم اسکو تھام کر امیر کے سامنے لائے، بکارہ نے سلام کیا اور بیٹھ گئی امیر نے سلام کا جواب دیا اور مزاج پوچھا اور کہا، افسوس ہے کہ زمانہ نے تمہارا حال دگرگوں کردیا۔ بکارہ نے کہا! بیشک اُس کی گردشیں ایسی ہی ہیں۔

مروان نے بطور سعایت کے کہا! اے امیر المومنین تم نے اُس کا کلام بھی سنا وہ کہتی ہے:

اترى ابن هند للخلافة مالكا — هيهات ذاك وان اراد بعيد
منتك نفسك في الخلاء ضلالة — اغراك عمرو وللشقا وسعيد

یعنی کیا ہم ابن ہند (یعنی معاویہ) کو خلافت کا مالک سمجھیں؟ یہ دور از قیاس ہے اور اگر وہ ایسا چاہے، تو اُس کے مرتبے سے بالاتر ہے (اے معاویہ) تیرے نفس نے گمراہی سے

یہ آرزو تیرے دل میں ڈالی ہے اور عمرو ابن العاص اور سعید ابن العاص نے تجکو بدبختی کے لیے ورغلانا ہے۔

جب مروان یہ اشعار پڑھ چکا تو سعید ابن العاص نے کہا، اُس نے یہ اشعار بھی کہے ہیں،

قد کنت اطمع ان اموت ولا اری — فوق المنابر من اُمیۃ خاطبا

فاللہ اخر مُدتی فتطاولت — حتے رأیت من الزمان عجائبا

فی کل یوم للزمان خطیبہم — بین الجمیع لآل احمد عائبا

یعنی میری آرزو تھی کہ میں مرجاؤں اور بنی اُمیہ میں سے کسی کو منبر پر خطبہ پڑہتا نہ دیکھوں، مگر خدا نے میری رستی دراز کردی یہانتک کہ زمانہ کے عجیب عجیب کرشمے میری نظر سے گذرے اور میں برابر اُن کے خطبوں سے علی الاعلان آل احمد کی بُرائیاں سُنتی رہی،

مروان وغیرہ جب یہ چھیڑ کرنے کے بعد خاموش ہوے، بکارہ بولی، اے معاویہ! بیشک یہ میرا کلام ہے جو اُنہوں نے اس وقت پڑہا او جو ابھی تجھ پر ظاہر نہیں کیا گیا، وہ اس سے بہت زیادہ ہے۔ امیر کو یہ سُنکر ہنسی آگئی اور کہا، یہ امر تمہاری حاجت براری کرنے سے مجھ کو مانع نہیں آسکتا۔ تم اپنی حاجت بیان کرو۔ اُس غیرتمند عورت نے کہا، بس اب اس بے لطفی کے بعد ایسا نہیں ہوسکتا اور وہاں سے اُٹھکر چلی گئی،

ازانجملہ شعبی نے بنی اُمیہ کی ایک جماعت سے روایت کی ہے کہ ایک ن رات کو جبکہ امیر کے پاس عمرو، سعید، عتبہ اور ولید موجود تھے۔ عدی ابن قیس ہمدانی کی بیٹی ذرقاء کا ذکر چلا جو اپنی قوم کے ساتھ جنگ صفین میں شریک تھی۔ امیر نے کہا تم میں سے کسی کو اُسکا کلام یاد ہے؟ اُن میں سے بعض نے کہا کہ اسکو قتل کرادیا جائے۔ امیر نے کہا تم نے بہت بُرا مشورہ دیا، کیا مجکو زیبا ہے کہ میں اپنی نسبت لوگوں سے یہ کہلواؤں کہ ایک عورت کو جبکہ وہ قابو میں آگئی قتل کروا ڈالا،

اسکے بعد امیر نے کوفہ کے عامل کو لکھا کہ زرقا کو اسکے چند معتمد محرموں اور قبیلہ کے سرداروں کے ہمراہ عمدہ ساز و سامان کے ساتھ اور معقول سفر خرچ دیکر اس طرف روانہ کر دو۔ عامل نے زرقا کو طلب کیا اور امیر کا خط پڑھوا دیا۔ زرقا نے کہا اگر امیر نے میرا وہاں جانا میری مرضی پر رکھا ہے تو میں جانا نہیں چاہتی اور اگر حتمی حکم ہے تو بہرحال جانا پڑیگا۔ فرماں برداری ضروری ہے، آخر عامل نے جیسا کہ اُسکو حکم تھا بہت تزک و احتشام کے ساتھ اسکو روانہ کیا۔

جب وہ معاویہ کے پاس پہنچی تو اسکو بہت خاطرداری اور اعزاز کے ساتھ لیا اور پوچھا کہ سفر کس طرح طے ہوا؟ کہا جس طرح لڑکی ماں کی گود میں پرورش پاتی ہے یا بچہ گہوارہ میں سوتا ہے امیر نے کہا ہم نے اسی طرح عامل کو ہدایت کی تھی پھر زرقا سے پوچھا! تم کو معلوم ہے کہ تم کیوں بلائی گئی ہو؟ کہا جو راز مجھ پر ظاہر نہیں کیا گیا اُسکو میں کیونکر جان سکتی ہوں۔

امیر نے کہا اے زرقا، کیا تو سرخ اونٹ پر سوار جنگ صفین کے مجمع میں موجود نہ تھی اور کیا تو اپنے خطبوں سے آتش حرب کو نہیں بھڑکا رہی تھی اور لوگوں کو مقابلہ پر برانگیختہ نہیں کر رہی تھی آخر اس جوش کا کیا سبب تھا؟ زرقا نے کہا اے امیر المومنین! سر مر چکا[۱] اور دُم کٹ چکی اور جو جانا تھا جا چکا۔ زمانہ پلٹیاں کھانے والا ہے اور حوادث و واقعات کا سلسلہ برابر جاری ہے۔

امیر نے کہا اے زرقا! تجکو اپنا اُس دن کا خطبہ یاد ہے؟ اُس نے کہا لا واللہ مجکو بالکل یاد نہیں رہا امیر نے کہا تجکو نہیں، تو مجکو یاد ہے۔ تیری اس تقریر کا کیا کہنا ہے جو تو اُس وقت کہہ رہی تھی کہ "لوگو باز آؤ اور پلٹ جاؤ، تم اُس فتنہ میں پڑ گئے ہو جس نے تم پر ظلمت کے پردے ڈالدیے ہیں اور تم کو راہ راست سے برگشتہ کر دیا ہے یہ کیسا اندھا اور بہرا اور گونگا فتنہ ہے کہ نہ ہانکنے والی کی ہانک سنتا ہے اور نہ کھینچنے والے کی مرضی پر چلتا ہے۔ دیکھو چراغ آفتاب کے سامنے روشن نہیں ہوتا اور ستارے چاند کے سامنے ماند رہتے ہیں اور لوہے کو لوہا ہی کاٹ سکتا ہے، دیکھو!

---

[۱] عربی کی یہ مثل کہ "ضاف الراس وبتر الذنب" ایسے موقع پر بولی جاتی ہے جیسے ہم کہتے ہیں گذشتہ را صلواۃ یا الماضی لا یذکر،

جو ہم سے راہ پوچھے گا ہم اس کو راہ بتائینگے، اور جو ہم سے سوال کریگا، ہم اسکو جواب دینگے لوگو! حق اپنی کھوئی ہوئی چیز کو ڈھونڈھ رہا تھا سو وہ اسکو مل گئی ہی۔ پس اے مہاجرین! غم وغصہ پر صبر کرو۔ تفرقہ کا رخنہ بند ہو گیا ہی اور کلمۂ حق پر سب متفق ہو گئے ہیں اور سچائی نے ظالموں کا سر توڑ دیا ہی۔ یاد رکھو عورتوں کی آرایش مہندی سے ہی اور مردوں کی خون سے' غرضکہ جس قدر امیر کو اسکے فقرے یاد تھے پڑھکر کہا، اے زرقا! جو خون علیؓ نے بہائے اُن میں تو بھی شریک تھی؟ زرقا نے کہا خدا تیرا بھلا کرے اور تجھے سلامت رکھے تو نے ایک مژدہ سُنا کر اپنی جلیس کو (یعنی مجھکو) خوش کر دیا۔ امیر نے کہا، کیا اس بات سے کہ سفک دمار میں تو علی کے ساتھ شریک تھی، تجھکو خوشی ہوئی؟ کہا بیشک اور اب مجھکو میرے خیالات کا بخوبی اندازہ ہو گیا ہوگا، امیر یہ سُنکر ہنسا اور کہا واللہ علیؓ کے ساتھ تمہاری وفاداری اُس کی وفات کے بعد زیادہ عجیب ہی بہ نسبت اُس محبت وولا کے جو اُس کی زندگی میں تم اُسکے ساتھ رکھتے تھے۔ اے زرقا اب تو اپنی حاجت بیان کر میں اُسکو پورا کر دونگا، زرقا نے کہا میں نے قسم کھائی ہی کہ جنکے برخلاف میں نے کوشش کی ہی اُن سے کچھ بھی سوال نہ کرونگی، ہاں اگر تو بغیر طلب اور خواہش کے کچھ دے تو تجھکو اختیار ہی۔ امیر نے کہا ٹھیک ہی اور اسکو اور اُسکے ہمراہیوں کو انعام واکرام وخلعت دیکر رخصت کیا۔

سعید ابن حذافہ سے منقول ہی کہ مروان نے جبکہ مدینہ کی ولایت اسکے نامزد تھی، ایک لڑکے کو کسی قصور پر قید کر دیا۔ جب اُسکے گھر خبر پہنچی تو اس کی دادی ام سنان بنت جشمہ مروان کے پاس گئی اور اپنے پوتے کے باب میں کچھ گفتگو کی۔ مروان نے نہایت سخت جواب دیا۔ وہ جواب سُنکر سیدھی امیر معاویہ کے دربار میں پہنچی۔ اور اپنا حسب نسب بیان کیا۔ امیر نے اسکو پہچان لیا اور کہا اے بنت جشمہ! بہت اچھا ہوا کہ تو آئی، مگر یہاں قدم رنجہ کرنے کا کیا باعث ہوا؟ مجکو خوب معلوم ہی کہ تو ہم پر تبرا کرتی تھی اور ہمارے دشمنوں کو ہمارے مقابلہ میں برانگیختہ کرتی تھی،

ام سنان نے کہا، سُن لے معاویہ! عبد مناف کی اولاد کو اخلاق پاکیزہ اور حلم وسیع دیا گیا ہی۔ وہ واقف ہوکر انجان نہیں بنتے اور حلم اختیار کرکے سفاہت اختیار نہیں کرتے اور عفو کے بعد انتقام نہیں لیتے۔ اور سب سے زیادہ اپنے اسلاف کے قدم بقدم چلنا تجھ کو سزاوار ہی۔ امیر نے کہا، ہاں بیشک ہم ایسے ہی ہیں۔ اسکے بعد امیر نے ام سنان کے چند اشعار پڑھے جس میں علی مرتضیٰ کی مدح وثنا اور اُن کے مخالفین پر تعریض کی گئی تھی، ام سنان نے اقرار کیا کہ بیشک یہ اشعار میرے ہیں، مگر میں امید کرتی ہوں کہ ہمارے لیے (علی مرتضیٰ کے بعد) اچھا جانشین ہوگا،

امیر کے ایک جلیس نے ام سنان کے کچھ اور اشعار پڑھے جن سے امیر کی طبیعت پر اُس کی نسبت بُرا اثر ہوا، ام سنان نے کہا اے امیر المومنین! مسلمانوں کے دل میں تیری دشمنی پیدا ہونے کے یہی لوگ باعث ہیں۔ ان کی باتوں کو حقیر جان اور ان کو اپنا مقرب نہ بنا اگر ایسا کریگا، تو خدا کا قرب اور مومنوں کی محبت تیرے ساتھ زیادہ ہوگی۔ تو ہماری رائے اور ہمارے دلی خیالات سے واقف ہی، واللہ کہ علیؓ کو ہم تجھسے زیادہ محبوب رکھتے تھے لیکن تجھکو بھی اور لوگوں سے زیادہ محبوب رکھتے ہیں۔ امیر نے پوچھا کن سے۔ کہا مروان بن الحکم اور سعید بن العاص سے۔ امیر نے پوچھا میں اس محبت کا مستحق تیرے نزدیک کیونکر ہوا؟ کہا اپنی وسعت حلم اور عفو و درگذر کے سبب سے۔

امیر نے پوچھا یہاں کیونکر آنا ہوا؟ کہا مروان نے مدینہ میں ایسے قدم جمائے ہیں کہ گویا کبھی وہاں سے نہ ٹلے گا۔ نہ وہ انصاف کے ساتھ حکومت کرتا ہی اور نہ شریعت کے موافق فیصلہ کرتا ہی۔ مسلمانوں کی لغزشیں ڈھونڈھتا رہتا ہی اور اُن کے پردے فاش کرتا ہے چنانچہ ابھی اُسنے میرے پوتے کو قید کیا ہی۔ میں اسکے پاس گئی تھی۔ اُس نے کہا تو نے ایسا کیا اور تو نے ویسا کیا (یعنی بنی اُمیہ کے برخلاف کارروائیاں کیں) میں نے بھی اُسکو پتھر سے زیادہ کرخت اور حنظل سے زیادہ کڑوے جواب دیے اور اپنے تئیں ملامت کی اور

دل میں کہا کہ میں کیوں نہ اپنا معاملہ اس شخص کے پاس لیجاؤں جس سے بہ نسبت مروان کے زیادہ عفو و درگذر کی امید ہے۔ بس میں تیرے پاس آئی ہوں، تاکہ تو میرے معاملہ میں غور کرے امیر نے کہا تو سچ کہتی ہے میں تجھ سے تیرے پوتے کی صفائی کی نسبت کچھ پوچھنا نہیں چاہتا اور کاتب کو اشارہ کیا کہ رہائی کا حکم لکھ کر اس عورت کو دیدو اور پانچ ہزار درہم زاد راہ کے دیے اور اونٹ سواری کے لیے اسکو دیکر رخصت کیا۔

ازاں جملہ ابوبکر ہذلی نے عکرمہ سے روایت کی ہے کہ اطرش ابن رواحہ کی بیٹی اپنے عصا کے سہارے سے امیر معاویہ کے دربار میں آئی اور یہ کہکر کہ السلام علیک یا امیر المومنین! بیٹھ گئی۔ امیر نے کہا اے عکرشہ! کیا میں اب تیرے نزدیک امیر المومنین ہوگیا؟ عکرشہ نے کہا ہاں؛ کیونکہ اب علیؑ زندہ نہیں ہے۔ اسکے بعد امیر نے کہا؛ کیا تو تلوار حمائل کیے صفین میں خطبہ نہیں پڑھ رہی تھی اور چند فقرے جو اُسکے خطبہ میں سے یاد رہ گئے تھے پڑھے جن میں یہ الفاظ بھی شامل تھے کہ "اے مہاجرین و انصار! معاویہ نا سمجھ عربوں کو جو نہ ایمان کو جانتے ہیں نہ شریعت کو سمجھتے ہیں ساتھ لیکر تم سے لڑنے کو آیا ہے اُن کو دُنیا کا لالچ دیا ہے سو وہ لالچ میں آگئے ہیں اور اُن کو باطل کی طرف پکارا ہے سو وہ اُس کی طرف دوڑ پڑے ہیں۔" پھر امیر نے کہا کہ میں اُس وقت تجکو دیکھ رہا تھا کہ تو گویا اسی عصا کے سہارے سے کھڑی تھی اور دونوں لشکر بالاتفاق کہہ رہے تھے کہ یہ اطرش بن رواحہ کی بیٹی عکرشہ ہے۔ اُس وقت اگر تیرے اختیار میں ہوتا تو تو اہل شام کا قتل و قمع کر ڈالتی، مگر جو خدا کو منظور ہوتا ہے، وہی ظہور میں آتا ہے۔ آخر اس جوش کا کیا سبب تھا؟

عکرشہ نے کہا اے امیر المومنین! صدقات میں ہمارا حق تھا جو کہ ہمارے مقدور والوں سے لیے جاتے تھے اور ہمارے بیمقدوروں پر تقسیم کیے جاتے تھے سو یہ حق ہمارے ہاتھ سے جاتا رہا تھا۔ نہ ہمارے شکستہ حالوں کی خبر لیجاتی تھی اور نہ ہمارے محتاجوں کی دستگیری کی جاتی تھی۔ بس اگر یہ تیری رائے سے ہوا تھا تو تجکو غفلت سے ہوشیار ہونا اور اپنی رائے

سے رجوع کرنا چاہیے تھا۔ اور اگر تیری رائے کے خلاف تھا تو تجھ کو زیبا نہیں تھا کہ خائنوں سے مدد لے اور ظالموں کو کام سپرد کرے۔ امیر نے کہا اے عکرشہ ہم کو رعیت کے معاملات میں ایسے امور پیش آجاتے ہیں جنکی روک تھام کرنا اور ہمیشہ مشکل ہو جاتا ہی۔ عکرشہ نے کہا خدا نے ہمارے لیے کوئی حق ایسا مقرر نہیں کیا جس میں دوسرے کا ضرر ہو، آخر امیر نے اُسکی خواہش کے موافق حکم دیدیا۔

ازانجملہ ابو سہل تمیمی سے روایت ہی کہ معاویہ ابن ابی سفیان نے موسم حج میں بنی کنانہ کی ایک عورت کا حال پوچھا جو حجون میں اُترا کرتی تھی اور جسکو دارمیہ حاجونیہ کہتے تھے اور جو نہایت سیہ فام اور فربہ تھی۔ لوگوں نے کہا وہ موجود ہی۔ امیر نے اسکو بلابھیجا اور جب وہ آئی تو اُس سے پوچھا، کہ اے دارمیہ تو جانتی ہی کہ تجھکو کیوں بلایا گیا ہی؟ اُس نے کہا غیب کا علم تو خدا ہی کو ہی۔ امیر نے کہا میں نے تجھے یہ پوچھنے کو بلایا ہی کہ کس لیے علی سے محبت اور مجھ سے بغض رکھتی تھی؟ اُس نے کہا تو مجکو معاف کریگا؟ امیر نے کہا نہیں۔ اس نے کہا اگر تو نے معافی سے انکار کیا ہی تو سُن!

میں علی کو اس لیے دوست رکھتی تھی کہ وہ رعیت کے ساتھ انصاف کرتا تھا سب کو استحقاق کے موافق حقوق دیتا تھا مسکینوں سے محبت رکھتا تھا اور دینداروں کی تعظیم کرتا تھا اور تجھ سے اسلیے بغض رکھتی تھی کہ تو اپنے سے فضل کیساتھ لڑا اور جسکا تو مستحق نہ تھا اس حق کا طالب ہوا۔ تو نے خونریزی کرائی۔ فیصلوں میں ناانصافی کی۔ ہوائے نفس کے موافق حکومت کی امیر نے کہا اے بدبخت تو نے علی کو بھی دیکھا ہی؟ کہا کیوں نہیں۔ امیر نے کہا، تو نے اسکو کیسا پایا کہا واللہ اسکو تیری طرح حکومت نے فتنہ میں نہیں ڈالا اور دولت نے تیری طرح اسکو غافل نہیں کیا امیر نے پوچھا اسکا کلام تو نے سُنا ہی کہا کیوں نہیں۔ اسکا کلام تاریکی سے دلوں کو اس طرح جلا کرتا تھا۔ جیسے کہ تیل برتن کا زنگ چھٹا دیتا ہی۔

امیر نے کہا بیشک تو سچ کہتی ہی اگر تجھ کو کوئی حاجت ہو تو بیان کر، اُس نے کہا کیا تو اُسے

پورا کریگا؟ امیر نے کہا ضرور، اُس نے کہا مجھکو سو اونٹنیاں سرخ رنگ کی دے، جنکے ساتھ اُن کا ساربان بھی ہو۔ امیر نے کہا، اگر میں یہ اونٹنیاں تجکو دوں تو بھی میری جگہ تیرے دل میں علی کے برابر ہوگی یا نہیں، دارمیہ نے کہا سبحان اللہ! کیا اسکے سوا دوسرے شخص کی جگہ۔ امیر نے اسکے جواب میں یہ دو شعر پڑھے،

اذا لم اعد بالحلم منی علیکم — فمن ذا الذی بعدی یومل للحکم

خذیہا ھنیئا واذکری فعل ماجد — جزاک علی حرب العداوۃ بالسلم

یعنی اگر میں تمہارے ساتھ فراخ حوصلگی سے پیش نہ آؤں تو پھر میرے بعد کون ہے جس سے اُس کی امید کیجائے۔ لے یہ اونٹنیاں تجکو مبارک ہوں اور یاد رکھ اُس شخص کو جسنے تیرے ساتھ عداوت کی لڑائی کا معاوضہ صلح کے ساتھ کیا ہے۔ اسکے بعد امیر نے کہا واللہ اگر علی زندہ ہوتا تو ان میں سے ایک اونٹنی بھی تجکو نہ دیتا وہ بولی واللہ اونٹنی تو اونٹنی وہ ایک بلی کا بچہ بھی مسلمانوں کے مال میں سے دینے والا نہ تھا۔

از انجملہ شعبی سے روایت ہے کہ معاویہ نے کوفہ کے والی کو لکھا کہ ام الخیر بنت حریش ابن سراقہ کو سوار کراکے عزت و احترام کے ساتھ ہمارے پاس بھیجدے والی نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور ام الخیر بہت آرام کے ساتھ معاویہ کے پاس پہنچی۔ معاویہ نے اسکو اپنے محل میں اُتارا اور چوتھے روز جبکہ جلیس و مصاحب جمع تھے اسکو بات چیت کے لیے بُلایا۔ ام الخیر نے کہا السلام علیک یا امیر المومنین! ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، امیر نے سلام کا جواب دیا اور تعریضاً اس بات کا شکریہ ادا کیا کہ تو نے مجھے امیر المومنین کے لفظ سے یاد کیا، ام الخیر نے کہا اے امیر المومنین لکل اجل کتاب یعنی ہر چیز کی مدت معین ہے۔ امیر نے کہا سچ ہے۔ پھر ادہر اُدہر کی باتیں کرکے پوچھا کہ عمار یاسر کے قتل کیوقت تو نے کیا خطبہ پڑھا تھا، کہا۔ نہ میں نے اسکو پہلے سے بنایا تھا اور نہ اُس موقع کے بعد کسی کو سُنایا۔ یہی چند جملے تھے جو صدمے کے سبب ٹپک پڑے تھے۔ لیکن اگر اُسکے سوا تو کوئی اور کلام سُننا چاہے تو میں سُناؤں۔ امیر یہ سُنکر مصاحبوں کی طرف

ملتفت ہوا اور پوچھا کہ تم میں سے کسی کو اسکا کلام یاد ہی؟ ایک نے اُن میں سے کہا اے امیرالمومنین مجکو کچھ اُس میں سے یاد ہی اور اُس نے اُس بلیغ خطبے کے چند فقرے امیر کے سامنے پڑھے جن میں لوگوں کو علی مرتضیٰ کے فضائل و مناقب کا ذکر کرکے اُن کا ساتھ دینے اور اہل شام سے لڑنے کی ترغیب نہایت پُرزور الفاظ میں دی گئی تھی۔

امیر نے ان فقروں کو سنکر ام الخیر سے کہا۔ ظاہر ہی کہ اس کلام سے تیرا مطلب میرے قتل کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ پس اگر میں تجکو قتل کرادوں تو اس میں کوئی ہرج نہیں معلوم ہوتا۔ ام الخیر نے کہا واللہ مجکو ہرگز شاق نہیں کہ میرا قتل اس شخص کے ہاتھ سے ظہور میں آئے جس کی شقاوت سے میری سعادت متصور ہی۔

امیر نے کہا اے فضول گو! عثمان ابن عفان کے باب میں تو کیا کہتی ہی، ام الخیر نے کہا لوگوں نے جب اسکو خلیفہ کیا تو اُس سے راضی تھے اور جب اسکو قتل کیا تو اس سے ناراض تھے۔ امیر نے کہا اے ام الخیر مدح ایسی ہی ہوتی ہی؟ وہ بولی خدا گواہ ہی اور اُس کی گواہی کافی ہے میرا مطلب اس سے عثمان کی تنقیص نہیں ہی بلکہ وہ سابقین اولین میں سے تھا اور بیشک آخرت میں اسکا درجہ بلند ہوگا۔ امیر نے کہا اچھا زبیر کے باب میں تو کیا کہتی ہی۔ کہا بھلا میں رسول اللہ صلعم کے پھوپھی کے بیٹے اور اسکے حواری کے حق میں کیا کہہ سکتی ہوں جسکی نسبت رسول مقبول نے جنتی ہونے کی شہادت دی ہی،

اسکے بعد ام الخیر نے کہا اے معاویہ تو قریش میں احلم الناس مشہور ہی۔ میں تجکو خدا کی قسم دیتی ہوں کہ مجھے ان سوالات سے معذور رکھ اور اسکے سوا اور جو تیرا جی چاہے سو پوچھ امیر نے سوالات موقوف کیے اور اُس کو معقول رخصتانہ دیکر عزت و احترام کے ساتھ رخصت کیا۔

مذکورہ بالا حکایتوں سے قطع نظر اس کے کہ قرون اولی کی عورتوں کی راستبازی اور حق گوئی کا حقہ ثابت ہوتی ہی۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہی کہ وہ جنگ کے معرکوں میں شریک ہوتی

تھیں اپنے جتھوں کا ساتھ دیتی تھیں۔ فریق مخالف کے برخلاف لوگوں کو اکسانے کے لیے نہایت فصیح و بلیغ اور پُرزور خطبے خود انشا کر کے پڑھتی تھیں۔ خلیفہ کے دربار میں بے حجابانہ حاضر ہوتی رہتی تھیں اور بھرے مجمع میں آزادانہ اور بیباکانہ گفتگو کرتی تھیں اور سب سے بڑھ کر ان حکایتوں سے امیر معاویہ کے تحمل اور فراخ حوصلگی کا ثبوت ملتا ہی کہ باوجود ہر طرح کے اقتدار اور حشمت کے رعیت کے ضعیف ترین فرقے کی ایسی تلخ اور ناگوار باتیں برداشت کی جاتی تھیں اور اعیان ملک کے سامنے اُن کو اپنے اوپر اعتراض اور خورده گیری کرنے کا موقع دیا جاتا تھا۔ امیر کا یہ قول مشہور ہے کہ النساء یغلبن الکرام ویغلبھن اللئام یعنی عورتیں شریفوں پر غالب اور کمینوں پر مغلوب رہتی ہیں اور اس سے یہ خیال پیدا ہوتا ہی کہ امیر کا اغماض اور تحمل شاید عورتوں کے ساتھ مخصوص ہو۔ لیکن معلوم ہوتا ہی کہ امیر کا یہ برتاؤ عورتوں اور مردوں کے ساتھ برابر تھا، چنانچہ ابو عمر نے ہمدان کے ایک شخص سے روایت کی ہی کہ معاویہ نے ضرار الصدی سے کہا کہ میرے سامنے علی کے کچھ اوصاف بیان کر، اُس نے جناب مرتضوی کے عدل و انصاف، علم و حکمت، دنیا سے نفرت، شب بیداری، اشکباری، ذکر و فکر قناعت مسکینوں پر شفقت اہل دنیا کی تعظیم، قوی اور کمزور کے ساتھ یکساں برتاؤ اور اسی قسم کی بہت سی خصلتیں بیان کیں۔ معاویہ پر اس ذکر سے رقت طاری ہوئی اور کہا ابوالحسن پر خدا کی رحمت ہو، واللہ وہ ایسا ہی تھا۔ پھر ضرار سے پوچھا کہ تجھ پر اُسکے غم میں کیا گذرتی ہی۔ ضرار نے کہا جو اس عورت پر گذرتی ہی جسکا اکلوتا بیٹا اُس کی گود میں ذبح کیا گیا ہو،

ظاہر ہی کہ امیر معاویہ کا جو معاملہ جناب مرتضوی کے ساتھ رہا تھا اسکو ہر شخص خوب جانتا تھا، باوجود اسکے لوگ آپ کے فضائل و مناقب بیدھڑک امیر کے سامنے بیان کرتے تھے اس سے صاف ظاہر ہی کہ اُس وقت تک اسلام کی تعلیم کا اثر جو اُس نے عرب عربا کی آزاد طبیعتوں پر کیا تھا، زائل نہوا تھا اور وہ باوجود ہر طرح کی قدرت اور مکنت کے حق کی تلخ اور ناگوار باتیں جو اُن کی طبیعت اور مرضی کے موافق کہی جاتی تھیں گوارا کرتے تھے۔

اگرچہ خلافت راشدہ کے تیس برس جنکی رسول مقبول نے پیشین گوئی کی تھی گذر چکے تھے اور ملک عضوض کا دور دورہ شروع ہو گیا تھا، مگر آزادی جو عرب کی خاک کا اصلی جوہر تھا اور اسلام کی تعلیم نے اُسکو جلا دی تھی اُس میں ابھی تک کچھ فرق نہیں آیا تھا۔

مذکورہ بالا حکایتوں کا مضمون ہم نے بطور خلاصہ کے بیان کیا ہے۔ خصوصاً اُن خطبوں میں سے جو صفین میں امیر معاویہ کے برخلاف پڑھے گئے صرف معدودے چند جملوں کا ترجمہ کیا گیا ہے اور بعض حکایتیں جو صاحب عقد الفرید نے اسی باب میں عورتوں کے متعلق نقل کی ہیں بالکل چھوڑ دی گئی ہیں ورنہ نتائج مذکورالصدر کے سوا اور بھی بہت سے نتیجے ان حکایتوں سے استخراج ہو سکتے تھے۔ مگر بخوف طول صرف اسی خلاصہ پر اکتفا کیا گیا۔

الطاف حسین حالی
(از صوفی)

اسکندر اعظم اور ایک ڈاکو کی مختصر گفتگو

اسکندر۔ کیا تو ہی شہر تھریس کا ڈاکو ہے۔ جس کی میں نے اسقدر شہرتیں سُنی ہیں۔

ڈاکو۔ میں تھریس کا رہنے والا ایک سپاہی ہوں۔

اسکندر۔ سپاہی! ایک چور، لٹیرا، قاتل، ملک کا طاعون ہے۔ میں تیری شجاعت کی داد دے سکتا ہوں۔ لیکن تجھے حقیر سمجھتا ہوں اور تیرے جرم کی تجھے سزا دونگا۔

ڈاکو۔ میں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے جس کی وجہ سے آپ حرف شکایت زبان پر لاتے ہیں۔

اسکندر۔ کیا تو نے میری نافرمانی نہیں کی! اور لوگوں کے امن و امان میں مخل نہیں ہوا! کیا تو نے اپنی عمر مخلوق کی ایذا رسانی میں نہیں گذاری! اور ان کی ملکیت کی خرابی کے درپے نہیں رہا ہے۔؟

ڈاکو۔ اسکندر! میں آپ کا قیدی ہوں جو کچھ آپ فرمائینگے اُسے سنونگا اور جو سزا تجویز کرینگے اُسے بدل قبول کرونگا۔ لیکن میرے خیالات آزاد ہیں۔ اگر میں آپ کی مذمتوں کا جواب دونگا تو ایک آزاد شخص کی طرح۔

اسکندر۔ آزادانہ طور پر بولو یہ ہماری مروت سے بعید ہی کہ اُسے خاموش کردیں جس سے ہم کچھ گفتگو کرنا چاہتے ہوں۔

ڈاکو۔ اب میں آپ کے سوالوں کا جواب آزادی سے دونگا۔ میں پوچھتا ہوں کہ حضور نے اپنی زندگی کس طرح بسر کی ہی؟

اسکندر۔ مثل ایک بہادر کے شہرت کے ساتھ۔ شجاعوں میں جوانمرد ترین، بادشاہوں میں فضل ترین، اور فاتحوں میں اعلیٰ ترین رہا ہوں۔

ڈاکو کیا شہرت مجکو نہیں حاصل ہوئی۔ کبھی کوئی ڈاکوؤں کا ایسا سردار ہوا تھا۔ لیکن میں لاف زنی سے نفرت کرتا ہوں۔ آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ میں آسانی سے مغلوب نہیں ہوا ہوں۔

اسکندر۔ ہرکیف تو کیا ہی۔ لٹیرا اور ایک کمینہ بددیانت ڈاکو۔

ڈاکو۔ اور فاتح کیا ہی! کیا حضور اس سطح زمین پر ایک بلاے ناگہانی کی طرح امن و شفقت کے نادر اثمار کو لوٹتے۔ پائمال کرتے۔ خون بہاتے بغیر کسی قانون اور انصاف کے محض ملک گیری کے خیال سے نہیں دوڑتے پھرے ہیں۔ جو کچھ میں نے ایک صوبے میں سو آدمیوں کی جماعت سے کیا ہی۔ وہی آپنے ہزاروں کی جماعت سے بہت سی قوموں کے ساتھ کیا ہی۔ اگر میں نے کسی بشر کی جان لی ہی تو آپ نے بہت سے بادشاہوں اور شہزادوں کو خاک کا پیوند کیا ہی اگر میں نے چند جھونپڑوں کو جلا دیا ہی تو آپ نے بہت سی خوشحال سلطنتوں اور شہروں کو نیست و نابود کر دیا ہی۔ تب حضور میں اور مجھ میں کیا فرق ہے۔ صرف یہ کہ آپ بادشاہ کے گھر پیدا ہوئے اور میں ایک معمولی آدمی کے گھر۔ اب آپ بھی ایک بڑے ڈاکو کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔

سکندر اگر میں نے مثل بادشاہوں کے لیا ہی تو مانند بادشاہوں کے دیا بھی ہی۔ اگر میں نے کسی بادشاہت کو تباہ کیا ہی تو اس سے بڑھکر قائم بھی کیا ہی۔ میں نے حکمت صنعت و حرفت کو ترقی دی ہی،

ڈاکو۔ جو کچھ میں نے امیروں سے لیا اُسے میں نے بھی غربا و مساکین کو آزادانہ طور پر دیا ہے بڑے بڑے وحشی قوموں میں علم اور تہذیب کو راہ دی ہی۔ مظلوموں پر دست پناہ دراز کیا ہے میں تھوڑا حکمت میں بھی دخل رکھتا ہوں۔ جسکے بارے میں آپ نے فرمایا ہی۔ لیکن مجھے یقین ہی کہ دونوں میں سے کوئی بھی اس جہان میں اپنے اپنے گناہوں سے سبکدوش نہیں ہوسکتا۔

اسکندر۔ اسے چھوڑ دو۔ اس کی زنجیریں کھولدو۔ اور اسکے ساتھ اچھی طرح پیش آؤ۔

(ڈاکو چلا گیا)

اسکندر (دل میں) کیا مجھ میں اور ڈاکو میں اسقدر مشابہت ہی۔ اسکندر اور ایک ڈاکو! آہ ذرا مجھے غور کرنے دو۔

(ترجمہ از انگریزی)

محمد عبدالرؤف (ابراہیم پوری)
از بھاگلپور

تقریر

علیاحضرت ہر ہائنس نواب سلطان جہان بیگم صاحبہ جی۔سی۔ایس۔آئی۔

فرمانروائے بھوپال دام اقبالہا و ملکہا

بہ جلسہ مدرسہ سلطانیہ

منعقدہ ۲۹۔ ذیقعدہ ۱۳۲۷ھ ۱۳۔ دسمبر ۱۹۰۹ء روز دوشنبہ

اے طالبات سلطانیہ اسکول! میں آج تمہارے سامنے پہلے اپنی اُس مسرت کو ظاہر

کرنا چاہتی ہوں جو مجھے اُس وقت حاصل ہوئی تھی۔ جبکہ تم نے ہر اکسلنسی لیڈی منٹو صاحبہ کے روبرو نہایت عمدہ طور پر ریسیٹیشن کیا تھا۔ الغرض اس میں شک نہیں کہ اُس مسرت کا اثر ہمیشہ میرے دل میں موجود رہیگا۔ کیونکہ مجھے جس قدر دلچسپی تمہاری تعلیم و تربیت کے ساتھ ہے اسکے لحاظ سے میں تمہاری ہر ایک بات پر نظر رکھتی ہوں اور تمہاری قابل تعریف باتوں سے ہمیشہ مجکو مسرت ہوتی ہی۔

میں نے یہ اسکول بطور نمونہ کے قائم کیا ہی۔ اسلیے میں یہاں کی ہر طالب علم کو اپنے ہمجنسوں کے سامنے بطور مثال پیش ہونا پسند کرتی ہوں۔ تاکہ تعلیم نسواں کی تحریک عام ہو جائے۔ اور تعلیم مدرسے کے متعلق جو اعتراضات اکثر لوگ کرتے ہیں، اُنکے لیے تم ایک مجسم جواب بنو۔

تم یاد رکھو کہ بہت سی نظریں تمہارے اسکول کی کامیابی پر لگی ہوئی ہیں۔ کیونکہ تمام ہندوستان میں بھوپال ہی بہ سبب عورت کے فرماں روا ہونے کے ایک ایسا مقام ہی جہاں عورتوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ہر قسم کے وسائل مہیا ہونے ممکن ہیں، اور جہاں کے نتائج سے ہر جگہ ایک پُر جوش تحریک کے پیدا ہونے کی توقع ہی۔

خود ہر اکسلنسی نے بھی اس بات کو محسوس کر کے فرمایا ہی کہ "ہندوستان میں کہیں عورتوں کی حالت بھوپال سے بہتر نہ ہونا چاہیے" اب تمہاری طالب علمانہ حالت اور آیندہ زندگی کے متعلق کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ تم خوب ذہن نشین کر رکھو کہ طالب علمی کے بعد تمہارے لیے جو زمانہ آنے والا ہی، وہ تمہاری تعلیم کے امتحان کا زمانہ ہوگا۔

تم کو اسی زمانہ سے ہی اپنے نازک مرتبہ کا اور اپنے فرائض کا جو قدرت نے تم پر عائد کیے ہیں خیال رکھنا چاہیے اور اس امتحان کے لیے تیار رہنا چاہیے جو تمہاری زندگی کے دوسرے درجہ میں جاکر ہوگا۔

ہر اکسلنسی لیڈی منٹو کے یہ جملے کہ "عورتوں کا اثر ہندوستان میں بھی اتنا ہی عظیم

اور کارگر اور مفید ہے۔ جس قدر کرہ مغرب میں دنیا بھر میں آیندہ نسلیں ماؤں کے زیر اثر ہوتی ہیں۔ اور ہمیشہ مائیں ہی اُن کی طبیعتوں کو ڈھالینگی۔ اسلیے یہ بات نہایت ضروری ہے کہ عورتوں کے اس اثر کو مفید بنانے کے لیے اُن کو اپنے زمانہ کے ساتھ چلنا چاہیے۔

بطور ایک نہایت بیش قیمت سبق، اور انمول نصیحت کے پیش نظر رکھو کیونکہ یہ جملے ایسے جامع اور بسیط ہیں۔ جن پر تمہاری زندگی کے آیندہ زمانوں کی اعلیٰ خوشی کا انحصار اور جن پر قوموں کی ترقی کا دارمدار ہے۔

عورتوں کی تعلیم، و تربیت مردوں کی ترقی کے لیے بالکل ایسی ہے جیسے کہ انجن کے چلنے کے لیے اسٹیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہ مسلمہ ہے کہ کسی قوم نے اُس وقت تک حقیقی ترقی نہیں کی، جب تک اُس قوم کی عورتوں نے وسائل ترقی میں حصہ نہ لیا ہو،

لیڈی منٹو صاحبہ نے لارڈ ہیلیفکس کا یہ فقرہ کہ مردوں کی تعلیم کی نسبت زنانہ تعلیم سے نوع انسان کی ترقی کو بہت زیادہ امداد ملتی ہے۔ فرمایا ہے کہ یہ الفاظ بالخصوص ہندوستان جیسی اقوام کے واسطے نہایت درست ہیں۔ جہاں ماں اور بیوی واقعی بہت اثر رکھتی ہیں۔ اگر اُن کی تربیت ناقص رہگئی تو مردوں کی ترقی ممکن نہیں۔

دیکھو اس زمانہ میں ہر طرف ترقی کے لیے جد و جہد ہو رہی ہے اور ترقی کا ذریعہ صرف تعلیم و تربیت ہی پایا گیا ہے۔ پس ہمارے ملک کی عورتیں اگر تعلیم یافتہ نہ ہونگی تو ناممکن ہے کہ اصلی ترقی ہوسکے کیونکہ بچے کی تربیت و تعلیم ماں کی گود سے شروع ہوتی ہے۔ اور ماں کو بھی اسکے اخلاق و عادات میں کامل دخل ہوتا ہے۔

یہ ناممکن ہے کہ جب تک ماں کے اخلاق و عادات عمدہ نہوں بچہ صرف باپ کے اخلاق و عادات کا اثر قبول کرسکے۔ اسکے علاوہ عورتوں کے فرائض بچے کی تعلیم و تربیت پر ہی ختم نہیں ہوجاتے۔ بلکہ خانہ داری کا انتظام شوہر کی مسرت اُس کے حقیقی، وقدرتی فرائض

میں داخل ہے۔

خانہ داری کا فن معمولی فن نہیں ہے بلکہ وہ اس قدر وسیع ہے کہ اُسکے لیے بہت سے علوم و فنون سیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کوئی عورت جبتک کہ وہ تعلیم یافتہ نہ ہو۔ یہ دعویٰ نہیں کرسکتی کہ وہ اپنے شوہر کی آمدنی اور خرچ کا انتظام اس طریقہ سے کریگی کہ گھر کی مالی حالت درست رہے۔ اور کوئی مشکل پیش نہ آئے اور وہ عمدگی کے ساتھ نوکروں کے کام کی نگہبانی کرسکے یا تیمارداری کی خدمت بجالائے۔ اپنے شوہر اور اعزا کے مزاج کے مطابق انتظامات کرے۔ اور گھر کو شوہر کے لیے خوشی و مسرت کا گھر بنادے۔ اپنی اولاد کی جسمانی اور اخلاقی تربیت اور قوائے عقلی کو مجلّی کرے۔

کیا تم خیال کرسکتی ہو کہ ایک جاہل عورت اپنے تعلیم یافتہ خاوند کی وقعت جان سکتی ہے اور اسکو خوش رکھ سکتی ہے اور شوہر کے وہ تمام حقوق ادا کرسکتی ہے جو مذہب و اخلاق نے اُس کے ذمہ عائد کیے ہیں؟ یا وہ اُن اوہام کا جو آجکل ہر گھرانے پر مسلّط ہیں مقابلہ کرسکتی ہے۔ یا اُس کی نیکی اصلی و حقیقی نیکی ہوسکتی ہے۔ اسلام سے پہلے کا زمانہ ایسا گذرا ہے کہ عورتوں کی حالت غلامی سے بھی بدرجہا بدتر تھی۔ لیکن جب اسلام کی نورانی شعاعیں۔ دنیا پر پھیلیں تو اُس نے عورتوں کو بھی تاریکی سے نکالا۔ اور مردوں کے برابر درجہ قرار دیکر حقوق معین کر دیے۔ اُن کو حصول علم میں آزادی، دی، اور ہر طرح کی سہولتیں پیدا کر دیں، اُن کے ساتھ حُسن سلوک، نرمی اور محبت کی ہدایت کی،

اس میں شک نہیں کہ مذہب نے عورت کو بے انتہا آسانیاں دی ہیں۔ لیکن تربیتِ اولاد کا بار ایسا اُسکے ذمہ ہے کہ جس سے کامل طور پر سبکدوش ہونے پر دنیا کی کلفتیں، اور آخرت کا مواخذہ اسکے ذمہ رہتا ہے اور چونکہ ماں کی تکلیفات باپ سے زیادہ ہوتی ہیں اسلیے ماں کے حقوق باپ سے زیادہ رکھے گئے ہیں۔ پس اگر ان عورتوں کی تعلیم جو بالآخر مائیں ہونیوالی ہیں نہ ہوگی تو کیونکر وہ اپنے فرائض کو ادا کرسکینگی، اور حکم العلم فریضة علیٰ کل مسلم و مسلمة

صاف ہدایت کرتا ہی کہ جس طرح مرد پر علم فرض ہی اُسی طرح عورت پر،

قرآن مجید کی آیہ اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ یہ ہدایت نہیں کرتی کہ مرد عورت پر حکمراں ہیں، بلکہ بلحاظ قواے فطری مردوں کے فرائض عورتوں سے چونکہ زیادہ ہیں، اسلیے وہ عورتوں کے لیے بطور کفیل و محافظ قرار دیے گئے ہیں، مرد حفاظت و کسب معاش کے لیے مخلوق کیا گیا ہے، اور عورت خانہ داری کے انتظام کے لیے، مرد کا فرض ہے کہ وہ عورت کی محافظت و کفالت کرے۔ اور جو پیدا کرے وہ عورت کے سامنے ڈالدے اور عورت اسکا خرچ و انتظام رکھے۔

تعلیم و تربیت میں غریبی و امیری کا کوئی امتیاز نہیں کرنا چاہیے، بلکہ غریبوں کے فرائض و ضروریات بمقابلہ امیر عورتوں کے زیادہ ہیں اور ہر عورت خود اندازہ کرسکتی ہی کہ وہ غریبانہ زندگی کو تعلیم و تربیت کے سرمایہ سے کیسا کامیاب بنا سکتی ہے۔ مگر تم یاد رکھو کہ تعلیم کا اصلی جز خدا ترسی و مذہب ہے اور جبتک مذہب و خدا ترسی شامل نہو تعلیم مثل گوہر بے آب کے ہی جس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی،

مذہب کی آبیاری سے تعلیم کی جڑ مضبوط ہوتی ہی، اور وہی درخت بارآور ہوتا ہی جس کی جڑ مضبوط ہو۔ اسلیے تعلیم کے عمدہ نتائج بھی اُسی وقت حاصل ہوسکتے ہیں جبکہ تعلیم میں مذہب کی آبیاری کیجاے۔ مذہب ادائے حقوق، اور پابندی احکام شرعی و فرائض کی تاکید کرتا ہے اس سے دل میں راستبازی و نیکی پیدا ہوتی ہے، اسلیے مینے تمہاری مذہبی تعلیم کو مقدم رکھا ہے تاکہ صفات انسانی کا کامل مجموعہ بن سکو،

لیڈی منٹو صاحبہ نے بھی اسپر مسرت فرمائی اور ان الفاظ میں بیان کیا کہ "اور میں یہ دیکھکر بہت خوشی ہوئی کہ یہاں کی فہرست مضامین میں مذہبی تعلیم سب سے مقدم ہے،،

اور اسکا سبب یہی ہی کہ انسان میں نیکی پیدا ہونے کا مادہ درصل مذہب ہی ہی، اور خواہ دنیا کا کوئی مذہب ہو وہ نیکی ہی کی ہدایت کرتا ہی،

پس ہر شخص جو عقل رکھتا ہے پہلے مذہب کی طرف نگاہ ڈالیگا، مسلمانوں میں تعلیم نسواں کے ساتھ پردہ اکثر زیر بحث ہوتا ہی اس لیے میں پردہ کے متعلق اسی سلسلہ میں تمہارے سامنے یہ بیان کرنا چاہتی ہوں کہ پردہ ایک شرعی حکم ہی، اور ہم تمام مسلمان اس امر پر متفق ہیں کہ مذہب اسلام کے جملہ احکام مصالحہ عامہ پر مبنی، اور فطرت انسانی کے مطابق ہیں، تم اگر ذرا غور سے دیکھو تو معلوم ہو جائیگا کہ تمہارے آرام تمہاری عصمت وعفت کے لیے پردہ کسقدر ضروری ہی، اس کی ہدایت تم کو کلام الٰہی سے ہوئی ہے جو آیات بینات یدنین علیھن من جلابیبھن ط اور ولا تبرجن تبرج الجاھلیۃ الاولیٰ، سے ظاہر ہے۔
یہی سبب ہے کہ مسلمان پردہ کو عزیز رکھتے ہیں اور ہر ملک میں جہاں مسلمان آباد ہیں پردہ رائج ہی لیکن ہندوستان کا پردہ مروجہ قیود شرعی سے زیادہ ہی، مگر وہ احکام شرعی کے مخالف نہیں کہا جا سکتا وہ وجوہات جن سے کہ یہ موجودہ پردہ رواج دیا گیا، بہت طویل ہیں جنکا اسوقت اور اس موقع پر میں بیان کرنا مناسب نہیں سمجھتی،

حقیقتاً ہندوستان جیسے ملک کے لیے پردہ مروجہ جو چند مصلحتوں سے اختیار کیا گیا ہے نہایت مناسب ہے اور وہ شرفا کی طبیعت ثانی بن گیا ہی اور مسلمان عورتوں کے ساتھ ایسا جز ہو گیا ہی جسکو شرفا ترک کرنا نہیں چاہتے۔

بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ پردے میں تعلیم ممکن نہیں۔ گو یہ اعتراض کسی حدتک صحیح ہے۔ مگر اول تو ہمت وکوشش کے مقابلہ میں لفظ ناممکن کوئی چیز نہیں ہی، اور پھر مسلمانوں میں ایسی مثالیں بکثرت موجود ہیں کہ عورتوں نے پردہ میں رہکر عمدہ تعلیم حاصل کی ہی اگر حامیان تعلیم اس پردہ کو نظر انداز کر کے تعلیم کا انتظام کریں تو اس میں کامیابی بہت دشوار ہے کیونکہ جبتک کسی اصلاح میں قومی حالات وخیالات کا لحاظ نرکھا جائے تو قوم کبھی متوجہ نہ ہوگی اسوقت مسلمان عورتوں کی تعلیمی ترقی کے لیے نہایت ضروری ہی کہ ہر جگہ ایسا ہی انتظام ہو جیسا میں نے تمہارے لیے کیا ہی۔

اے میری عزیز لڑکیو!

تمہارے لیے آزادی کے ساتھ تعلیم حاصل کرنا اس قدر زیادہ باعث اعزاز نہیں ہوسکتا جس قدر کہ پردہ میں باعث افتخار ہوسکتا ہے، تمہارے حسب پسند رواج کے مطابق جملہ انتظامات کیے گیے ہیں تم کو مدرسہ اور گھر میں ہر وقت اپنی تعلیم، واخلاق کی ترقی و عمدگی پر توجہ رکھنا چاہیے۔ اگر تم نے توجہ نہ کی تو وہ تمہاری غفلت اور سستی کی دلیل ہوگی،

میں یہ امر بھی ایک عرصہ سے نہایت تاسف کے ساتھ دیکھ رہی ہوں کہ ہندوستان کی عورتوں کے حالات، ومذاق کے مطابق ہنوز کتابیں موجود نہیں، اور مرد جو ہر قسم کی کتابیں تصنیف وتالیف کرسکتے ہیں اس طرف بہت ہی کم متوجہ ہیں؛ اور یہ ایک ایسی کمی ہے جو تمہاری تعلیمی ترقی کے لیے سدراہ ہے،

لیڈی منٹو صاحبہ نے باوجودیکہ وہ ایک یورپین خاتون ہیں، لیکن چونکہ زمانہ کی ضرورتوں سے واقف ہیں، اس نقصان کو محسوس فرمالیا جسکا تذکرہ انہوں نے نہایت لطیف پیرایہ میں تمہارے ایڈریس کے جواب میں کیا ہے اور اُنہوں نے امید ظاہر کی ہے کہ تھوڑے ہی دن میں ہندوستانی خاتونیں اپنے لیے خود کتابیں لکھ کر خود اپنے خیالات کا اظہار کرسکیں گی، جس میں مغرب کے تجربے، مجموعہ حکمت مشرق کی پُرانی روایتوں، اور طریقوں پر جلا دینگے،

اس میں شک نہیں کہ جبتک خود عورتیں اپنی جنس کے لیے تالیف، وتصنیف کا کام شروع نہ کرینگی اس وقت تک عمدہ نصاب دستیاب نہیں ہوسکتا۔ اور اگرچہ عورتوں کی تعلیم ہنوز ابتدائی ہے. لیکن ابھی سے اس طرف توجہ کرنا چاہیے، لہذا میں تم کو نصیحت کرتی ہوں کہ تم بقدر اپنی لیاقت کے مضمون بھی لکھنا شروع کرو۔ اور ماہوار جلسوں میں ان مضامین کو پڑھا کرو، میں خود بھی ان مضامین کو دیکھا کروں گی۔ اور جسکا مضمون سب سے اچھا ہوگا وہ میری

تحسین خاص کا مستحق ہوگا۔ فقط

حضور ہر ہائنس کی سلطانی عنایتوں سے یہ تقریر ہمارے پاس خاتون میں شائع کرنے کیلیے بھیجی گئی ہے۔ اس تقریر سے جہاں ہر ہائنس کی اس دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے جو اُن کو تعلیم نسواں کیساتھ ہے، یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ بذات خود کس صحیح رستہ پر عورتوں کی رہنمائی کرتی ہیں

تعلیم و تربیت امور خانہ داری اور عورتوں کے دنیاوی فرائض تو صرف زندگی ہی تک محدود ہوتے ہیں۔ لیکن جو چیز اصلی ہے اور جس سے انسان کی عاقبت سدھرتی ہے، وہ مذہب ہے۔ اور عورتیں ہی ایک ایسا ذریعہ ہیں جو کسی قوم میں مذہب کی جڑ کو مضبوط رکھ سکتی ہیں، عورتوں ہی سے انکے بچے مذہب کو وراثت میں پاتے ہیں، اسلیے اس پاک چیز کی حفاظت کے لیے عورتوں کی تعلیم کا سب سے اہم اور مقدم جز و مذہبی تعلیم ہونی چاہیے، چنانچہ ہر ہائنس کا یہ جملہ آب زر سے لکھے کے قابل ہے کہ،

”مذہب ہی کی آبیاری سے تعلیم کی جڑ مضبوط ہوتی ہے اور وہی درخت بار آور ہوتا ہے جسکی جڑ مضبوط ہو اسلیے تعلیم کے عمدہ نتائج بھی اُسی وقت حاصل ہو سکتے ہیں جبکہ تعلیم میں مذہب کی آبیاری کیجائے۔ مذہب ادائے حقوق اور پابندی احکام شرعی و فرائض کی تاکید کرتا ہے اس سے دل میں بہت پاکیزگی و نیکی پیدا ہوتی ہے“

چنانچہ اسی وجہ سے ہر ہائنس نے سلطانیہ اسکول میں مذہبی تعلیم کو مقدم رکھا ہے،

امید ہے کہ تمام زنانہ اسکول جو آیندہ لڑکیوں کے لیے قائم کیے جائینگے اس ضروری اصول کو مد نظر رکھیں گے تاکہ مسلمان عورتیں تعلیم پاکر پختہ تر مسلمان ہوں، کیونکہ مسلمانوں کی اگر فلاح و بہبودی ہے تو صرف مذہب پر ہے اور اسی سے وہ دنیا میں معزز اور خوش اور آخرت میں خدا کے مقبول بندے ہو سکتے ہیں۔

ہر ہائنس کی یہ تقریر نہ صرف مسلمان عورتوں کے لیے بلکہ حامیان اور کارکنان تعلیم نسواں کیلیے بمنزلہ ایک دستور العمل کے ہے ہماری نہ دل سے دعا ہے کہ خداوند عالم ایسی عاقلہ و فاضلہ اور ہمدرد

سلطان بیگم کو مدتوں سریر آرائے سلطنت رکھے، اور اقبال وجاہ میں روز افزوں ترقی عطا فرمائے"

اڈیٹر

سہرا

در تہنیت شادی برادران فخر الدین و جلال الدین علی احمد خاں

مرزا معز الدین سام صاحب ہمارے کالج کے اولڈ بوائے ہیں انکی فرمایش سے اس سہرہ کو خانوں میں درج کرتے ہیں، اڈیٹر

ہو مبارک تمہیں کہتے ہیں ملک گر سہرے — زیب سر فخر و جلال آج ہیں سر پہ سہرے
فخر دیں ایک تو دوم ہیں جلال الدیں ہے — ناز کیونکر نہ کریں دونوں برابر سہرے
ہیچ تمام مردمک دیدۂ مشاطۂ چرخ — ایسے سہروں سے کہیں دیکھے ہیں بہتر سہرے
اہل محفل سے یہ رشک نگاہی اللہ اللہ — دیکھنے بھی نہیں دیتے رخ انور سہرے
پاس رکھتا ہوں نہ میں پھول نہ دُرہاے صدف — دُرِ مضمون کے لایا ہوں بناکر سہرے
مہر دو نوشاہ کے انوار سے ثابت یہ ہے — بندھ گئے جیسے کہ خورشید و قمر پر سہرے
آسماں پر سے بھی نغمہ کی صدا آتی ہے — مشتری گاتی ہے خوش ہو کے فلک پہ سہرے
محفل جشن مبارک رہے کرنل صاحب — اور اقبال و ترقی کے ہوں یاور سہرے
شادیاں ایک ہی تاریخ میں دو ہیں باہم — مشترک یوں لکھے اے مائل مضطر سہرے

حقیر۔ مرزا معز الدین سام مائل لوہاردی

اڈیٹوریل

اقتباس

عالیجناب راجہ علی محمد خاں بہادر کے۔سی۔آئی۔ ای پریسیڈنٹ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس

نے اپنے پریسیڈنشل اڈریس میں تعلیم نسواں کے متعلق یہ خیال ظاہر فرمایا،

اب میں چند الفاظ تعلیم نسواں کے متعلق کہنا چاہتا ہوں،

خوش قسمتی سے ملک اور قوم کے خیالات کچھ عرصہ سے اس جانب متوجہ ہو گئے ہیں قاعدہ کی رو سے عورتوں کی تعلیم مردوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ہونی چاہیے۔ مگر ہمارے یہاں جب لڑکوں ہی کی تعلیم ایسی ناقص حالت میں ہے تو عورتوں کی تعلیم خواہ مخواہ قابل تاسف حالت میں ہونی چاہیے سنہ ۱۹۰۲ء میں صرف ایک مسلمان لڑکی بمقابلہ ۳۱ ہندو اور ۳۳ پارسی لڑکیوں کے کالج کی تعلیم پانے والیوں میں تھی۔ سکنڈری مدارس میں صرف اکیسو چالیس مسلمان لڑکیاں بمقابلہ ۱۴۰۲ پارسی ۴۳۱۲ ہندو لڑکیوں کے ہندوستان میں ہیں۔ صوبہ بہار میں ۳۵ لڑکیاں انگریزی کی تعلیم پا رہی ہیں۔ ابتدائی مدارس میں البتہ لڑکیوں کی تعداد زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ خاصکر بنگال اور مشرقی بنگال میں میرے نزدیک اب لوگوں کو اس مسئلہ میں کوئی تعصب نہیں ہے۔ مگر پھر بھی بہت سی سکیں ہیں خصوصاً متوسط الحال شرفا اپنی لڑکیوں کو پردہ شکنی کے خوف سے سرکاری مدارس میں بھیجنا پسند نہیں کرتے۔ اسکا علاج یہی ہے کہ ہم خود اپنے یہاں زنانہ مدارس قائم کریں اور پرانی رسوم وعادات پر اپنی آیندہ اخلاقی اور تمدنی ترقی کو قربان نہ کریں۔ یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ عورتوں کو تعلیم دینے سے جو امور قومی ترقی کے سد راہ ہیں اُن میں سے ایک عظیم سبب دفع ہو جائیگا۔ ہم نے گذشتہ زمانہ میں عورتوں کی طرف سے بہت لاپروائی کی اور اُن کو اُس منصب سے جو فطرتی طور پر اُن کو سوسائٹی میں حاصل ہے محروم رکھا۔ اب وہ گویا اسکا عوض لے رہی ہیں اور ہماری ترقی کی سد راہ رہیں گی۔ جبتک ہم اُس بدسلوکی کی تلافی نہ کریں جو سابق میں اُنکے ساتھ کی گئی ہیں۔ میری رائے میں ہمکو اس روشنخیال فرمانروا یعنی بیگم صاحبہ بھوپال (جیرز) سے اس بارے میں سبق حاصل کرنا چاہیے تاکہ مسلمان عورتوں کی آیندہ نسلیں جہالت سے محفوظ رہیں،

رپورٹ متعلق نمایش زنانہ صنعت و حرفت رنگون

۷. دسمبر کو شام کے ۴½ بجے آل انڈیا لیڈیز آرٹ اگزبیشن (نمایش مصنوعات زنانہ) کے افتتاح کا وقت تھا۔ نمایش لیڈی وایٹ زوجہ محترمہ ہز آنر سر ہرکل وائٹ لفٹنٹ گورنر برما کی سرپرستی میں ہوئی۔ کمیٹی انتظامیہ (جس میں کئی معزز یورپین، پارسی و برہمی لیڈیاں بھی ہیں) اس کی پریسیڈنٹ مسز لاری دختر نیک اختر ہز آنر لفٹنٹ گورنر برما ہیں۔ اور جوائنٹ سکرٹری مسٹر محمد الیاس اور مسٹر حسن محمود ہیں۔ نمایش رنگون کالج کے اگزامینشن ہال میں ہی۔ ۴½ بجے تک ہال رنگون کے کم و بیش تین سو مسلمان پارسی، برہمی اور یورپین عمائد سے (جن میں بہت سے برہمی پارسی اور یورپین لیڈیاں بھی تھیں) پُر ہو چکا تھا۔

لیڈی وائٹ مع ہز آنر لفٹنٹ گورنر ۴½ بجے سے کچھ قبل تشریف لائیں۔ نمایش کے ہال کے دروازہ پر مسٹر ٹول اور جوائنٹ سکرٹریان مسٹر محمد الیاس و مسٹر حسن محمود نے استقبال کیا۔ مسٹر الیاس نے آنریبل صاحبزادہ آفتاب احمد خاں آنریری جوائنٹ سکرٹری کانفرنس اور مسٹر جے ایچ ٹول پرنسپل علیگڈہ کالج کو انٹروڈیوس کیا۔ ہال کے اندر لیڈی وائٹ کا استقبال مسز لاری پریسیڈنٹ کمیٹی اور مسز ڈانٹرا مسز برجورجی، مسز ہلا اونگ، مسز بی۔ ایچ اونگ، مسز اے این سین، اور مسز اے ایم مرے نے کیا۔ جب لیڈی وائٹ اپنی کرسی پر نشست فرما چکیں تو مسز ڈانٹرا نے اڈریس پڑہا۔ جسکا ترجمہ یہ ہے۔

لیڈی وائٹ، سر ہرکل وائٹ، لیڈیز اینڈ جنٹلمین! مسلمانان ہند میں تعلیم نسواں کے مسئلہ کی جانب آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس نے سنہ ۱۹۰۴ء سے توجہ کی ہی۔ اور اس وقت سے اس صیغہ کا کام برابر کانفرنس کے پروگرام میں شامل چلا آتا ہی۔ کانفرنس کی کوششیں اس حد تک کامیاب ثابت ہوئی ہیں کہ علی گڈہ میں ریزیڈنشل سسٹم پر ایک زنانہ نارمل ماڈل اسکول اس غرض سے قایم ہوگیا ہی کہ کُل ہندوستان میں تعلیم نسواں کے کام کو انجام دینے کیلیے

استانیاں مہیا کی جائیں۔ اس اسکول کی عمارت پردہ کے پورے انتظام کے ساتھ سال نو سے شروع ہوجائیگی۔ نئی عمارت کا تخمینہ ایک لاکھ روپیہ کا ہی جس میں سے مع سرکاری امداد کے ۴۰ ہزار روپیہ اسوقت ہاتھ میں ہی۔ ساڑھے پانسو روپیہ ماہوار کی مستقل آمدنی موجود ہی۔ جس میں سے ۲½ سو روپیہ گورنمنٹ کا، ۱۲۵ ہز ہائنس بیگم صاحبہ بھوپال کا، پچاس پچاس ہز ہائی نسز نواب صاحبان ٹونک بھاول پور اور خیرپور کا ہی۔ اسکے علاوہ ہز ہائنس بیگم صاحبہ بھوپال کی مالی امداد کے ذریعہ سے ہندوستان کی مسلمان لڑکیوں کے لیے ایک خاص کورس تیار ہورہا ہی۔ مسلمان عورتوں میں صنعت وحرفت کو ترقی دینے کے لیے ہرسال کانفرنس کے ساتھ زنانہ نمایش بھی ہوتی ہی، جس سے اُس جماعت کی عورتوں میں تحریص کی روح پیدا ہوگئی ہی۔ اسکا عمدہ ثبوت یہ ہی کہ آج اس ہال میں ہمارے پاس پانسو سے زیادہ اشیا موجود ہیں۔ مینجنگ کمیٹی یور لیڈی شپ کی دل سے ممنون ہی کہ حضور عالیہ نے نمایش سے گہری دلچسپی لی، اسکی سرپرستی منظور فرمائی، اور نہایت مہربانی سے اس کے افتتاح کے لیے یہاں تشریف لائیں۔ ہم مسٹر عبدالکریم جمال کے بھی ممنون ہیں کہ اُنہوں نے نمایش کے تمام اخراجات برداشت کیے ہیں۔ ہم مسٹر عبداللہ بی اے ایل ایل بی آنریری سکرٹری صیغہ تعلیم نسواں کے ممنون ہیں کہ وہ ہرسال ملک کے دور دست مقامات پر نمایش منعقد کرنے میں نہایت جانکاہی برداشت کرتے ہیں،

اس اڈریس کا جواب لیڈی وائٹ نے مختصر الفاظ میں دیا اور نمایش کے افتتاح کا اعلان کیا۔ اسکے بعد آنریبل صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے تقریر کی جس میں نمایش اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا تعلق ظاہر کرکے ان دشواریوں کو بیان کیا جو مسلمانوں کے لیے تعلیم نسواں کے مسئلے میں حائل ہیں۔ ساتھ ہی اسکے اُنہوں نے ثابت کیا کہ تعلیم نسواں کیسی اہم چیز ہے اور مسلمانوں کو ترقی کرنے کے لیے اس کی کس قدر ضرورت ہی۔ انہوں نے فرمایا کہ "ہندوستان میں تعلیم نسواں منجملہ اُن بے شمار برکتوں اور نعمتوں کے ہے جو برٹش حکومت کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہیں"

اخیر میں صاحبزادہ صاحب نے لیڈی وائٹ کا نمایش کے افتتاح کے لیے اور مسز لاری اور مسز وانٹر اور دیگر خواتین ممبران کمیٹی کا ان کی خوش انتظامی کے لیے شکریہ ادا کیا۔

اسکے بعد معزز حاضرین نے اشیائے نمایش کا معائنہ کیا جو پانسو سے زیادہ ہیں علاوہ مسلمان خواتین کے یورپین، پارسی اور برہمی لیڈیوں نے بھی اپنی دستکاریوں کے نمونے بھیجے ہیں اشیاے نمایش میں زردوزی، کارچوبی، لیس، قیطون، کاغذی پھولوں، پردوں، تصاویر اور برہمی ساخت کی گڑیوں کے عمدہ عمدہ نمونے ہیں۔ کمیٹی انتظامیہ نے نمایش کی درستی و آراستگی میں نہایت سلیقہ سے کام لیا ہے۔

ریاست بھاولپور کی چیزیں ایک جدا آئینہ دار کیس میں ہیں۔ بھاؤنگر کی ایک چاردہ سالہ شہزادی صاحبہ نے بھی اپنی دستکاری کا نمونہ بھیجکر نمایش کے ساتھ اپنی دلچسپی کا ثبوت دیا ہے۔ بہت سی چیزیں فروخت کے لیے ہیں۔ نمایش ۳۱۔ دسمبر تک رہی۔ کمرہ نمایش ہر روز ساڑھے چار بجے شام سے ۹ بجے رات تک کھلا رہتا۔ ۳۰۔ دسمبر کی تاریخ صرف لیڈیوں، علی الخصوص پردہ نشین مستورات کی سیر کے لیے مخصوص تھی۔ اور اس روز نمایش ۱۰ بجے صبح سے ۹ بجے رات تک کھلی رہی۔ اس نمایش کے ایک پہلو کے کمرہ میں وینس کرسچن ٹمپرنس یونین نے چائے کا انتظام کر رکھا تھا۔ جہاں نمایش کے گھنٹوں میں ریفرشمنٹ مل سکتا تھا۔

رسم افتتاح کے بعد ہزآنر لفٹنٹ گورنر لیڈی وائٹ اور دیگر معزز یورپین و ہندوستانی صاحب نے یہاں چاے نوشی کی۔ قریب ساڑھے پانچ بجے کے ہزآنر اور لیڈی وائٹ تشریف لے گئیں۔ مسٹر محمد الیاس سکرٹری کمیٹی کئی ماہ سے نمایش کا کام نہایت سرگرمی سے کر رہے ہیں۔ جسکے لیے وہ ہزار آفریں کے مستحق ہیں۔ نمایش کے انتظام میں رنگون کے ایک نوجوان پُرجوش تاجر مسٹر اے جی ایم براسنے بھی بہت بڑا حصہ لیا ہے۔ مسٹر حسن محمود کا کام بھی قابل تعریف ہے۔ مسٹر نور محمد سندہی طالب علم علیگڈہ کالج نے بھی زنانہ نمایش اور صیغہ تعلیم نسواں کی خدمت سرگرمی کے ساتھ انجام دی ہے۔

ذیل میں ہم ممبران انتظامیہ کمیٹی و رضاکاران کے اسمائے گرامی کی فہرست درج کرتے ہیں جنہوں نے اپنی کمال ہمت اور قومی ہمدردی کے ساتھ اس نمایش کو کامیاب کرنیکے لیے تہ دل سے کوششیں فرمائیں۔ نہ صرف ہم کو بلکہ تمام قوم کو ان حضرات کا شکرگزار ہونا چاہیے۔ جنرل سکریٹری مولوی عبدالسلام صاحب رفیقی تھے۔ لیکن جن لوگوں نے واقعی کام کیا ہے اُن کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

فہرست ممبران انتظامی کمیٹی نمایش صنعت و حرفت نسواں مقام رنگون

مسز ایم لاری — پریسیڈنٹ

مسز ایم روسٹ

مسز ایم بی مہرلی

مسز ایس۔ آر ڈانٹرا

مسز بی۔ برزورجی

مسز ایس۔ ڈی سکلٹ

مسز ایس این سین

مسز آغا محمود

مسز زیڈ۔ اے زیل

مسز ایس ایچ زیل

مسز ایم۔ ای بھیمیہ

مسز لاؤنگ

مسز بالا آؤنگ

مسز باٹو

مسز خن

مسز حین سان

مسز لم پوانگ

مسز ایس اے رحمان

مسٹر محمد الیاس سکرٹری

مسٹر ایچ محمود سکرٹری

فہرست والنیٹرس (رضاکاران) نمایش مذکور

مس سکلٹ

مس جے سکلٹ

مس ایف ہانی

مس پاسن

مس فورایکر

مس روک

مس اسمتہ

۵۱۲

مس اڈنگ

مس این اڈنگ

مس کام بیڈ

مسز مہتا

مس پیس کال

مسٹر ایس اے طیب جی

مسٹر اے سین

مسٹر سی جی باوا۔ مسٹر نور محمد

تقریر مسز علی اکبر

عورتوں کے فرائض منصبی پر

جو انہوں نے بحیثیت صدر انجمن سالانہ جلسہ میں ہندو لیڈیز سوشیل و لٹریری کلب بمبی میں کی ،

مسز علی اکبر نے کرسی صدارت پر رونق افروزی کے بعد حاضرین جلسہ کی طرف مخاطب ہوکر تہ دل سے ممبروں کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے باوجود ہندو ہونے کے ایک مسلمان لیڈی کو اپنا صدر انجمن قرار دیا جس سے اُن کی بے تعصبی اور اپنی بہنوں سے عام ہمدردی کا ثبوت ملتا ہی ۔ اور پھر اپنی ناقابلیت کا اعتراف کرکے کلب کو اس کی کامیابی پر مبارکباد دی اور یہ فرمایا کہ اس کلب اور نیز نیشنل انڈین ایسوسی ایشن ان دونوں انجمنوں نے ہماری ملکی بہنوں کو آپس میں اتفاق اور میل جول کا بہت موقع دیا اور نیز ہمارے لیے صحت جسمانی کے قائم رکھنے کے واسطے تفریح اور ورزش کے سامان بھی بہم پہنچائے ۔

میں اس بات کو بخوبی جانتی ہوں کہ ہماری بعض بہنوں کے لیے یہ امر بہت دشوار ہی کہ وہ اپنے پیارے گھروں کو چھوڑکر باہر نکلیں جہاں پر انکو نسوانی اوصاف حمیدہ کے ظاہر کرنے کے لیے بڑا وسیع میدان حاصل ہی اور جہاں پر اپنے خاندان سے محبت کرنے اور اُن کی محبت حاصل کرنیکا موقع حاصل ہی ۔ لیکن میری عزیز بہنوں ! تم مجھے معاف کروگی اگر میں یہ کہوں کہ عورت کی مفید محبت صرف گھر کی ہی چار دیواری تک محدود نہ رہنی چاہیے بلکہ اس کو اجازت دینی چاہیے کہ وہ آزادی کے ساتھ انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر اپنا اثر ڈال سکے ۔ شفقت اور اُلفت ، مہربانی اور ہمدردی عورت کے لیے ایسے ہی اوصاف ہیں جیسے پھول کے لیے خوشبو ۔ اب یہ خوشبو گھر ہی کی چار دیواری میں پیدا ہوکر وہیں ختم نہیں ہونی چاہیے ۔ اگرچہ گھر کی چار دیواری ہی اسکے لیے زیادہ موزوں ہی کہ اس میں وہ خوشبو پوری مہک پیدا کرے ۔ اُن کو گھر کی چار دیواری سے باہر نکل کر بھی آزادی کے ساتھ اپنا اثر دکھانا چاہیے تاکہ انسانی زندگی کے ہر ایک

شعبے پر اُس کی شعاعیں پڑیں۔ اور ہماری حالت کو موجودہ حالت سے بہتر کردیں یہ وہ آسمانی برکتیں ہیں کہ جو زندگی کو خوشگوار معتدل اور مسرت آمیز کردیتی ہیں۔ اور جو دنیا کی چیزوں کو آسمانی نور اور جلال سے منور کردیتی ہیں۔

یہ خوشنما روشنی ہم دنیا میں اسی قدر وسعت سے پھیلا سکینگے جس قدر کشادگی ہم اپنی قلبی محبت میں پیدا کرسکینگے اور محبت قلبی وہ شے ہے کہ جس میں فرقہ بندی اور اختلاف اقوام و مذاہب اور تمدنی تعصب کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اور محبت قلبی تمام دنیا کو بلا امتیاز ایک لگاتار جاری رہنے والے چشمہ سے نکل کر سیراب کرتی ہے اور جو مثل سورج کی روشنی کے ہے۔ جو اپنے آسمانی کُرّہ نور سے نکلکر ہر ایک چیز کو جو اسکے سامنے آتی ہے منور کردیتی ہے۔

عزیز بہنوں! عورت کو ام الاقوام اور قومی بنیاد کی بنا کرنے والا کہا گیا ہے۔ وہ فطرۃً نازک اور نرم دل ہے۔ یہ اُس کی نزاکت اور نرم دلی ہی ہے جس کی وجہ سے اُسکے ہاتھ میں قیصرانی کی اس قدر ایک زبردست قوت ہے جو تمام عالم کی قوتوں سے بالاتر ہے۔

عورتیں ہی مردوں اور عورتوں کے عادات و اخلاق کی عمارت کو بناتی ہیں۔ جو کہ عجائب گاہ دنیا میں جلوہ افروزی کرتے ہیں۔ عورتیں ہی اپنے بچوں کے سادہ اور کچے دلوں میں وہ اثرات پیدا کرتی ہیں جن سے کہ وہ قوم کے اچھے اور مفید افراد بن سکتے ہیں۔ یہ ماؤں ہی کے ناصحانہ الفاظ ہیں اور یہ انہی کی غیر محدود ہمدردی محبت اور حُب وطنی ہے جو کہ اُن کے چھوٹے بچوں کے دلوں میں حلول کرجاتے ہیں جو بعد میں مثل کلیوں کے کِھل کر انکے زبردست مردانہ یا ملکوتی نسوانی صفات میں نمایاں ہوتے ہیں۔ اور اپنے وطن کی خدمت کرتے ہیں۔

سب سے بڑا اور اعلیٰ درجہ کی ذمہ داری کا کام عورتوں کی زندگی کا ہی ہے اور مناسب ہے کہ ہم ذرا تامل کرکے غور کریں کہ ہم اس کام کے لیے اپنے آپ کو کس طور پر سب سے بہتر اور مناسب و موزوں بنا سکتے ہیں۔

اسکے سب سے پہلی شرط یہ ہی کہ ہم عمدہ اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے خود اپنی طبیعت کو مصفّٰی کریں تربیت پذیر اور شائستہ بنائیں۔ مطالعہ اور دقیقت اور قدیم وجدید زمانہ کے سب سے عمدہ اور اعلیٰ خیالات سے تعارف یہ اس کام کی تیاری کے لیے نہایت ضروری ارکان ہیں جنکو ہماری والدہ ماجدہ یعنی فطرت نے ہمارے سپرد کیا ہے۔ لیکن صرف کتابوں کا پڑہنا اور علمی تربیت کچھ زیادہ مفید نہ ہوگی۔ اگر ہم اپنے دلی خیالات کی تربیت اور شائستگی کی طرف متوجہ نہوں۔ اور اگر محبت اور ہمدردی۔ اور بے لوث خدمت گذاری اور ایثار نفسی کو اپنی زندگی کی روح رواں اور اپنی زینت کا مقصد نہ بنائیں۔ یہی ہماری مضبوط ترین جاے پناہ ہیں۔ اور یہی منبع ہیں ہمارے نفع رسانی کے۔

میری عزیز بہنوں ا ہمیں ان شریف صفات کے ترقی اور وسعت دینے اور اپنی زندگی کے ہر ایک کام میں انکو اپنا رہنما بنانے میں کوئی موقع ہاتھ سے نہ دینا چاہیے۔

میٹھے الفاظ محبت آمیز خیالات ہمدردانہ کام۔ ارادۃً اور بلاارادہ ہمیشہ ہم سے ظہور میں آنے چاہییں۔ عورت مثل اس فرشتہ کے ہی جو تکلیف سے نجات دیتا ہی اور ہمارے دل اس برکت کا منبع ہیں جس سے ہم کو ایسی طبیعت ملی ہی۔

محبت، امداد اور خدمت یہ الفاظ ہمارے تکیۂ کلام ہونے چاہییں۔ ایک شیریں لفظ ایک دوستانہ مصافحہ۔ اور ایک ہمدردی اور شفقت آمیز نگاہ بعض وقت معجزے کا کام کرجاتی ہے۔

یہ ایک مقولہ ہی کہ "محبت خدا ہی اور خدا محبت ہی اور وہ جو محبت کرتا ہی وہ خدا کی جانب سے ہی اور خدا کو جانتا ہی" اور یہ عورتوں کا سب سے بڑا فخر ہونا چاہیے کہ وہ اس دنیا میں آسمانی محبت کا اظہار کریں جو کہ منبع ہی تمام سچی خوشیوں کا۔ اس شریفانہ کام کے انجام دہی کی مناسبت حاصل کرنے کے لیے ہماری دعائیں اور ایثار نفسی سب سے بہتر ذریعے ہوسکتے ہیں۔

ہر روز بلاناغہ اور بلا کسی پس وپیش کے ہم کو اپنے مہربان آسمانی باپ سے جو کہ

رب العالمین سے دعائیں مانگنی چاہییں اور اپنے دلوں میں اس کی برکت اور قوت کو حاصل کرنے کی سچی آرزو کرنی چاہیے جس سے کہ ہماری محبت اور ہمدردی نشو و نما پائے گی۔ ہمارے خیالات میں اور وسعت پیدا ہو گی۔

ہمیں ایک دن بھی ایسا ضائع نہیں کرنا چاہیے جسکا کوئی نہ کوئی حصہ سچے دل اور کمال خلوص کی دعاؤں سے خالی ہو۔ تاکہ ہماری محبت پوری وسعت کے ساتھ ظہور پذیر ہو۔ ہم کو اپنی توجہ ایک اور خوبی کی طرف منعطف کرنی چاہیے یعنی درگذر اور چشم پوشی اپنے دوستوں سے محبت کرنا ایک انسانی وصف ہے۔ لیکن ان لوگوں سے جو ہم کو نقصان پہنچاتے ہیں یا ہماری برائیاں کرتے ہیں محبت کرنا ایک وصف الٰہی ہے۔

کسی مصنف نے کیا خوب کہا ہے کہ جب تم کسی کے گناہ سے درگذر کرتے ہو تو وہ آدمی جو تمہارے دل کو اپنے افعال یا اقوال سے زخم پہنچاتا ہے اُسکا اس دریا کے کیڑے کا سا حال ہو جاتا ہے جو سیپ کو زخمی کر کے اُس میں چھید کرتا ہے مگر سیپ فوراً اُس زخم کو موتی سے بند کر دیتی ہے۔

جب ایذا رسانی کے جواب میں عورت کی جانب سے درگذر ہو اور وہ نفرت کا معاوضہ محبت سے کرے تب سمجھنا چاہیے کہ عورت اپنے پورے سچے اور اصلی اوصاف کے ساتھ دنیا میں جلوہ گر ہو رہی ہے۔

اس بات کو بھی ہم نظر انداز نہیں کر سکتے کہ ظاہری شان و شوکت دولتمندی وجاہت اور اعلیٰ رتبہ عورت کی زندگی کو مفید بنانے کے لیے ضروری چیزیں نہیں ہیں۔ یہ عورت کا دل ہے نہ کہ اسکے زیور جنکی وجہ سے وہ دنیا میں اس قدر نمایاں طور پر جلوہ افروز ہے۔ ایک غریب سے غریب عورت حقیقتاً ایک عالی مرتبہ عورت ہو سکتی ہے۔ اور ایک ملکہ تنگ خیال اور ادنیٰ ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ ہمارے بزرگ شاعر شیخ سعدی نے فرمایا ہے۔

بزرگی بعقل ست نہ بسال و تونگری بدل ست نہ بمال۔

کسی عورت کی بڑائی صرف اُس کی دنیاوی شہرت ہی پر قیاس نہیں کرنی چاہیے،
عمدہ باتوں میں اور بھی خوبی زیادہ پیدا ہوجاتی ہے۔ اگر دنیا میں اُن کی تشہیر نہ کی جائے۔
عورت کا سب سے شریفانہ اور ضروری کام یہی نہیں ہے کہ دنیا کی آنکھوں کے سامنے بھی اسکو
بڑا کرکے دکھایا جائے۔ عورت کا سچا اثر لگاتار ہر شخص کو محسوس ہونا چاہیے جس کی نسبت
ورڈس ورتھ ایک انگریزی شاعر نے کہا ہے۔ کہ

"وہ چھوٹے چھوٹے بے نام و نمود کے گمنام کام ہیں جو عورت کی محبت اور
شفقت سے ہروقت ٹپکتے رہتے ہیں"

میری بہنوں! میں ایک اور خیال تمہارے سامنے ظاہر کرنا چاہتی ہوں۔ ظاہری
شکل وصورت بالیقین ایک بڑی نعمت ہے۔ لیکن اگر وہ ہماری اندرونی خوبصورتی کا عکس نہ
تو ظاہری خوبصورتی فی الواقع بے حقیقت ہے۔

ہمارے دل میں ایک بھی محبت آمیز خیال ایسا نہیں ہے جو ہماری شکل وشباہت کو
ہماری روحانی شکل وشباہت سے مشابہ نہ کردے۔ ایک انگریز مصنف نے کیا ٹھیک کہا ہے
کہ نیکی اور محبت ظاہری شکل کو ایک سانچے میں ڈھالکر اپنے ہمشکل بنا لیتی ہیں۔ اور محبت
کی خوشی اور خوبصورتی اس کی وجہ سے چہرہ کے ہر ایک حصہ سے ہروقت نمایاں
رہتی ہے۔

رسکن کہتا ہے کہ "ہمارے اندر ایک بھی خوبی ایسی نہو گی کہ جسکو کام میں لانے کی وجہ سے
ہماری شکل پر ایک نئی خوبصورتی نمودار نہو"

امرسن اسی خیال کو اس طور پر ظاہر کرتا ہے کہ "چہرہ کے رنگ روغن کو کوئی چیز اس سے
زیادہ خوبصورت بنانے والی نہیں ہے کہ ہمارے دل میں ہروقت یہ خواہش ہو کہ اپنے گرد و پیش
ہم خوشی پھیلائیں اور کسی کو رنج نہ پہنچائیں"

میری بہنوں! ہمارا یہی مقصد ہونا چاہیے اور ہماری توجہ بھی اسی طرف رہنی چاہیے کہ

ہم اپنے دل کو خوبصورت اور صاف بنائیں جس کی وجہ سے بالیقین ہمارا چہرہ بھی خوبصورت ہو جائے گا۔

اسکے بعد مسز علی اکبر نے بہت سی ہندوستانی اور انگریزی بیگمات کے نام لیے جنہوں نے اپنی بہنوں اور ملک کے لیے مفید کام کیے ہیں۔ اور حضور ہر ہائنس بیگم صاحبہ بھوپال دام اقبالہا کا بھی اس زمرہ میں ذکر خیر کیا ہے۔ اور بعد اسکے سیوہ سدن کلب کے لیے جو حال میں قایم ہوا ہے ممبران سے مدد کی استدعا کرکے اپنی انگریزی تقریر ختم کر دی۔

تعلیم نسواں اور انگریزیت تھیوسوفیکل سوسائٹی نے جو تعلیمی کانفرنس بنارس میں ۳۱۔ دسمبر سنہ ۱۹۰۹ء کو کی تھی اُس میں مسز اینی بسنٹ نے بہ حیثیت صدر جلسہ کے ایک تقریر میں اس بات پر زور دیا کہ ہندوستانی عورتوں کو زیادہ تعلیم دینی چاہیے اور انہی کو تعلیم دیکر اُستانیاں بنانی چاہییں تاکہ وہ یوروپین اُستانیوں کی جگہ جو ہندوستانیوں کے اطوار و عادات اور رسوم و رواج وغیرہ سے واقف نہیں ہوتیں تعلیم کا کام انجام دیسکیں۔

ہندوستانی ہی اُستانیاں ہندوستانی لڑکیوں کو ہندوستانی طریقہ زندگی کی تعلیم نہایت عمدگی سے دیسکتی ہیں۔ اہل ہند کا گھر ہی ان کی قومیت کا مسکن ہے، اگرچہ ہندوستان کے مردوں میں انگریزیت آگئی ہے۔ لیکن عورتوں میں اسنے ابھی تک کوئی اثر نہیں کیا ہے۔ اور اسی سلیے عورتوں کی روحانیت اور ان کے اخلاق کمزور نہیں ہوئے ہیں اور نہ اُن کے دوسرے صفات میں کسی قسم کا ضعف آیا ہے۔ اسلیے ہندوستانی ہی عورتوں کو لڑکیوں کی تعلیم سپرد کرو۔

یہ تو مسلمہ امر ہے کہ عورت ہی وہ سانچہ ہے جس میں انسان ہر صورت سے ڈھل جاتا ہے اسلیے اگر مائیں تعلیم و اخلاق وغیرہ میں اچھی ہیں تو اولاد بھی اچھی ہوگی۔ اس مسلمہ اصول کی

روسے تعلیم نسواں لازمی اور ضروری ٹھہرتی ہے۔ اور اہل ہند کو ہر طرح پر اُسکے فروغ دینے کے لیے کوشش کرنا چاہیے۔ ہندوؤں میں اب تعلیم نسواں بہت ترقی کر رہی ہے لیکن مسلمانوں میں ابتک اُس کی طرف کافی توجہ نہیں کی گئی ہے۔ مگر اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہندوستان کی جملہ قومیں اپنی عورتوں کو اُستانیاں بنائیں۔ اور اُن کو لڑکیوں کی تعلیم میں لگائیں۔ بلا ضرورت خواہ مخواہ انگریزیت کو اپنے گھروں میں داخل ہونے دیں۔

ایک نیا علمی جہیز ہمارے مکرم و مہربان اور خاتون کے دلی قدر دان محمد فضل کریم خاں صاحب نے ماہ گذشتہ میں اپنی دختر نیک اختر کی رسم وداع کے موقع پر جہاں اور جہیز دیے وہاں رسالہ خاتون کو بھی اس علم دوست لڑکی کو جہیز میں دیا۔

ہم اپنے دوست کی اس بے نظیر مثال کو قوم کے لیے شگون خیر سمجھتے ہیں۔ حقیقت میں اپنی پیاری اولاد کے ساتھ انسان سب سے بہتر اگر کوئی سلوک کرنا چاہتا ہے تو وہ یہ ہے کہ اسکو تعلیم دے۔ اور علم کا شوق اسکے اندر پیدا کر دے۔ دنیا کے مال و متاع فانی ہیں۔ اور علم کو بقاء ابدی حاصل ہے۔

ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اپنے مہربان دوست کا خط خاتون میں درج کر دیں تاکہ وہ آیندہ قوم کے لیے ایک عمدہ مثال ہو جس کی دوسرے لوگ لڑکیوں کے جہیز دینے میں تقلید کریں۔

جناب بندہ۔ تسلیم

میں نے رسالہ خاتون اپنی لڑکی کو جہیز میں دینا تجویز کیا ہے۔ الحمد للہ رسم وداع ۲۸۔ دسمبر سنہ گذشتہ کو ادا ہو چکی۔ لہذا مبلغ تین روپیہ چندہ سالانہ رسالہ خاتون آج کی تاریخ بذریعہ منی آرڈر نمبر ۲۰۳ آپ کی خدمت میں بھیجکر درخواست ہے کہ براہ کرم رسالہ خاتون مندرجہ ذیل پتہ پر جاری فرما دیجیے۔ اور چونکہ جو چیز جہیز میں دی جاتی ہے۔ وہ دُلہن کے

مدت العمر استعمال کی غرض سے دی جاتی ہے، اسلیے میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میری عزیز دختر اور رسالہ کی حیات تک (خداوند تعالیٰ دونوں کی عمر میں برکت دے) رسالہ کی خریداری جاری رہے گی۔ اور سال بسال میری جانب سے چندہ سالانہ آپ کی خدمت میں پہنچتا رہے گا۔

آخر میں التجا ہے کہ براہ عنایت ماہ جنوری سنہ ۱۹۱۰ء کے نمبر سے رسالہ کا اجرا شروع فرمائیے۔

نیازمند محمد فضل کریم خاں سب انسپکٹر
ریڈر صاحب انسپکٹر جنرل بہادر پولس۔ ریاست پٹیالہ

رجسٹرڈ نمبر ۲۵۱

خاتون

جلد ۶	بابت ماہ فروری سنہ ۱۹۱۰ء	نمبر ۲

اڈیٹر شیخ محمد عبداللہ بی اے ایل ایل بی سکرٹری تعلیم نسواں سکشن

فہرست مضامین

محمد عبدالسلام پرنٹر کے اہتمام سے

مطبع فیض عام علی گڑھ میں طبع ہوا

۵ - مارچ سنہ ۱۹۱۰ء

شیخ محمد عبداللہ بی اے پبلشر نے علیگڑھ سے شائع کیا

خاتون

۱۔ یہ رسالہ ۴۲ صفحے کا علی گڈھ سے ہر ماہ میں شائع ہوتا ہے اور اس کی سالانہ قیمت ۱؎ ہے،، اور ششماہی ۱۲؎ ہے۔

۲۔ اس رسالہ کا صرف ایک مقصد ہے یعنی مستورات میں تعلیم پھیلانا اور پڑھی لکھی مستورات میں علمی مذاق پیدا کرنا،

۳۔ مستورات میں تعلیم پھیلانا کوئی آسان بات نہیں ہے، اور جبتک مرد اس طرف متوجہ نہونگے مطلق کامیابی کی امید نہیں ہوسکتی، چنانچہ اس خیال اور ضرورت کے لحاظ سے اس رسالہ کے ذریعہ سے مستورات کی تعلیم کی اشد ضرورت اور بے بہا فوائد اور مستورات کی جہالت سے جو نقصانات ہو رہے ہیں اُس کی طرف ہمیشہ مردوں کو متوجہ کرتے رہیں گے۔

۴۔ ہمارا رسالہ اس بات کی بہت کوشش کریگا کہ مستورات کے لیے عمدہ اور اعلیٰ لٹریچر پیدا کیا جاے جس سے ہماری مستورات کے خیالات اور مذاق درست ہوں اور عمدہ تصنیفات کے پڑھنے کی اُن کو ضرورت محسوس ہو تاکہ وہ اپنی اولاد کو اُس بڑے لطف سے محروم رکھنا جو علم سے انسان کو حاصل ہوتا ہے معیوب تصور کرنے لگیں۔

۵۔ ہم بہت کوشش کرینگے کہ علمی مضامین جہانتک ممکن ہو سلیس اور با محاورہ اُردو زبان میں لکھے جائیں،

۶۔ اس رسالہ کی مدد کرنے کے لیے اسکو خریدنا گویا اپنی آپ مدد کرنا ہے اگر اس کی آمدنی سے کچھ بچیگا تو اس سے غریب اور یتیم لڑکیوں کو وظائف دیکر اُستانیوں کی خدمت کے لیے تیار کیا جائے گا۔

۷۔ تمام خط وکتابت و ترسیل زر بنام اڈیٹر خاتون علی گڈھ ہونی چاہیے۔

خاتون

تقریر

علیاحضرت ہر ہائنس نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ، جی، سی،

آئی، ای فرمانروائے بھوپال دام اقبالہا وملکہا

بہ جلسہ الگزینڈرا ہائی سکول

منعقدہ ۲۹۔ ذی قعدہ ۱۳۲۷ھ ۱۳ دسمبر ۱۹۰۹ء روز دوشنبہ

مسٹر ہین! ممبران اسٹاف طلبا، الگزینڈرا اسکول!

آج تم نے جس جوش مسرت اور حسن عقیدت کے ساتھ مجکو میری سالگرہ پر مبارکباد دی ہے، میں اسکا شکریہ ادا کرتی ہوں اور مناسب سمجھتی ہوں کہ اس موقع پر تمہارے سامنے اپنے اُن خیالات کا اظہار کروں جو میرے دل میں تمہارے کاموں، اور بہبودی کے متعلق ہیں،

میں نے جب اسکول کی بنیاد ڈالی، اور جس دن سے یہ ملکہ انگلستان وقیصرہ ہندوستان کے اسم گرامی سے موسوم ہوا میری یہ تمنا تھی کہ اسکا افتتاح نہایت شاندار موقع پر کسی معزز ہاتھ سے کیا جائے۔ خدا کا شکر ہی کہ میری یہ تمنا پوری ہوئی کہ گذشتہ ماہ میں ملک معظم قیصر ہند کے نائب السلطنت ہز اکسلنسی لارڈ منٹو نے افتتاح فرمایا، اور نہ صرف افتتاح فرمایا بلکہ تم کو اپنی شفیقانہ اور ناصحانہ اسپیچ سے خاص عزت عطا فرمائی اور ہز اکسلنسی نے بہ وفور عنایت تمہاری کامیاب ہم جماعتوں کو انعام تقسیم کیا،

مجکو امید ہی کہ تم ہمیشہ اس عزت کی قدر اس طریقہ پر کروگے کہ جو کچھ جناب محتشم الیہ نے تم کو نصیحتیں فرمائی ہیں اُن پر عمل پیرا ہو، اور یقیناً میری اُن توقعات کو پورا کرنیکی کوشش کروگی جو تمہارے اس مدرسہ اور تمہاری آیندہ زندگی کے ساتھ وابستہ ہیں۔

تم کو ہز اکسلنسی کے وہ جملے خوب یاد ہونگے جن میں انہوں نے میری اُن توقعات کو جو تمہاری ذات سے متعلق ہیں ظاہر فرمایا ہی۔ اور جسکو تم میں سے اکثر نے اسکو پرسوں کے دربار میں بھی مکرر سن لیا ہی۔ اور میں اس موقع پر تم کو اپنی اُس اسپیچ کی یاد بھی تازہ کراتی ہوں جو میں نے ۱۹۰۸ء میں بوقت تقسیم انعام بجواب اسپیچ مسٹر ہین کی تھی۔

بیشک تمہارا ملک اور تمہارا وطن یہ حق رکھتا ہی کہ تم اسکے انتظام میں اپنے فرمان وا کی اعانت کرو اور تمہارا یہ استحقاق اور فرض ہی کہ ریاست کے اعلیٰ عہدوں پر نظر آؤ۔ اور بھوپال کو تمدنی، و معاشرتی ترقی سے زینت دو اسوقت انتظامی کاروبار اور عہدہ ہاے ریاست میں ملکی لوگوں کا حصہ جیسا کہ چاہیے نہیں ہی۔ اسکا بڑا سبب کمی تعلیم ہی جسکا میں مکرر سہ کرر اظہار کر چکی ہوں اکثر تم میں سے اُن لوگوں کی نسلوں سے ہو جو بھوپال کی اصلاح میں ترو کاٹ کہلائے جاتے ہیں۔ اور تمہیں میں وہ لوگ بھی ہیں جنکے آبا و اجداد نے ریاست کے قایم کرنے، اور دشمنوں کی مدافعت میں وہ کارہاے نمایاں کیے جنکے ذکر سے تاریخ بھوپال کے صفحے مزین ہیں۔ لیکن تمہاری سستی و کاہلی کی وجہ سے وہ اوصاف تم میں پیدا نہوے جو تمہارے

اسلاف کی برتری کا باعث تھے اور آج ان اوصاف کے نمونے سے تمہاری یہ حالت ہوگئی
تم یاد رکھو کہ یہ حالت خود تمہاری پیدا کی ہوئی ہے۔ کیونکہ ان اللہ لا یُغیّر بقوم حتیٰ یغیروا مابانفسہم
تم نے نہ صرف تعلیم جدیدہ سے عدم توجہی اختیار کی بلکہ تم میں تساہل کی ایسی روح آگئی کہ وہی فنون
سپہ گری و شمشیر زنی جو تمہارا آبائی پیشہ تھا اور جنکو اسلاف اپنی ماؤں کے آغوش میں سیکھتے تھے
اور جسکو تمہارے بزرگ اپنا شرف قومی، وذاتی سمجھتے تھے تم اُس کی طرف رُخ بھی نہیں کرتے خصوصاً
جاگیرداران ریاست کی اولاد نے تو سواری اسپ اور فوجی دلچسپی کو خیرباد کہہ رکھا ہے حتیٰ کہ اُن کو
اپنے رئیس کے فرزندوں کو دیکھ کر بھی ترغیب نہیں ہوتی۔

میں نے اہل بھوپال کے حالات پر افسوس سے نظر ڈالکر حتی الامکان ان ضروریات کی
تکمیل پر اپنی ہمت کو مصروف کیا کہ جو تمہاری اور تمہاری آیندہ نسلوں کے واسطے باعث
بہبودی اور میری توقعات میں کامیابی پیدا کرنے والی ہوں اور موجودہ نسلیں تعلیم یافتہ ہوکر
انتظام ملک میں میری معین بنیں اور ان میں وہی اسپرٹ پیدا ہو جائے جو اُنکے آباو اجداد
میں تھی۔

جدید تعلیم کے لیے میں نے اُن مدارس کا جو پہلے سے جاری تھے ضرورت و روش
زمانہ کے مطابق انتظام کیا اور تمہارے اس مدرسہ کی بنیاد ڈالی۔ اور یہ کوشش کی کہ اس مدرسہ میں
صرف تعلیم ہی نہو بلکہ یہ ایک ایسی جگہ بن جائے جہاں وہ اعلیٰ صفات پیدا کرائی جائیں کہ جب یہاں کے
طلبا اپنی تعلیم ختم کریں تو وہ تعلیم یافتہ کا صحیح مفہوم بن سکیں اور گو اُن کو دنیوی تعلیم کے بہت سے
مدارج طے کرنے باقی ہوں مگر انکا اخلاق مکمل، اور نیک و بد میں اُن کی قوت تمیز کامل ہو چکی ہو
کالجوں میں جاکر اپنے ہم سبقوں کے لیے نمونے اور اپنے وطن کے لیے سرمایۂ ناز
ثابت ہوں۔

اس تعلیم گاہ کی نسبت ہز اکسلنسی نے یہ فرمایا ہے کہ "چنانچہ یہ دیگر مدارس کی تعلیم کے علاوہ
اپنے طلبا میں ان صفات کے پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے جو انسان میں اخلاقی جرأت

پیدا کرکے اُن کو روزانہ کارزارہستی میں کامیاب کرتی ہی۔ اوائل عمر کی تربیت ہی انسان کو انسان بنادیتی ہی،،

اب یہ امراچھی طرح ثابت ہوگیاہی کہ انگریزی زبان علوم وفنون کامخزن اور معدن ہے اور ہر حیثیت سے وہ علمی زبان ہے، اور ہر قسم کی تعلیم اس زبان کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے اسلیے عام رُجحان انگریزی تعلیم کی طرف پیدا ہوگیا ہے۔ گو یہ بالکل صحیح ہی کہ عربی زبان ہی زمانہ گذشتہ میں ایک بے نظیر علمی زبان تھی اوراسوقت تک اسکا فیض جاری ہی۔ لیکن افسوس کہ مسلمانوں کی غفلت سے ان کا یہ موروثی ذخیرہ بھی ان کے ہاتھ سے نکلکر اہل مغرب کے ہاتھ میں چلاگیا، مگر اہل مغرب نے اس کی ایسی قدردانی کی اوراُس سے ایسا تمتع حاصل کیا کہ مسلمان اُسکا عشرعشیر بھی نہ کرسکے، اوراسوقت سیکڑوں عربی کی اعلیٰ تصانیف اوراعلیٰ کتابیں محض اہل مغرب کی فیضی سے پبلک میں آرہی ہیں۔

پس یادرکھو کہ انگریزی تعلیم ایک ایسی تعلیم ہی کہ جس سے تم عربی کی تعلیم زندہ کرسکتے ہو اور میں تمہیں گویا اس علم کی ہدایت کرتی ہوں۔ جس سے تم اپنی تاریخ تہذیب و اخلاق کو زندہ کرسکو، اور یہ ظاہر ہی کہ ہندوستان میں بھی اسوقت جو کچھ عربی کی ترقی ہورہی ہی وہ انہیں کے ہاتھوں سے ہوتی ہی جو انگریزی تعلیم یافتہ ہیں۔

میں نے تمہاری پرائمری اور سیکنڈری تعلیم کا کامل انتظام کردیا ہی۔ تمام ریاست میں آغاز سے ہی فری ایجوکیشن ہی اور میں نے وظائف کی تعداد غیرمحدود کررکھی ہی تاکہ تمہاری تعلیم میں رُکاوٹ نہ پیدا ہو۔ اور تم نہایت اطمینان کے ساتھ ترقی کرتے ہوئے چلے جاؤ۔ لیکن تم یہ امربھی ذہن نشین رکھو کہ کوئی تعلیم جب تک کہ اُس میں مذہب اور اخلاق شامل نہو آدمی کو اُس کے میدان ہستی میں کامیاب نہیں بناسکتی اور جن طالب علموں میں مذہبی اوراخلاقی اثر نہیں ہوتا وہ ملک کے لیے مفید ثابت نہیں ہوتے اسی لیے میں ہمیشہ تمہارے اُستادوں کواس جانب توجہ دلاتی رہی ہوں،

مذہب ہمیشہ انسان شناسی، وفاداری، ہمدردی اور حسن اخلاق کی تعلیم دیتا ہے اور مسلمانوں کا یہ مذہبی شیوہ ہے کہ جب وہ دوسری قوموں کے محکوم ہو کر رہے ہیں تو انہوں نے ہمیشہ سلطنت کی وفاداری کی ہے حسن اخلاق محبت و وفاداری، اور اطاعت مسلمانوں کی تعلیم مذہب کا نہایت گراں قدر سبق ہے۔ کتب تاریخ کے صفحات اگر تم دیکھو گے تو تمکو معلوم ہو جائے گا کہ دنیا میں جہاں جہاں تمہارے مذہب کی تعلیم کی اشاعت ہوئی ہے وہاں کے باشندوں میں یہ تمام اعلیٰ صفات پیدا ہو گئے ہیں اسی طرح یہ تمام صفات مذہب ہنود میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اور اس مذہب کی بنیاد بھی رحمدلی حسن اخلاق، اور راج کی اطاعت پر قائم ہے جس کی شہادت ہندوستان قدیم کی تاریخ کے اوراق میں موجود ہے اور خود بھوپال میں بھی جس طریقہ سے کہ مسلمانوں نے اطاعت اور وفاداری کی۔ اسی طرح ہندو بھی مطیع وفادار ہے، پس ہندوؤں کیواسطے بھی مذہبی تعلیم ایسی ہی ضروری ہے جیسی مسلمانوں کے لیے ہے اور یہی اصول دیگر مذاہب میں بھی پائے جاتے ہیں،

اسی لیے میں نے تمہاری تعلیم میں مذہبی اور اخلاقی اثر کو زیادہ رکھا ہے اور یہی سبب ہے کہ ہز اکسلنسی نے ارشاد فرمایا کہ جو طلباء اس کی چار دیواری سے باہر نکلیں گے وہ صحیح المزاج خوش خلق خدا ترس اور اپنے ملک کی نہایت ممتاز منتظمہ ہر ہائنس کے جاں نثار وفادار خادم ثابت ہونگے،

وفاداری اور جاں نثاری کے متعلق مجھے اس سے زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ میری اور برٹش گورنمنٹ کی وفاداری تمہارے لیے ایک ایسی لازم و ملزوم شے ہے کہ جو کسی طرح ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتی اور مجھے امید ہے کہ تم ابھی سے اس خیال کو اپنے دل میں قائم رکھو گے اور جب تم طالب علمی کی لائف سے نکلکر کاروباری زندگی میں قدم رکھو گے تو یہ خیال ایک نخل ثمرور کی طرح تمہارے دل میں ہوگا،

اسی کے ساتھ میں تم کو یہ بھی بتانا چاہتی ہوں کہ یہ فطری امر ہے کہ ہر انسان پہلے اپنے عزیز

پھر اپنے خاندان پھر اپنے ہم مذہب اور اہل وطن کی طرف درجہ بدرجہ رجحان محبت و اُلفت رکھتا ہے لیکن چونکہ بنی آدم اقتضائے یکدیگر اند اسلیے شریف طبیعتوں میں عامہ بنی نوع انسان کے ساتھ بھی ہمدردی ہوتی ہی پس اگرچہ یہ مدارس اہل بھوپال کی ضروریات وحالات کو دیکھکر جاری کیے گئے اور انہیں کی بہبودی کے لیے یہ انتظامات و مصارف عمل میں آئے، لیکن اسکا فیض صرف اہل بھوپال ہی پر محدود نہ رہنا چاہیے، تعلیم کا چشمہ عام ہی اور ہمیشہ عام ہی ہونا چاہیے، اس میں ملکی و غیر ملکی کا امتیاز کرنا ایک بڑی غلطی اور مذہب و اخلاق کے بالکل خلاف ہی، تمہارے اسکول کی جماعتوں میں غیر ملکی طالب علم بھی ہیں اور وہ تعلیم سے اُسی قدر فائدہ اُٹھانے کا حق رکھتے ہیں جسقدر کہ تمہارا ہے، غیر ملکوں کے ساتھ اتحاد رکھنا تمدن اور ترقی کے لیے نہایت ضروری ہی، اور ایسا اتحاد ہمیشہ چھوٹے تعلقات سے شروع ہوکر عظیم الشان تعلقات تک پہنچتا ہے اور اسی سے ملکی ترقی ہوتی ہی۔ پس تم کو بھی ابھی سے طریقہ اتحاد پر عمل کرنا چاہیے، اور کبھی غیر ملکیوں کے ساتھ تکبر و نفاق نہیں کرنا چاہیے،

اب یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو نہایت اہم ہی اور اس سوال کا فیصلہ تم کو زمانہ طالب علمی ہی سے کرنا ضرور ہی، وہ سوال یہ ہی کہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد تمہاری زندگی کے مشاغل کیا ہونگے؟

اگر تم نے تعلیم کے بعد صرف ملازمت ہی کی کوشش و جستجو کی تو تم یاد رکھو کہ کسی طرح منازل زندگی میں کامیاب نہیں ہوسکتے، ہر حکومت میں ملازمت کا حلقہ محدود ہی اور کوئی بادشاہ اور فرماں روا تمام اُن اشخاص کو جو تعلیمی مدارج طے کرلیتے ہیں ملازمت نہیں دیسکتا،

انگلستان میں جس قدر تعلیم عام ہی، اور جس قدر وہاں پبلک کو تعلیم میں دلچسپی ہی تم اُسکو غالباً اخبارات وغیرہ میں دیکھتے ہوگے اور اُسکے ساتھ تم کو یہ بھی معلوم ہی کہ کس قدر وسیع رقبے پر انگریزی حکومت ہی، لیکن باوجود اس عظمت و شان کے انگلش گورنمنٹ اپنی تمام قوم

اور دارالعلوموں کے تمام فارغ التحصیل طلبا کو ملازمت نہیں دیسکتی، پس اسکواب بغور دیکھو کہ اہل انگلستان تعلیم پانے کے بعد کیا کرتے ہیں اور کیا سیکھتے ہیں اُن کی کامیابی کا راز دولت و محنت کے حقیقی معنی سمجھنے میں مضمر ہی، انہوں نے دولت کو ملازمت میں نہیں پایا، بلکہ فنون لطیفہ تجارت و صنعت ایجاد اختراع میں کیا۔ اور اسی کے لیے ہر قسم کی محنتیں کیں وہ پہلے تعلیم حاصل کرتے ہیں اور پھر اُسی تعلیم کو تجارت و صنعت اور اختراعات کے کام میں لاتے ہیں، لیکن ہندوستان میں تعلیم کے بعد تمام تر توجہ ملازمت کی طرف مبذول کیجاتی ہے حالانکہ تعلیم کا اصلی مقصد صرف نوکری حاصل کرنا نہیں ہی بلکہ تعلیم یافتہ فرقے کو صنعت کی طرف زیادہ متوجہ ہونا چاہیے، جس سے تمام تر دنیوی فلاح وابستہ ہی،

صنعت و اختراعات کی ضرور قدر ہوتی ہے، ہندوستان میں ہی جو اشیا بنتی ہیں اور نیز جو صناعی قدیم کے نمونے ہیں اُن کو انگلش قوم اور حکام گورنمنٹ نہایت عزت و وقعت سے دیکھتے اور خرید کرتے ہیں۔ اور عمدہ صنعت کی چیزوں کا جو انکے مذاق کے مطابق ہوتی ہیں بڑے شوق سے استعمال کرتے ہیں،

چنانچہ دہلی کے عظیم الشان دربار میں لیڈی کرزن صاحبہ اور خود بھوپال بنکوائٹ میں لیڈی منٹو صاحبہ ہندوستانی ساخت کی پوشاک زیب تن کیے ہوئے تھیں،

باوجود ایسے صریح مشاہدات کے باشندگان ہند یا تو نقص تعلیم کی وجہ یا اپنی خام خیالی کی وجہ سے پورے طور پر متوجہ نہیں ہوتے۔ اور جنہوں نے توجہ کی اور تجارت کے فوائد کو سمجھا وہ اسوقت ہندوستان میں سب سے زیادہ متمول قوم ہیں،

پارسی جماعت ہندوستان میں نہایت قلیل ہی لیکن اُن میں تجارت کی سرگرمی ہی بوہرہ، خوجہ، میمن، جو مسلمانوں کے فرقے ہیں اور جن کی تعداد بہت کم ہی، تجارت پیشہ ہیں اسی طرح ہندوؤں میں بعض قومیں ہیں جو تجارت کرتی ہیں وہ سب آسودہ اور دولتمند ہیں اور آج اُن کی دولت کا بڑے بڑے امرا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ اُن کو ملازمت کی پروا نہیں بلکہ وہ

اسکو حقارت سے دیکھتے ہیں۔ مگر ان میں بھی جو تعلیم یافتہ تجار ہیں اُن کی تجارت میں فروغ ہی۔ اس زمانے میں سلطنت برطانیہ کے تمدن و انتظامات سے سفر و خبر کی سہولتیں حرفت و صنعت کی گرم بازاری و حوصلہ افزائی، ہر قسم کی تعلیم کی درسگاہیں موجود ہیں۔ اگر ان برکات سے فائدہ نہ اُٹھایا جائے اور تعلیم کو صرف ذریعہ ملازمت قرار دیکر ملازمت ہی کی کوشش کیجائے تو یہ فعل دانشمندی کا نہیں ہے اور نہ کبھی اس سے ملک کی حقیقی ترقی ہوسکتی ہے۔

تم تاریخہائے زمانہ کی ورق گردانی کرو ہر زمانے میں ملکوں کی ترقی کا راز تجارت و صنعت اور تعلیم میں پاؤ گے۔ وحشی سی وحشی قومیں اور مفلس سے مفلس ملک تعلیم و تجارت اور صنعت کی بدولت صاحب دولت اور آسودہ ہوئے ہیں،

اہل عرب جو کہ جزیرہ نمائے عرب کی ایک وحشی اور جاہل قوم تھی، اُس نے علمی تحقیقاتیں کیں، ریاضی، وہیئت، جغرافیہ، طبیعیات، کیمیا، حیوانات، نباتات، معدنیات، طب میں کیا کیا کمال دکھائے اور اُن کے ذریعہ سے ملک و قوم کو کیسے کیسے عظیم الشان فوائد پہنچائے، فنون حرفت و تعمیر کی یادگاریں صدیاں گذرنے پر بھی موجود ہیں۔ اُن کے تجارتی تعلقات ہندوستان، چین، یورپ و افریقہ سے وابستہ تھے وہ اس زمانہ میں جبکہ نہ ریل تھی نہ موٹر نہ تار تھا اور نہ دخانی جہاز کہاں کہاں تعلقات قائم کرتے تھے۔ اور حصول علم کی خاطر کیسے دور دراز مقامات پر جاتے تھے لیکن جب ان میں کاہلی پیدا ہوگئی حوصلہ دب گیا وہ جوش جسنے اُن کو دنیا میں ایک متمدن قوم بنایا تھا جاتا رہا تو ملکی و معاشرتی نظامات بگڑنے لگے اور بالآخر ایسا انحطاط آیا جو اسوقت تمہارے پیش نظر ہے۔

ممبران اسٹاف!

اس مدرسہ سے جو میرا مقصد ہے اسکو تمہارے قابل پرنسپل مسٹر ہن نے اچھی طرح

اس ایڈریس میں ظاہر کیا ہے جو ہز اکسلنسی کے روبرو پیش کیا گیا ہے اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ یہاں تعلیم دی ہے۔ اور وظائف دے دیگر کالجوں میں طلبا بھیجے جاتے ہیں، پس تم کو وہ مقصد ہر وقت ذہن نشین رکھنا چاہیے جو اس مدرسہ کا ہے تاکہ جب طلبا یہاں سے نکلکر دوسرے کالجوں میں جائیں تو تم سے وہ چیزیں حاصل کرکے اپنے ساتھ لیجائیں جس سے وہ دوسرے طلبا کے سامنے نمونہ بنیں۔

وہ چیزیں کیا ہیں؟ اعلیٰ اخلاق حوصلہ مذہب کی پختگی، عمدہ تربیت مضبوط چال چلن تاکہ نہ صرف وہی نمونہ بنیں بلکہ تمہاری بھی قابلیت کی شہرت وعزت ہو اور یہ اسکول جس معزز نام کے ساتھ موسوم ہوا ہے اُسی کے مطابق نیکنامی اور برتری کا اظہار کرنے والا ثابت ہو۔

مسٹر ہین نے تمہارے سامنے اُستادی کے فرائض کی ایک مثال قائم کی ہے اور میری یہ امید بیجا نہو گی کہ اُس مثال کو ہمیشہ پیش نظر رکھو گے۔

آپ لوگوں کا یہ فرض بھی ہے کہ وقتاً فوقتاً اُن طلبا کو اڈورڈ میوزیم میں لیجا کر عملی تعلیم بھی دیا کریں تاکہ وہ وہاں کے عجائبات کو دیکھکر سائنٹفک اور ٹکنیکل تعلیم کی طرف متوجہ ہوں۔

ہز اکسلنسی کا یہ ارشاد بالکل صحیح ہے اور آپ کے اور طلبا کے لیے قابل توجہ ہے کہ" ہندوستان کے سرکردہ اصحاب روز بروز اس بات کو زیادہ سمجھتے ہیں کہ محض کتب آموزی کے فوائد محدود ہیں اور اُن لوگوں کی تربیت کے لیے زیادہ عملی تعلیم کی ضرورت ہے اور لوگوں کو اُس سے فنون زراعت جنگل، معدنیات و دیگر صنائع میں معقول آسانیاں ہو جائیں گی۔

مجھے امید ہے کہ الگزینڈرا ہائی اسکول کے طلبا جس کا میں نے افتتاح کیا ہے یہاں آجایا کرینگے۔

حاضرین!

یہ ایک دلچسپ اتفاق ہے کہ" اسکول ملکہ معظمہ کے نام سے" اور میوزیم ملک معظم

قیصر ہند کے نام سے موسوم ہے اور تعلیم کے لحاظ سے ایک دوسرے کے ساتھ لازم
و ملزوم ہیں۔

مجھے امید ہے کہ جس طرح الگزینڈرا ہائی اسکول اخلاق و عادات اور ذہنی تعلیم سے جہل
کو بدرجہ دور کریگا اسی طرح ایڈورڈ میوزیم سائنٹفک اور ٹکنیکل تعلیم سے فائدہ پہونچائیگا۔ اور اس طرح
ان دونوں معزز ناموں سے موسوم شدہ مجالس علمی کا فیض عام جاری رہے گا،

میں بہ نیابت ہز ہائنس (باضابطگی) پر اظہار مسرت کرتی ہوں جو وہ ہمیشہ اسکول
میں قائم رکھتے ہیں اور جسکو انہوں نے ہز ایکسلنسی کی تشریف آوری اور انعام کے وقت نہایت عمدگی
کے ساتھ ظاہر کیا ہے۔

صاحبزادہ حاجی محمد حمید اللہ خاں کے نظم پڑھنے کی طرز پر نہ صرف میں ہی مسرور ہوئی
بلکہ جس قدر حاضرین تھے وہ مسرور ہوئے اور مسٹر پین نے اُن کو انعام دینے کی سفارش کی ہے
مجھے امید ہے کہ وہ ایک اچھے اسپیکر ہونگے اور وہ تمام علمی قابلیتوں کے لیے اسی طرح کوشش
کرینگے جیسی کہ اس وقت کر رہے ہیں۔ میں اُس امداد پر بھی مرحبا کہتی ہوں جو انہوں نے انتظامات
متعلقہ گارڈن پارٹی اور بنگو اس میں مجھے دی۔

اے عزیز طالبعلمو!

یہ جو کچھ میں نے اپنی تقریر میں کہا ہے وہ ہندو اور مسلمانوں کے لیے مساوی طور پر ہے
اور دونوں کو اس سے برابر اثر پذیر ہونا چاہیے۔ مجکو امید ہے کہ تم ہمیشہ یہ فقرہ کہ "ہمدردی و
وفاداری سب سے شریف جوہر اور میراث سلف ہے" اپنی زندگی میں پیش نظر رکھو گے اور
اپنے فرماں روا کی وفاداری کا سلطنت برطانیہ کی وفاداری کے ساتھ وہی لزوم رکھو گے
جو نفس اور حیات کا ہے۔

مسٹر پین!!

میں نہایت خوشی کے ساتھ آپ کی خدمات اور سرگرمی کا جو آپ نے اسکول کے کامیاب

بنانے میں کی میں اعتراف کرتی ہوں۔
اور اپنی اسپیچ اس دعا کے ساتھ ختم کرتی ہوں کہ خداوند کریم میری ان توقعات کو پورا کرے جن کے ساتھ میں نے اس اسکول کو قائم کیا ہے،

آئینۂ وفا

مادرش کا راجہ اشواپتی نہایت سخی و فیاض دل آدمی تھا۔ رعیت اپنے پیارے راجہ پر نثار تھی سب سامان اسکے ارمان پورا کرنے کے لیے مہیا تھے مگر ایک غم نے اسے دلگیر و شکستہ خاطر کر رکھا تھا۔ وہ یہ کہ لاولد تھا۔ سلطنت تو تھی لیکن وارث تاج و تخت نہ تھا۔ گھر تھا مگر چراغ نہ تھا مدت تک وہ خدا سے دعا مانگتا رہا، آخر کار درگاہ باری میں اس کی گریہ وزاری قبول ہوئی۔ یعنی بڑھاپے میں ایک دختر نیک اختر تولد ہوئی اور اسکا نام ساوتری رکھا،

ساوتری جوں جوں بڑھتی گئی خوبصورتی کے ساتھ خوب سیرت و عقلمند بھی ہوتی گئی، جو اپنے باپ کی آنکھوں کا نور ماں کے دل کا سرور اسکے ہر طرح کے آرام و آسایش کا ذریعہ قوم کا فخر اور اپنی سہیلیوں کی خوشی کا باعث تھی،

ساوتری اکثر جنگل میں خود رو پھول توڑنے جایا کرتی تھی اور وہاں رشیوں منیوں سے جو اس جنگل میں یاد الٰہی میں مصروف رہتے تھے ملا کرتی۔ جسکو وہ اس اندھیرے جنگل میں آنکھوں کا اُجالا سمجھتے تھے اور خود بخود اُسے ہر قسم کی تعلیم بھی دیا کرتے،

اسی طرح سے وہ بڑی ہوگئی اور اگرچہ اسکا سن ایک خوبصورت راج کنوار کی بیوی بنجانے کے قابل ہوگیا تھا۔ لیکن وہاں کوئی ایسا شخص نہ تھا جو اس جیسی دوشیزہ کے خاوند ہونے کے قابل ہو اسواسطے وہ ایک عرصہ تک کنواری ہی رہی۔ جس قدر زمانہ گذرتا جاتا تھا اسی قدر اُسکے والدین اس کی طرف سے فکرمند ہوتے جاتے تھے۔ آخر کار کچھ صلاح

و مشورہ کے بعد یہ رائے قرار پائی کہ توکل بر خدا جو کچھ خدا کی مرضی ہوگی دیکھا جائیگا،
چونکہ ماں باپ کے لیے خواہ لڑکی سمجھو یا لڑکا یا جو کچھ سمجھو لے دے کے ایک ساوتری ہی تھی اسواسطے ہر شخص ان کی محبت کا جو اسکے ساتھ تھی اندازہ کر سکتا ہے۔ اور اس کی ہر قسم کی خوشی پوری کرنے میں انہیں کسی قسم کا عذر نہوتا تھا۔ اُن ہی دنوں میں جبکہ اس کی شادی کا چرچا ہو رہا تھا اُنہوں نے ساوتری سے یہ بھی کہہ رکھا تھا کہ اگر تو چاہے تو خود اپنے لیے کوئی راج کنور پسند کر سکتی ہو ہماری اجازت ہے کیونکہ یہ امر تیری ہی مرضی پر منحصر ہے۔ مگر یہ خیال رہے کہ ہر طرح تیری برابر ہو۔ اور ہم بھی رضامند ہوں۔ علاوہ بریں کوئی ایسا ناجائز طریقہ استعمال میں نہ لایا جائے جو خدا کو ناگوار گذرے یا خاندان میں دھبہ لگائے۔

اسی اثنار میں ساوتری ایک روز حسب معمول جنگل میں جاتی تھی اتفاقاً اس کی نظر ایک رشی کے لڑکے پر پڑی جو نہایت حسین نوجوان تھا۔ لیکن جوں ہی ساوتری کی نگاہ اس سے ملی حجاب کے مارے ایک قدم آگے نہ بڑھا گیا، وہیں ٹھہر گئی اور دل ہی دل میں سوچنے لگی۔ ظاہرا ساوتری ست مند سی تھی لیکن فرط خوشی سے یہ حال تھا کہ وہاں سے ہٹنا محال تھا۔ مگر عزت کا تقاضا وہاں ٹھہرنے کا مقتضی نہ تھا۔ لہذا بمشکل تمام خاموشی کے ساتھ وہاں سے چلی۔

ساوتری ایک رشی کے جھونپڑے میں جو بطور استاد کے تھا داخل ہوئی۔ چلی تو گئی لیکن اس سے باتیں کرنے میں اسکا دل نہ لگتا تھا۔ اگرچہ منی کی باتیں وہ ظاہرا سنتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن اسکا دل وہاں کہاں۔ ہر وقت اسے اسی کا خیال تھا جس سے بعض دفعہ تو اسکے چہرے پر خوشی کے آثار نمایاں ہو جاتے تھے اور بعض دفعہ وہ خیال افشاے راز کی کوششیں کرتا تھا یعنی اسے بے چین کر دیتا تھا۔ منی نے جب اس کی یہ حالت دیکھی تو اس سے اس طرح ہمکلام ہوا،

بیٹی آج تیرا کیا حال ہے۔ کس بیماری میں مبتلا ہے، یا رنج و غم کا تجھ پر پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے یا

ی فکر کے دریا میں غرق ہی صحیح صحیح بتلا کر کیا ہوا، میں ایک سن رسیدہ شخص ہوں اور زمانہ کے
شیب و فراز میں نے خوب دیکھے ہیں ممکن ہی کہ میں تیرے مرض کی چارہ جوئی کر سکوں،
س وقت ساوتری نے جو انتظار ہی میں بیٹھی تھی۔ جو کچھ گذرا تھا اول سے آخر تک سب
صاف صاف کہدیا۔

سکے جواب میں منی نے اس جوان کا تمام قصہ کہہ سنایا اور کہا کہ اسکا نام ستی وان
ہے۔ اور وہ دمیتسن کا اکلوتا بیٹا ہی جو کسی زمانہ میں راجہ تھا۔ لیکن گردش لیل و نہار نے اور
چرخ کجرفتار کے ظلم و جور نے اسکا تخت و تاج برباد کر دیا۔ پیر فلک اُسے اس حالت میں بھی دیکھ سکا
اور زمانے نے اُسکا ساتھ نہ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب ضعیف ہو گیا زبردست دشمنوں نے ملک سے
نکال باہر کیا۔ اور اب وہ انہیں جنگلوں میں جوگی کی طرح زندگی بسر کرتا ہی ستی وان اس زمانے
میں بچہ تھا۔ یہیں پرورش پائی اور اب وہ نہایت قوی۔ ہوشیار۔ عقلمند خوبصورت و
نیک سیرت لڑکا ہی۔ سچ پوچھو تو ہر بات میں یکتا ہی آج تک اسنے کبھی جھوٹ نہیں بولا کبھی
وعدہ خلافی نہیں کی اور یہی وجہ ہی کہ اسکا نام ستی وان ہی جسکے معنی ہیں راستباز۔

جب ساوتری یہ داستان پُر درد سُن چکی اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے مگر جب اُس کا
خیال آجاتا تھا۔ چہرے پر خوشی طاری ہو جاتی تھی۔ مُنی کا شکریہ ادا کر کے گھر روانہ ہوئی۔
قاعدہ ہی کہ جب کسی کو زیادہ مسرت حاصل ہوتی ہی ہر چیز بھلی معلوم ہوتی ہی علی ہذا ساوتری کو
ہر چیز پہلے سے زیادہ خوشنما دکھائی دیتی تھی۔ پھول زیادہ خوشنما معلوم ہوتے تھے۔
آسمان زیادہ نیلگوں نظر آتا تھا۔ بلبلوں کی نغمہ سرائی زیادہ دل لبھانے والی تھی۔

غرض اسی دُھن میں گھر پہنچی ماں سے ساری سرگذشت بیان کی اسکو اپنے شوہر سے
اس امر کی اطلاع کرنی ضرور تھی۔ اس کی تعمیل کرنے کو وہ خاوند کے پاس گئی۔ اور جو جو باتیں
لڑکی سے سُنی تھیں کچھ رو کر کچھ ہنسکر اسکے سامنے کہدیں، بادشاہ کے لیے اگرچہ یہ ایک
مژدہ تھا اور یہ خبر اس کی فکر کو رفع کرنے کے لیے کافی تھی۔ مگر وہ یہ خوب جانتا تھا کہ اس اہم مسئلے

کے حل کرنیکو نہایت غور وفکر کی ضرورت ہے۔ تھوڑی دیر بعد کہا اچھا پہلے ہم کو نارد پنڈت سے مشورہ کرنا لازم ہے بعد ازیں جو کچھ اس کی راے ہوگی اسی پر عمل کیا جائیگا۔

فوراً نارد طلب کیا گیا اور شہزادی نے اسکے سامنے دلی خیالات کا اظہار اور قصہ کا آغاز کیا نارد اس کی باتیں سنتا جاتا تھا لیکن فکر کے آثار دمبدم اسکے بشرے سے ظاہر ہوتے جاتے تھے

جب ساوتری کہہ چکی نارد نے اپنا سر ہلایا اور کہا کہ افسوس! تیری خواہش پوری نہیں ہوسکتی غیب کے سامان کچھ اور ہیں کوئی اور فکر کرنا چاہیے۔ ساوتری نے جواب دیا کیا وجہ ہے جو میں اس سے دست بردار ہوجاؤں جب میں ایک دفعہ ہی اپنے لیے پسند کر چکی تو اب دل سے ہٹنا میرے لیے دشوار ہوگا اور خدا کو بھی ناگوار ہوگا۔ میرے نزدیک تو اس میں کوئی برائی نہیں ہے،

اسکے بعد اشوا پتی نارد سے شہزادے کے اوصاف اور حسب نسب دریافت کرنے لگا مگر خاطر خواہ جواب پاکر سخت متعجب ہوکر کہا۔ آخر پھر کیا وجہ ہے اور کونسا امر مانع ہے جو ساوتری کی دلشکنی کیجاے " نارد جو بالکل خاموش بیٹھا تھا۔ یہ الفاظ اُس کی مہر سکوت توڑنے کو کافی تھے بہت سکوت کے بعد کہا " اگرچہ ظاہرا اس میں کوئی نقصان نہیں معلوم ہوتا بلکہ اس خیال سے کہ ہر ایک کی منشار دلی کا دارمدار اسی پر ہے نہایت موزوں اور زیبا ہے لیکن دراصل ساوتری کے لیے اور نیز اسکے اقربا کے لیے یہ سبز باغ ہے کیونکہ منشار ایزدی اسکے بالکل خلاف ہے ستی دان کی زندگی تقریباً تمام ہوچکی صرف ایک سال اُس کی زندگی کا اور باقی ہے۔ اگر ساوتری کی شادی اس کے ساتھ کردی گئی تو ایک سال بعد یقیناً اسکو بیوہ ہونا پڑیگا چاردن کی چاندنی اور پھر اندھیری رات،،

بادشاہ نے جب یہ خبر وحشت اثر سُنی تو خاموشی کے سوا کچھ نہ بن پڑی اپنی بیٹی سے کہنے لگا۔ ذرا سوچ تو سہی بیوہ ہوجانا کس قدر خوفناک جملہ ہے تیری زندگی خاک میں ملجائے گی اور کچھ دن ہی جینا وبال ہوجائیگا۔ میرے خیال میں اگر کسی کو بیچ دریا میں کسی چٹان سے

باندھ دیا جائے اور اُسے رہائی کی کوئی امید نہ رہے۔ رات دن دریا کی موجیں تھپیڑے دیا کریں تو یہ بُڈاپے کے دن کاٹنے سے بدرجہا بہتر ہے۔ خیال تو کر کہ تیری زندگی کا آیندہ حصہ کس قدر تلخ ہو جائیگا۔ زمانے کو رنگ بدلتے کچھ دیر نہیں لگتی خدا جانے کن کن مصیبتوں کا سامنا ہو۔ بہتر ہے کہ اس ارادہ سے باز آ۔

غرض ہر طرح سے اونچ نیچ سمجھاتا تھا لیکن ساوتری جسکو ابھی کمسن ہی کہنا چاہیے۔ چونکہ دنیا کی نیرنگی سے واقف نہ تھی ارادہ سے ٹلتی نہ تھی۔ اور کہتی تھی کہ میں آپ کے حکم کو نہیں ٹال سکتی مگر یاد رہے کہ عمر بھر بیاہ کا نام نہ لونگی ؎

سینہ میں کسی شخص کے دو دل نہیں ہوتے

نارد کو اس کی اس سچی محبت اور وفاشعاری پر سخت تعجب ہوا۔ اور کہا خیر اگر تیری یہی خوشی ہے تو ہم لاچار ہیں۔ مگر خدا کی باتیں خدا ہی جانے۔ ممکن ہے کہ زمانہ آیندہ کی تاریکی روشنی سے بدل ڈالے۔ راجہ کو بھی یہ بات پسند آئی اور اپنی لڑکی کی نسبت اسی نوجوان سے کرنے پر راضی ہو گیا۔ لیکن یہ تاکید کر دی کہ ستی وان کو اس راز سے آگاہ نہ کیا جائے۔

راجہ اپنی رانی کو لے مع ساوتری اور چند مصاحبوں کے اس جنگل میں پہنچا جہاں دیتسن رہتا تھا وہاں جاکر دیکھا کہ وہ ایک سال کے درخت کے نیچے گھاس پر بیٹھا ہے اور ستی وان بھی اسکے پاس اس کی خدمت میں حاضر ہے۔ راجہ نے مقصد دلی اسکے سامنے ظاہر کیا ستی وان نے جب سے ساوتری کو دیکھا تھا۔ اسی کے خیال میں غرق تھا اور ایک لحظہ بھی ساوتری کی صورت اور اسکا خیال دل سے نہ بھلا سکتا تھا۔ دوبارہ ملنے سے بالکل مایوس ہو گیا تھا۔ اب جوں ہی اسکو دیکھا۔ اسکے دلی جذبات کا اندازہ ہر شخص کر سکتا ہے اور جو کچھ خوشی اُسے حاصل ہوئی ہمیں بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ اتنا کہہ سکتے ہیں کہ وہ بہت ہی بیقراری سے اس بات کا انتظار کر رہا تھا کہ اسکا باپ کیا جواب دیتا ہے۔

اندھے دھندھے خدا رس جوگی میں سے رئیسانہ ٹھاٹ نہیں گئے تھے اور جانتا تھا کہ

کہ اپنے بلند مرتبہ مہمانوں کی کس طرح تواضع کرنی چاہیے۔ جو کچھ حاضر تھا اسکے سامنے رکھکر کہا اے راجہ میں نے تیری شہرت اور تیری لڑکی کے حسن و جمال کا چرچا بہت سنا ہے۔ بڑی قسمت کہ تیری بیٹی میری بہو بنے۔ لیکن میں ایک غریب آدمی ہوں اور اس ویرانے میں رہتا ہوں اسلیے ایسی شہزادی کو جو ناز و نعمت سے پلی ہو جنگل میں رہنا سخت دشوار ہوگا اشوپتی نے جواب دیا کہ میری لڑکی مرتبہ اور دولت کی جو دنیا میں مثل اور چیزوں کے آتی جاتی ہے خواہاں نہیں۔ اسپر دمتیسن نے رضامندی ظاہر کی اور وہیں جنگل میں ایک کو دوسرے کی قسمت کا مالک بنا دیا گیا۔

اسکے بعد سب لوگ واپس چلے آئے اور ساوتری اپنے پیا کے دیس میں تنہا رہ گئی۔ ساوتری نے اپنا شاہی لباس تن سے جدا کیا اور جوگیہ کپڑے پہنے اپنے پتی کے ساتھ خوش خوش رہنے لگی۔ اپنے نئے والدین کو خدمت گذاری سے خوش کرتی اور اپنے شوہر کو پیاری پیاری باتوں اور نیک خصلتوں سے ہمیشہ خوش رکھتی اور اس کی تابعداری میں وقت مصروف رہتی۔

(باقی آیندہ)

سلمہ اور استانی کی گفتگو

سلمہ نے کچھ ایسی حوصلہ مند طبیعت پائی تھی کہ ہر بات کی تہ کو پہنچنے کی کوشش پہلے وہ خود کرتی اور جب وہاں تک اسکا ذہن رسا نہ ہوتا تو ہر چہ ندانی از پرسید نش ننگ مدار" پر عمل کرتی اور استفسار حقیقت سے باز نہ رہتی۔ استانی بھی ایسی شفیق اور لائق ملی تھی کہ اسکا کوئی سوال تشفی بخش جواب سے خالی نہ جاتا،

ایک دن اسنے اپنی استانی سے یہ سوال کیا کہ تعلیم و تربیت کے کیا معنی ہیں اس سے

مراد اگر لکھنا پڑھنا ہے تو ہم عورتوں کو اس کی کیا ضرورت ہے، ہم سب تو گھر کی رہنے والیاں ہیں ہم کو پکانا. ریندنا، سینا پرونا سیکھنے کی ضرورت ہے۔ پڑھنے لکھنے کی تو اُنکو ضرورت ہے جن کو نوکری کرنا ہے۔ اماں برابر ابا سے کہا کرتی ہیں کہ "نہ معلوم تم اس لڑکی کو مولوی بناکر کیا کروگے۔ میں تو دیکھتی ہوں کہ جوں جوں عورتیں تعلیم یافتہ ہوتی جاتی ہیں ووں ووں نکمی اور اپاہج بنی جاتی ہیں، گھر کا کام کاج کرنا کسر شان ہے۔ چولھے چکی کے نزدیک جانے میں کپڑا میلا ہونے کا خیال ہے۔ نوبت بہ اینجا رسید کہ باورچی خانے کا انتظام بھی باہر کے نوکروں کے سپرد ہوتا جاتا ہے۔ پکا پکایا آتا ہے اور میاں بیوی کھاتے ہیں۔

البتہ اتنا دیکھتی ہوں کہ پڑھی لکھی بیویاں اپنی چکنی چپڑی باتوں اور شستہ زبان خوش مذاقی سے میاں کو لبھا لیتی ہیں اور نکیل پکڑ کر جدھر چاہتی ہیں گھما دیتی ہیں۔ اور میاں کی نظروں میں بیوی ہی ہمہ اوست ہوجاتی ہے۔

چنانچہ وہ کسی ڈاکٹر صاحب کا تذکرہ کرتی تھیں کہ وہ ڈاکٹر صاحب پہلے بڑے ملنسار صاحب اخلاق اور اقربا پرور تھے۔ جب اُن کی پہلی بیوی مرگئیں تو دوسرا نکاح ایک عالمہ عورت سے کیا۔ اب وہی ڈاکٹر صاحب ہیں نہ وہ اخلاق ہے نہ وہ اقربا پروری۔ بیوی کے حکم کے بندے ہیں۔ مجھے تو ڈر ہے کہ بہت جلد وہ دن آنے والا ہے جب ہماری لڑکیاں بھی بے غیرتی اور بیحیائی کا جامہ پہنے سڑکوں اور باغوں میں سیر کرتی ہوئی اور ہال میں ناچتی ہوئی نظر آئیں گی"۔

اُستانی جی! ان باتوں کو سنتے سنتے میرے دل میں کچھ عجیب قسم کے خیالات پیدا ہونے لگے ہیں۔ اور پڑھنے لکھنے کو میں مشتبہ نگاہوں سے دیکھنے لگی ہوں۔

اس موقع پر اُستانی نے جو تقریر کی وہ اس قابل ہے کہ ہر تعلیم پانے والی خاتون کو گوش نصیحت نیوش سے سننا اور عمل کرنا چاہیے۔

اُستانی۔ بیٹی سنو! قبل اسکے کہ میں تم کو تعلیم و تربیت کے معنی اور اُن پر عائد شدہ

الزامات کے عائد ہونے کے اسباب بتاؤں یہ ذہن نشین کر دینا چاہتی ہوں کہ بغیر تعلیم و تربیت انسان معنوی اور حقیقی تعریف میں انسان نہیں ہی جس طرح ماہتاب میں بغیر آفتاب کے روشنی نہیں آسکتی سب اسی طرح انسانی اخلاق میں بغیر تعلیم و تربیت سلامت روی نہیں پیدا ہو سکتی۔

انسان جس وقت پیدا ہوتا ہی اُس وقت اس میں اور حیوان میں بجز ظاہری شکل و صورت وضع و قطع کے اور کوئی چیز مابہ الامتیاز نہیں رہتی ہی مگر آگے چلکر جو چیز انسانی تفوق کو دوبالا کر دیتی ہے وہ عقلی ترقی ہی جسکا کسبی اختیار خود اس کی خواہش اور ارادہ کے تابع ہے۔ اور اس ترقی کی باگ تعلیم و تربیت کے پنجۂ قدرت میں ہی۔ اچھا دماغ فطرت سے لیکر آدمی پیدا ہو سکتا ہی اور ہوتا ہی مگر وہ دماغ اُس وقت تک بیکار و معطل ہی جب تک کہ تعلیم و تربیت کے سرچشمہ سے اس کی آبیاری نہ کیجائے۔

اس لیے ہر انسان کے لیے تعلیم و تربیت لازمی شئے ٹھہری اور اگر عورت بھی انسان ہی تو اسکو بھی اس کلیہ سے خارج نہیں کرنا چاہیے۔ اسی فلسفہ ترقی انسانی کی بنا پر حدیث شریف میں آیا ہی طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم ۔ ومسلمۃ ایک متمدن قوم کی سب سے بڑی پہچان یہی ہے کہ اسکے طبقہ کے دونوں افراد ذکور و اناث بیشتر دولت علم سے مالامال ہوں اگر ایسا نہیں ہی تو تمدن ناقص ہی۔

اس کی بدیہی مثال خود ہمارے اسلام میں موجود ہی جب جاہلیت کی تاریکی آفتاب اسلام کی شعاعوں سے دور ہوئی۔ اور اسلامی تمدن کا ستارہ چمک اُٹھا تو ساتھ ہی ساتھ علم کی روشنی بھی پھیلتی گئی۔ اور ہر اُس شخص پر جسنے اسلامی تاریخ و سیر کا مطالعہ کیا ہے۔ پوشیدہ نہیں ہی کہ اسلام میں کیسی کیسی قابل عورتیں گذری ہیں۔ بیویاں تو بیویاں جاریہ تک زیور علم سے آراستہ ہوتی تھیں،

شاید یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اسلام میں لکھنے کی صلاحیت حاصل کرنے کی

ادبیت کا فخر جن دو شخصوں کو حاصل ہوا اُن میں سے ایک عورت تھی۔ یعنی حضرت حفصہ یکے از ازواج مطہرات (دیکھو رسائل شبلی) مگر اُس زمانے کی عورتوں میں ڈھونڈھنے سے بھی شاید کوئی عورت ایسی نہ مل سکے گی جسکا ایک قدم بھی جادۂ فرائض نسوانی سے باہر پایا جاسکے۔ یہ ثبوت ہی اس بات کا کہ تعلیم نسواں کا دامن ہمیشہ سے ہر قسم کے دھبہ سے پاک ہی اور پاک رہے گا۔

نفس تعلیم کے سران بُرائیوں کا الزام دھرنا جو آجکل تعلیم یافتہ گروہ میں پائی جاتی ہیں ویسا ہی ہے جیسے کوئی قاتل کے قتل کرنے کا الزام اس کی تلوار پر لگائے یا فن سپہگری پر۔ تمہاری والدہ جو کچھ فرماتی ہیں وہ سرے سے جھوٹ نہیں ہی۔

یہ قاعدہ کی بات ہی کہ آدمی جس چیز سے بدظن ہوجاتا ہے اسکے عیوب ذرا مبالغہ کے ساتھ بیان کرتا ہی مگر بات یہ ہی کہ الناس علی دین ملوکہم۔ محکوم قوم پر حکمراں قوم کے عادات و خصائل کا غیر احساسی طریقہ پر ایسا گہرا اثر پڑتا ہی کہ جسکا ازالہ غیر ممکن ہی۔ یہ اثر ایسا چلتا ہوا جادو ہے جس کی کاٹ نہیں ہی۔

خصوصًا وہ لوگ جو یورپ کی ہوا کھائے ہوئے ہیں یا جو یورپین طرز معاشرت کے ہر پہلو کو اپنی کور عقلی کی وجہ سے قابل تقلید سمجھتے ہیں کب کسی کی سُننے والے ہیں اور حق تو یہ ہی کہ انہی ناسمجھوں کے کرتوتوں نے تعلیم نسواں کو بدنام کر ڈالا ہی۔ اور ان کو اس کی خبر نہیں کہ یورپ کی طرز معاشرت کا اخلاقی پہلو بعض حیثیتوں سے بہت کچھ قابل ملامت ہی جس کا خود منصف مزاج یورپ والوں کو اقرار ہی خود یورپین مصنفین جنھوں نے تعصب سے کام نہیں لیا ہی مقر ہیں کہ ایشیائی حرم (اس سے آجکل کے ہندوستانی حرم مراد نہیں ہے) ہر حیثیت سے یورپین حرم پر فائق ہی۔

آج بھی ہمارا حرم ویسا ہی ہوجائے جیسا سلف صالحین کے وقت میں تھا تو کیا بات ہے اور یہی ہماری غرض ہونی چاہیے۔ مگر یہاں تو مدنظر ہی کچھ اور ہی۔ کوئی تو یہ چاہتا ہے کہ

تعلیم کی آڑ میں پردۂ نسواں کو پھاڑ پھینکوں جو ہندوستان جیسی پُرآشوب و فتنہ جگہ کیلیے کوئی عقل والا روا نہیں رکھ سکتا۔ اور کوئی یہ چاہتا ہے کہ سرے سے عورتوں کو تعلیم ہی نہ دیجائے تب ہی پردہ قایم رہیگا۔ یہ خواہش بھی بالکل لچر و پوچ ہے۔ پچھلے خیال والا گروہ اگر اپنی اسی لکیر کا فقیر بنا رہا تو بازی یقینی اگلے گروہ کے ہاتھ ہے۔

چاہیے یہ کہ تعلیم کی مخالفت کو اُٹھا کر طرزِ تعلیم کو راہ راست پر لانے کی کوشش کریں اور اس کی فراہمی سامان کی فکر پر اپنی قوت صرف کریں ورنہ اپنی غفلت اور غیرضروری دعا کی بدولت کفِ افسوس ملنا پڑیگا اور روز بد دیکھنا ہوگا۔

بات کہاں سے کہاں جا پڑی اور اپنے موضوع تقریر سے کسی قدر الگ جا پڑی۔ ہاں تو کہنا یہ تھا کہ بیٹی تم تعلیم نسواں کو بُرا نہ سمجھو علم ہی خدا و رسول کے پہچاننے کا ذریعہ ہے فی زمانا بعض ہندوستانی تعلیم یافتہ عورتوں میں جو کچھ عیوب نظر آتے ہیں وہ یا تو اُن کے مردوں کی خواہشوں کے نتیجے ہیں یا اُس تربیت کی خرابی کی وجہ سے ہیں جس کی آغوش میں اُن کی تعلیم نے پرورش پائی تھی۔ اب آؤ میں تمہیں تعلیم و تربیت کے مفہوم و معنی کو ذرا تفصیل سے سمجھا دوں۔

تعلیم و تربیت جس طرح کہنے میں دو لفظ ہیں اسی طرح معناً بھی دو ہیں مگر جس طرح ظاہری حیثیت سے ایک دوسرے کا ساتھ نہیں چھوڑتے اسی طرح معنوی قرابت بھی رکھتے ہیں۔

(۱) تعلیم کے لغوی معنی ہیں علم کا سیکھنا۔ معلومات یا واقفیت کا بڑھانا۔ اور اصطلاح میں تعلیم اس کام کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ سے ہم کو کسی خاص علم و فن میں واقفیت یا لیاقت حاصل ہوتی ہے۔

(۲) تربیت کے لغوی معنی ہیں پرورش کرنا۔ ترقی دینا اور اصطلاح میں اُس شے کو کہتے ہیں جس سے مختلف قواے انسانی نشو و نما پاتے اور ترقی کرتے ہیں۔ تعلیم سے صرف علم حاصل ہوتا ہے اور واقفیت پیدا ہوتی ہے اور تربیت سے اسی حاصل شدہ علم کو عملی

جامہ پہنانا اور اپنی لیاقت سے بے تکلف کام لینا آتا ہے۔ اگر کسی بچے کو سچ بولنے کے فوائد سمجھائے جائیں تو ہم یہ کہیں گے کہ اُس نے سچ بولنے کی تعلیم پائی ہے اور اگر اس نے سچ بولنے کی عادت بھی اختیار کرلی تو ہم کہیں گے کہ تربیت بھی پائی ہے۔ اس لیے تعلیم بلا تربیت ادھوری ہے۔

تم جب کسی تعلیم یافتہ شخص میں کوئی نقص دیکھو تو یہ نہ سمجھو کہ علم کا قصور ہے بلکہ اس تربیت کا قصور ہے جسکے گہوارہ میں اسکے علم نے نشو و نما پائی ہے۔ یا سرے سے کسی کو ایسی تعلیم دیجائے جس میں اخلاقی تعلیم کی بو باس تک نہو تو وہ یقینی شیطان مجسم ہوگا۔ تعلیم یافتہ کہلانیکا تو صرف وہی شخص مستحق ہے جس میں نیک و بد میں تمیز کرنے کی علمی اور عملی دونوں قابلیتیں موجود ہوں۔ نہ کہ ایسا شخص جو دوسروں کو تو شراب کے نقصانات سمجھا کر اُسکے پینے سے باز رہنے کی ہدایت کرے اور خود شراب خانہ میں بیٹھکر خم کے خم لُنڈھایا کرے۔

یہی راز ہیں اُن نقائص و عیوب کے جو تمہاری والدہ کو پڑھی لکھی عورتوں میں نظر آتے ہیں۔ اب رات زیادہ آگئی اور تمہارے سمجھانے کی بہت سی باتیں رہگئیں، اُن کو کسی دوسری شب کے لیے اُٹھا رکھتی ہوں ؎

راقم
ابوالکمال دیسنوی

سیدہ نفیسہؒ

ایک حدیث ہے کہ "انسان پہلے آسمان پر مقبول ہولیتا ہے تب زمین پر مقبول ہوتا ہے" یعنی جو شخص اپنی نیکیوں اور اعلیٰ انسانی صفات کی بدولت اپنے آپ کو خدا کا مقبول بندہ ثابت کرتا ہے اُس کی تمام لوگ عزت کرنے لگتے ہیں۔ اور وہ دنیا میں ہر دل عزیز ہو جاتا ہے۔

خدا کی مقبولیت اور دنیا میں ہردلعزیزی نہ علم وعقل سے حاصل ہوتی ہے نہ حسن وجمال سے ملتی ہے نہ مال و دولت سے خریدی جاتی ہے نہ طاقت اور قوت کے زور سے کمائی جاتی ہے۔ اسکے حصول کا ذریعہ صرف ایک چیز ہے **نیکی**

مصر ہی میں دیکھو فرعون کیسا طاقتور تھا۔ **ہامان** اسکا وزیر کتنا بڑا عقلمند اور عالم تھا **قارون** اس قدر خوبصورت اور دولتمند تھا مگر سب کے سب اللہ کی بارگاہ سے مردود ہوئے اور تمام مخلوق کے نزدیک ملعون ٹھہرے۔

اسی مصر میں ایک غریب اور کمزور عورت جسکا نام عنوان پر درج ہے گذری ہے جسکے پاس نہ بہت مال تھا نہ جاہ وجلال تھا مگر دل میں نیکی اور پرہیزگاری تھی اور اسی کی بدولت وہ آج گیارہ سو سال گذرنے کے بعد بھی اس قدر مقبول ہے کہ لوگ ایک پرستش نہیں کرتے اور باقی سب کچھ کرتے ہیں۔

مصر میں بڑے بڑے اولیا اللہ گذرے ہیں مثلاً حضرت **ذوالنون مصری** رحمۃ اللہ علیہ حضرت **سید احمد** بدویؒ وغیرہ لیکن جو شرف قبول سیدہ نفیسہؒ کو اللہ تعالےٰ نے عطا فرمایا وہ کسی کو نہیں دیا۔ یہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ اولیا اللہ کے مزاروں میں سے مردوں میں **خواجہ معین الدین چشتیؒ** کا مزار ہند میں اور عورتوں میں **حضرت سیدہ نفیسہؒ** کا مزار مصر میں تمام دنیاے اسلام میں سب سے بڑی زیارت گاہیں ہیں۔

سیدہ نفیسہ حضرت امام حسنؓ کے بیٹے زید کی پوتی ہیں۔ انکے باپ کا نام بھی حسن ہے انکا سلسلہ نسب اس طرح پر ہے۔ نفیسہ بنت حسن، بن زید، بن حسن، بن علی، بن ابی طالب رضی اللہ عنہم۔

ان کی پیدائش ۱۴۵ھ میں مدینہ شریف میں ہوئی۔ علم حدیث وقرآن تو انکے گھرانے کا ورثہ تھا۔ اسکو انہوں نے اچھی طرح حاصل کیا۔ انکے والد **حسن** خلیفہ بغداد **ابوجعفر منصور** کی طرف سے ۱۵۰ھ میں مدینہ کے حاکم مقرر ہوئے۔ اسی سال **امام جعفر صادق** کے

بیٹے **اسحاق المؤتمن** کے ساتھ انکا نکاح کر دیا گیا۔ اسحاق المؤتمن خاندان نبوت کے ایک چراغ تھے اور علم وفضل وزہد وپرہیزگاری میں بے مثل تھے۔ وہ سیدہ نفیسہ کو مکہ شریف لے گئے اور وہیں رہنا شروع کیا۔

۱۵۰ھ میں کچھ ایسے ملکی جھگڑے پیش آئے (جنکے بیان کرنیکا یہاں موقع نہیں ہے) کہ خلفائے عباسی حضرت علی کی اولاد کے مخالف ہو گئے چنانچہ حضرت سیدہ نفیسہ کے باپ حسن بن زید بھی اس بلا میں گرفتار ہو گئے یعنی ابوجعفر منصور نے ان کا تمام مال ومتاع ضبط کر لیا اور قید کر دیا۔

لیکن دو ہی برس کے بعد ۱۵۸ھ میں ابوجعفر مر گیا۔ اسکے بعد مہدی تخت پر بیٹھا۔ اسنے حسن بن زید کو قید سے رہائی دی اور مال ومتاع بھی واپس دیدیا اور ان کو اپنے خاص مقربوں میں جگہ دی کیونکہ وہ علم اور عقل دینداری اور پرہیزگاری کے لحاظ سے بہت معزز لوگوں میں سے تھے۔ دس سال مہدی کے دربار میں رہے۔ ۱۶۸ھ میں جب مہدی حج کو چلا تو یہ بھی اسکے ساتھ حج کو چلے۔ رستہ میں بیمار ہو گئے۔ مقام حاجر میں پہنچکر ۸۰ برس کی عمر میں انتقال کر گئے۔

سیدہ نفیسہ اپنے شوہر اسحاق المؤتمن کے ساتھ مکہ سے مصر میں چلی گئیں اور وہیں ان لوگوں نے جا کر سکونت اختیار کر لی۔ عرب چھوڑنے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ علوی خاندان کے لوگوں کو خلفاء کی طرف سے خطرہ رہا کرتا تھا۔ اس وجہ سے اسحاق نے مناسب سمجھا کہ ہم اس ملک ہی کو چھوڑ دیں۔

مصر میں آکر سیدہ نفیسہ کے علم وفضل اور زہد وورع کا گھر گھر چرچا ہوا۔ دوسرے وہ خاندان نبوت کی تھیں اسلیے تمام مصر گرویدہ ہو گیا۔

اسحاق المؤتمن کو حکام مصر نے سر آنکھوں پر لیا۔ ان کی بڑی عزت کی۔ اور بڑی رقم انکی گزارہ کے لیے مقرر کی۔ اسکے علاوہ سیدہ نفیسہ کے باپ کا ترکہ بھی ان کو مصر میں بھیجدیا گیا۔

اب ان کے پاس بڑی دولت ہوگئی۔ لیکن انہوں نے اپنی درویشی کو نہیں چھوڑا اور اس دولت سے اپاہجوں، غریبوں، مسکینوں اور بیواؤں کی درپردہ امداد کرتی تھیں۔ ان کی سخاوت کا مصر میں بڑا شہرہ تھا۔

جب امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ مصر میں گئے تو چونکہ وہ بھی اسی خاندان سے تھے اسلیے اکثر سیدہ نفیسہ کی خدمت میں تشریف لیجاتے۔ اور اُن سے حدیثیں سُنتے۔

امام شافعی کے متعلق بہت سے علمائے اسلام کا قول ہے کہ وہ امت اسلامیہ میں بےمثل عالم ہیں مگر وہ بھی سیدہ نفیسہ کے باتوں سے فیض حاصل کرتے تھے۔ رمضان کے مہینے میں امام شافعی سے وہ اپنے گھر میں تراویح پڑھواتی تھیں اور خود سنتی تھیں۔

امام شافعیؒ ان کا اس قدر احترام کرتے تھے اور ان کی نیکی اور پرہیزگاری پر اس درجہ اعتقاد رکھتے تھے کہ ۲۰۴ھ میں جب ان کا انتقال ہونے لگا تو انہوں نے دو وصیتیں کی تھیں ایک تو یہ کہ مجکو حاکم شہر آکر غسل دے۔ دوسرے یہ کہ سب سے پہلے میرے جنازے کی نماز سیدہ نفیسہ پڑھیں۔

حسب وصیت لوگوں نے محمد بن سری حاکم مصر کو اطلاع دی کہ امام کو آکر غسل دے وہ آیا۔ اور پوچھا کہ کیا امام پر کچھ قرضہ تھا لوگوں نے کہا کہ ہاں تقریباً ۲ ہزار دینار اسنے اسی وقت قرضہ ادا کر دیا اور کہا کہ غسل سے امام کی مراد یہی تھی۔ اب تم لوگ نہلاؤ اور لیجا کر دفن کرو۔ لوگوں نے نہلایا کفنایا اور حسب وصیت تابوت لیجاکر پہلے حضرت سیدہ نفیسہ کے مکان میں رکھا۔ انہوں نے پردہ کی آڑ سے اسپر نماز جنازہ ادا کی۔ اسکے بعد لوگ لے گیے اور جنازہ پڑھکر دفن کیا۔

۲۰۸ھ رمضان کے مہینے میں ۶۴ سال کی عمر میں سیدہ نفیسہ نے وفات پائی انکے شوہر اسحاق الموتمن نے خواہش کی کہ میں ان کو مدینہ میں لیجا کر دفن کروں لیکن مصر والوں نے کہا کہ آپ اس برکت کو ہم سے نہ چھینیے۔ اور ان کو یہیں دفن کر دیجیے۔ چنانچہ ان لوگوں کے

اصرار سے مقام درب السباع میں جو مصر قدیم اور قاہرہ کے درمیان واقع ہے وہ دفن کی گئیں معتقدین نے ان کی قبر پر ایک عظیم الشان عمارت تعمیر کرائی۔

ان کی مقبولیت کی اس سے بڑھکر کیا دلیل ہو گی کہ جس قدر حکمراں خاندان مصر میں ہوئے مثلاً فاطمی عباسی، چرکسی ایوبی ترکی، وغیرہ ان میں سے ہر ایک شخص ان کے مزار کے احاطہ میں مدفون ہونا موجب برکت اور باعث نجات سمجھتا تھا چنانچہ آج تمام گذشتہ حکمراں خاندانوں کے بادشاہوں امراء اور ارکان سلطنت کی بیشتر قبریں حضرت سیدہ نفیسہ ہی کے مزار کے احاطے میں ملینگی۔ زائرین اور عقیدت مندوں کی اس مقام پر ہمیشہ بھیڑ رہتی ہے۔

یہ عمارت کسی قدر شکستہ ہو گئی تھی سنہ ۶۳۵ھ میں **ملک ناصر** نے اس کی از سر نو مرمت کرائی اور اس کی تمام محرابوں کو درست کرایا۔ سنہ ۶۲۵ھ میں **ملک اشرف خلیل** نے اس مزار پر ایک بڑا بھاری مدرسہ بنوا دیا تھا اور اس پر بہت بڑی جائداد وقف کر دی تھی۔ اس کی عمارت کی چھت بھی کسی قدر جھک گئی تھی وہ بھی درست کرائی۔

یہ عقیدت اس قدر بڑھتی چلی گئی کہ **سیف الدین قائتبائے** نے جو سنہ ۸۷۲ھ میں مصر کے تخت سلطنت پر بیٹھا حضرت سیدہ نفیسہؒ کے مولود کی رسم جاری کی۔ اس مولود کی مجلس میں خلیفہ چاروں مذہب کے قاضی اور تمام امراء اور اعیان سلطنت شریک ہوتے تھے۔ اور نہ صرف قاہرہ بلکہ دور دور سے لوگ اس مجلس میں شریک ہونے کے لیے آتے تھے۔ سلطنت کی طرف سے عمدہ عمدہ کھانے تیار کیے جاتے تھے اور ہر شخص کو کھلائے جاتے تھے۔

اس قسم کے متبرک مزاروں پر ایسے واقعات اکثر ہوتے رہتے ہیں جو عوام الناس کی عقیدت مندی کو بڑھاتے ہیں۔ حضرت سیدہ نفیسہ کے مزار کی بھی بہت سی کرامتیں مختلف کتابوں میں ہم نے دیکھیں۔ ہم ان میں سے ایک واقعہ لکھتے ہیں جس سے عوام کی عقیدتمندی کا اندازہ ہو سکے گا۔

سنہ ۹۲۶ھ میں مصر میں مراغہ کا ایک تاجر رہتا تھا جس کا نام **محی الدین** تھا۔ اس کی ایک

لڑکی سات سال کی عمر کی بچوں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ اسکے سر پر ایک عراقی زرین قیمتی ٹوپی تھی۔ سامنے ہی ایک لڑکے کی دوکان تھی جو بچوں کے لیے کھلونے اور قمریاں بنایا کرتا تھا۔ اس حریص دوکاندار لڑکے نے جب اس بھولی بھالی کمسن لڑکی کے سر پر زرین ٹوپی دیکھی تو اسکے دل میں لالچ پیدا ہوا۔ وہ اُٹھا اور اپنے حبشی غلام کو بھی ساتھ لیا۔ دونوں ملکر لڑکی کو بہکا پھسلا کر حضرت سیدہ نفیسہ کے مزار کے ایک اندھیرے تہ خانے میں لے گئے۔ وہاں لیجاکر چھری سے اُسکا گلا کاٹا اور ٹوپی لیکر چلتے بنے۔ وہ بچی خاک وخون میں تڑپتی رہی۔

ادہر لڑکی کی تلاش ہوئی۔ ماں باپ پریشان تھے کہ کیا ہوئی کہاں گئی۔ آخر اسکے باپ کو شبہ ہوا کہ معلوم ہوتا ہے کسی بدمعاش نے ٹوپی کی خاطر اسکو مار ڈالا۔ یہ خیال کر کے کہ جسنے مارا ہوگا وہ ٹوپی بیچنے کے لیے بازار ہی میں آئیگا۔ وہ دوڑا ہوا بازار میں گیا۔ تمام سوداگروں کو جن سے رات دن کا اسکا لین دین تھا جمع کیا اور واقعہ سُنایا۔ اور کہا کہ جب اس قسم کی ٹوپی کوئی شخص بازار میں بیچنے کے لیے لائے تو خیال رکھو۔ وہی میری لڑکی کا قاتل ہوگا۔

شام کو قمری ساز ٹوپی لیکر بازار میں بیچنے کو پہنچا۔ ایک دوکاندار کو دکھلائی اُسنے اس کی قیمت چالیس دینار (سو روپیہ) لگائی۔ لیکن اسکے ساتھ ہی کہا کہ جب تک اس بات کی ضمانت نہ دوگے کہ یہ چوری کا مال نہیں ہے اُس وقت تک میں اسکو نہیں خریدونگا۔ اسنے ضمانت دینے میں حیلہ حوالہ کیا۔ اور چند سوداگروں نے دیکھا انہیں شبہ ہوا۔ جھٹ محی الدین کو خبر کی وہ دوڑا ہوا آیا دیکھا تو اسی کی لڑکی کی ٹوپی ہے۔

اسنے لڑکے کو پکڑ لیا میرک کشبغا مصر کا کوتوال تھا۔ اسکے پاس لیگیا۔ اُس نے اس لڑکے کو خوب پیٹا۔ آخر اس نے اقبال کیا کہ میں نے اور میرے حبشی غلام نے دونوں نے ملکر اس لڑکی کو قتل کیا ہے۔ کوتوال ان کو ساتھ لیکر موقع واردات پر تحقیقات کو چلا۔ وہ دونوں اسی تاریک تہ خانے میں لے گئے۔ دیکھا تو وہاں لڑکی پڑی ہوئی ہے۔ لیکن زندہ ہے اور ہوش وحواس میں ہے۔ اسکا باپ اسکو اُٹھالایا۔ علاج کیا۔ چند دنوں کے بعد وہ بالکل اچھی ہوگئی۔

ہاں تو اب مشہور یہ ہے کہ اس لڑکی نے کہا کہ وہاں پڑے پڑے میں نے خواب دیکھا کہ ایک نورانی شکل کی بوی سفید لباس پہنے ہوئے میرے پاس آئیں۔ انہوں نے میرے چہرہ سے خون پونچھا۔ اور بہت دلاسا اور تسلی دلائی اور کہا کہ تو روتی نہیں۔ ہم آج ہی شام کو تجھے تیری ماں ہاں کے پاس بھجوا دینگے۔ اس سے مجھے تسلی ہوگئی۔ اور میں آرام سے لیٹی رہتی۔

اسلم جیراج پوری
مدرسۃ العلوم علی گڈھ

مستورات ہند کی حالت

قدرت ایسی کس سالی لی قسم کھا کر کہتی ہے کہ اسے عورت کو سب سے بہتر صورت میں خلق کیا ہے جب مرد نے میستی ست نکلکر ہستی میں قدم رکھا تو اُس وقت قدرت یک گونہ کام سیکھ رہی تھی مگر عورت کے خلق ہونے پر وہ کامل استاد ہو چکی تھی۔

"برنس"

مسٹر گلیڈسٹون سابق وزیر اعظم انگلستان بنی نوع انسان کے معیار تمدن و شائستگی پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں "اگر یہ دریافت کرنے کی خواہش ہو کہ فلاں قوم کے درمیان جو تصور فطرت انسانی کا مروج ہے وہ کس قدر وقیع ہے۔ تو اسکا بہترین طریقہ یہ ہے کہ دیکھو اُنکے یہاں مستورات کے ساتھ کس قسم کا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ وہ قانون قوت جسکے ذریعہ سے دوسروں کو اپنا مطیع و فرمانبردار بنالیا جاتا ہے وہ صرف انسانوں ہی میں نہیں بلکہ حیوانات میں بھی پایا جاتا ہے یہ قانون دراصل "بجبر" ہے جو انگریزی میں "لا آف فورس" کے نام سے مشہور ہے۔ پس جس نسبت سے وہ اس قانون کی پابندی کرتا ہے۔ وہ حیوانات کے طبقہ سے مشابہ ہوتا جاتا ہے۔ برعکس اسکے انسان جس قدر اس قانون کے اختیار سے نکل جاتا ہے اتنا ہی وہ ہستی کے اعلیٰ طبقے میں قدم رکھنے

لگتا ہی اور اسی تناسب سے قربت الٰہی کا دعویٰ بھی کرسکتا ہی" گویا کسی قوم کی ترقی و شائستگی کا معیار اسکے طبقہ نسواں کی حالت پر منحصر ہی اور افراد کی تہذیب اور روشن خیالی کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہی کہ وہ کس حد تک دوسروں کو زور و جبر سے اپنا تابع کرتے ہیں۔

جنھی اقوام میں عورت محض غلام یا خدمتگار سمجھی جاتی ہی۔ مرد ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا ہے مگر بیوی بچوں کی دیکھ بھال کے علاوہ تمام محنت و مشقت کے کام بھی انجام دیتی ہے۔ برعکس اسکے مہذب ممالک میں اُن کو تعلیم و تربیت دیجاتی ہے۔ اور وہ قابل عزت اور واجب الاحترام سمجھی جاتی ہیں۔

مستورات ہند کی حالت کچھ اور ہی ہی اُن کو مردوں کی بہ نسبت زیادہ نفیس پوشاک اور عمدہ خوراک دیجاتی ہی۔ ان کے شوہر حسب حیثیت انھیں فراخ دلی سے زیورات بھی پہناتے ہیں فرتے کے متعلق اُن کو کسی قسم کی شکایت نہیں۔ وہ اپنی حالت موجودہ میں خوش اور بشاش ہیں مگر ان کی یہ طمانیت اور قناعت ان کی جہالت کا لابدی نتیجہ ہی۔ مستورات کے باب میں بہت سے امور بیان کیے جاتے ہیں جن میں اصلاح کی اشد ضرورت محسوس ہوتی ہی!

جنوبی ہندوستان کا مشہور اخبار" ہندو" لکھتا ہی" ہمارے یہاں ایک ایسی بڑی خرابی نظر آتی ہی جو تمام اصلاحوں میں سدِ راہ ہی۔ اگر بہ طریق احسن اس کی بیخ کنی کر دیجائے تو ہماری قوم بلا روک ٹوک ترقی کے اعلیٰ مرتبے پر پہنچ جائیگی۔ اس بڑی خرابی سے ہماری مراد مستورات کی موجودہ حالت ہی۔

ہم اُن لوگوں سے اتفاق نہیں کرسکتے جو محض اپنی تجاویز کی اہمیت کو پبلک پر ظاہر کرنیکی غرض سے مجلسی خرابیوں کے بیان میں نہایت مبالغہ سے کام لیتے ہیں۔ یہ خیال کر لینا کہ مستورات ہند کی بھی وہی حالت ہی جو ممالک غیر میں ہی حب الوطنی کے نقطۂ خیال سے کوسوں دور اور سراسر نادانی ہی۔ ہم اس بات کو ماننے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہیں کہ ہمارے ملک کی مستورات میں اس قدر قابلیت موجود ہی کہ وہ قوم اور افراد قوم کی زندگی اور چال چلن پر کوئی

نمایاں اثر ڈال سکیں۔ یہاں کے قوانین شادی کی سختی و نامعقولیت۔ پردہ نشینی اور مستورات کی جہالت نے انہیں ایسا نکما اور ناکارہ بنا دیا ہے کہ اب ان میں افراد قوم کے چال چلن پر اعلیٰ اور پاکیزہ اثر ڈالنے کی صلاحیت بھی باقی نہیں رہی۔ اس کی صرف یہی وجہ ہی کہ وہ اپنے اعلیٰ اور ذاتی اختیار کو عمل میں لانے کے ناقابل بنا دی گئی ہیں۔ ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ قوم کی حیثیت نوجوانوں سے بنتی ہے اور نوجوان اسی شاہراہ پر چلتے ہیں۔ جن پر اُن کی مائیں انکو ڈالدیتی ہیں۔

اگر ہم چاہتے ہیں اور اس امر کی ضرورت محسوس ہوتی ہی کہ ہمارے ملک میں محبان وطن اور بہی خواہان ملک۔ بڑے بڑے بہادر اور شجاع۔ مدبّر اور دانائی کے پتلے پیدا ہوں تو مستورات کو ایک نئی قسم کی تربیت دینی چاہیے۔ اُن کے ساتھ کچھ اور ہی سلوک کیا جائے موجودہ پالیسی کو بالکل بدل دینا مناسب ہے۔ مستورات کو گھر کی چار دیواری کے اندر صرف چولھے کے لیے مختص نہ رکھو اور نہ پروہتوں کو اُنکے اخلاقی ناصح بناؤ شادی کے سخت اور نامعقول قوانین جنکے ہاتھوں اُن کی جوانی اور اُن کا اشباب برباد ہوتا ہی اُنہیں یک قلم موقوف کر دینا چاہیے۔ گویا اس بات کی ضرورت ہی کہ اعلیٰ اور پاکیزہ تعلیم سے اُن کے دل و دماغ زیادہ وسیع بنائے جائیں۔ آؤ ہم سب ان کی موجودہ ناگفتہ بہ حالت کو سُدھارنے کا تہیّہ کریں۔ ان کو زیادہ آزادی دیں اور اُن مشکلات کو دور کریں جو اُن کی ترقی میں حائل ہوتی ہیں ہمیں یہ امر ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ مستورات ہی قوم کی حیثیت کو اعلیٰ اور بلند بنانے والی ہیں۔[1]

کیا وہ لوگ "ہندوستان کے سچے دوست" کہے جا سکتے ہیں جو اس کی حالت کو مبالغہ آمیز لہجہ میں کمل اور خرابیوں سے مبرا بیان کرتے ہیں اور یہاں کی مذموم رسموں اور اندرونی قباحتوں کو مفید اور معقول ثابت کرنے میں مصنوعی اور نمائشی بہانے ڈھونڈھتے اور آسمان اور زمین کے قلابے ملاتے ہیں؟ نہیں۔ نہیں حقیقی بہی خواہانِ ملک وہی اصحاب ہیں

---

[1] دیکھو اخبار ہندو مطبوعہ ۲۸۔ ستمبر ۱۸۸۸ء

جو اپنی اصلاحی تجاویز کے ذریعے سے اپنے ملک کو شاہراہ ترقی پر ڈالنا چاہتے ہیں۔ مستورات ہند کے ساتھ جو جابرانہ سلوک کیا جاتا ہے اسکا بیان مسٹر ڈی۔ ای گی اس طرح کرتے ہیں۔

"ہم زمانہ قدیم سے باقاعدہ طور پر اپنی مستورات کو یہ تعلیم دیتے آئے ہیں کہ جب وہ اپنے تمام حقوق سے دست بردار ہو جاتی ہیں اور کسی قسم کے دعاوی پیش نہیں کرتیں بلکہ اپنے تئیں سرتاپا اپنے آقا، خداوند (شوہر) کے سپرد کر دیتی ہیں تو وہ نیک اور پاکیزہ خصلت معلوم ہوتی ہیں۔ ہر زمانہ اور ہر ملک میں مستورات کی ملایم اور اثر پذیر فطرت کا بہت برا استعمال ہوتا ہے آدمی اپنے خود غرضانہ مقاصد کے لیے انہیں ایسی تربیت دیتا آیا ہے کہ گویا اُن میں اب زندگی کا احساس ہی باقی نہیں رہا"

اب سوال ہو سکتا ہے کہ وہ کونسے وسائل ہیں جن پر عمل کرنے سے ہمارے ملک کی مستورات کی حالت بہتر ہو سکتی ہے؟ اسکے متعلق ہم چند تجاویز پیش کرتے ہیں۔

تعلیم نسواں کو رواج دینا چاہیے!

حیوان اور انسان میں ایک بیّن فرق یہ ہے کہ انسان کی فطرت میں وہ مادّہ ودیعت کیا گیا ہے جس سے وہ زیور علم سے آراستہ ہو سکتا ہے۔ مگر حیوان اس قوت سے فطرۃً بے بہرہ ہے کتا کیسا سمجھدار اور ہوشیار جانور ہے مگر وہ ایک حرف بھی نہیں سیکھ سکتا۔ برعکس اسکے ایک چند سال کا بچہ بشرطیکہ وہ صحیح الدماغ ہو بآسانی پڑھنا لکھنا سیکھ سکتا ہے۔ جو آدمی لکھنے پڑھنے کی قوت سے بہرہ یاب نہیں ہے وہ حیوان کے برابر ہے۔

زمانہ قدیم کی سنسکرت کتب میں مذکور ہے کہ گارگی بہت مشکل اور ادق سوالات پوچھا کرتی تھی یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ رشی یاگ بلک نے اپنی اہلیہ میتریٔ کو علم فلسفہ کی تحصیل کرائی تھی مگر ایسی مثالیں شاذ و نادر ہیں جنکو مستثنیات سے سمجھنا چاہیے۔ مہاراج منو کے زمانہ سے مستورات ہند عموماً ان پڑھ اور جاہل رہی ہیں۔

ہندوستان کی مستورات بہت سے اوصاف حمیدہ اور خصائل پسندیدہ سے مملو ہیں۔ ان کی وفا اور پارسائی کے ڈنکے چار دانگ عالم میں بج چکے ہیں۔ بچوں سے انہیں ایسی محبت اور شفقت ہوتی ہے کہ وہ اپنی جان پر کھیل جاتی ہیں مگر ان کا بال تک بیکا نہیں ہونے دیتیں انتظام خانہ داری کے معاملہ میں شاید ہی کوئی دوسری قوم ان کا مقابلہ کر سکے۔ غریبوں و بیکسوں پر وہ بیحد مہربان ہوتی ہیں۔ باوجود ان خوبیوں کے ان کی زنانہ فطرت اپنے اسقام و نقائص سے بالکل مبرا نہیں ہے۔ جس طرح اندھا اندھے کی رہبری نہیں کر سکتا۔ اسی طرح ایک ان پڑھ اور جاہل ماں اپنی اولاد کو نیک تعلیم و تربیت نہیں دے سکتی۔ خزائن علم کا ایک عظیم حصہ کتابوں ہی میں مقفل ہے ان ہی کے طفیل بہت سے اشخاص نہایت عقلمند اور مشہور ہوئے ہیں۔ بھلا جب مائیں لکھ پڑھ نہ سکینگی تو وہ دولت علم سے کیا خاک بہرہ یاب ہونگی۔

آدمی کے لیے سب سے بڑی برکت یہ ہے کہ وہ عمدہ تربیت یافتہ بچوں کا باپ بنے اگر بچوں کی تربیت بطریق احسن نہ ہوگی تو اس کی تمام زندگی تلخ ہو جائیگی۔ ان کا فرمانبردار۔ نیک۔ محنتی اور مودب ہونا ہی دنیوی برکت و شادمانی کا موجب ہے۔ اور بچوں کی ایسی تربیت کا مدار و دارو زیادہ تر اُن کی ماؤں پر موقوف ہے۔ کیونکہ وہ زمانہ بچپن میں زیادہ تر اپنی ماں کے پاس ہی رہتے ہیں۔ باپ اپنے دنیوی کاروبار میں مصروف رہنے کے باعث اُن سے بہت کم ملتا جلتا ہے۔ اسلیے وہ کوئی نمایاں اثر اپنی اولاد پر نہیں ڈال سکتا۔ سوج لینڈر صاحب کا قول ہے کہ "جیسی مائیں ہوتی ہیں ویسے ہی بچے بنتے ہیں۔ باپ خواہ کتنی ہی کوشش کرے مگر وہ بچے پر کچھ اثر نہیں ڈال سکتا۔ آہ! ماں کی اُن محبت بھری نگاہوں میں کیسا جادو نما اثر ہے جو اُس بچے پر ٹوٹی پڑتی ہیں جو گہوارے میں پڑا ہے" ہندوستان میں بھی عام طور پر کہا جاتا ہے جیسی ماں ویسا بچہ۔

جو ہدایت اور نصیحت بچے کو بچپن میں ملتی ہے وہ اُس کی آیندہ زندگی میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔ اوٹ وے صاحب نے لکھا ہے کہ "روح کی کنجی ماں باپ کے ہاتھ میں ہے۔ ماں ہی اُسکے

اخلاق پر نیکی اور سچائی کی مُہر لگاتی ہے اور وہی وحشی سے انسان بناتی ہے۔ مناسب ہے کہ عورت کو "ملکہ عالم" کا خطاب دیا جائے"۔ اگر تعلیم یافتہ باپ بچے کے لیے ایک برکت ہے تو تعلیم یافتہ ماں اُس سے کئی درجہ افضل نعمت ہے۔

مستورات کی جہالت اور حمق کا اثر انکے خاوندوں پر بھی کئی طریقوں سے پڑتا ہے بعض اوقات قابل شوہر کو ملک کے کسی دوسرے حصہ میں عمدہ آسامی ملتی ہے۔ مگر اُن پڑھ بیوی اُسے وہاں جانے سے محض اس بنا پر روکتی ہے کہ وہ کسی اجنبی شہر یا صوبہ میں جانے سے خوف کھاتی ہے۔ اگر شوہر کسی مفید کام میں روپیہ لگانا چاہتا ہے تو بیوی اڑ بیٹھتی ہے کہ "پہلے مجھے زیور بنوا دو۔ ایسے ویسے کاموں کے لیے تمہارے پاس روپیہ آجاتا ہے مگر میرے نام پر پھوٹی کوڑی بھی تم سے نہیں نکلتی"

کبھی کبھی زیورات کے مطالبہ میں مقابلہ سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ مثلاً بیوی کہتی ہے کہ "میری بہن مایا دیبی جب سے دولت رام کے گھر گئی ہے اُسکے میاں نے اُسے کتنا زیور بنوا دیا ہے۔ مجھے تو اب اس سے ملتے بھی شرم آتی ہے۔ جب تک تم بھی مجھے اتنا ہی زیور نہ بنوا دوگے میں چین نہیں لینے دونگی"۔

ایسے چھوٹے چھوٹے تفکرات اور رنج و غم جاہل عورت کے دل پر بہت بڑا اثر کرتے ہیں۔ وہ ہمیشہ ایسے ہی خیالات میں مستغرق رہتی ہے۔ اور انہیں وجوہ سے خاندانوں میں فساد اور ناچاقی پیدا ہو جاتی ہے۔ جو آخر میں بڑے بھاری دُکھ اور ابتری کا موجب ٹھہرتی ہے۔

بہت سے صاحب اصلاح تمدن میں عملی حصہ لینا چاہتے ہیں۔ مگر ان کی جاہل بیویاں مخالفت کرتی ہیں۔ مجبوراً انہیں اپنے ضمیر کے خلاف عمل کرنا پڑتا ہے۔ اگر عام طور پر مستورات تعلیم یافتہ ہوں تو وہ ضرور ملکی اصلاحوں میں حصہ لینگی اور تب یہ کام دس گُنا زیادہ عمدگی کیساتھ انجام پائیگا۔ ایک روشن ضمیر شخص جو تعلیم نسواں کے اعلیٰ مقصد کی ترقی و اشاعت کا تہیہ کیے ہوئے ہے۔ محض اس اندیشہ سے رُک جاتا ہے کہ بوڑھی عورتیں مخالفت کرینگی۔ جاہل مستورات کے

دل و دماغ میں فضول اور لغو تعصبات بھرے ہوئے ہیں۔ وہ دستور اور رواج کی اندھا دھند پیروی کرتی ہیں۔ جب وہ خود ہی ان پڑھ اور جاہل ہیں تو تعلیم نسواں کے فوائد کیا سمجھینگی۔ مرد کو خاندان کا سرمانا جاتا ہے۔ اگر ایسی جاہلانہ مخالفتوں کی وہ پروا کریں اور اپنے ارادوں کو ان سے مغلوب ہو جانے دیں تو اس سے زیادہ شرم اور افسوس کی بات کیا ہوگی؟

کبھی کبھی مردوں کی بے اعتنائی سے بھی بہت برے نتائج ظہور میں آتے ہیں۔ ایک تعلیم یافتہ کسی عورت نے کہا تھا "میرے لکھنے پڑھنے سے کیا فائدہ؟ سب لوگ مجھ پر ہنستے ہیں میرا شوہر بھی میری حوصلہ افزائی نہیں کرتا۔ غرضکہ میں سب کی نظروں سے گری ہوئی ہوں" کوشش کرنا چاہیے کہ ایسے اعتراضات پیدا نہو نے پائیں!

صغر سنی کی شادی بھی ایک رکاوٹ ہے جو تعلیم نسواں کی سد راہ ہے۔ ہندوستانی لڑکیاں پڑھنے لکھنے میں بہت ہوشیار ہوتی ہیں۔ اور تعلیم میں نمایاں ترقی کرتی ہیں لیکن جب ان کی تعلیمی ترقی کا وقت آتا ہے تو ان کی کہیں شادی ٹھہرادیجاتی ہے۔ بدیں وجہ مجبوراً انہیں مدرسہ کو خیرباد کہنا پڑتا ہے۔ اس سے صرف مطالعہ ہی بند نہیں ہو جاتا بلکہ تھوڑے عرصے کے بعد وہ آموختہ بھی بھول جاتا ہے۔ بچپن کی شادی کی وجہ سے ذہنی طور پر وہ تمام عمر "نادان بچہ" ہی رہتی ہیں۔ اگرچہ اب یہ تعداد گھٹ رہی ہے۔ مگر اب بھی تعلیم یافتہ صحاب کی بیویاں زیادہ تر تمام عمر ان پڑھ ہی رہتی ہیں۔

اگر عورت ضعیف العمر ہو یا کوئی اور خاص وجہ ہو تو خیر ورنہ ہر عورت کو کچھ نہ کچھ تعلیم دینا چاہیے۔ یہ کوئی عذر نہیں ہے کہ عورتیں پڑھنے لکھنے سے انکار کرتی ہیں۔ اصل وجہ یہ ہے کہ خاوند خود کچھ خیال نہیں کرتے۔ ان کا یہ فرض ہونا چاہیے کہ وہ اپنی عورتوں کو تعلیم دیں۔ اور تاوقتیکہ وہ لکھنے پڑھنے کے قابل نہ ہو جائیں۔ انہیں روزمرہ سبق دیا جائے۔ اسکے ساتھ ہی یہ بھی ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے کہ تعلیم کی قدر اس کی نوعیت پر منحصر ہے۔ قواعد حفظان صحت۔ مریض کی تیمار داری۔ بچوں کی تربیت اور پرورش۔ انتظام خانہ داری۔ یہ سب

ایسے ضروری مضامین ہیں کہ اگر ہر ایک عورت ان سے واقف ہو تو اُسکا گھر "خوشی و خرمی کا گھر" بنا رہے گا۔

بمبئی میں پارسیوں کے زنانہ مدارس کا آغاز اُن چند نوجوانوں کی کوشش سے ہوا تھا جو سٹوڈنٹس لٹریری و سائنٹفک سوسائٹی کے ممبر تھے۔ جب اُن کے دل میں اس خیال نے گھر کر لیا کہ "زبانی جمع خرچ تو کافی سے زیادہ ہو چکا ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ عملی کارروائی کیجائے" تو انجمن مذکور کے ممبروں نے بخوشی بلامعاوضہ اُستاد بننا منظور کیا اور بعض نے اپنے اپنے گھروں کے کمرے میں عارضی مدرسے قائم کر دیے۔ اور اس خیال سے کہ آنریری اُستادوں کے روزانہ فرائض کی انجام دہی اور معمولی کاروبار میں خلل واقع نہو تعلیم کا وقت صبح مقرر کیا گیا۔ چھ ماہ بعد یہی کام باقاعدہ شروع ہوا اور ضرورت کے موافق اُستاد ملازم رکھے گئے۔

جب تک مستورات ہند جاہل و ران پڑھ رہینگی ملک کی نصف دماغی قوت ضائع ہوتی رہیگی۔ یہ اُس چوپہیہ گاڑی کی مثال ہے جس میں ایک ہی گھوڑا جوتا گیا ہو۔ عورتوں کو تعلیم نہ دینے سے صرف یہی قباحت واقع نہیں ہوتی بلکہ جیسا کہ ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں وہ ملکی ترقی اور اصلاح کے کام میں بھی بہت سی مشکلات پیدا کر دیتی ہیں۔ لہذا ہر روشنضمیر شخص کا یہ فرض ہونا چاہیے کہ وہ تعلیم نسواں میں عملی حصہ لے۔ ایک مشہور فرانسیسی عالم کہتا ہے "لڑکے کو پڑھانے سے ایک فرد واحد تعلیم یافتہ ہوتا ہے مگر لڑکی کے تعلیم دینے سے ایک خاندان تعلیم حاصل کرتا ہے!"

۲۔ صغرسنی کی شادیوں کو موقوف کرنا چاہیے!

تقریباً دنیا کے تمام ممالک میں یہ دستور ہے کہ جب تک آدمی خود کھانے کمانے کے قابل نہیں ہو جاتا اور اپنی بیوی کی پرورش اور دیگر ضروری اخراجات کے متحمل ہونے کی مقدرت حاصل نہیں کر لیتا۔ اسوقت تک شادی نہیں کرتا۔

برعکس اسکے ہندوستان میں بچوں ہی کی شادی کر دیجاتی ہے شادی کی پہلی رسم تو "سگائی" کہلاتی ہے۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد دوسری رسم ادا ہوتی ہے جسکو نکاح کا درجہ حاصل ہے اس رسم کے بعد اگر لڑکا فوت ہوجائے تو کم عمر بیوی تمام عمر کے لیے بیوہ ہوجاتی ہے۔ شادی کی عمر ملک کے مختلف حصوں اور ذاتوں میں مختلف ہے۔ بعض فرقے معصوم بچوں ہی کی شادیاں کر دیتے ہیں۔ گذشتہ مردم شماری کی رپورٹ سے واضح ہوتا ہے کہ بنگال میں ایک سالہ شادی شدہ لڑکیوں کی تعداد ۳۹۰۱ تھی۔ اور ایک برس کی عمر کی بیوہ لڑکیوں کا شمار ۵۳۰ تھا۔

صغرسنی کی شادیوں کا رواج قدیم زمانے میں رائج نہیں تھا۔ رام چندر جی نے سیتا جی سے، مہاراج کرشن نے رکمنی جی سے، ارجن نے دروپدی سے اور راجہ نل نے دمینتی سے شادی کی اور یہ سب شادیاں جوانی کی عمر کو پہنچنے کے بعد ہوئی تھیں۔ قانون تعزیرات ہند نے سن استرضا، دس برس کی عمر قرار دی تھی۔ مگر اس سے بہت سے ہولناک حادثے پیش آئے ہیں۔ اور بہت سی کمسن بیویاں اپنی جان کھو بیٹھی ہیں۔ لارڈ لینڈ ڈاؤن کے عہد حکومت میں دو برس اور بڑھائے گئے اور دس کے بجائے بارہ برس کی عمر قرار دیگئی۔ مندرجۂ ذیل وجوہ کے باعث صغرسنی کی شادی کی رسم قابل ترک ہے۔

الف۔ صغرسنی کی شادی سے کمزور اور سست بچے پیدا ہوتے ہیں۔ اس امر سے ہر ایک کاشتکار واقف ہے کہ اگر بچھڑے کو ہل میں جوت دیا جائے تو وہ کبھی مضبوط و قوی نہ ہوگا۔ یہی حال مستورات کا ہے۔ اگر چھوٹی عمر میں وہ مائیں بن جائیں تو انکے جسم کو بہت بڑا نقصان پہنچیگا۔ وہ قبل از وقت ضعیف ہوجائینگی۔ صغرسنی کی شادی کے بعد جو اولاد ہوتی ہے وہ بہت دُبلی پتلی اور کمزور ہوتی ہے۔ اور اُسکا نصف سے زائد حصہ حالت طفلی ہی میں عدم کو روانہ ہوجاتا ہے۔

ب صغرسنی کی شادی حارج تعلیم اور ذہنی کمزوری کی موجب ہے۔ پیشتر ذکر ہوچکا ہے کہ

صغر سنی کی شادی سے جس طرح بیوی کے دماغی قوا کو ضعف پہنچتا ہے۔ ایسا ہی اثر خاوند پر بھی ہوتا ہے۔ ایک مجرد طالبعلم اپنا تمام وقت تحصیل علم میں صرف کرتا ہے مگر شادی شدہ طالب علم کو اپنا کچھ نہ کچھ وقت بیوی اور بچوں کی نذر بھی کرنا پڑتا ہے۔ گھر کی چھوٹی چھوٹی باتیں اُسے اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہیں۔ زیور کی فرمایش بھی اُس سے کیجاتی ہے۔ بعض اوقات خانگی منازعات میں بھی اُسے اُلجھا دیا جاتا ہے۔ مجبوراً وہ پڑھنے کے بجائے معمولی نوکری قبول کر لیتا ہے۔ حالانکہ اگر وہ تحصیل علم میں لگا رہتا تو کسی اعلیٰ آسامی پر فائز ہو کر شہرت حاصل کرتا۔ نوعمر خاوند کے جسم پر بھی متاہلی کا بہت اثر پڑتا ہے۔ ایک انسپکٹر مدارس کا خیال ہے کہ "صغر سنی کی شادی کے باعث طلبا کی جسمانی طاقت سترہ برس کی عمر تک پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہو جاتی ہے اسکے بعد اُن میں وہ مستعدی اور تیزی طبع پھر نظر نہیں آتی"۔

ج نا تجربہ کار اور نوعمر ماں اپنے بچوں کی تربیت نہیں کر سکتی! بچوں کی خاطر خواہ اور عمدہ تربیت کرنا کوئی کھیل نہیں ہے۔ بچے کو لاڈ پیار سے بگڑنے سے بچانے میں بڑی احتیاط اور دانائی کی ضرورت ہے۔ لیکن جو ماں خود ہی سن بلوغ کو نہ پہنچی ہو وہ اس اہم فرائض کو کب انجام دسکتی ہے؟ شاید یہ کہا جائے کہ نوعمر بیوی کی ساس بچے کی تربیت کریگی۔ مگر اول تو بچے پر ماں کا سب سے زیادہ اثر پڑتا ہے۔ دوئم جب ساس بھی جاہل اور اَن پڑھ ہے تو بچے کی تربیت معلوم!

د صغر سنی کی شادی خلاف انصاف ہے! بچوں کے بھی طبعی حقوق ہوتے ہیں جن سے کوئی باپ اُن کو محروم نہیں کر سکتا ہے۔ ان کی مرضی کے خلاف ان کو تمام عمر کے لیے کسی معاہدہ کا پابند بنا دینا بعید از انصاف ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جو دستور انصاف کے خلاف ہے وہ درحقیقت بُرا دستور ہے۔ لہذا تاوقتیکہ اولاد بالغ نہ ہو جائے اُسے شادی کی زنجیروں میں نہیں جکڑ دینا چاہیے۔

ر ہندوستان میں بیوہ عورتوں کی تعداد بہت ہی زیادہ ہے اور اس کی ایک بڑی

۔ جہ صغرسنی کی شادی ہے جس قدر بچے پیدا ہوتے ہیں ان کی ایک تہائی پانچ برس کی عمر کو پہنچنے سے پیشتر ہی مرجاتی ہے۔ اور باقی میں نصف سے زائد نوجوانی کی حالت میں روانۂ عدم ہو جاتے ہیں۔ اگر کمسن لڑکیوں کی شادی کر دیجائے تو یہ ممکن ہے کہ ان کے خاوند سن بلوغ کو پہنچنے سے پیشتر ہی چلتے بنیں گے اور بدنصیب لڑکیاں تمام عمر بیوہ رہیں گی۔

س صغرسنی کی شادی باعث افلاس ہے! دوسرے ممالک میں شادی کا خیال نوجوانوں کو بڑی محنت وتندہی سے کام کرنے کی تحریک کرتا ہے۔ مگر ہمارے ملک میں اسکے خلاف نظر آتا ہے۔ حالت تجرید میں تو کسی قدر محنت و توجہ سے کام لیا جاتا ہے اور کامیابی کی صورت بھی نظر آنے لگتی ہے۔ مگر متاہل آدمی کو گھر بار کے تفکرات کامل توجہ کے ساتھ کام کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔

ش۔ صغرسنی کی شادی قومی تنزل کا موجب ہے۔ ڈاکٹر پی۔ جی۔ فلپ سن نے ہندو کو ایڈرس کرتے وقت کہا تھا۔

صدیوں سے آپ لوگ بچوں کے بچے ہوتے چلے آئے ہیں اور خادموں کے خادم بننے کا اس سے عمدہ اور یقینی کوئی دوسرا طریقہ نہیں ہے''

مسز ڈاکٹر فسل فرماتی ہیں کہ "صغرسنی کی شادیوں کے رواج کے باعث ہندوستان کی ذہین اور طباع نسلیں پست ہوگئی ہیں۔ وہ اپنی اصلی حیثیت سے گر کر خارجی قوتوں کی مطیع و فرماں بردار بنگئی ہیں۔ وہ اس قوم کی محکوم ہوگئی ہیں جو جسمانی قوت میں اُن سے بدرجہا زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دیگر اقوام کے درمیان ہندوستان "کمتر" شمار کیا جاتا ہے۔ جب تک صغرسنی کی شادی کی زبون اور مذموم رسم جاری رہیگی اور مستورات کو غلامی کی حالت اور جہالت میں رکھا جائے گا۔ قوم زیادہ پست اور ذلیل ہوتی جائیگی۔ جب تک مائیں کمزور اور ناتوان رہیں گی اور اپنے بچوں کو اصلی طاقت وجان نہ دے سکیں گی۔ ہندوستان میں ایسے کمزور اور ناکارہ بچے پیدا ہوتے رہیں گے جو بہادری اور محنت کشی کی طاقت سے

محروم ہو گئے اور اس طرح قوم ضعیف اور دوسروں کی دست نگر بنی رہے گی،،

خوشی کی بات ہی کہ تعلیم یافتہ طبقے میں صغرسنی کی شادی کے برخلاف جوش پیدا ہو چلا ہی۔ راجپوتوں نے بہت اچھا نمونہ قایم کیا ہی کہ شادی کی عمر اٹھارہ اور چودہ برس مقرر کر دی ہی۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں نے بھی اس تجویز پر عملدرآمد شروع کیا ہی کہ لڑکا جبتک کالج کی تعلیم سے فارغ نہ ہولے شادی ملتوی رہے۔ اگر عام طور پر لڑکوں کی شادی اُس وقت تک موقوف رہی جائے جب تک کہ وہ بالغ نہ ہو جائیں تو بہت اچھا ہو اس سے وہ اس قابل ہو جائیں گے کہ کامل توجہ کے ساتھ اپنے کاروبار اور فرائض منصبی کو انجام دیسکیں!

شاکر

(از ادیب)

بقیہ شاہ لیر

سین نمبر ۳

جنگل کی ایک طرف کو۔ ایڈگر اسٹیج پر آتا ہے

ایڈگر۔ میرا تو اشتہار بھی ہو چکا ہے۔ اس وقت تو خوش قسمتی سے کھوکھلے درخت میں چھپکر جان بچی۔ اب غضب تو یہ ہی کہ کوئی بندرگاہ بھی میرے لیے محفوظ نہیں ہی کہ جہاں میں جا سکوں اور کوئی جگہ ایسی نہیں کہ جہاں پر پہرہ نہ کھڑا ہو اور میری گرفتاری کے لیے غیر معمولی ہوشیاری نہ برتی جاتی ہو۔ خیر جبتک ہو سکیگا میں اپنی جان تو بچاؤنگا۔ اب مجھے مناسب معلوم ہوتا ہی کہ نہایت ذلیل اور خبیث گندہ قابل نفرت لباس جو افلاس زدہ لوگ پہن لیتے ہیں اور جو انسانوں کے دائرے سے نکل کر مثل حیوانوں کے نظر آتے ہیں۔ میں بھی پہن لوں۔ میں اپنا چہرہ گندگی سے لیپ لونگا۔ اپنی کمر کے گرد کمبل لپیٹ لونگا۔ اپنے بالوں کو گرہ دار جٹیں بنا کر چھوڑ دونگا اور برہنہ ہو کر سرد ہوا اور برف اور مینھ کی سختیاں جھیلونگا۔ ایسی حالت کے

لوگوں سے ملک کے لوگ ناآشنا بھی نہیں ہیں کیونکہ اس وقت بہت سے چُھری مار فقیر ملک میں پھر رہے ہیں اور چیخیں مار مار کے اپنے برہنہ بازوؤں میں جو بالکل سُن ہو جاتے ہیں سوئیاں اور سلیں اور کانٹے چبھوتے ہیں اور اس قسم کے وحشیانہ کرتب کر کے غریب دیہاتیوں اور گڈریوں اور چکی والوں سے بعض وقت دیوانہ وار کوس کر اور بعض وقت دعائیں مانگ مانگ کر بھیک کا ٹکڑا حاصل کرتے ہیں۔ یہ مصیبت زدہ فقیر کم از کم کچھ تو ہستی رکھتے ہیں۔ لیکن غریب ایڈگر تو کچھ بھی نہ رہا۔

سین نمبر ۴

گلاسٹر کے قلعہ کے سامنے کینٹ کاٹھ میں مقید نظر آتا ہے

شاہ لیر اور دیوانہ اور مصاحبین اسٹیج پر آتے ہیں

شاہ لیر۔ ایک تعجب کی بات ہے کہ میری بیٹی اور داماد اس طور سے اپنے گھر سے چلے گئے اور میرے آدمی کو بھی واپس نہ بھیجا۔

ایک مصاحب۔ صاحب مجھے تحقیق معلوم ہوا ہے کہ اپنی روانگی سے تھوڑے عرصہ قبل تک آپ کی صاحبزادی اور داماد کا کہیں جانے کا ارادہ نہ تھا۔

کینٹ۔ حضور میرے معزز آقا تشریف لائے ہیں آپ کا خیر مقدم کرتا ہوں۔

لیر۔ کیوں یہ کیا حال ہے کیا تو اپنی اس ذلت کو کھیل بنا رہا ہے۔

کینٹ۔ نہیں حضور۔

دیوانہ۔ ہا ہا کیا خوب آپ کسی تنگ پہنے ہوئے ہیں۔ گھوڑوں کو لوگ سر سے باندھتے ہیں۔ کتوں کو اور ریچھوں کو گردن سے بندروں کو کمر سے اور آدمیوں کو ٹانگوں سے جب آدمی اپنی ٹانگوں سے بہت کام لینے لگتے ہیں تو لوگ اُن کی ٹانگوں میں لکڑی کی جرابیں پہنا دیتے ہیں۔

لیر۔ وہ کون صاحب ہیں جنہوں نے تمہارے مرتبہ کا غلط اندازہ کیا ہے اور اس طرح سے

تم کو یہاں قید کیا ہی۔
کینٹ حضور یہ وہی دونوں ہیں۔ آپ کی صاحبزادی اور داماد نے کیا ہے۔
لیر۔ نہیں نہیں۔
کینٹ۔ ہاں ہاں۔
لیر۔ نہیں ہرگز نہیں۔
کینٹ۔ ہاں ہاں ضرور ہی ضرور ہے۔
لیر۔ نہیں نہیں وہ ایسا کر نہیں سکتے۔
کینٹ۔ ہاں ہاں اُنہوں نے کر دکھایا ہے۔
لیر۔ نہیں خدا کی قسم ہی ایسا نہیں ہوا۔
کینٹ۔ میں قسم کھاتا ہوں ایسا ہی ہوا ہے۔
لیر۔ اُن کی مجال نہ تھی کہ وہ ایسا کرتے۔ وہ کر نہیں سکتے۔ اُنہوں نے کیا ہی نہیں ہوگا۔ ارے اس قدر بیجا سختی تو قتل سے بھی بدتر ہے۔ اب تم جلدی سے بتاؤ کہ اس کی اصلیت کیا ہی۔ آیا تم نے کچھ قصور کیا ہی یا محض اس وجہ سے یہ مصیبت آئی کہ تم میرے قاصد ہو
کینٹ حضور جب آپ کا خط لیکر میں اُن کے پاس پہنچا تو وہ اپنے مکان پر موجود تھے میں خط اُن کے حوالہ کر کے جُھک کر سلام کر رہا تھا اور ابھی سلام کر کے ہٹا بھی نہ تھا کہ ایک آدمی گھوڑے پر سوار ہانپتا ہوا پسینہ میں لت پت مارے جلدی کے سانس پھولا ہوا گانرل کی طرف سے پہنچا اور سلام کے بعد خطوط پیش کیے جو اُنہوں نے جلدی سے پڑھ لیے اور اسکے پڑھتے ہی فوراً روانگی کی تیاری کر لی اور گھوڑے منگا کر روانہ ہو گئے۔ چلتے وقت مجھے حکم دیا کہ میں بھی انکے ساتھ ساتھ ہو لوں۔ جب تک حضور کے خط کا جواب نہ ملے انہیں کے ساتھ رہوں۔ میں نے دیکھا کہ اُن کی آنکھوں سے سرد مہری ٹپک رہی تھی۔ اور جب میں یہاں پہنچا تو گانرل کا قاصد بھی آ موجود ہوا۔ یہ قاصد وہی شخص تھا کہ کچھ دن ہوئے

اس نے حضور کی خدمت میں گستاخی کی تھی اور چونکہ مجکو یقین ہو گیا تھا کہ اسی کے آنے کی وجہ سے میری آؤ بھگت میں کمی ہوئی تھی تو جوش میں آکر میں نے اسکے اوپر تلوار کھینچ لی۔ اس شخص نے بزدلی سے شور مچانا شروع کیا اور تمام گھر کو سر پر اُٹھایا حضور کی صاحبزادی اور داماد کو میری بات بری معلوم ہوئی اور میرا یہ درجہ کیا جسکو حضور دیکھ رہے ہیں۔

دیوانہ اگر قازیں جنوب کی جانب کو اُڑ رہی ہیں تو معلوم ہوا کہ ابھی جاڑا ختم نہیں ہوا جنکے باپ چیتھڑے پوش ہیں تو اولاد اندھی ہو جاتی ہے اور والد کو پہچانتی ہی نہیں لیکن جو والد روپیوں کی تھیلیاں رکھتے ہیں اُن کی اولاد مہربانی سے پیش آتی ہے۔ دولت ایک غیر مستقل کُتیا ہے جو کبھی غریبوں کی طرف توجہ ہی نہیں کرتی۔ لیکن باوجود اسکے روپیوں کے بجائے تمہارے دل پر زخموں کی اتنی دولت رسیگی کہ تم گِن بھی نہیں سکو گے۔

لیر ہائے ہائے رنج کا غبار کس قدر زور سے اُڈا چلا آتا ہے۔ او کمبخت رنج کے دریا تو اس قدر طغیانی میں مت آ۔ اور کچھ دیر تو بیٹھا رہ۔ بتاؤ بھئی میری بیٹی صاحبہ کہاں ہیں۔

کینٹ۔ صاحب وہ شہزادہ گلاسٹر کے پاس اس قلعہ کے اندر موجود ہیں۔

لیر۔ میرے پیچھے کوئی مت آنا سب یہیں ٹھہرے رہو۔ (چلا جاتا ہے)

ایک مصاحب (کینٹ سے)، کیا تم نے سوائے اسکے اور کوئی جرم نہیں کیا جو ابھی تم نے بیان کیا ہے۔

کینٹ نہیں۔ کیا وجہ ہوئی کہ بادشاہ سلامت اتنے تھوڑے سے آدمیوں کو ہمراہ لیکر آئے ہیں۔

دیوانہ۔ بہت مناسب ہوتا کہ اس سوال کے لیے تم کو قید کی سزا دیجاتی۔

کینٹ۔ کیوں بھائی دیوانہ۔

دیوانہ۔ ہم تمہیں چیونٹی کے مدرسہ میں داخل کرینگے تاکہ وہ تم کو یہ سبق سکھائے کہ جاڑے کے موسم میں محنت مشقت نہیں کیجاتی۔ جب کوئی بھاری چیز پہاڑ سے لُڑھک رہی ہو اسکو روکنے

کی سعی کوشش کرو مبادا اسکے ساتھ لٹک کر تمہاری گردن نہ ٹوٹ جائے اور اگر کوئی بڑا آدمی اُبھرا ہو تو تم اسکے ساتھ ہو لو کہ تم کو بھی اوپر کھینچ لیجائے۔ اب اگر تم کو کوئی اس سے بہتر مشورہ دے تو مہربانی سے میرا مشورہ واپس دیدینا کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ کوئی سوائے کسی شیطان کے اس نصیحت پر عمل کرے کیونکہ یہ ایک دیوانہ کی طرف سے دی گئی ہے۔ حضرت جو لوگ فائدہ کے لیے ملازمت کرتے ہیں اور ظاہرداری سے تمہارے پیچھے پیچھے لگے رہتے ہیں جب بارش شروع ہو جائے گی تو بستر و ستر باندھکر تم کو آندھی اور مینہ میں چھوڑ کر چلدینگے۔ لیکن میں تو ٹھہروں ہی گا کیونکہ دیوانہ سوائے ٹھہرنے کے اور کیا کر سکتا ہے۔ عقلمند آدمیوں کا دل چاہے تو وہ بھاگ جائیں۔ وہ بدمعاش جو بھاگے اُسے دیوانہ سمجھو۔ خدا کے فضل سے میں دیوانہ تو ہوں مگر بدمعاش نہیں ہوں۔

کینٹ۔ دیوانے۔ تونے یہ باتیں کہاں سے سیکھی ہیں۔

دیوانہ۔ قید میں نہیں سیکھی ہیں۔

(باقی آیندہ)

اڈیٹوریل

الگزینڈرا ہائی اسکول کا ایک جلسہ حضور عالیہ بیگم صاحبہ بھوپال کی سالگرہ کی تقریب میں منعقد ہوا تھا۔ اس جلسہ میں جاگیرداران ریاست کی ایک بڑی تعداد اور اکثر طلبائے شہر اور انکے سرپرست شریک تھے۔ ہرہائنس صدر انجمن تھیں۔ پہلے مسٹر پین اسکول مذکور کے پرنسپل نے ایک تقریر کی۔ جس میں اہل مدرسہ کی طرف سے سالگرہ کی مبارکباد دی۔ پھر طلبا اور اُن کے سرپرستوں کے فرائض کے متعلق کچھ ہدایتیں فرمائیں۔ اسکے جواب میں ہرہائنس نے یہ تقریر فرمائی جسکے اس نمبر میں درج کرنے کا ہم کو فخر حاصل ہوا۔

اس تقریر کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف سے حضور عالیہ کی علمی دلچسپی اور

روشن دماغی کا ثبوت ملتا ہی۔ اس تقریر سے یہ معلوم ہوتا ہی کہ حضور عالیہ نے مسلمانوں کی تعلیم اور طریقہ تعلیم کے متعلق بہت غور کیا ہی۔

ہرہائنس نے طلبا کی اخلاقی نشو و نما مذہبی تعلیم اور سوشیل تربیت پر بہت زور دیا ہی۔ اور درحقیقت یہی امور ہیں جن کی طرف سے لاپروائی برتنے سے ابتک یونیورسٹی کی تعلیم زیادہ مفید نہیں ثابت ہوئی اور ان میں سے ایسے آدمی بہت کم نکل سکے جو تعلیم یافتہ انسان کا صحیح نمونہ کہے جاسکیں۔

بھوپال کے لوگ زمانہ دراز سے تعلیم سے غافل رہے ہیں۔ وہاں کے لوگوں کا آبائی پیشہ فن سپہگری رہا ہے۔ اور اگرچہ ان میں اسلامی سادگی اور مذہب کی عظمت اور پابندی سب صفات حسنہ ابتک موجود ہیں۔ لیکن تعلیم نہ حاصل کرنے کے باعث اولوالعزمی، بے تعصبی اور سوشل میل جول کی وسعت ان کے دماغوں میں بہت کم رہگئی ہے۔ ہرہائنس کی ان مربیانہ کوششوں سے امید ہی کہ اہل بھوپال کے دل و دماغ میں روشندلی پیدا ہوجائیگی اور تعلیم و تربیت کی برکتوں سے وہ مالامال ہوجائینگے۔

ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالی ہرہائنس بیگم صاحبہ جیسی روشندل اور مہربان حکمران کے اقبال اور عمر کو بڑہائے اور عرصہ دراز تک وہ اپنی خوش قسمت رعایا کے سرپر سایہ فگن رہیں۔ اور اہل بھوپال حضور عالیہ کے دامن عاطفت میں علمی اور عملی ہر قسم کی ترقی کریں۔

ادیب

اردو زبان میں ملک میں آجکل بہت سے رسالے نکل رہے ہیں۔ لیکن ان سب رسالوں میں سے بہت کم ایسے ہیں جو مفید ہوں اور کام کے ہوں۔

کوئی رسالہ نکلے اسکے لیے یہ لازم ہے کہ کسی خاص مقصد اور غرض یا کسی ضرورت کا پورا کرنے والا ہو۔ لیکن ہمارے ملک میں بہت سے رسالے محض اس غرض سے نکل رہے ہیں کہ

اڈیٹر صاحب کے پاس اور کوئی ذریعہ معاشس نہیں ہے۔ بہت سے ایسے لوگ ہیں کہ جنکے پاس اپنے ضروری کاموں سے کچھ وقت بچتا ہے اس میں وہ کوئی رسالہ نکال بیٹھتے ہیں کہ شغل بیکاری ہی سہی۔ اور یہی وجہ ہے کہ اکثر رسالے وقت پر نہیں نکلتے۔ ایک ایک دو دو مہینے لیٹ ہوجاتے ہیں۔ کبھی کبھی کچھ مدت کے لیے بند ہوجاتے ہیں اور پھر نکل آتے ہیں۔ حالانکہ ایک بڑے اخبار نویس کی یہ رائے ہے کہ اگر رسالہ یا اخبار وقت پر نہ نکل سکے تو تو اُسکا بند کردینا بہتر ہے۔

اُردو زبان کے رسالوں کی ابتدا کبھی ہوئی ہو لیکن اس کی گرم بزاری رسالہ **مخزن** کی بدولت ہوئی۔ اس نے ملک میں اُردو کا مذاق پیدا کیا۔ تعلیم یافتہ فرقے کو اس سے دلچسپی پیدا کرائی اس کی کوشش ملک کے ہر حصے میں مشکور ہوئی۔ اور قبولیت کی نظر سے دیکھی گئی اسی کی دیکھا دیکھی اردو زبان کے رسالے حشرات الارض کی طرح نکلنے شروع ہوئے۔ مگر اسے فوقیت لیجانا کیا معنی اس کی تقلید بھی چند رسالوں کے سوا اور کسی سے نہو سکی۔ لیکن مخزن نے جو کام شروع کیا تھا اب اسکو ایک مدت گذر گئی۔ ملک کا مذاق اس حد سے بہت زیادہ ترقی کر گیا۔

اب ایک نئے رسالہ کی ضرورت محسوس ہورہی تھی جو اس ترقی یافتہ جماعت کی پیاس بجھائے۔ اسی غرض کو پورا کرنے کے لیے جنوری ۱۹۱۰ء سے الہ آباد سے رسالہ **ادیب** ماہوار اُردو زبان میں نکلنا شروع ہوا ہے۔ اسکے اڈیٹر منشی نوبت رائے صاحب نظر لکھنوی ہیں جو اپنے مقبول عام مضامین کی وجہ سے اُردو داں اصحاب میں مشہور و معروف ہیں اور کسی مزید تعارف کی ضرورت نہیں ہے۔

اس رسالہ کا پہلا نمبر ہمارے پاس بغرض ریویو آیا ہے بڑی تقطیع پر ۹۰ صفحے کا رسالہ ہے۔ کاغذ نہایت عمدہ لگایا گیا ہے۔ چھپائی لکھائی اور سب ضروری چیز تصحیح کا یہ رسالہ بہترین نمونہ ہے۔

اسکے ساتھ ہی اس میں چھ تصویریں بھی شامل کی گئی ہیں جن میں سے ایک رنگین ہے جس سے رسالہ کی وقعت دوبالا ہو جاتی ہے۔ ہندوستانیوں کے ہاتھ میں جس قدر پریس ہیں ان میں انڈین پریس الہ آباد عمدہ تصویروں کے چھاپنے میں خصوصیت رکھتا ہے۔ یہ رسالہ انڈین پریس ہی سے نکلتا ہے اور وہیں تصویریں چھاپی گئی ہیں۔

ان سب خوبیوں کے ساتھ اس رسالہ کی سالانہ قیمت چار روپے رکھی گئی ہے۔ جسکے لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس سے زیادہ سستا ہندوستان میں کوئی دوسرا رسالہ اُردو زبان کا نہیں ہے۔

اس رسالہ کی خصوصیات میں سے یہ بھی ہو کہ ایک ایسا ادب کا چمن تیار کرنا چاہتا ہے جو مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے یکساں مفید ہو۔ اور وعدہ کیا گیا ہے کہ اس رسالہ میں جو مضامین چھاپے جائینگے ان میں یہ احتیاط کیجائیگی اور اس بات کا نہایت خیال رکھا جائیگا کہ وہ عورتوں کے لیے بھی مفید اور خوشگوار ہوں۔

ہم اس خصوصیت سے نہایت ہی خوش ہیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ اب ہندوستان کی حقیقی ترقی کا زمانہ آن پہنچا ہے۔ کیونکہ ملک کے علمی رسالوں میں عورتوں کا خیال رکھا جانے لگا اور وہ فرقہ جو کہ علم سے ابتک بہت دور پڑا تھا اب اسکو بھی ان علمی محفلوں میں شریک ہونے کی دعوت دیجانے لگی۔ اور یہی ملکی اور قومی ترقی کی نیک فال ہے۔ خاتون کے اس نمبر میں مستورات ہند کی حالت کے عنوان سے جو مضمون درج کیا گیا ہے وہ اسی رسالہ سے منقول ہے۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ اس ناگوارکمی کو جو اُردو رسالوں میں ابتک ہے کہ وہ تصویریں نہیں شائع کرتے جو علم ادب کی ایک نہایت ضروری شاخ ہے، پورا کرے گا اور زیادہ تر ملکی صناعوں کے قلم کے نکلے ہوئے نمونے پیش کریگا۔ پالٹیکس اور مذہبی جھگڑوں سے بالکل الگ تھلگ رہے گا۔ جس سے امید ہو کہ اس رسالہ کو مقبولیت عام حاصل ہوسکیگی ہم اپنے اس نئے ہمعصر کا نہایت خوشی سے خیر مقدم کرتے ہیں۔ اور دعا کرتے ہیں کہ وہ

وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہو۔

ملنے کا پتہ۔ منیجر رسالہ ادیب انڈین پریس الہ آباد

دائیوں کی انجمن ممالک یورپ میں دائیوں کا کام تعلیم اور تربیت یافتہ عورتیں کرتی ہیں جو جرّاحی اور طب میں خاصی مہارت رکھتی ہیں۔ لیکن ہندوستان میں یہ کام جاہل عورتوں کے سپرد ہے۔ جن کی جہالت کی وجہ سے سیکڑوں عورتوں اور بچوں کی جانیں ہر سال ضائع جاتی ہیں۔ ہندوستان میں قابل اور تعلیم یافتہ دائیوں کو زیادہ تعداد میں بہم پہنچانے کے لیے دسمبر میں سپرنٹنڈنٹوں کی نرسنگ ایسوسی ایشن نے بمبئی میں ایک کانفرنس منعقد کرکے مندرجہ ذیل تجاویز پاس کی ہیں۔

(۱) ہر صوبے میں دائیوں کی ایک انجمن کھولی جائے جو دائیوں کے تعلیم کا انتظام کرے۔

(۲) جملہ اسپتالوں میں جہاں یورپین اور دیسی دائیوں کی تعلیم ہوتی ہے۔ قابل دائیاں ملازم رکھی جائیں۔ جو تعلیم دیا کریں۔

(۳) ہر صوبے میں دائیوں کی تعلیم کے لیے ایک سنٹرل اسکول کھولا جائے۔

ان تجاویز کی عملی صورت میں آنے سے ملک کو بیحد فائدہ ہوگا۔ لیکن ان اسکولوں کی دائیاں جہاں قابل ہونگی وہاں ان کی فیس بھی زیادہ ہوگی۔ جسکے باعث غریب لوگ ان کی خدمتوں سے فائدہ نہیں اُٹھا سکینگے۔

اسلیے دائیوں کے ایسے مدرسے ہونے چاہییں جیساکہ دہلی میں حاذق الملک حکیم محمد اجمل خانصاحب کے زیر اہتمام کھولا گیا ہے۔ اس قسم کے مدرسے ملک میں جابجا کھولے جائیں۔ اور گورنمنٹ سے اسکے لیے امداد حاصل کیجائے۔

روس میں زنانہ مدرسہ۔ اخبار وقت لکھتا ہے کہ شہر باکو میں حاجی زین العابدین کی اہلیہ نے ایک زنانہ مدرسہ کھولا ہے۔ جس میں ۹۰ لڑکیاں بالفعل تعلیم پا رہی ہیں۔ روسی اور ترکی دونوں زبانیں پڑھائی جاتی ہیں۔ اور دستکاری کی تعلیم ہوتی ہے۔ اسلامی مذہبی تعلیم کے لیے جید معلمات ہیں اس مدرسے میں یہ علوم پڑھائے جاتے ہیں۔

عقائد اسلام، فقہ اسلام، حساب، جغرافیہ، تاریخ، تاریخ طبعی، دستکاری،

خواتین بمبئی کا جلسہ۔ ہفتہ کے دن چندر راجی ہائی اسکول کے ہال میں معزز مستورات بمبئی کا ایک بہت بڑا جلسہ ہوا۔ اس موقع پر مسز رام بائی متوفہ زوجہ جسٹس راناڈے کی مورت بے نقاب کی گئی۔ جو ان کی ہمدردی نسواں اور تعلیم نسواں کے مساعی جمیلہ کے صلے میں نصب کی گئی ہے۔ مس شیرین مانک جی خورشید جی۔ صدر نشین تھیں۔ نواب دلشاد بیگم صاحبہ جنجیرہ، مہارانی لکشمی بائی صاحبہ گائیکوار۔ مس فیضی۔ مس شمس طیب جی، لیڈی چندر واکر وغیرہ کے علاوہ تقریباً ڈھائی سو دیگر خواتین جمع تھیں۔

فلسفہ ازدواج

یہ کتاب سید صغر علی صاحب بلگرامی مددگار اول تعلقہ دار ضلع نلگنڈہ ریاست حیدرآباد دکن نے حال میں شائع کی ہے۔

اپنے موضوع کے لحاظ سے یہ کتاب نہایت ہی اہم ہے۔ اس کی تالیف میں اگرچہ انگریزی تصانیف سے مدد لی گئی ہے۔ لیکن بجائے خود مصنف نے اس قدر محنت اور کوشش کی ہے کہ اسکو ماخوذ نہیں کہا جاسکتا۔ اس کتاب کو تمام نوجوانوں کو ضرور دیکھنا چاہیے۔

اس میں وہ تمام رازکش مکش زندگی کے نہایت خوبی سے بیان کیے گئے ہیں جو انسان کو دنیاوی زندگی میں کامیاب بناتے ہیں۔ زبان اُردو میں یہ ایک بیش قیمت اضافہ ہے چھپائی لکھائی اچھی ہے۔ تعداد صفحات ۱۳۲۔ اس کی قیمت عہ ہے۔
محمد جعفر صدیقی افندی اینڈ کمپنی محاذی جنرل پوسٹ آفس انگریزی حیدرآباد دکن یا شمسی پریس آگرہ سے ملسکتی ہے۔

خاتون بابت ماہ جون ۱۹۰۹ء میں جوگن کے منظومہ معمہ کا حل طلب کیا گیا تھا ر بیگم صاحبہ سکرٹری انجمن مفید نسواں بنگلور نے اُسی زمانے میں اسکو صحیح حل کرکے بھیجدیا تھا لیکن وہ خط گُم ہو گیا تھا۔ اب مدت کے بعد ملا ہے اسلیے درج کیا جاتا ہے۔ اور بہت سی بیگمات نے اسکا حل بھیجا تھا۔ سب کے جواب غلط تھے۔

سوال	جواب	سوال	جواب
جوگن	رسالہ خاتون	جگمگ نگری	تعلیم کی روشنی
دیس	علیگڈھ	لچھمی جی	بیگم صاحبہ بھوپال و دیگر سلامی حکومتیں
راجہ	علم (مسلمانوں کا)		
اسکی دو آنکھیں	مرد و عورت (مسلمان)	سات کروڑ گھر	ہندوستان کی سلامی دنیا
رانی	نارمل سکول علیگڈھ کالج	نومن کا جل	نو لاکھ روپیہ
نورانی آنکھ	مرد	علم کا دریا	علیگڈھ کالج
کانڑی آنکھ	عورتیں	بید (حکیم امت)	سرسید کا باوفا جانشین یعنی
اندھیر نگری	بے علمی جہالت		شیخ عبداللہ بی۔اے۔ ایل ایل بی

مژدہ

اب وہ وقت آگیا ہی کہ ہم علی گڈہ کے زنانہ مدرسہ اور اسکے بورڈنگ ہوس کے سنگ بنیاد رکھنے کی رسم کا مژدہ ناظرین کو سنائیں۔

شروع سے یہ خیال تھا کہ جب سب سامان بہم پہنچ جائے تو حضور عالیہ جناب ہرہائنس بیگم صاحبہ والیہ بھوپال دام اقبالہا کے دست مبارک سے اس رسم کا افتتاح ہو۔ چنانچہ اسی غرض کے لیے جناب نواب وقار الملک بہادر آنریری سکرٹری کالج اور آنریری سکرٹری صیغہ تعلیم نسواں (یعنی خاکسار اڈیٹر) بطور ڈپوٹیشن کے ۲۱- فروری کو بھوپال میں حضور عالیہ دام اقبالہا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور حضور عالیہ کے سامنے معروضہ پیش کیا اور علی گڈہ میں قدم رنجہ فرمانے کی دعوت دی۔

حضور عالیہ نے اپنی نوازش شاہانہ سے اس درخواست کو منظور فرمایا کہ وہ علیگڈہ میں بنفس نفیس تشریف لاکر اپنے دست مبارک سے زنانہ مدرسہ کی سنگ بنیاد رکھنے کی رسم ادا فرمائینگی۔ و نیز مسلمانوں کی بڑی مرکزی درسگاہ ایم۔ اے۔ او کالج کو ملاحظہ فرمائینگی۔ لیکن ابھی تک حضور عالیہ نے کسی تاریخ کا تعین نہیں فرمایا ہی۔ کیونکہ بوجہ علالت جناب صاحبزادہ کرنل حافظ عبید اللہ خاں صاحب بہادر کے حضور عالیہ اسوقت کسی قدر پریشان ہیں۔ اور وہ ٹھیک نہیں فرماسکتیں کہ کب تک تشریف لانے کا موقع ملیگا۔

البتہ جناب صاحبزادہ صاحب بہادر موصوف کی صحت یابی پر حضور عالیہ کچھ عرصہ قبل تاریخ تشریف آوری سے مطلع فرمائینگی۔ اور اس وقت ناظرین کو بھی حضور عالیہ کی تشریف آوری کی تاریخ سے اطلاع دیجائے گی۔ ہم جناب صاحبزادہ صاحب بہادر موصوف کی تندرستی وصحت کے لیے دست بدعا ہیں اور اپنے ناظرین کو بھی خواہش کرتے ہیں کہ وہ اپنی محسنہ کے فرزند دلبند کی صحت کے لیے دعا فرمائیں۔

رجسٹرڈ نمبر ایل ۲۰۷۱

خاتون

نمبر ۳	بابت ماہ مارچ سنہ ۱۹۱۱ء	جلد ۶

اڈیٹر شیخ محمد عبداللہ بی اے ایل ایل بی سکرٹری تعلیم نسواں سکشن

فہرست مضامین

باہتمام محمد عبدالسلام پرنٹر

مطبوعہ فیض عام پریس علی گڈھ

شیخ محمد عبداللہ بی اے پبلشر نے علی گڈھ سے شائع کیا

۱۰ اپریل سنہ ۱۹۱۱ء

خاتون

۱۔ یہ رسالہ ۴۰ صفحے کا علی گڈھ سے ماہوار شائع ہوتا ہے اور اسکی سالانہ قیمت (عہ) اور ششماہی عہ ہے،

۲۔ اس رسالہ کا صرف ایک مقصد ہے، یعنی مستورات میں تعلیم پھیلانا، اور پڑھی لکھی مستورات میں علمی مذاق پیدا کرنا،

۳۔ مستورات میں تعلیم پھیلانا کوئی آسان بات نہیں ہے اور جب تک مرد اس طرف متوجہ نہونگے مطلق کامیابی کی امید نہیں ہو سکتی، چنانچہ اس خیال اور ضرورت کے لحاظ سے اس رسالہ کے ذریعے سے مستورات کی تعلیم کی شدضرورت اور بے بہا فوائد اور مستورات کی جہالت سے جو نقصانات ہو رہے ہیں اس کی طرف ہمیشہ مردوں کو متوجہ کرتے رہینگے،

۴۔ ہمارا رسالہ اس بات کی بہت کوشش کریگا کہ مستورات کے لیے عمدہ اور اعلیٰ لٹریچر پیدا کیا جائے جس سے ہماری مستورات کے خیالات اور مذاق درست ہوں اور عمدہ تصنیفات کے پڑہنے کی ان کو ضرورت محسوس ہو تا کہ وہ اپنی اولاد کو اس بڑے لطف سے محروم رکھنا جو علم سے انسان کو حاصل ہوتا ہے معیوب تصور کرنے لگیں،

۵۔ ہم بہت کوشش کرینگے کہ علمی مضامین جہانتک ممکن ہو سلیس اور بامحاورہ اُردو زبان میں لکھے جائیں،

۶۔ اس رسالہ کی مدد کرنے کے لیے اسکو خریدنا گویا اپنی آپ مدد کرنا ہے اگر اسکی آمدنی سے کچھ بچیگا تو اس سے غریب اور یتیم لڑکیوں کو وظائف دیکر استانیوں کی خدمت کے لیے تیار کیا جائے گا،

۷۔ تمام خط و کتابت و ترسیل زر بنام اڈیٹر خاتون علی گڈھ ہونی چاہیے،

خواتین

حضرت اسماءؓ

حضرت ابو بکر صدیقؓ کی بیٹی ہیں۔ ہجرت سے ۲۷ سال پہلے مکہ میں پیدا ہوئیں۔ ان کی والدہ کا نام قتیلہ تھا۔ وہ قریش کے ایک مشہور اور نامور سردار عبد العزیٰ کی بیٹی تھیں۔ عبد اللہ ابن ابوبکر ان کے حقیقی بھائی تھے، حضرت عائشہؓ ان کی سوتیلی بہن تھیں۔ ان کی والدہ کا نام ام رومان تھا۔

حضرت ابوبکر صدیق سب سے پہلے آنحضرت پر ایمان لائے۔ ان کے مسلمان ہونے کے چند روز بعد حضرت اسماءؓ ایمان لائیں۔ یہ سترہویں مسلمان تھیں۔ ان کی والدہ قتیلہ نے چونکہ اسلام قبول نہیں کیا۔ اس وجہ سے حضرت ابوبکرؓ نے ان کو طلاق دیدی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ کے کافروں نے جب بہت تنگ کیا یہاں تک کہ قتل کر ڈالنے پر تیار ہوئے تو آپ نے مکہ چھوڑ کر مدینہ چلے جانے کا ارادہ کیا۔ حضرت ابوبکرؓ بھی آپ کے ہمراہ ہوئے اور رات کو دونوں آدمی نکل کر مکہ سے تھوڑے فاصلہ پر ایک پہاڑ ہے جسکو جبل ثور کہتے ہیں اسکے ایک غار

میں جاکر چھپ رہے تاکہ کافر پیچھا کرکے پکڑ نہ لیں۔ تین دن تک اسی غار میں بیٹھے رہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو اسی وجہ سے یارِ غار کہتے ہیں۔ کافر چاروں طرف ان کی تلاش میں گھوڑے دوڑاتے پھرے بارہا اسی غار کے موُنھ پر گذرے لیکن اللہ تعالیٰ نے اُن کو محفوظ رکھا،

حضرت اسماء چپکے سے رات کو کھانا لیکر جاتی تھیں اور غار میں اُن کو کھلا آتی تھیں۔ انکے بھائی عبداللہ جو اب تک مسلمان نہیں ہوئے تھے دن بھر کافروں کے ارادوں اور مشوروں کا پتا لگایا کرتے تھے اور رات کو غار میں پہونچکر تمام خبریں سُنا دیا کرتے تھے۔ عامر حضرت ابوبکرؓ کا چرواہا رات کو ان کی بکریاں غار کے موُنھ پر لاتا تھا بقدرِ ضرورت دودھ دے جاتا تھا اور حضرت اسماء اور عبداللہ کے نقشِ قدم کو اپنی بکریوں کے کھُروں سے مٹا دیتا تھا۔ تاکہ کفار کو اس نقشِ قدم کے ذریعہ سے غار کا سراغ نہ لگجائے۔

آخرکار کافر تھک کر بیٹھ رہے۔ مگر ابھی تک ان کو کسی قدر امید باقی تھی انھوں نے سو اونٹ کا انعام اس شخص کے لیے مقرر کیا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو گرفتار کرکے لائے۔ تیسرے دن رات کو جب اسماءؓ کھانا لیکر گئیں تو آپ نے اُن سے کہا کہ تم علیؓ سے جاکر کہنا کہ وہ کل رات کیوقت ہمارے لیے تین اونٹ اور ایک راہبر تلاش کرکے اسی غار پر بھیجیں حضرت علی نے ایسا ہی کیا۔ حضرت اسماءؓ زادراہ تیار کرکے لیگئیں۔ دسترخوان کو باندھنے کے لیے رسّی کی ضرورت ہوئی مگر وہاں رسّی کہاں! حضرت اسماء نے جھٹ اپنا نطاق (ایک رومال جسکو عرب کی عورتیں قمیص کے اوپر کمر پر باندھتی ہیں) کھولکر اسکے دو ٹکڑے کردیے ایک سے دسترخوان باندھا دوسرے سے مشکیزہ کا موُنھ۔ اسی دن دربارِ نبوت سے ان کو ذات النطاقین کا لقب ملا

حضرت ابوبکرؓ جب اسلام لائے تھے تو ان کے پاس چالیس ہزار دینار یعنی تقریباً ایک لاکھ روپیہ تھے۔ وہ تمام دولت انھوں نے آنحضرت اور دین اسلام کی امداد میں صرف کردی۔ ہجرت کے وقت کل پانچہزار درہم یعنی ہزار ڈیڑھ ہزار روپیہ انکے پاس باقی رہگئے تھے۔ وہ بھی اپنے بیٹے عبداللہ سے منگا کر اپنے پاس رکھ لیے کہ مدینے میں آنحضرت کے کام آئینگے۔ اور بال بچوں کو

اللہ کے بھروسہ پر چھوڑ کر چلے گئے۔

حضرت اسماء ان لوگوں کو رخصت کر کے گھر آئیں۔ صبح کو ابو قحافہ (حضرت ابوبکر صدیق کے والد جو ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے بعد میں اسلام لائے) اُن کے گھر میں آئے۔ بہت بڈھے ہو گئے تھے۔ آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بہت رنج کے ساتھ کہنے لگے کہ نہایت افسوس ہے کہ ابوبکرؓ خود بھی چلے گئے اور تمام مال بھی ساتھ لیگئے تم لوگوں کے لیے کچھ نہ چھوڑا۔ حضرت اسماء نے ان کی طبیعت کو تسکین دلانے کے لیے ایک تھیلی کنکر پتھر سے بھر کے اسی طاق میں رکھدی جس میں حضرت ابوبکرؓ روپیے رکھا کرتے تھے۔ اور اُن سے کہا کہ دادامیاں! وہ تو ہمارے لیے بہت کچھ چھوڑ گئے ہیں اور ان کا ہاتھ لیجاکر اس طاق پر رکھدیا۔ ابو قحافہ سمجھے کہ حقیقت میں یہ رُپیے ہی ہیں۔ ان کو اطمینان ہوگیا اور بولے خیر تب کچھ ہرج نہیں۔

مدینہ میں پہنچکر حضرت ابوبکر نے تین اونٹ بھیجے۔ اور عبداللہ کو لکھا کہ تم سب کو لیکر چلے آؤ چنانچہ وہ حضرت عائشہؓ اور ان کی والدہ ام رومان اور حضرت اسماء کو لیکر مدینے کو روانہ ہوئے۔

ان کا نکاح حضرت زبیر کے ساتھ ہوا تھا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھی زاد بھائی تھے اور جنکو حواری کا لقب ملا تھا۔ خود حضرت اسماء کی زبانی روایت نقل کی گئی ہے کہ

جب میرا نکاح زبیرؓ کے ساتھ ہوا تو اُن کے پاس کچھ نہ تھا۔ نہ کوئی غلام تھا۔ نہ کچھ مال تھا نہ سامان تھا صرف ایک گھوڑا تھا میں ہی اس گھوڑے کی سائیسی کی خدمت انجام دیتی تھی۔ آنحضرت نے زبیرؓ کو ایک نخلستان عطا فرمایا تھا جو مدینہ سے دو میل کے فاصلہ پر تھا۔ میں وہاں سے کھجور کی گٹھلیاں روزانہ اپنے سر پر اٹھا کر لاتی خود ہی دلتی پھر گھوڑے کو کھلاتی۔ اسکو پانی پلاتی۔ اسکا ساز سیتی۔ گھر کا جو کچھ کام کاج تھا وہ بھی میں ہی کرتی تھی۔ مجھے اچھی روٹی پکانی نہیں آتی تھی۔ آٹا گوندھکر اپنے پڑوس میں انصار کی بیویوں کو جو نہایت خلوص اور محبت رکھنے والی بیویاں تھیں

اور دوسروں کا کام کرکے ان کو دلی خوشی ہوتی تھی، دے آیا کرتی تھی وہ پکا دیا کرتی تھیں۔ اس قدر دشواری اور مشکل میں دیکھکر میرے باپ نے میرے پاس ایک غلام بھیجدیا جس کی بدولت گھوڑے کی سائیسی سے مجکو سبکدوشی ہوگئی، انہوں نے غلام کیا بھیجا، گویا مجکو آزاد کر دیا،،

حضرت زبیرؓ عرب کے ان لوگوں میں سے تھے جو بہادری میں بے مثل مانے گئے ہیں وہ آنحضرت کے زمانہ میں اور اُن کے بعد بھی برابر لڑائیوں میں شریک رہے۔ شام اور مصر کی فتوحات میں انکے بڑے بڑے کارنامے ہیں۔ حضرت اسماء بھی انکے ساتھ جایا کرتی تھیں۔ جنگ **یرموک** جو شام میں سب سے بڑی لڑائی ہوئی اس میں بھی موجود تھیں۔ حضرت **عمرؓ** نے ایک ہزار درہم سالانہ انکی تنخواہ مقرر کی تھی۔

جس زمانے میں **سعید ابن العاص** مدینہ شریف کے حاکم تھے اُس زمانہ میں وہاں چوریاں بہت ہونے لگی تھیں۔ حضرت اسماءؓ اپنے سرہانے خنجر رکھکر سویا کرتی تھیں۔

انکے پانچ بیٹے اور تین بیٹیاں ہوئیں، انکے نام یہ ہیں،

عبداللہ، عروہ، منذر، عاصم، مہاجر، خدیجہ، ام الحسن، عائشہ رضی اللہ عنہم

ان کے تمام بیٹوں کے تاریخ اسلام میں بڑے بڑے کارنامے ہیں۔ عروہ بہت بڑے محدث ہوئے۔ حضرت **عبداللہ** تو خلیفہ ہی ہوگئے۔

باوجودیکہ حضرت اسماء کے گھر میں دولت کی کچھ انتہا نہ رہی مگر وہ اپنی اسلامی سادگی پر رہیں، ہمیشہ موٹا پہنتیں اور درویشی کے ساتھ بسر کرتیں۔ انکے بیٹے **منذر** جب عراق کی لڑائی فتح کرکے لوٹے تو کچھ زنانے خوبصورت کپڑے انکے لیے لائے۔ انہوں نے نہیں منظور کیا۔ اور واپس کر دیا، منذر پھر موٹے کپڑے لیکر خود ان کی خدمت میں گئے اور پیش کیا۔ بہت خوش ہوئیں اور کہنے لگیں کہ ہاں مجکو ایسے ہی کپڑے پہنایا کرو۔

فیاضی جو عرب کا اصلی جوہر ہے حضرت اسماء کے مزاج میں بہت تھی۔ اپنے تمام مال بچوں کو

ہمیشہ نصیحت کیا کرتی تھیں کہ مال اپنا اور دوسروں کا کام نکالنے کے لیے ہی نہ کہ جمع کرنیکے لیئے اگر تم اللہ کی مخلوق سے اپنے مال کو روکوگے تو اللہ بھی اپنی نعمتوں کو تم سے روک رکھیگا۔ جو تم نے صدقہ کیا وہی درحقیقت تمہارا ذخیرہ ہی اور وہ کبھی کم نہوگا۔

ان کو کبھی کبھی دردسر کا دورہ ہوجایا کرتا تھا۔ اُس وقت جو کچھ انکے پاس ہوتا تھا غریبوں کو بانٹ دیتی تھیں اور جس قدر غلام ہوتے تھے سب کو آزاد کردیتی تھیں۔ کیونکہ صدقہ سے انسان کی بلائیں دور ہوجاتی ہیں

شرک کی ایسی سخت دشمن تھیں کہ اُن کی ماں قتیلہ کچھ تحفے تحائف لیکر مدینہ میں اُن کو دیکھنے آئیں انہوں نے انکے تحفے لینے سے انکار کیا اور گھر میں نہیں داخل ہونے دیا کیونکہ وہ ابتک مشرک تھیں۔ حضرت عائشہ کے پاس کہلا بھیجا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھو کیا حکم دیتے ہیں آپ نے فرمایا کہ تحفے قبول کرو اور اُن کو مہمان رکھو۔ تب اُن کو گھر میں لاکر مہمان رکھا،

سنہ ۶۰ھ میں انکے بیٹے عبداللہ مدینہ سے مکہ میں آ گئے حضرت اسمار کو بھی جو بڑھاپے کی وجہ سے اندھی ہوچکی تھیں وہیں بلالیا۔ حضرت عبداللہ جیسا فرمانبردار بیٹا ہونا بھی بہت ہی مشکل ہے وہ بھی اس بوڑھی ماں کی بہت اطاعت کرتے تھے اور ان کی رضامندی کو اپنے تمام مقاصد کی کنجی سمجھتے تھے،

سنہ ۶۴ھ میں وہ عرب اور عراق وغیرہ کے خلیفہ ہوگئے۔ سات برس تک خلافت کرنیکے بعد حجاج نے اُن پر بڑی بھاری فوج لیکر چڑھائی کی اور یکم ذی الحجہ سنہ ۷۲ھ کو مکہ کا محاصرہ کرلیا۔ چاروں طرف سے رسد کی آمد بند کردی تقریباً چھ مہینے تک لڑائی جاری رہی حضرت عبداللہ کے مددگار بوجہ کمی رسد کے ٹوٹ ٹوٹ کر حجاج سے جا ملے۔ اور ان کے پاس تھوڑے سے آدمی رہ گئے،

آخر شہرپناہ کے دروازے بھی لوگوں نے کھول دیئے اور دشمنوں نے چاروں طرف سے حضرت عبداللہ پر نرغہ کیا۔ حضرت اسمار نے کہا کہ بیٹا اگر تو سمجھتا ہے کہ حق پر ہی تو مردوں کی

طرح لڑ۔ اور ذلت کی کوئی بات جان کے خوف میں آکر ہرگز برداشت نہ کر۔ عزت کے ساتھ تلوار کھانا زیادہ بہتر ہے بہ نسبت اسکے کہ ذلت کے ساتھ آدمی دنیا کی نعمتیں کھائے،

حضرت عبداللہ بہادری کے ساتھ لڑے۔ لیکن کیا ہو سکتا تھا۔ آخر زخمی ہو کر گرفتار ہوئے حجاج نے ان کا سر کاٹ کر عبدالملک کے پاس بھیجدیا اور حضرت اسمار کے پاس جاکر کہا کہ تمہارے بیٹے کو میں نے اسلیے قتل کیا کہ اس نے اللہ کے گھر میں بیدینی اور بغاوت پھیلائی تھی حضرت اسما نے کہا کہ واللہ میرا بیٹا بیدین نہ تھا۔ بڑا پرہیزگار عبادت گزار اور اپنی ماں کا فرمان دار تھا مگر میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث سنی ہے کہ قبیلہ ثقیف سے دو دجال پیدا ہونگے جن میں سے دوسرا پہلے سے بدتر ہوگا۔ پہلا تو گذر چکا (مختار ثقفی) دوسرا تو ہے۔ حجاج انکے اس بے ہراس اور تلخ جواب سے جل گیا اور اُسنے عبداللہ کی لاش حجون پہاڑی پر لٹکا دی اور کہا کہ جب تک اسمار خود آکر نہ مانگیں وہیں لٹکی رہے تین دن گذر گئے۔ تیسرے دن بھی جب حضرت اسمار نے سُنا کہ ابتک لاش لٹکی ہوئی ہے تو کہا کہ کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ یہ سوار اُترے۔

جب یہ جملہ لوگوں نے سُنا تو حجاج سے سفارش کی۔ اُس نے لاش اُتروادی اور وہ دفن کی گئی۔ حضرت اسمار کی عمر اسوقت سو برس کی تھی۔ ان کا کوئی دانت نہیں ٹوٹا تھا اور تمام قوے صحیح و سالم تھے البتہ آنکھوں سے معذور ہوگئی تھیں۔ عبداللہ کے مارے جانے کے بیس روز کے بعد ۲۷ جمادی الاول ۷۳ھ میں انتقال کیا۔ مکہ میں دفن ہوئیں۔

اسلم جیراجپوری

بھاپ

سلمہ جو آج اُستانی سے سبق پڑھنے گئی تو مضمون سبق میں ایک جگہ سکہ بخار کا لفظ آگیا جسکا ترجمہ اُستانی نے ریل بتایا،

سلمہ۔ اُستانی جی ریل کا نام اسکا بخار کیوں رکھا گیا۔

اُستانی۔ چونکہ ریل بخار یعنی بھاپ کی قوت سے چلتی ہے۔

سلمہ۔ کیا بھاپ میں اتنی قوت ہے کہ وہ اتنی بڑی ریل کو چلا دے۔

اُستانی۔ بیشک ہے۔

سلمہ۔ یہ کیسے؟

اُستانی۔ کیا تم نے انجن نہیں دیکھا ہے۔ اگر دیکھا ہے تو اس میں کوئلا اور پانی ڈالتے ہوئے بھی دیکھا ہوگا۔ آگ اور پانی سے جو بھاپ بنتی ہے اسی کے زور سے ریل چلتی ہے۔ کوئلہ اور پانی اگر نہ رہے تو ریل ایک انچ بھی اپنی جگہ سے نہیں کھسک سکتی ہے

سلمہ۔ ریل تو انگریزوں ہی کی ایجاد ہے نا؟

اُستانی۔ ہاں۔

سلمہ۔ اُستانی جی اچھا آپ یہ بتا سکتی ہیں کہ ریل کی ایجاد کی ابتدا کیا ہے اور اس کا موجد کون ہے؟

اُستانی۔ سنو میں سناتی ہوں۔ دو سو برس سے کچھ زیادہ کا زمانہ گذرتا ہے کہ ایک شخص جسکا لقب مارکوئس وارسیسٹر تھا ایک کمرہ میں بیٹھا تھا اور سامنے آگ دہک رہی تھی۔ وہ اس وقت قید کی حالت میں تھا۔ اُس آگ پر ایک کیتلی پانی اُبالنے کے لیے چڑھی ہوئی تھی۔ وہ دور سے بیٹھا ہوا اُس بھاپ کو جو کیتلی کی ٹونٹی سے زوروں کے ساتھ نکل رہی تھی اور اُسکے ڈھکنے کو اچھال رہی تھی نہایت ہی غور سے دیکھ رہا تھا۔

غور و تفکر کی نظر نے بھاپ کی قوت کو بھانپ لیا جس سے وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ اگر کیتلی کی ٹونٹی بند کر دی جائے اور ڈھکنے کو جڑ دیا جائے تو یا تو کیتلی پھٹ جائیگی یا اُڑ جائیگی اسی وقت اسکے دل میں یہ بات سما گئی کہ بھاپ میں بڑی قوت ہے اور اس سے بڑا بڑا کام لیا جا سکتا ہے۔ قید سے رہا ہوتے ہی اُس نے بھاپ کی قوت آزمانے کی تدابیر پر عملدرآمد

شروع کر دیا۔ ایک بیان ہے کہ اس نے پہلی کارروائی یہ کی کہ توپ کے ایک گولے کو پانی سے بھر کر دونوں جانب سوراخوں کو خوب مضبوطی سے بند کر کے آگ کے تاؤ پر اسکو رکھدیا۔ جب وہ خوب گرم ہوگیا تو خود بخود پھٹ گیا۔ بعدہ اس نے ایک بیڈول کل بنائی اور اسکے ذریعے بھاپ کی قوت پہنچا کر پانی کو چالیس فیٹ اونچا اچھالا۔

متذکرہ بالا واقعہ کے سو برس بعد کا قصہ ہے کہ ایک دن ایک چھوٹا لڑکا جیمس واٹ نامی چولھے کے پاس بیٹھا ہوا کھیل کر رہا تھا کہ ایک چڑھی ہوئی کیتلی کی ٹونٹی سے نکلتی ہوئی بھاپ کے سامنے چمچہ رکھکر اُس پر نظر غائر ڈالتا تھا۔ اُس کی چچی اُس کی یہ حرکت دیکھکر اُس پر خفا ہوئی اور کہا کہ تجھے شرم نہیں آتی کہ تو اس طرح بیٹھکر اپنا وقت ضائع کر رہا ہے، مگر جیمس درحقیقت تضیع اوقات نہیں کر رہا تھا بلکہ وہ بھاپ کی اس حیرت انگیز قوت پر غور و فکر کر رہا تھا جو چمچہ کو حرکت دے رہی تھی۔

جیمس جوان ہوکر بڑا لایق شخص ہوا اور بھاپ کی قوت کو بکارآمد بنانے میں نہایت کامیابی کے ساتھ بڑی بڑی ترقیاں کیں اور آج یہ اُسی کی کوشش کا نتیجہ ہے کہ تم بھاپ کے انجن اس قدر مفید و بکارآمد شے پاتی ہو۔

جیمس کے بیڈول انجن میں اس قدر کسر باقی تھی کہ کوئی اُستاد دماغ پیدا ہوکر اسکو بکارآمد اور سڈول بناوے اور درجۂ تکمیل کو پہنچاوے۔ اس اُستادی کا سہرا جیورج سٹفنس کے سر بندھا جو ۱۷۸۱ء میں انگلستان کے ایک دیہات میں نیوکاسل کے نزدیک پیدا ہوا تھا۔ سٹیم انجن کی ترقی پر غور کرنے کے لیے اُس نے پہلے بہت سے مٹی کے انجن بطور نمونہ بنائے اور اُن ہی کے ذریعہ سے اپنے تجربے اور مشق کو بڑھایا۔ سنہ عیسوی کا ۱۸۱۵ واں سال تھا کہ سٹفنس نے اپنی جودت طبع سے اپنا پہلا انجن طیار کیا اور وہ انعام حاصل کیا جو انتخاب کی رو سے سب سے بہتر رکھا گیا تھا۔

جب سٹفنس نے ایک ایسا انجن بنانے کا ارادہ ظاہر کیا جو فی گھنٹہ بارہ میل جا سکے تو

تو ہر شخص اپنے خیال میں اسکے خیال کو مہمل ولایعنی سمجھتا تھا۔ مگر وہ کہتا تھا کہ تم کو اسی پر تعجب ہے تم بہت جلد دیکھو گے کہ یہ بھاپ کی قوت کیا کیا کرشمے دکھاتی ہے۔ تم دیکھو گے کہ اس کی قوت سے خشکی پر ریلیں دوڑ رہی ہیں۔ تری میں جہاز چل رہے ہیں۔ زمین کھودی جا رہی ہے۔ پانی کھینچا جا رہا ہے۔ کتابیں چھپ رہی ہیں۔ چکی چل رہی ہے۔ کپڑے بُن رہے ہیں۔ غرضکہ دنیا کا کوئی کام ایسا نہوگا جو بھاپ کی قوت سے نہ چلتا ہو۔

سلمہ دیکھو ایک معمولی چائے کی کیتلی کی بھاپ سے جس خیال کی ابتدا ہوئی تھی اس کی انتہا یہاں جا پہنچی۔ زمین اور سمندر کا ذکر ہی کیا ابتو آسمان تک بلند پروازی شروع ہوئی۔ ہوائی جہاز چلنے لگے۔ انگلستان سے قطب شمالی کی راہ معلق بلا واسطہ زمین و آسمان طے ہوئی یہ کل کرشمے محض غور و فکر کے ہیں دنیا کی ادنیٰ ادنیٰ چیزوں میں بہت کچھ کرامات پوشیدہ ہیں۔ متجسس نگاہیں چاہییں اور بات نکالنے والی عقلیں بہت سی آنکھوں نے پانی جوش کرتے ہوئے دیکھا ہوگا مگر بھاپ کی قوت کی تہ کو کسی کی عقل جیمس سے قبل نہ پہنچ سکی۔ اسی غور و فکر۔ جد و جہد پر انسانی تفوق منحصر ہے۔ کوئی اعلیٰ درجہ کا کمال حاصل کرتا ہے اور کوئی اپنے مرکز سے ایک قدم آگے نہیں بڑھتا۔

راقم
ابوالکمال دیسنوی

عیب گیری

کوئی عیب خواہ لکھنؤ کی کسی بیگم میں ہو خواہ بمبئی کی بُرا ہے۔ ہم اس مضمون کو اسلیے درج کرتے ہیں کہ بیگمات میں عیب گیری کا عیب زیادہ سُننے میں آتا ہے اسلیے ان کو اس عیب کی اصلاح کی طرف متوجہ ہونا چاہیے

اڈیٹر

ایک مرتبہ میں لکھنؤ بطور سیر کے گئی تھی چند روز قیام کرکے وہاں کی چند معزز بیبیوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ اُس میں ایک خاتون جو بشرے سے بہت مہذب معلوم ہوتی تھیں اُن سے بات چیت کرنی شروع کی تو میں نے اپنی بہن میں تعلیم کا اثر بالکل برعکس پایا کہ بہن موصوفہ کو سوائے لوگوں کی ہجو اور بدگوئی کے دوسری بات شاید کرنی آتی ہی نہ تھی۔

خیر جب آپ باتوں سے فارغ ہوکے مکان واپس گئیں تو اور معزز بہنیں جو آپس میں باتوں میں مشغول تھیں میری طرف مخاطب ہوئیں اور مجھ سے اُن سے باتیں شروع ہوئیں تو باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ صاحبہ موصوفہ کو لوگوں کی ہجو اور بدگوئی میں بڑا لطف آتا ہے اور اُس میں بہت سی اُن کی ستائی ہوئی تھیں جو ابتک خون کے آنسو بہاتی ہیں جنکا نام مقدس میں اس مضمون میں ظاہر کرنا مناسب نہیں سمجھتی۔ مجھ سے اُن کی عادتیں بیان کرنے لگیں تو اُن کی عادتیں سُنکر میں ششدر رہگئی کہ آیا میری پیاری بہنوں میں باوجود اس قدر تعلیم کے بھی ایسی خصلتیں ابتک باقی ہیں۔

اول یہ کہ بہن موصوفہ بغیر اطلاع کے ملاقات کو تشریف لیجاتی ہیں دوم بیچاری معزز بہنوں کو لوگوں کے حالات دریافت کرنے کی بہت بڑی فکر رہتی ہے اور قدمے درمے اس بات کی کوشاں رہتی ہیں اور محض اسی غرض کے لیے دو چار مستورائیں ذلیل قوم کی لوگوں کے خانگی امورات دریافت کرنے کے لیے مقرر کر رکھی ہیں تاکہ سب کے حالات سے واقفیت حاصل کرکے ایک کی بُرائی دوسری کے روبرو بیان کرکے شرمندہ کریں۔

اور افواہً وخارجاً یہ بھی دریافت ہوا ہے کہ جب وہ کسی کے یہاں تشریف لیجاتی ہیں اور وہاں سے واپس آتی ہیں تو کل حال وہاں کی خواتین کا یعنی شکل وصورت وغیرہ وغیرہ اپنے صاحب سے بیان کرتی ہیں۔

صاحب کا مطلب میری پیاری ناظرین بہنیں سمجھ گئی ہونگی کہ آجکل مستورات میں شوہر کو صاحب کہنا بہت مروج ہو گیا ہے اور خصوصاً ان مستورات میں جو صرف اب جانتی ہیں

اور اپنے کو تعلیم یافتہ لکھتی ہیں۔

میں اپنی پیاری بہنوں سے کیا کہہ رہی تھی اور کیا بکنے لگی اچھا تو میری پیاری ناظرین بہنو تمہیں انصاف کرو کہ پردہ دار مستورات کے حال سے نامحرم مرد کو آگاہ کرنا کتنی معیوب بات ہے اور باوجود دونوں کے تعلیم یافتہ ہونے کے کیسے اپنے معزز دوستوں کی بیبیوں کی بہنوں کو جائز رکھتے ہیں اور تعلیم کا نام مفت بدنام کرتے ہیں

اسلیے میں بشکل مضمون اپنی پیاری بہنوں کی گوش گذار کرتی ہوں کہ آیندہ وہ لوگوں کی عیب جوئی سے باز آئیں اچھا! بہن رخصت اور ساتھ ہی اسکے یہ التجا کر جاتی ہوں کہ اس عاجزہ کو بھی اپنی نعمت کے دعائے خیر سے یاد کیجیے گا۔

راقمہ

س،م از بمبئی

مرد کی پت نہیں عورت کے بغیر

عیش و عشرت نہیں عورت کے بغیر — گھر میں جنت نہیں عورت کے بغیر
کہتے ہیں گھر متمدن جس کو — فی الحقیقت نہیں عورت کے بغیر
ہوں سب اسباب معیشت لیکن — دل کو فرحت نہیں عورت کے بغیر
صاحب مال ہوا مرد تو کیا — با فراغت نہیں عورت کے بغیر
زر و زیور جمع کرے لاکھ مگر — کچھ حفاظت نہیں عورت کے بغیر
دل رہے جس سے شگفتہ ایسی — کوئی صورت نہیں عورت کے بغیر
من و سلوی بھی نہ کیوں خوان پہ ہو — اس میں لذت نہیں عورت کے بغیر
خدمتی ہوں حبشی لاکھ غلام — حسن خدمت نہیں عورت کے بغیر
آپ بنتا ہے گھر میں لنگر — خیر و برکت نہیں عورت کے بغیر

مرد گو زہد سے بنجائے ملک — آدمیت نہیں عورت کے بغیر
اہل دنیا کے بے دنیا میں — پاک صحبت نہیں عورت کے بغیر
مہرباں مرد ہو بچوں پہ تو کیا — اُن پہ رحمت نہیں عورت کے بغیر
جانتے ہیں متاہل اس کو — حفظ صحت نہیں عورت کے بغیر
سب کے نزدیک مسلّم ہے کہ مرد — نیک نیت نہیں عورت کے بغیر
پارسا مرد بھی ہیں گرچہ مگر — قدر عفت نہیں عورت کے بغیر
ترک لذات ہے کفر نعمت — اجر طاعت نہیں عورت کے بغیر
چکی چولھا ہو کہ ہنڈیا ڈوئی — ان کی زینت نہیں عورت کے بغیر
سم نہیں مرد کے حق میں گو حلم — مگر امرت نہیں عورت کے بغیر
اس گزرگاہ میں مردوں کے لیے — اچھی سنگت نہیں عورت کے بغیر
بزم دنیا میں مکمل انساں — حسب فطرت نہیں عورت کے بغیر
بعد مرنے کے بھی حوروں کی قسم — لطف جنت نہیں عورت کے بغیر

الغرض دونوں جہاں میں احسن
مرد کی پت نہیں عورت کے بغیر

احسن مارہروی
اڈیٹر فصیح الملک

آرام جان بیگم

یہ قصہ اگرچہ ایک بازاری گپ ہے لیکن چونکہ دلچسپ ہے اور اس میں ایک عورت کی ذہانت کا قصہ گھڑا گیا ہے اسلیے محض ناظرین کی تفریح طبع کے لیے اسے درج کرتے ہیں۔

اڈیٹر

صاحب تذکرہ نے اس خاتون کا صرف اس قدر پتہ دیا ہے کہ یہ جہانگیر کی چوتھی بیگم تھی مگر افسوس اسکا ذکر نہیں کہ یہ کون تھی؟ اسکا مولد و مسکن کہاں تھا؟ کہاں سے آئی؟ اور شاہی حرم میں کیونکر داخل ہوئی۔

بہرحال یہ شریف و پاکدامن خاتون ظاہری حسن و جمال کے علاوہ سیرت پاکیزہ و طبیعت شائستہ رکھتی تھی فہم و فراست کا کافی سرمایہ اور روشن خیالی و اعلیٰ دماغی کا کامل ذخیرہ رکھتی تھی۔

اگرچہ جہانگیر کی اور خاتونیں بھی طباع و خوش خیال اور صورت و سیرت میں سرمایۂ ناز تھیں مگر بارگاہ فیاض سے جو جودت ذہنی و استقلال طبعی اسکو عطا ہوئی تھی اس سے جہانگیر کی اور بیگمیں بے بہرہ تھیں۔ گو آرام جان نے باقاعدہ تعلیم نہیں پائی تھی اور اس نے لڑکپن کے زمانے میں معمولی نوشت و خواند کے علاوہ اور کچھ حاصل نہیں کیا تھا۔ لیکن اسپر بھی اکثر وہ اپنی ذہن رسا طبیعت اور خدا داد قابلیت کی برکت سے بآسانی علمی موشگافیاں کرتی۔ اور مشکل گتھیاں سلجھاتی تھی، لڑکپن ہی سے اس کی طبیعت لطیفہ سنجی و مذاق پسندی کی جانب مائل تھی۔ اور لطف یہ کہ اس کا یہ مذاق لغو و مہمل نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ سننے والے ہمیشہ اس سے کوئی مفید و کارآمد نتیجے نکال سکتے تھے۔

یہ بھی اس کی قدرت کا ایک کرشمہ ہے کہ باوجودیکہ آرام جان علمی ذخیرہ بہت کم رکھتی تھی مگر علمی مباحثوں میں کبھی پیچھے نہیں رہی خصوصاً مشکل و مغلق شعروں کو یہ اس طرح بلا غور و خوض حل کرتی تھی کہ سننے والے حیرت کرتے تھے۔

رفتہ رفتہ اسکو فن شاعری سے کچھ ایسی دلچسپی پیدا ہوئی کہ فارسی اشعار لکھتے لکھتے عربی میں بھی طبع آزمائی کرنے لگی۔

جہانگیر کی لائف پر نظر ڈالنے سے یہ امر عموماً تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس کی تمام بیگمات شاعرہ و بذلہ سنج نہیں۔ اور خود جہانگیر بھی کبھی کبھی شعر موزوں کر لیا کرتا تھا۔ مگر جو حاضر جوابی و

بے ساختگی اور برجستہ شعر کہنے میں آرام جان کو ملکہ تھا۔ وہ کسی اور بیگم کو کیا خود جہانگیر کو بھی میسر نہ تھا آرام جان نے اس فن میں وہ قدرت وطاقت پیدا کر لی تھی کہ ایرانی شعرا اسکے اشعار سُن کر حیرت سے پتلے بن جاتے تھے۔

جہانگیر شطرنج کھیلنے کا بڑا شائق تھا اور تقریباً محل کی تمام بیگمات بھی اس میں مہارت رکھتی تھیں مگر شطرنج بازی میں جو تجربہ و درک آرام جان کو تھا وہ کسی اور کو نصیب نہ تھا۔ اگرچہ وہ شطرنج بازی کو فضول، لغو سمجھتی اور کہتی کہ دماغ ریزی وجاں فشانی کے بعد جس کام کا کچھ نتیجہ نہ نکلے وہ شطرنج ہے، پھر بھی اسکا میلان طبع اس طرف بہت زیادہ تھا۔ اس نے رفتہ رفتہ شطرنج بازی میں وہ مشاقی پیدا کر لی تھی کہ اکثر جہانگیر جیسا مشہور شخص بھی مات کھا جاتا تھا۔

چنانچہ نقل ہے کہ ایک مرتبہ جہانگیر بادشاہ ایک شہزادہ کے ساتھ شطرنج کھیلنے بیٹھا اور یہ بازی مقرر ہوئی کہ مات کھا جانے والا بازی جیتنے والے کو اپنی ایک بیگم نذر کرے۔ اس بیہودہ شرط پر دونوں نے معاہدہ کیا اور تحریری اقرارنامہ مرتب ہوا۔ شطرنج بچھائی گئی اور طرفین سے چالیں شروع ہوئیں۔

اتفاق سے شہزادے کی بازی نے اچھا نقشہ جمایا۔ اور جہانگیر کو مایوسی پیدا ہوئی۔ بہت گھبرایا شطرنج کا نقشہ اُسی طرح چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اور محل سرا میں داخل ہو کر اول نورجہاں سے ملا سارا حال شرط بدنے اور اپنا نقشہ بگڑنے کا کہہ سُنایا اور کہا کہ اب مجھے مات ہو جانے کا۔۔۔ پورا یقین ہے۔ یا تو تم مجکو کوئی ایسی چال بتاؤ کہ میں بازی ہاتھ سے نہ جانے دوں۔ یا یہ صلاح دو کہ میں کونسی بیگم کی مفارقت گوارا کروں۔

اس وحشت انگیز خبر سے نورجہاں بہت گھبرائی۔ اور کہا کہ چال تو مطلق میری سمجھ میں نہیں آتی میں بالکل قاصر وعاجز ہوں۔

جہانگیر نے کہا۔ اور میری دوسری بات کا جواب۔

نورجہاں نے نہایت برجستگی کے ساتھ فی البدیہ یہ شعر پڑھا ؎

تو بادشاہ جہانی جہاں ز دست مدہ　　　　کہ بادشاہ جہاں را جہاں بکار آید

یعنی اے شاہ! تو جہاں کا شہنشاہ ہے۔ اور جب یہ بات ہے تو نورجہاں کو اپنی صحبت سے الگ نہ کر۔ کیونکہ شاہ جہاں کے لیے جہان مفید و کار آمد شے ہے۔

جب جہانگیر کو نورجہاں سے مطلب بر ری کی امید ساقط ہو گئی تو اُس نے اپنی دوسری بیگم حیات النسا رکو بلوایا۔ اور ساری سرگذشت کہہ سُنائی۔

اس خاتون نے بھی پہلی بات کے جواب سے اعراض کیا۔ اور دوسرے سوال کے متعلق برجستہ یہ شعر پڑھا۔

جہاں خوش ست و لیکن حیات می باید　　　　اگر حیات نباشد جہاں چہ کار آید

یعنی اس میں تو شک نہیں کہ جہاں نہایت پُر لطف جولاں گاہ اور دلچسپی کی جگہ ہے مگر اسکے ساتھ ہی حیات کی ضرورت اشد ہے۔ جب حیات نہیں تو جہان بیکار ہے کوئی کام نہیں آسکتی۔

حیات النسا نے اس شعر میں نہایت عاقلانہ نورجہاں پر بھی سخت حملہ کیا ہے۔

غرض جہانگیر ان دونوں خاتونوں کے جواب سے عجب شکنجے میں پھنسا۔ بالآخر اُسنے ننات النسا رکی حاضری کا حکم دیا۔ اُس نے بھی حاضر ہوتے ہی برجستہ ایک شعر پڑھا جسنے دونوں بیگموں کے مضمون کو مات کر دیا وہ کہتی ہے۔

جہان و حیات ایں ہمہ بیوفا ست　　　　فنا را نگہدار کآخر فنا ست

کیا معنی کہ جہان و حیات سب بے مروت و بے وفا ہیں۔ کسی کو قیام نہیں۔ بس فنا کو ہر وقت ملحوظ خاطر رکھو۔ کیونکہ آخر کار فنا ہی ہے۔

بیچارہ جہانگیر عجب کشمکش و پیچ میں تھا۔ کوئی تدبیر راس نہیں آتی اور کسی طرح مطلب کی عقدہ کشائی نہیں ہوتی تھی۔ اس نے اپنی چوتھی بیگم آرام جان کو بلایا۔ حقیقت حال کہہ سنایا اور درد دل کے علاج کا خواستگار ہوا۔

چاہیے تھا کہ آرام جان بھی اور بیگموں کی طرح منتشر الحواس ہوتی۔ اور جہانگیر سے اپنا پہلو بچا کر الگ ہو جاتی نہیں بلکہ اُسنے نہایت دلیری سے کہا کہ حضور عالی اُس نقشہ کا خاکہ کھینچیں جس سے جہاں پناہ کو اپنی مات کا یقین ہے۔ شاید لونڈی کے خیال ناقص میں کوئی چال آ جائے۔ جہانگیر نے آرام جان کے روبرو وہی نقشہ جمایا جس سے وہ لوٹ تھا اور بازی ہار رہا تھا۔

اس ذہین وطباع خاتون نے فوراً بلا غور وخوض نہایت آزادانہ مزاجی کی شان سے یہ شعر پڑھا۔

شاہا دو رُخ بدہ، و دل آرام را مدہ پیل و پیادہ پیش کن و اسپ گشت مات

جہانگیر آرام جان کے اس شعر پر پھڑک گیا۔ اُس کی روشن دماغی و حاضر جوابی او اپنی کامیابی و مطلب براری پر خوش خوش محل سے برآمد ہوا۔ اور آرام جان کی بتلائی ہوئی چال سے بازی لے لیا۔

الحاصل اس حکایت سے آرام جان کی حیرت انگیز ذہانت و خداداد قابلیت کا ثبوت ملتا۔ اور یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہماری خاتونیں مردوں سے کسی طرح کسی بات میں کسی کام میں کسی علمی میدان میں کم نہیں۔ اور وہ پیچیدہ گتھیوں کو سلجھا سکتی اور مشکل مرحلوں کو طے کر سکتی ہیں۔

راقمہ
م۔ ح ف دسنوی
از بختیار پور

شمس العلماء مولینا آزاد مرحوم

سودا کے جو بالیں پہ گیا شور قیامت
خدام ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

مولانا آزاد کی وفات کی خبر ملک کے تمام حصوں میں پہنچ گئی ہے جسے سن کر اکثروں نے کہا ہے افسوس مولانا آزاد جن کی انشا پردازی کی نظیر ہندوستان میں نہیں۔ سچ سچ قید ہستی سے آزاد ہو گئے

مولینا محمد حسین آزاد ۱۲۴۶ھ میں بمقام دہلی پیدا ہوئے اور وہیں کے عربی کالج میں تعلیم پائی اور اپنی خداداد علمی قابلیتوں سے شمس العلماء کا خطاب سرکار سے حاصل کر کے اور اپنی علمی ادبیت کا سکہ علمی دنیا پر بٹھا کے آخر ۸۲ سال کی عمر میں ۲۱۔ جنوری ۱۹۱۰ء کو بمقام لاہور انتقال کیا۔

آزاد ۲۰، ۲۵ سال ہوئے گورنمنٹ کالج میں عربی فارسی کے پروفیسر رہے اور نیز اردو کی ابتدائی اور فارسی کی پہلی دوسری کتابیں پنجاب یونیورسٹی کے واسطے بنائیں جس سے ہزاروں طالب علم فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

اگرچہ وہ عربی فارسی کے پروفیسر اور شمس العلماء کے خطاب سے ممتاز تھے۔ لیکن جو شہرت انہوں نے اپنی زباندانی کے لحاظ سے حاصل کی ہے اس کے آگے اور کی شہرتیں ہیچ ہیں۔ ان کی انشا پردازی کا جواب ہندوستان میں کسی سے نہیں ہو سکا۔ اردو کی ابتدائی کتابوں کے لیے جو دردسری اور دماغ درکار تھا وہ مولانا آزاد ایسے شخص کے سوا اور کسی کو کہاں نصیب ہو سکتا ہے اور نہ ایسی دردسری معمولی دماغ کا آدمی برداشت کر سکتا ہے۔

قصص ہند کا دوسرا حصہ بھی جو مولینا آزاد کی جادو نگاری کا نتیجہ ہے جسکا لطف زبان اُردو کے شیدائیوں کو محو حیرت کر دیتا ہے۔ بچے اسکے ایک ایک لفظ کو پڑھتے ہیں اور سمجھ لیتے ہیں باوجود اسکے بڑے اور بوڑھے آدمی بھی اسکو پڑھکر ویسی ہی دلچسپی حاصل کرتے ہیں جیسے کسی تاریخ کی بڑی کتاب کو پڑھکر ہو سکتی ہے۔ میں قصص ہند میں سے صرف ایک مضمون کا ٹکڑا نقل کرتی ہوں جس کو مولانا آزاد کی انشا پردازی کا ایک معمولی نمونہ سمجھنا چاہیے۔

شاہ جہاں بادشاہ نے جب اپنی مشہور عالم عمارتوں کے بنانے سے فراغت پائی تو اُس نے ایک جشن کیا جسکا ذکر مولانا آزاد یوں کرتے ہیں معمولی اشیار کا سادگی بیان کے ساتھ ذکر ہے لیکن لطف زبان نے غضب کیا ہے

رات کو جشن ماہتابی ہوا کہ تمام دیوان عام ایک بقعہ نور نظر آنے لگا۔ فرش میں سفید مخمیں سفیدی قالیں۔ دیواروں پر براق اطلس، زربفت و کمخواب کے پردے، گلزدہ یعنی روپہلی۔ آرایش کے سامان اور روشنی کے سب لوازمات موجود، لیکن تمام بلور اور شیشہائے سفید سامنے چمن اور درختوں کے پھول پتے تمام سفید۔ روشوں پر گملے سفید، دربار کا لباس سفید، یہاں تک کہ انگوٹھی بھی چاندی کی اور اسپر بھی الماس سفید، خیمہ زمین سے آسمان تک نور کا عالم تھا اور دریائے مہتاب لہراتا نظر آتا تھا۔

آپ کی سب سے بڑی تصنیف آبحیات ہے جس میں شاعروں کی تاریخ بڑی خوبی سے درج کی گئی ہے۔ کتاب خاصی بڑی ہے مگر اُردو کی رنگینی اس میں بھی کم نہیں ہے۔ اس کے ایک حصہ میں اپنے اُستاد شیخ محمد ابراہیم ذوق کے حالات آزاد اس طرح شروع کرتے ہیں،

جب وہ صاحب کمال عالم ارواح سے کشور اجسام کی طرف چلا تو فصاحت کے فرشتوں نے باغ قدس کے پھولوں کا تاج سجایا جنکی خوشبو شہرت عام بنکر جہان میں پھیلی اور رنگ نے بقائے دوام سے آنکھوں کو طراوت بخشی۔ وہ

تاج سر پر رکھا گیا تو آبِ حیات اُسپر شبنم ہوکر برسا کہ شادابی کو کملاہٹ کا اثر نہ پہنچے ملک الشعرائی کا سکّہ اس کے نام سے موزوں ہوا اور اسکے طغرائے شاہی پر نقش ہوا کہ اسپر نظم اُردو کا خاتمہ ہوگیا۔

جس باغ کا بلبل تھا وہ باغ برباد ہوگیا نہ ہمصفیر رہے نہ ہم داستاں رہے نہ اُس بولی کے سمجھنے والے رہے۔ جو حزاں آباد اسی زبان کے لیے ٹکسال تھا وہاں بھانت بھانت کا جانور بولتا ہے"

افسوس ایسے انشا پرداز کا جو اپنے ملک اور قوم کے لیے فخر اور اُردو لٹریچر کے لیے مایہ ناز تھا، دس بارہ سال ہوئے دماغ خراب ہوگیا اور اُن پھولوں کی جنسے علمی دنیا کا دماغ معطر ہوتا تھا فقط راکھ باقی رہگئی، نہیں میں نے غلطی کی اُس راکھ کو بھی ۲۱ جنوری ۱۹۱۰ء کی بادِ تند نے اُڑا کر ملیامیٹ کرکے چشم دنیا سے پوشیدہ کردیا،

بس نامور بزیر زمیں دفن کردہ اند
کز ہستیش بروی زمیں یک نشاں نماند

آزاد عالم جنوں میں بھی لکھنے پڑھنے میں مشغول رہے اور غزلیں بھی کہتے رہے، عالم جنوں کی لکھی ہوئی کتابیں چھپ بھی چکی ہیں جن میں سے ایک کا نام سپاک دنماک ہے،

شاعری کے اعتبار سے بھی آپ کا پایہ بہت بلند ہی اور اس میں بے ساختگی اور رنگینی پائی جاتی ہے۔ اور کیا یہ تھوڑی بات ہی کہ مولینا آزاد نے اس وقت نیچرل شاعری کے رواج پر کمر باندہی جبکہ پرانی شاعری کے سوا جسے اس زمانے میں بیہودہ شاعری کے نام سے موسوم کیا جاتا ہی کوئی نیچرل شاعری کے نام سے بھی واقف نہ تھا۔

غزلیں بھی کہتے تھے لیکن کم اور اکثر غزلوں کو دوسرے رنگ پر لے آتے تھے جسکی تقلید آجکل عام ہورہی ہی۔ ایک غزل کا مطلع دیکھیے،

جہاز عمر رواں پر سوار بیٹھے ہیں سوار خاک میں بے اختیار بیٹھے ہیں

ایک اور غزل کا مطلع ومقطع ملاحظہ ہو،

دنیا ہے جب فنا تو فنا ہی سمجھ اُسے پی جام مرگ آب بقا ہی سمجھ اُسے
آزاد نے قدم نہ رکھا قید حرص میں سچ ہے کہ دی خدا نے ہی کیا ہی سمجھ اُسے

آپ کے خیالات کی نفاست کا اندازہ اس کتاب سے بخوبی ہو سکتا ہے جسے آپ نے نصف صدی سے قریب لذرتا ہے لکھا تھا، اب ان کے خلف الرشید آغا محمد ابراہیم منصف امرتسر نے دو ڈہائی برس ہوتے ہیں اُسے چھپوایا ہے۔

اگرچہ آجکل کے زمانے میں اُنکے وہ خیالات بہت ادنیٰ معلوم ہوتے ہیں لیکن اس زمانے میں جبکہ لڑکوں کی تعلیم ہی کا کال پڑا ہوا تھا اور سر سید جیسے روشنخیال ریفارمر اس باب میں لب کشائی نہ کر سکتے تھے، اُن کا لڑکیوں کی تعلیم کی حمایت میں لکھنا اعلیٰ درجہ کی روشنخیالی ہے اور مارل فورس کا ثبوت؛ اس کتاب کا نام نصیحت کا کرن پھول ہے۔ اور قیمت صرف چار آنے ہے۔

دنیا مثل ایک تھیٹر کے ہے جس میں ایکٹر اپنا اپنا پارٹ ادا کرکے چلتا دہندا کرتے ہیں لیکن جسنے اپنے پارٹ کو اچھی طور پر انجام دیا اُسے دیکھنے والوں کی آنکھیں ہرگز نہیں بھول سکتیں۔

مولینا آزاد گو دنیا سے انتقال کر چکے لیکن دربار اکبری، آبحیات، نیرنگ خیال، ایسی کتابوں سے اُن کا نام ہمیشہ قائم ہے اور اُن کی اُردو کا سکہ ہندوستان میں جاری ہے جس وقت اُردو دنیا کی اعلیٰ زبانوں میں شمار ہوگی اور ہندوستان کی ترقی کا ساتھ دیگی۔ کیونکہ ع شامے بجہاں نیست کہ اور اسحرے نیست،

اسوقت مولانا آزاد کا نام اس کی ترقی کے بام پر چڑہنے کی اولین سیڑہی ثابت ہوگا اور اُن کی کتابیں اُردو کی عالیشان عمارت کی نیو،

ہمارے اُن کی اعلیٰ شان سے کم مضمون ان کی عالمگیر شہرت میں ہرگز اضافہ نہیں کر سکتے کیونکہ

قارون ہلاک شد کہ چہل خانہ گنج داشت نوشیرواں نمرد کہ نام نکو گذاشت

راقمہ

بنت حفیظ اللہ ایل ایل بی

پلیڈر امرتسر

مکہ کی شادیاں

علی گڑھ کے مشہور رسالہ المعارف میں یہ مضمون ۱۹۰۱ء میں نکلا تھا چونکہ اس میں بہت سی مجھ حیرباتیں ہیں اور یہ بجائے خود یہ نہایت دلچسپ ہے، اس لیے ہم اسکو ناظرین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

اڈیٹر

مکہ میں جس طریقہ سے شادیاں ہوتی ہیں انکا بیان نہایت دلچسپ ہے، ناظرین کے لیے ہم وہاں کی شادیوں کا خاکہ کھینچتے ہیں۔ جو شادیاں بہت دہوم دہام سے ہوتی ہیں، ان میں مردانہ اور زنانہ مکانات خوب آراستہ کیے جاتے ہیں، دیوار و در پر چونے کی استرکاری کی جاتی ہے، پھر اُس پر طرح طرح کے شوخ رنگوں سے بیل بوٹے بنائے جاتے ہیں، ہر مکان میں نہایت مکلف فرش بچھایا جاتا ہے، رات کے وقت ان کو جھاڑ فانوس سے آراستہ کیا جاتا ہے اگر شادی میں کثرت سے آدمی بلانے منظور ہوتے ہیں اور مکان میں اس قدر گنجایش نہیں ہوتی کہ سب آدمی اس میں سما سکیں، تو کھلے میدانوں میں جعفریوں، قناتوں اور شامیانوں سے مصنوعی مکان سجائے جاتے ہیں، جعفریوں پر بھی طرح طرح کے رنگین اور خوشنما کپڑے

منڈھے جاتے ہیں دیکھنے والوں کو یہ ہرگز معلوم نہیں ہوتا کہ یہ مصنوعی مکان ہیں۔

میں اس موقع پر ایک شادی کا ذکر کرتا ہوں جو نہایت دھوم دھام سے ہوئی تھی اور اس سے ناظرین کو معلوم ہو جائیگا کہ مکہ میں شادیوں کا کیا طریقہ ہے اور مکانوں کی آرایش اور شادیوں کی دعوت وغیرہ رسوم کا کیا حال ہے۔ اس شادی کی کیفیت ایک سیاح نے اپنے سفرنامہ میں لکھی ہے۔ سیاح مذکور لکھتا ہے۔

شیخ محمد حسین نے جو شیخ الهند کے لقب سے ممتاز ہیں اور جن کو ان تمام ہندوستانیوں کے مقدمات و معاملات کے فیصلہ کرنے کا اختیار ہے جو مکہ میں رہتے ہیں، اپنے بیٹے کی شادی نہایت شان و تجمل سے کی۔ اس شادی میں سات روز تک مہمانوں کو دعوت دی گئی،

پہلے دن ان تمام حاجیوں کو دعوت دی گئی تھی، جو اس سال مکہ میں حج کے ارادہ سے آئے تھے، دوسرے دن مکہ کے ان تمام باشندوں کو دعوت دی گئی جو ہندوستان یا دیگر ملکوں سے آکر وہاں آباد ہوگئے ہیں، تیسرے دن شریف مکہ اور شیخ السادات اور وہ تمام سید دعوت میں شامل ہوئے، جو حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین علیہما السلام کی اولاد میں تھے، چوتھے دن مکہ کے علما و فضلا اور بڑے بڑے آدمی دعوت میں شریک ہوئے۔ پانچویں دن مکہ کا گورنر اور قاضی اور ان کا اسٹاف اور ترکی فوج شریک دعوت کی گئی۔ چھٹے دن ان تمام ترکوں کو دعوت دی گئی، جو مکہ میں تجارت کی غرض سے یا کسی اور غرض سے مقیم تھے، ساتویں دن اس شہر کے عام باشندے مدعو کیے گئے، اس طرح پورے سات دن میں شیخ الهند کو اس شادی کی مہمانداریوں سے فرصت ہوئی۔

اس سے پہلے کہ اس دعوت کا ذکر کیا جائے، اس مکان کا ذکر کرنا مناسب ہے، جس میں اس دعوت کا سامان کیا گیا تھا، یہ مکان ساٹھ گز لمبا، پچاس گز چوڑا اور بارہ گز بلند تھا، اسکے اندر چاروں طرف قرینہ سے بنچ بچھے ہوئے تھے، بیچ میں آمد و رفت کا دروازہ تھا، اس دروازہ کے قریب ایک نہایت خوشنما کامدار قنات مکان کے عرض میں نصب کی گئی

تھی. جسکے ذریعہ سے یہ مکان دو بڑے کمروں میں تقسیم ہوگیا تھا، قنات میں تین محرابی دروازے رکھے گئے تھے اور اُن پر رنگین پردے آویزاں تھے. مکان کے اندر چاروں طرف کی دیواریں کمخواب اور زربفت سے منڈھی گئی تھیں. بیچ جو دیواروں سے لگاکر بچھائے گئے تھے، اُن پر کمخواب، اطلس اور مخمل کے گدّے پڑے ہوئے تھے اور اُن پر بہت سے تکیے رکھے ہوئے تھے. جن پر طرح طرح کے رنگین اور خوشنما غلاف چڑھائے گئے تھے گدّوں اور تکیوں پر ترتیب کی باریک اور سفید چادریں ڈالدی گئی تھیں جنسے گدّوں کے رنگین اور خوشنما غلافوں کی جھلک نظر آتی تھی،

بیچوں کے درمیان ہر کمرہ کی زمین پر مکلف فرش استنبول کے قالینوں کا تھا، کمروں کی چھتیں سفید پارچہ کی تھیں اور ان میں قسم قسم کی رنگین ہانڈیاں اور طرح طرح کے خوشنما جھاڑ آویزاں تھے، دیواروں پر ہزاروں دیوارگیریاں لگی ہوئی تھیں جنکے رنگ مختلف تھے، جب یہ ہانڈیاں اور جھاڑ اور دیوارگیریاں ایک ساتھ روشن کیجاتی تھیں تو تمام مکان بقعۂ نور نظر آتا تھا،

دونوں کمروں میں ہر طرف چند جلی آئینے دیواروں سے ملاکر رکھے گئے تھے، جو قدآدم سے زیادہ بلند تھے اور جنکے گرد نہایت خوشنما طلائی چوکھٹے لگائے گئے تھے، ان آئینوں میں جب مکان کی آرایش، مہمانوں کی صورتیں اور اُن کے طرح طرح کے لباس نظر آتے تھے تو عجیب لطف کا سماں دکھائی دیتا تھا، روشنی کے وقت تو ان آئینوں کے سبب سے تمام مکان چمک اُٹھتا تھا،

دونوں کمروں میں ایک کمرہ ہندوستانیوں کے لیے اور ایک اہل عرب کے لیے تھا، درمیان کی قنات بہت اونچی نہ تھی، اسلیے دونوں کمروں کے بیٹھنے والوں کو ہر کمرہ کی دیواریں اور چھت کی آرایش صاف نظر آتی تھی،

باہر کی طرف دونوں کمروں سے ملا ہوا ایک اور مکان تھا جسکا طول بیس گز اور عرض

دس گز تھا، اسکے درمیان دو قناتیں کھڑی کرکے اُس مکان کو تین حصوں میں تقسیم کیا تھا، بیچ کا حصہ خالی چھوڑا گیا تھا اور اس میں ایک فرش بطور پا انداز کے ڈالا گیا تھا، یہ حصہ بطور دہلیز کے بنایا گیا تھا اور اس میں مالک مکان اور اسکے عزیز و اقارب مہمانوں کے انتظار میں بنچوں اور کرسیوں پر بیٹھے رہتے تھے۔ جب کوئی شخص آتا تھا تو اسکو مالک مکان معانقہ اور مصافحہ کے بعد تعظیم و تکریم سے کسی کمرہ میں لیجا کر بٹھاتا تھا،

دہلیز کے دونوں پہلوؤں میں جو حصے اس مکان کے تھے، ان میں سے ایک حصہ کو تین کمروں میں تقسیم کیا تھا اور اُن میں داخل ہونے کے لیے قنات میں تین دروازے رکھے گئے تھے، ان میں سے ایک کمرہ جو صدر دروازہ کے قریب تھا اُس میں طرح طرح کے میوے اور مٹھائیاں مہیا کی گئی تھیں، دوسرے کمرہ میں شربت وغیرہ کا سامان تھا، تیسرا کمرہ بطور آبدار خانے کے تھا، یہ تینوں کمرے دہلیز کے دائیں طرف تھے،

بائیں طرف بھی اسی طرح کے تین کمرے بنائے گئے تھے، جن میں سے اس کمرہ میں جو صدر دروازہ سے ملا ہوا تھا، روشنی کا سامان رکھا گیا تھا۔ دوسرے کمرہ میں حقہ پینے کا، اور تیسرے میں قہوہ پینے کا سامان تھا، دونوں کمرے جو قہوہ خانے اور آبدار خانہ کے نام سے موسوم تھے دعوت کے کمروں سے متصل تھے۔

دعوت کے کمروں میں جو فرش قالینوں کا بچھایا گیا تھا اُسپر مہمانوں کی آمد کے وقت ایک سفید دسترخوان بچھایا جاتا تھا، اسکا طول تو کمرہ کے طول کے برابر ہوتا تھا، مگر عرض اسقدر ہوتا تھا کہ اُسپر ایک بڑی سینی رکھی جا سکے، مہمان دسترخوان کے آمنے سامنے بیٹھ جاتے تھے چار مہمانوں کے درمیان ایک سینی پلاؤ کی رکھی جاتی تھی، یہ پلاؤ ایسی نفاست اور سلیقہ سے تیار کیا جاتا تھا کہ اس کی خوشبو اور ذائقہ کی کچھ تعریف نہیں ہو سکتی،

علاوہ پلاؤ کے ہر شخص کے سامنے چینی کی دو دو رکابیاں رکھی جاتی تھیں، جن میں سے ایک میں رکابی کے دَور کی برابر دو بڑی بڑی جلیبیاں ہوتی تھیں، اُن کا وزن آدھ سیر سے

ہوتی ہیں۔ یہ جلیبیاں نہایت صاف سفید اور ملایم ہوتی نہیں، مکہ میں عام طور پر اسی شکل اور ... کی جلیبیاں تیار کی جاتی ہیں،

دوسری رکابی میں تین سموسے نہایت خوش رنگ اور خوش ذائقہ رکھے ہوتے تھے، ان میں بکری کے گوشت کا قیمہ اور قسم قسم کے مصالحے بھرے ہوتے تھے، سموسوں کا ... بھی آدھ سیر سے کسی طرح کم نہ ہوگا، دعوت کے وقت اس بات کا انتظار نہیں کیا جاتا ... جب سب مہمان جمع ہو جائیں، تب کھانا شروع کیا جائے، بلکہ جس قدر آدمی جمع ہو جاتے تھے ان کو کھانا کھلا دیا جاتا تھا، یہی وجہ تھی کہ صبح سے شام تک مہمانوں کا تانتا بندھا رہتا تھا،

آٹھواں دن نکاح کا تھا، نکاح کی مجلس میں کسی شخص کو شریک ہونے کی ممانعت نہ تھی اور رقعے خاص خاص آدمیوں کے نام جاری کیے گئے تھے، اس تقریب میں شریف مکہ، شیخ السادات، قاضی، گورنر حجاز اور شہر کے عمائد و اکابر وغیرہ شریک ہوئے تھے، نماز ظہر کے بعد سب آدمی دولھا کے مکان میں جمع ہوئے تھے، عصر کی نماز کے قریب قاضی نے نکاح کا خطبہ پڑھا اور ایجاب وقبول کی رسم ادا کی گئی،

اس رسم کے تمام ہونے کے بعد رومی اور عربی باجے بجنے شروع ہوئے اور اُن کے ذریعہ سے نکاح کا اعلان کیا گیا، پھر چھواروں کے علاوہ قسم قسم کی شیرینی تقسیم کی گئی، جو حاضرین محفل میں سے ہر شخص کے حصہ میں ایک ایک سیر کے قریب آئی، رنگ، وضع، بناوٹ اور ذائقہ کے لحاظ سے ہندوستان کی کوئی مٹھائی مکہ کی مٹھائی سے ہمسری نہیں کر سکتی، مکہ کی تمام مٹھائیوں میں عام طور پر ہر قسم کا میوہ اور خاصکر بادام زیادہ استعمال کیا جاتا ہے، اس سبب سے ہندوستانی ان تمام مٹھائیوں کو غالباً لوزیات میں شمار کرینگے،

دولھا کے مکان پر نکاح ہونے کا سبب یہ تھا کہ جب برات دُلہن کے مکان پر پہنچی، تو وہاں کوئی مکان بھی گنجایش کا نہیں تھا کہ برات کے سب آدمی اس میں سما سکیں، مجبوراً برات کے

آدمی دلہن کے مکان سے دولھا کے مکان پر واپس آئے اور معمولی رسموں کے ادا ہونے کے بعد وکیل اور شاہدوں کے ذریعہ سے نکاح پڑھا دیا گیا۔

بیان بالا سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ شریف مکہ، قاضی مکہ اور گورنر حجاز ہر شادی میں شریک ہوتے ہیں، نہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جس شادی میں وہ کسی خاص وجہ سے شریک ہوتے ہیں اُس میں شادی والوں کا اعزاز عام لوگوں کی نظروں میں بہت بڑھ جاتا ہے، عام شادی میں خواہ وہ غریب کی ہو یا امیر کی یہ لوگ کبھی شریک نہیں ہوتے، جس شادی کا میں نے ذکر کیا اس میں ایک لاکھ کے قریب روپیہ صرف ہوا تھا اور اس میں شریف اور قاضی اور گورنر کے شریک ہونے سے اس کی شہرت عرب میں دور دور تک پھیل گئی تھی۔

شادیوں میں آرایش کا تمام سامان، جسکو انگریزی میں فرنیچر کہتے ہیں گھر کا نہیں ہوتا، بلکہ عام طور پر کرایہ پر لیا جاتا ہے، اس میں فرش فروش تکیے گدّے، شیشہ آلات، شامیانے اور قناتیں وغیرہ سب چیزیں شامل ہیں، جب لوگوں کے گھروں میں شادی کے سامان اور تجمّل کی گنجایش نہیں ہوتی، تو مصنوعی مکان جعفریوں اور قناتوں سے بنائے اور سجائے جاتے ہیں، جیسا کہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں، ٹھیکہ دار ان مصنوعی مکانوں کو جلد تیار کر دیتے ہیں، پھر ان کو ہر قسم کے فرنیچر سے آراستہ کرتے ہیں، جب شادی ہو چکتی ہے، تو وہ اُس تمام سامان کو اُکھاڑ کر لیجاتے ہیں اور سامان کا کرایہ اور اُس کے آراستہ کرنے کی اُجرت شادی والوں سے وصول کر لیتے ہیں

یہانتک جو کچھ بیان ہوا، وہ مردانہ محل کے مکانات کے متعلق تھا، اسکے علاوہ زنانہ محفلیں بھی ہوتی ہیں جو دولھا اور دلہن کے مکانات پر منعقد کی جاتی ہیں، ان محفلوں کے متعلق جو مکانات مخصوص ہوتے ہیں وہ بھی نہایت عمدگی اور سلیقہ سے آراستہ کیے جاتے ہیں، دلہن کی نشست کا کمرہ خاصکر نہایت زرق برق فرنیچر سے سجایا جاتا ہے اور اُس کمرہ کی زینت وآرایش کا کما حقہ بیان نہیں ہو سکتا، اکثر اُس کمرہ کی تمام دیواریں سرخ بانات سے منڈھی جاتی ہیں جنپر نقرئی اور طلائی کام کے بیل بوٹے ہوتے ہیں، دروں پر نہایت پر تکلف اور زرنگار پردے آویزاں

کیے جاتے ہیں، چھت گیری نہایت بیش قیمت رنگین کپڑے کی ہوتی ہی اور اسپر بھی اعلیٰ درجہ کا کار چوبی کام ہوتا ہی، چھت گیری کے مقابل زمین پر دبیز قالینوں کا فرش ہوتا ہی، جسپر رومی صناعوں کے ہاتھ کی گلکاریاں عجب لطف دیتی ہیں، اس کمرہ میں جھاڑ فانوس اور ہانڈیوں اور دیوارگیریوں کی ایسی کثرت ہوتی ہی کہ رات کے وقت روشنی سے دن نظر آتا ہی اور کمرہ کے زرق برق فرنیچر پر نظر نہیں ٹھہرتی، جب کوئی انسان اس کمرہ میں داخل ہوتا ہی تو اس کی زینت و آرایش کے سامانوں کو دیکھکر ششدر رہجاتا ہی،

شادیوں میں عورتیں جس لباس اور زیور کو پہن کر شریک ہوتی ہیں اسکا بیان کرنا اس موقع پر ضروری ہی مگر ہم اس سے پہلے ملک کی عورتوں کے لباس عام کا ذکر کرتے ہیں، یاد رہے کہ یہاں کی عورتوں میں غرارہ دار پاجامہ اور محرم کا مطلق رواج نہیں ہی، عام طور پر تمام عورتیں تنگ مُہری کا ریشمی پائجامہ پہنتی ہیں، یہ کبھی تو سادہ ہوتا ہی کبھی مُہری پر ٹپک ٹکی ہوتی ہی، سینہ بند کا کام چکن یا نین سکھ کی ایک نیم آستین جاکٹ سے لیا جاتا ہی، جس میں ناف یا نیفہ تک خوشنما بوتام لگے ہوتے ہیں، کبھی کبھی جاکٹ پر ایک کُرتہ بھی پہن لیا جاتا ہی، سر پر ایک رومال بندھا ہوتا ہی، جو عموماً قند سرخ کا اور شاذ و نادر سفید یا کسی اور رنگ کا ہوتا ہی، عام طور پر کوئی عورت دوپٹہ نہیں اوڑھتی، صرف نماز پڑھنے کے وقت سر پر ڈال لیتی ہیں، پھر فوراً اسکو اُتار کر رکھدیتی ہیں، گھروں میں عام طور پر عورتوں کی معمولی پوشش یہی ہی، اس میں کتخدا یا ناکتخدا، جوان یا ضعیفہ کی کوئی قید نہیں ہی، نفاست اور صفائی کا عورتوں کو ہمیشہ خیال رہتا ہی، آنکھوں میں سُرمہ اور ہاتھوں میں مہندی لگانے کا عام دستور ہی،

یہاں عورتیں جب عزیزوں سے ملنے یا حَرَم میں جانے کے لیے باہر نکلتی ہیں، تو ان کی پوشش میں نسبت خانگی پوشش کے فرق ہوتا ہی، اول تو جاکٹ پر تنزیب یا ململ، یا بریانو وغیرہ کپڑے کا سادہ یا رنگین کُرتہ پہن لیا جاتا ہی، بعض دفعہ اس کُرتہ پر طلائی کام بھی ہوتا ہے، اور اسکے گریبان میں عام طور پر ایک ہی بٹن ہوتا ہی، کبھی جاکٹ پر کُرتا نہیں پہنا جاتا بلکہ اسکی

جگھ توپ پہن لیتی ہیں، کرتہ اور توپ میں فرق یہ ہی کہ کرتہ سوتی ہوتا ہی اور توپ ریشمی، اسکے علاوہ توپ کے گریبان میں سینہ تک دو بٹن ٹکے لگائے جاتے ہیں. کبھی دونوں طرف شانوں تک بٹن ٹانک دیے جاتے ہیں، توپ کی آستینیں پوری ہوتی ہیں اور اسکا طول اس قدر ہوتا ہی کہ زانو سے نیچے تک تمام جسم اس سے ڈھکا رہتا ہی توپ میں جو ریشمی کپڑا استعمال کیا جاتا ہی وہ ایک توپ کے [illegible] کے موافق قیمت میں آٹھ روپیہ سے بیس روپیہ تک کا ہوتا ہی، اسپر عموماً کارچوبی کام ہوتا ہی اور یہ کام گھروں میں عورتیں خود اپنے ہاتھ سے کرتی ہیں، توپ کا کپڑا جو بیش قیمت ہوتا ہی، وہ مثل ماہی کے باریک ہوتا ہی، اگر کم قیمت کسی قدر کرخت اور مثل کریب کے ہوتا ہے سفید رنگ کا توپ کم پہنا جاتا ہی اور اس کی بناوٹ مثل چارخانہ کے ہوتی ہی، توپ کرتہ کی نسبت زیادہ فراخ اور کشادہ ہوتا ہی، جو رومال سر پر باندھا جاتا ہی اسپر باہر نکلنے کے وقت ایک اور کپڑا دستار کے طریقہ سے بندھا ہوتا ہی، یہ کپڑا عموماً سرخ ہوتا ہی، یا کسی اور رنگ کا، مگر کبھی سادہ ہوتا ہی. کبھی خفیف سازی کا کام بھی ہوتا ہی ملایہ سر سے پاؤں تک ہوتا ہے اسکو ناظرین سیاہ رنگ کی ایک چادر خیال کریں. اسکے چاروں کونوں پر چار گچھے سیاہ ریشم کے بنائے جاتے ہیں، اور اُن کی جڑیں کلابتون کی ہوتی ہیں ملایہ اس طریقہ سے اوڑھا جاتا ہی کہ اسکا ایک کنارہ سر پر سے اُتر کر پیشانی تک آجاتا ہی،

ملایہ معمولی درجہ کا قیمت میں دس رُپیے سے پچیس رُپیے تک اور اعلیٰ درجہ کا پچاس سے سو رُپیے تک ہوتا ہی. عام عورتوں کا کچھ ذکر نہیں، مگر جو عورتیں کسیقدر متمول اور آسودہ حال ہیں وہ بیس پچیس رُپیے سے کم قیمت کا ملایہ استعمال نہیں کرتیں، ملایہ کا کپڑا لٹھے کی طرح دبیز ہوتا ہی اور اس کی بناوٹ سنگین ہوتی ہی،

ملایہ پر نقاب پہنا جاتا ہی. جو عام طور پر سفید پارچہ کا ہوتا ہی اور اسکا طول ڈیڑھ گز اور عرض چہرہ کے دَور کے موافق ہوتا ہی، اول اسکو مُہرہ کی طرح ماتھے پر رکھتی ہیں، پھر اس کے بند ملایہ پر نیچے کو خوب کس کر باندھتی ہیں، تاکہ ملایہ سر پر سے سرک نہ جائے، نقاب کا جو حصہ

گھٹنوں تک سامنے ہوتا ہی، اسکو آنکھوں کے دوڑ کے موافق کتر دیتی ہیں اس میں اندر کی طرف
پیچ والتک کلابتون کا کام ہوتا ہی، اسکا جو حصہ آگے کی طرف ہوتا ہی، وہ ٹخنوں تک لٹکتا رہتا ہے
اکثر اسیر ملولپیٹ کر سینہ تک لے آتی ہیں، چلنے کے وقت ملایہ کو بھی دونوں طرف سے سمیٹ کر
ہاتھوں سے تھام لیتی ہیں، جب کوئی عورت اس لباس کو پہنکر باہر نکلتی ہی، تو اسکے جسم کا اندازہ
کسی طرح نہیں ہو سکتا، سر سے پاؤں تک ایک حالت معلوم ہوتی ہی،

پاؤں میں ساہر کے موزے اور ساہری کی جوتیاں پہنتی ہیں اور دونوں کا رنگ علی العموم زرد
ہوتا ہی جوتیاں کثر کامدار ہوتی ہیں اور انکے حاشیوں پر اکثر تاروں کا جال بنایا جاتا ہے،
جب کسی کی شادی کی محفل میں جانا ہوتا ہی، تو تمامی یا کمخواب کا پائجامہ پہنتی ہیں اور اس کی مہری پر
کارچوبی کام ہوتا ہی، کمر پر ایک خوشنما کارچوبی کام کا پٹکا باندھا جاتا ہی جس کی قیمت بیس سے
پچاس روپے تک ہوتی ہی، جاکٹ ریشمی اور کامدار پہنتی ہیں اور اسپر ایک رنگین کرتہ پہن لیتی ہیں
جسپر گوٹا اور گوکھرو کا ہوتا ہی، کبھی کرتہ کی جگہ توپ پہنتی ہیں، جسکے گریبان اور پشت اور شانوں پر
کارچوبی کام ہوتا ہے، سر پر ایک ریشمی کپڑا عموماً سرخ رنگ کا اور کبھی کسی اور رنگ کا ہوتا ہے
اسپر بھی کارچوبی کا کام بنایا جاتا ہی، چہرہ پر نقاب ہوتا ہی جسکے اندر پیشانی سے ٹھوڑی تک
کارچوبی بیل بوٹے بنائے جاتے ہیں،

زیور ہر قسم کا ہوتا ہی طلائی بھی، مرصع بھی اور موتیوں کا بھی، مگر موتیوں کا زیور عام پسند ہے
اور اسی کو بہت زیادہ استعمال کرتی ہیں، چنانچہ وہ گلے میں موتیوں کے ہار پہنتی ہیں، جو دس دس
گیارہ گیارہ لڑی کے ہوتے ہیں اور گلے سے سینہ تک آویزاں رہتے ہیں، دونوں طرف
کانوں میں ایک ایک طلائی بالی پہنتی ہیں، جس میں موتی پروے جاتے ہیں، یہ بالیاں کان کی
لو میں ڈالی جاتی ہیں کیونکہ یہاں کان کی لو کے سوا اور کوئی حصہ کان کا بیندھا نہیں جاتا، شادی
کے وقت اکثر دو دو بالیاں پہنی جاتی ہیں جن میں سے ایک خالی ہوتی ہی اور ایک میں موتی پڑے
رہتے ہیں، کبھی بالیوں کی جگہ موتیوں کے گچھے لٹکا لیے جاتے ہیں، کبھی ایک طلائی زیور

پہنا جاتا ہے، جس میں مرصع ٹکلیاں لگی ہوتی ہیں، ناک بیندھنے کا مطلق دستور نہیں ہے، نہ یہاں بلاق پہنا جاتا ہے، نہ لونگ اور نتھ کا استعمال جاری ہے، ٹیکے اور جھومر کا بھی بالکل دستور نہیں ہے، دائیں بازو پر ایک طلائی جوشن پہنا جاتا ہے، مگر بائیں بازو پر کوئی زیور نہیں ہوتا، ہاتھوں میں طلائی کام کی چوڑیاں، بجلی کی پٹریاں، جڑاؤ کنگن اور کڑے ہوتے ہیں اور اُن میں بھی اکثر موتیوں کا کام ہوتا ہے، انگوٹھیاں اور چھلے بھی پہنے جاتے ہیں، مگر سوائے دو اخیر کی انگلیوں کے باقی انگلیاں بالکل خالی رہتی ہیں۔ پاؤں میں بھی صرف انگوٹھے اور اُس کی پاس کی انگلی میں طلائی چھلے پہنے جاتے ہیں جو ناخن کی جڑ تک چوڑے ہوتے ہیں۔

کوئی عورت کانچ کا زیور نہیں پہنتی، شادی میں اکثر وہی عورتیں جاتی ہیں، جنکے پاس عمدہ لباس اور عمدہ زیور ہو، ورنہ ہرگز نہیں جاتیں، مگر یہ ضرور نہیں کہ زیور اور لباس اپنے ہی گھر کا ہو، بلکہ اکثر عورتیں شادی میں جاتے وقت لباس اور زیور بازار سے کرایہ پر منگالیتی ہیں، ایک شب کے لیے تمام زیور کا کرایہ پندرہ روپے ہوتا ہے، اسی پر لباس کے کرایہ کو قیاس کر لینا چاہیے، جو شادیوں میں استعمال کرنے کو منگایا جاتا ہے،

جب عورتیں اس طرح لباس و زیور سے آراستہ ہو کر کسی شادی میں جاتی ہیں، تو مکان کے دروازہ تک وہ عورتیں استقبال کو آتی ہیں جنکے ہاں شادی کی محفل ہوتی ہے، اُس وقت وہ اپنے چہروں سے نقاب اُلٹ کر سر پر ڈالتی ہیں، اور اب زرین اور کارچوبی کام کا وہ حصہ جو چہروں پر نقاب ڈالتے وقت پوشیدہ رہتا ہے، نمایاں ہو جاتا ہے، پہلے ایک دوسرے کے ہاتھ پر بوسہ دیتی ہیں، پھر دیر تک مزاج پُرسی کرتی رہتی ہیں، اسکے بعد وہ خاتون جسکے مکان پر شادی ہوتی ہے، ان کے نقاب اور ملایہ کو اپنے ہاتھ سے اُتار کر ایک علیحدہ کمرہ میں جا رکھتی ہے، پھر اُنکو اپنے ساتھ لیجا کر قرینہ سے محفل میں بٹھاتی ہے،

ہندوستان کے باشندے اس بات کو شاید تعجب سے سنیں گے کہ مکہ کی عورتیں عموماً حقہ کا استعمال کرتی ہیں، چنانچہ شادی کی زنانہ محفلوں میں جب عورتیں جمع ہوتی ہیں، تو ہر ایک کے سامنے

حواں رکھا جاتا ہی، جس کی چلم چاندی کی ہوتی ہی اور اُسکے سرپوش میں چاندی کے گھونگرو لٹکے رہتے ہیں، حقہ کے علاوہ قہوہ کا دور بھی برابر چلتا رہتا ہے۔ ان محفلوں میں عورتیں بنچوں پر تکیوں سے پشت لگاکر، یا پاؤں لٹکاکر یہی بے تکلفی سے بیٹھتی ہیں کہ انکے حسن و جمال یا زیور ولباس کی کوئی خوبی چھپی نہیں رہتی، ان عورتوں کے سامنے چند ڈومنیاں نہایت خوش الحانی سے عربی گیت گاتی ہیں، اوران کے ہاتھوں میں ایک باجا بھی ہوتا ہی، جو ایک ہاتھ لمبا اور ایک فٹ دور کا ہوتا ہے، اور اوپر سے منڈھا ہوا اور نیچے سے کھلا ہوا ہوتا ہی مگر یہ عورتیں باہم گفتگو میں اس قدر مصروف ہوتی ہیں، کہ اُن کی توجہ گیت سُننے کی طرف مطلق نہیں ہوتی،

عام طور پر شادی کی زنانہ محفلوں میں ایسا تکلف اور تجمل ہوتا ہی کہ بن بلائی عورتیں بھی تماشا دیکھنے کے لیے جوق جوق چلی آتی ہیں، اگرچہ اُن میں سے بعض عورتیں محفل کے مناسب زیور اور لباس پہنکر آتی ہیں، مگر چونکہ شادی والوں کی طرف سے بلائی نہیں جاتیں، اسلیے اکثر عورتوں کا سادہ لباس ہوتا ہے۔ یہی عورتوں کو ایک بنچ پر جگہ ملتی ہی، جو مکان کے ایک گوشہ میں بچھا رہتا ہی اور جسپر گدے اور تکیے بھی پڑے رہتے ہیں، مگر نہ اُن کا استقبال کیا جاتا ہی، نہ اُن کی خاطر تواضع کی جاتی ہی، وہ اپنا ملایہ اوڑھے اور چہرے پر نقاب ڈالے چپ چاپ بیٹھی رہتی ہیں اور محفل کا تماشا دیکھا کرتی ہیں، مکان کی عورتیں اُنسے بات چیت نہیں کرتیں، اگر کبھی اتفاق سے گھر کی باندیاں قہوہ کی پیالیاں اُن کی طرف لیجاتی ہیں، تو یہ عورتیں دور ہی سے لا لا یعنے نہیں نہیں کہہ دیتی ہیں اور ان کو اپنے پاس آنے نہیں دیتیں،

گانے کی محفل اکثر دو تین گھنٹہ تک رہتی ہی، پھر سب عورتیں اُٹھ کر دوسرے کمرے میں جاتی ہیں، جہاں فرش پر کھانا چُنا رہتا ہی، کھانا کھانے کے بعد دلہن کو دیکھنے کی درخواست کرتی ہیں، دُلہن کی والدہ جب ان کو اجازت دیتی ہی تو دُلہن کے کمرہ میں باری باری سے غول باندھکر جاتی ہیں،

یہ کمرہ نہایت تکلف سے آراستہ کیا جاتا ہی، جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، یہاں دُلہن ایک آرام کرسی پر بت کی طرح بے حس و حرکت بیٹھی ہوئی ہوتی ہی، اُسکے چہرہ پر ایک باریک نقاب ہوتا ہی، جس سے خط و خال کی جھلک صاف نظر آتی ہی، سر پر کارچوبی کام کا ایک رومال بندھا ہوتا ہی، شادی کا لباس سر سے پاؤں تک مغرق اور سرخ رنگ کا ہوتا ہی اور وہ سونے اور موتیوں کے زیورات سے بھی آراستہ ہوتی ہی،

مگر میں یہ بھی ایک عجیب رسم ہی کہ جب عورتیں دلہن کو دیکھنے کے لیے اس کمرہ میں جاتی ہیں تو اُس وقت دُلہن اپنے دونوں ہاتھ کانوں سے ایک ایک بالشت کے فاصلہ پر اُٹھائے رہتی ہی، دلہن کی پشت آرام کرسی سے لگی ہوتی ہی اور وہ اسپر کسی قدر پاؤں پھیلائے رہتی ہے اور کسی قدر گھٹنے کھڑے رہتے ہیں، جہیز میں جو لونڈیاں دُلہن کے ساتھ دینی ہوتی ہیں وہ اُس وقت دُلہن کے دائیں بائیں کھڑی ہوتی ہیں اور اُن کا لباس اور زیور بھی نہایت تکلف کا ہوتا ہی،

دُلہن کے کمرہ میں ایک آرام کرسی کے سوا کوئی بنچ یا کرسی نہیں ہوتی، اسلیے جو عورتیں دلہن کو دیکھنے کے لیے اُس کمرہ میں جاتی ہیں وہ بیٹھ نہیں سکتیں بلکہ پانچ چھ منٹ دُلہن کے روبرو کھڑی رہتی ہیں اور اسکو اچھی طرح دیکھ بھال کر کمرہ سے دعائیں دیتی نکل آتی ہیں، ایک غول کے بعد عورتوں کا دوسرا غول آتا ہی اور باری باری سے دلہن کو دیکھکر اور دعائیں دیکر چلی جاتی ہیں، برادری کی عورتوں کے بعد اُن عورتوں کو کمرہ میں جانے کی اجازت ہوتی ہی، جو صاحب خانہ کی طرف سے شادی میں بلائی جاتی ہیں، پھر وہ عورتیں دلہن کو دیکھنے جاتی ہیں، جو بلائی نہیں گئیں، بلکہ تماشائیوں کی حیثیت سے شریک ہوئی ہیں،

دلہن کے کمرہ سے باہر نکلکر عورتیں دوبارہ محفل میں نہیں بیٹھتیں، بلکہ مکان کے صحن میں یا چھت پر ٹہلتی رہتی ہیں، جب سب عورتیں دلہن کو دیکھ چکتی ہیں تو اسکو محافہ میں سوار کرکے دولھا کے مکان پر لیجاتے ہیں، وہاں بھی دلہن ایک نہایت آراستہ اور پر تکلف کمرہ میں بٹھائی جاتی ہے،

اور اسی طرح باری باری سے عورتیں دیکھنے کے لیے آتی ہیں اور دعائیں دیکر چلی جاتی ہیں۔ دلہن کا چہرہ دونوں طرف ٹھیک پر آراستہ کرایا جاتا ہی۔ شادی ہو چکنے کے بعد ٹھیک دار دن کو اُسکے آراستہ کرنے کی اجرت ادا کر دی جاتی ہی۔ اور وہ اپنے سامان آرایش کو واپس لیجاتے ہیں،

شادی میں جو عورتیں بلائی جاتی ہیں، جب وہ رخصت ہوتی ہیں تو وہ عورت جو صاحب خانہ ہوتی ہی ان کے ملاے اور نقاب لاکر اپنے ہاتھ سے اُن کو اُڑھاتی ہی اور چند رسمی کلمات کے بعد اُن کو مکان کے دروازہ تک لیجاتی اور رخصت کر دیتی ہے،

آخر میں یہ بیان کرنا بھی ضروری ہی کہ شادی سے پہلے چند باتیں ضرور دریافت کیجاتی ہیں اوّل یہ کہ لڑکی سینے پرونے، کشیدہ کاڑھنے، کارچوبی کام کرنے، کپڑے دھونے اور ہر قسم کا کھانا پکانے کا سلیقہ رکھتی ہی یا نہیں، اگر وہ ان کاموں اور خانہ داری کے مشاغل میں سلیقہ نہیں رکھتی تو اسکو قبول نہیں کیا جاتا۔ یہی وجہ ہی کہ لڑکیاں غریب گھر کی ہوں یا امیر گھر کی بچپن سے دستکاری کا کام سیکھتی اور اُس میں کمال پیدا کرتی ہیں۔ **دوم** یہ امر بھی پہلے سے طے ہو جاتا ہے، کہ شوہر کو اپنے ساتھ فرش اور قالین گدّے اور تکیے اس تعداد کے اور اس قسم کے لانے ہونگے جو کہ مکان کو مکلف رکھنا وہاں ایک ضروری اور مہتم بالشان فرض ہی۔ **سوم** مہر کی مقدار بھی باہمی قرار داد سے پہلے ہی طے ہو جاتی ہی، کہ جس عام طور پر نکاح سے پہلے کل مہر لینے کا دستور ہی۔ کیونکہ دلہن کے لیے جہیز کا سامان اسی روپیہ سے خرید کیا جاتا ہی، اگر کل روپیہ نکاح سے پہلے ادا نہ کیا جائے، تو یہ ضروری ہی کہ نصف مہر نکاح سے پہلے ادا کیا جائے اور نصف بعد نکاح کے فوراً ادا کر دیا جائے، امرا اپنی لڑکیوں کے جو مہر باندھتے ہیں اسکی مقدار کا کچھ اندازہ نہیں ہو سکتا، مگر غریبوں میں عام طور پر مہر کی مقدار تیس چالیس ریال تک ہوتی ہی، یہاں بیوی اور شوہر میں اکثر اتفاق رہتا ہی، مگر خلع اور طلاق کے واقعات بھی اکثر سننے اور دیکھنے میں آتے ہیں،

عزیز الرحمٰن، عزیز

لیڈیز کانفرنس کی ضرورت

ترقی تعلیم نسواں کے بہی خواہوں کو یہ محسوس کرکے بہت مسرت ہوتی ہے کہ تقریباً اکثر نامور حصص ہندوستان کی عورتیں تعلیمی معاملات میں غور و فکر کی عادی ہو چلی ہیں، مضامین کے ذریعہ سے تبادلہ خیالات میں مشاقی پیدا ہو رہی ہے، عورتوں کے مخصوص پرچے ملک کی اس اہم ضرورت کو بتدریج پورا کرتے جاتے ہیں، عورتوں میں یہ مفید اُمنگ کچھ زیادہ دن نہیں ہوئے کہ پیدا ہوئی ہے اور رہنمایان قوم نے تھوڑا ہی زمانہ گذرا کہ شدومد سے قوم کی ابتری اور کاواک نشو و نما کو محسوس کرکے اعلیٰ تعلیم اور اعلیٰ تربیت اور تبادلۂ خیالات کے مفید ذریعے عورتوں کے لیے ضروری اور اشد ضروری ظاہر کیے ہیں۔ مدبران مصالح قومی کو مردوں میں اعلیٰ تعلیم اور جامع تربیت کے نشو و نما میں کچھ ایسی ناگزیر دقت پیش آئی کہ عورتوں کو گمنامی سے نکالنے اور حجاب اکبر کے بیش بہا جواہر کی طرف تحریض دینے کے لیے توجہ کرنا پڑی،

جہاں تک میں سمجھتا ہوں تیر بہدف تدابیر اصلاح قومی میں مایوسی اور سب جتن پورے کرنے کی تھکن اسکا باعث ہوئی، خادمان قوم نے ہر قسم کی تدبیریں (بدون شمول خواتین ہند) مردوں میں ترقی تعلیم درستی اخلاق و معاشرت کے واسطے کیں لیکن منتہائے کار یہ معلوم ہوا کہ جب تک قدرت کے شگفتہ پھول اپنی نیرنگیاں زیب نگاہ نہ کرینگے یہ چمن سجتا نظر نہیں آتا،

افسوس یہ جو انجام میں خیال کیا گیا تھا آغاز میں سوچ کر عمل پیرا ہونے کی چیز تھی، کھلی ہوئی بات ہے کہ ہر شخص کی عمر کا اصلاح پذیر حصہ بلکہ بعض بعض مقامات پر اس سے بھی زیادہ زمانہ عورتوں ہی کے زیر پرورش و نگرانی بسر کرنا پڑتا ہے، لڑکا اور پھر ہندوستانی لڑکا فطرتی طور پر مدت مدید تک ماں بہن خالہ پھوپھی چچی ہی سے بسی ہوئی دنیا کو دنیا سمجھتا ہے اور اس محدود حلقہ کے اخلاق و آداب تعلیم حسن معاشرت سے اس کے دماغی قوئ نشو و نما پاتے رہتے ہیں، ظاہر ہے کہ اگر اسی اہم دنیا

کی صاد تعلیمی بنیاد پر ہی تو لڑکا بھی اسی رنگ میں رنگ جائیگا اور اگر ایسا نہیں ہی تو لڑکے کو بھی "ہوا بتا دے" کے سبق کا حافظ سمجھو،

ہاں تو میری غرض یہ ہی کہ مدبران قوم نے بہت دیر میں پورے طور پر عورتوں کی تعلیم کے مسئلہ کو طے کیا اور ہندوستانی پبلک خصوصاً مسلمانوں کی جامع ترقی کے لیے آخری علاج یہی تجویز کیا۔ اس درنگ کاری کی تلافی ممکن ہی مگر نہ اس رفتار کے ساتھ جو اس سرد مزاج والی صنف انسانی نے اس وقت اختیار کی ہی:

ذرا غور کرو کہ ہر سال ہندوستان میں کتنی لڑکیاں اور لڑکے وجود پذیر ہوتے ہیں اور اس سے بہت سے اُن کی نشو ونما اور عورتوں کے سالانہ معیار اصلاح اخلاق و ترقی تعلیم کو قیاس کرو، پورے غور کے بعد تم مایوس ہو جاؤ گے اور یقین کرنے لگو گے کہ بس وقت نکل گیا۔ اب اگر عورتیں تعلیم بھی پائیں تو نو سو برس تک تو ملک میں وہ برکات اور روشنیاں نہیں نظر آسکتی ہیں جو ایک تعلیم یافتہ ملک میں نظر آنا چاہیے۔ مگر مایوسی ترقی کی دشمن اور کام کی بیرن ہے اسلیے کچھ نہ کچھ جو امکان میں رہ گیا ہی ضرور ہونا چاہیے،

اس کی تدبیر یہ ہی کہ ہندوستان کی عورتوں کی رفتار تعلیم تیز کر دی جائے اور یہ ممکن نہیں جبتک کہ تعلیم یافتہ عورتیں غیر تعلیم یافتہ عورتوں سے نہ ملیں اور انکے ذہن میں فوائد تعلیم ذہن نشین نہ کر دیں اور ایک دوسرے کے تبادلۂ خیالات سے سارے دماغ نہ متاثر ہوں محض ہر مہینہ میں دو چار پرچوں میں چند عورتوں کے مضامین کا شائع ہو جانا میرے نزدیک عورتوں کی ترقی کا حامی نہیں ہو سکتا اور تحریص در یس اس قوم میں نہیں پیدا ہو سکتی جو ضروری وسہل الحصول ہی بشرطیکہ عورتوں ہی کی طرف سے ہو، ایک ہندوستانی بیوی جس طرح اپنے ہمجنس کو دیکھکر رشک کرتی ہی اور اس جیسی بننے کی کوشش کرتی ہی، مشکل سے دوسرے جنس کی کسی قول وفعل سے متاثر ہوگی اسلیے کہ جنس مقابل مردوں کے متعلق تو سیدھی سادی سوزنی طبیعتیں یہ طے کر چکی ہیں کہ "اللہ رکھے تم مرد وے ہو ہم لوگ تمہاری برابری

کیا کر سکتے ہیں"

غرض اسی اصول پر اس ابتدائی زمانہ میں جبکہ مردوں کے لیے بھی اس قسم کے مشکلات درپیش تھے آنریبل سید احمد خاں مرحوم نے ایجوکیشنل کانفرنس کا نسخہ تجویز کیا، اس میں شک نہیں کہ یہ نسخہ شیر مادر ہو کے رہا۔ اگر خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ملک میں تعلیم کے شوقین اور زبان آوری میں مشاق فیصدی نوے تو اس نسخہ کے سریع الاثر ہونے کا نتیجہ ہیں۔ قوم کی بھلائیوں کے سوچنے کی نوبت جو آئی اور قوم کی برائیاں جو محسوس ہونے لگیں یہ محض کانفرنس کا صدقہ ہے ورنہ تہذیب الاخلاق اور دیگر پرچے آخر مسلمانوں کے مضامین سے بریز ہوتے تھے مگر جبتک کہ دو بدو کی نوبت نہ آئی کچھ اصلاح نہ ہو سکی۔

اس طور پر ضرورت اس کی ہے کہ عورتوں کے لیے بھی وہی نسخہ تجویز کیا جائے اور ایک آل انڈیا زنانہ ایجوکیشنل دمومیشن کانفرنس قایم کی جائے۔ ماشاء اللہ ملک میں اسوقت بہت کی قابل و لایق خواتین موجود ہیں۔ ثروت کے لحاظ سے بھی ایسی ایسی ہیں جو لندن کی ڈچز کہی جا سکتی ہیں یہ لوگ سکرٹری پریسیڈنٹ پیٹرن ممبر ہو کر ہر سال نئے نئے شہروں آباد بستیوں میں کانفرنس کے اجلاس کریں اور اُن عورتوں کو جو ابتک تعلیم و اصلاح رسوم کی ترکیب لفظی سے بھی واقف نہیں آدمی بنائیں ان میں جائز رشک و تعلیمی تحریص پیدا کریں۔

عورتیں جب اپنی بہنوں کو اس طرح مضمون آفریں، اصلاح رسوم کی دلدادہ و عامل دیکھینگی تو میرا عقیدہ ہے کہ بغیر مزید کوشش کے ان میں وہ روح پیدا ہو جائے گی جو ہر تعلیم یافتہ ملک کے جاندار افراد انسانی میں ہوتی ہے۔ ابھی تک تو اچھی سمجھدار عورتیں بھی اس شبہ میں ہیں کہ بعض پرچوں میں جو مضامین عورتوں کے نظر آتے ہیں وہ فی الحقیقت انہیں کے قلم و دماغ کا نتیجہ ہیں یا اعزا و اقربا ذکور میں سے کوئی اُن کے نام سے چھپوا دیتا ہے۔

خود مجھ سے اور اس قسم کی فہمیدہ عورتوں سے جھک جھک ہو چکی ہے مگر اُن کو یقین ہی نہیں آتا۔ یہ اسلیے کہ ممند جہالت و نارشیدگی عورتوں کے لیے طبیعت ثانی ہو گئی ہے

اور وہ بھول گئی ہیں کہ ہم بھی لائق ہو سکتے ہیں ہم میں بھی وہی قابلیت ہے جو مردوں کو عطا ہوئی ہے، ایک ذرا توجہ کی دیر ہے

اس کانفرنس سے عورتوں کے اس قسم کے شبہات بھی رفع ہونگے جسکا نتیجہ شوق تحصیل علم تو بدیہی ہے تبادلہ خیالات اور میل جول سے جو ضمنی سیکڑوں فائدے ہونگے وہ طرفہ برآں اور عورتوں کا میل جول، بقول مسٹر گلیڈ اسٹن "دس عورتوں کا متفقہ مجمع سیکڑوں مردوں کی متحدہ جماعت سے زیادہ قوی ہوتا ہے"

میں یہ نہیں کہتا کہ یہ کانفرنس آج ہی اس اعلیٰ پایہ پر نظر آئے جیسی مردوں کی کانفرنس ہے اسلیے کہ یہ ممکن ہی نہیں اُس کانفرنس کی ابتدا بھی کچھ ایسی شاندار نہ تھی، شروع شروع میں خدا بخشے سر سید اپنے حواریوں اور دو چار تابعین میں تقریریں کر دیتے تھے، مگر رفتہ رفتہ ترقی ہونی شروع ہوئی اور بڑھے گی،

ابھی میں نے ایک تجویز کی صورت پیش کی ہے، اگر ملک کی خواتین نے اسکو بنظر استحسان دیکھا تو میں آیندہ کسی مضمون میں اس کانفرنس کے چند ادامر و نواہی بھی لکھونگا، امید ہے کہ تعلیم یافتہ خواتین ہند ضرور ہر پہلو پر غور فرمائیں گی، اور اپنے خیالات کا اظہار کرینگی،

امین احسن رضوی
(الناظر)

بقیہ شاہ لیر

(لیر معہ گلاسٹر کے پھر سٹیج پر آتا ہے)

لیر تو کیا وہ مجھ سے باتیں کرنے سے گریز کرتے ہیں! ہاں تو کیا وہ بیمار ہیں؟ ہاں تو کیا وہ تھک گئے ہیں؟ ہاں تو کیا رات بھر انہوں نے سفر کیا ہے! یہ محض بہانے ہیں، یہ ٹالنے کی غرض

سے باغیانہ جھکے ہیں، جاؤ میرے لیے کوئی شافی جواب لے آؤ،

گلاسٹر۔ حضورِ انور۔ یہ تو حضور جانتے ہی ہیں اور شاہزادہ کے غصیلے مزاج سے حضور واقف ہی ہیں کہ وہ اپنی ہٹ کے کیسے پکّے ہیں اور جس بات کا وہ ارادہ کر لیتے ہیں اُس سے ٹلنا جانتے ہی نہیں،

لیر۔ غضب خدا کا۔ موت! بیماری! اور انقلاب! غصیلے! مزاج! کیوں گلاسٹر۔

گلاسٹر، سنو جی۔ میں اس شاہزادہ کارنوال اور اس کی بیوی سے باتیں کرنا چاہتا ہوں،

گلاسٹر۔ ہاں حضور مہربان، میں نے بھی تو ان کو اسی بات کی اطلاع دی ہے،

لیر۔ اطلاع دی ہے! ارے تم مجکو پہچانتے ہو کہ میں کون ہوں،

گلاسٹر۔ ہاں حضور مہربان، پہچانتا ہوں،

لیر۔ جاکر اُن سے کہو کہ بادشاہ کارنوال سے باتیں کرنا چاہتا ہے، اور شفیق باپ اپنی بیٹی سے باتیں کرنا چاہتا ہے۔ اور ان دونوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ فرماں برداری کریں، کیا اس بات کی بھی ان کو اطلاع ہوگئی؟ مجھے اپنے سانس اور اپنے خون کی قسم! غصیلے! غصیلے شاہزادے! ان آتش فشاں شاہزادے صاحب سے جاکر کہیے۔ نہیں نہیں ابھی نہ کہیے، ممکن ہے وہ واقعی بیمار ہو، کیونکہ بیماری میں ہم اکثر ان کاموں کو انجام نہیں دیسکتے جنکا انجام دینا تندرستی کی حالت میں ہمارا فرض ہوتا ہے۔ انسان کا جسم جب بیمار ہوتا ہے اور اُسکے ساتھ اسکا دل بھی پریشان ہوتا ہے، تو ایسی حالت میں ہم کبھی اپنے معمولی کاموں کو بھی انجام نہیں دیسکتے، اسلیے میں ذرا تامل کرنا چاہتا ہوں، کیونکہ شاید میں نے جلد بازی اور غصہ کی حالت میں ایک بیمار آدمی کو تندرست سمجھ لیا ہو،

(کینٹ کی طرف دیکھکر)

ہائے میری سلطنت کی تباہی اور بربادی پھر یہ میرا ملازم قید میں کیوں بٹھایا گیا ہے

ان کے اس فعل سے مجھے اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ اسوقت شاہزادہ اور میری بیٹی بہانہ کیے ہوئے ہیں۔ اب میرا ملازم مجکو فوراً واپس ملنا چاہیے۔ اور شاہزادہ اور اس کی بیوی سے کہدو کہ میں ابھی فوراً اُن سے ملنا چاہتا ہوں۔ ان کو حکم دو کہ وہ فوراً باہر چلے آئیں، ورنہ ان کے خواب گاہ کے کمرے کے قریب میں اس طرح سے نقارے بجواؤنگا کہ ان کی نیند و آرام سب خاک میں ملجا ئینگے،

گلاسٹر۔ میرا دل چاہتا ہے کہ اب سب میں صفائی ہوجائے،

(قلعہ میں چلا جاتا ہے)

لیر۔ او خدا، او میرے دل، او میرے دریا کے مثل اُمنڈنے والے جوش، ذرا تو ٹھیرا رہ،

دیوانہ۔ چچا جان چلّائے جائیے چلّائے جائیے، تمہاری بھی وہی مثال ہو کہ کسی نے زندہ مچھلیوں کو کڑھائی میں ڈالا تھا اور جب وہ تڑپ تڑپ کر اُچھلنے لگیں تو لکڑی لیکر انکے سر پر مارتا تھا اور کہتا جاتا تھا کہ شرارت کی پتلیو بیٹھ جاؤ۔ بیٹھ جاؤ، اور اسی طریقہ کے ایک اور بھی عقلمند تھے جنہوں نے گھوڑے پر مہربان ہو کر اس کی گھاس میں مکھن ملکر کھلانا شروع کیا تھا،

(کارنوال، ریگن، گلاسٹر اور ملازمین اسٹیج پر آتے ہیں)

لیر۔ آپ دونوں کی خدمت میں سلام،

کارنوال۔ ہم حضور عالی کا خیر مقدم کرتے ہیں،

(کینٹ کو آزاد کر دیا)

ریگن۔ میں حضور عالی کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی،

لیر۔ ریگن! میں جانتا ہوں تم ضرور خوش ہوئی ہوگی، اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس خوشی کے وجوہات بھی ہیں اور اگر تم ایسا نہ کرتیں تو میں تمہاری ماں کے مرنے کے بعد اسکو طلاق دیتا کہ

اس سے میرے ساتھ بیوفائی کی،

ڈیکینٹ کی طرف مخاطب ہوکر، ہاں تم آزاد ہوگئے، اچھا اسکے متعلق پھر گفتگو کرینگے،

پیاری ریگن تمہاری بہن نے کیا ظلم ڈہایا، او ریگن میں تم سے کیا بیان کروں کہ اسنے اپنے ناشکرگزاری اور بہیری کے تیز خونخوار دانت مثل گدہ کے بچوں کے (اپنا دل کھاکر) چبھو دیے ہیں۔

میں مشکل سے اپنے خیالات تم سے ظاہر کرسکتا ہوں تم اسکو سمجھ بھی نہیں سکوگی کہ اس نے کس نالایقی سے۔ او ریگن!

ریگن۔ حضور میں امید کرتی ہوں کہ آپ ذرا تامل اور برداشت سے کام لینگے، مجھے اس بات کا یقین ہی کہ ریگن نے اپنے فرائض کے ادا کرنے میں اتنی کوتاہی نہیں کی ہوگی جتنی کہ حضور نے اس کی قابلیت کی قدر میں کوتاہی کی ہوگی،

لیر۔ ذرا یہ تو بتاؤ کہ تم یہ کیسے کہتی ہو،

ریگن۔ میں اس بات کا یقین نہیں کرسکتی کہ میری بہن نے اپنے فرض کی ادائگی میں ذرہ برابر بھی کوتاہی کی ہوگی، اور اگر اتفاقاً آپ کے ہمراہیوں کی شورہ پشتی اور غدر روکنے کے متعلق اسنے کوئی کارروائی کی ہو تو اسکے معقول وجوہات موجود ہیں، اسوجہ سے اسپر کوئی الزام عائد نہیں ہوسکتا،

لیر۔ خدا کرے میری بددعائیں اسکو اپنا نشانہ بنائیں،

ریگن۔ حضور آپ بڈہے ہیں اور آپ کی عمر اب حد طبعی کو پہنچ چکی ہی، اب یہ انتہائے خاتمہ پر ہی، اب آپ کو کسی ایسے شخص کی صلاح پر چلنا چاہیے جو آپ کی حالت کو آپ سے بہتر جانتا ہو، اسلیے میں آپ سے التجا کرتی ہوں کہ ابھی لوٹ کر میری بہن کے یہاں جائیے اور اُن سے معافی مانگیے کہ آپنے غلطی کی ہے،

یر کیا جاکر میں معافی مانگوں! کیا تم نے اسپر غور کرلیا ہی کہ خاندان پر اسکا کیا اثر ہوگا، پیاری بیٹی
یں اعتراف کرتا ہوں کہ میں بڈھا ہوں، اور بڑھاپے میں آدمی سب کو بیکار اور فضول معلوم
ہونے لگتا ہی۔ اب میں تمھارے سامنے سجدہ کرتا ہوں،

(سجدہ میں گرگیا)

کہ آپ مجھ پر کرم کیجیے، اور مجکو کپڑا، بچھونا اور کھانا دیجیے،

ریگن سُنیے صاحب! اس قسم کی باتیں مجھے اچھی نہیں معلوم ہوتیں، یہ نہایت ناپسندیدہ
جو سچے ہیں، سیدھے جائیے۔ ابھی لوٹ کر میری بہن کے پاس جائیے۔

یر (سجدہ سے کھڑا ہوکر) نہیں ریگن، کبھی نہیں، ایسا نہیں ہوگا، اس نے میرے نصف
ہمراہیوں کو موقوف کردیا ہے۔ میری طرف نہایت چیں بجبیں ہوکر دیکھتی تھی۔ اپنی زبان درازی
سے جو مثل سانپ کے زہریلے دانتوں کے ہے میرے اس دل کو اُس نے زخمی کیا ہے، وہ
تمام انتقامات جو اسوقت تک آسمان سے کسی پر نازل نہیں ہوئے۔ وہ اس ناشکرگذار کے سر پر
نازل ہوں۔ اور زہریلی ہوا، تو اس کی جوانی کی ہڈیوں کو صدمہ پہنچا کہ وہ لنگڑی اور لولی
ہو جائے،

کارنوال شرم شرم صاحب!

یر او تیز رفتار بجلی اپنی آنکھوں کے چندھیانے والے شعلوں کو اُس کی نفرت انگیز آنکھوں پر گرا،
اور اس کی خوبصورتی کو صدمہ پہنچا، او دلدل میں سے نکلی ہوئی زہریلی ہوا جسکو سورج
کی زبردست کرنوں نے اوپر کھینچا ہی، تو جا کر اُس کے مغرورانہ جسم پر گر کر اس کو خاک
میں ملا دے،

یگن او خدا! کیا جس وقت ان کو غصہ آئیگا تو اسی قسم کے کوسنے یہ مجکو بھی دینگے!
یر نہیں ریگن نہیں، نہیں میں کبھی نہیں کوسونگا، تمہارا نازک اور مہربان دل کبھی تم کو مجھ پر
سختی کرنے پر مائل نہ کریگا، گانرل کی آنکھیں نہایت تند ہیں، لیکن تمہاری آنکھوں سے مہربانی

تپکتی ہو، اور آگ نہیں نکلتی ہے، تم میں یہ بات نہیں ہے کہ تم میری خوشی سے جلو گی، میرے ہمراہیوں کو کم کر دو گی، مجکو گستاخانہ جواب دو گی، میری باتوں کو حقارت سے دیکھو گی اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مجکو گھر میں آتے دیکھکر دروازہ نہیں بند کر لو گی۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ تقاضائے فطرت کیا ہونا چاہیے۔ بچوں کو ماں باپ سے کیا سلوک کرنا چاہیے، مہربانی اور محبت کا کیا اثر ہونا چاہیے، اور ایک شکرگذار دل کو کیا کرنا چاہیے، تم غالباً یہ نہیں بھولی ہو گی کہ تم کو میں نے آدھی سلطنت دی ہے،

ریگن۔ صاحب مطلب کی بات کہیے۔

لیر۔ میرے آدمی کو کس نے کاٹھ میں قید کیا تھا،

کارنوال۔ یہ بگل کی آواز کہاں سے آ رہی ہے،

ریگن۔ مجھے معلوم ہو گیا یہ میری بہن کا بگل ہے۔ انہوں نے لکھا تھا کہ وہ بھی اپنے قاصد کے بعد ہی یہاں پہونچیں گی۔ اس سے ان کی تحریر کی تصدیق ہوتی ہے،

(آسولڈ اسٹیج پر آتا ہے)

آسولڈ۔ کیا حضور عالیہ تشریف لے آئیں،

لیر۔ یہ وہی غلام ہے، وہی غلام ہے، جسکا غرور جلد ابل پڑتا ہے۔ اور جسکے غرور کا انحصار اس متلون مزاج کی مہربانی پر منحصر ہے جسکے پیچھے پیچھے چلتا ہے، چل او ادنیٰ غلام چل میری آنکھوں کے سامنے سے دور ہو جا،

کارنوال۔ کیا مطلب ہے آپ کا حضور،

لیر۔ بتاؤ میرے آدمی کو کس نے قید کیا تھا۔ ریگن! مجھے امید ہے کہ تم نے ایسا نہ کیا ہو گا اور نہ تم اسکو جانتی ہو گی، یہ کون آ رہا ہے،

(گانرل اسٹیج پر آتی ہے)

لیر۔ او خدا! اگر بڈھے آدمیوں پر تو کچھ بھی مہربان ہے، اگر آپ بھی چاہتے ہیں کہ اپ

یہاں حکومت کی لوگ فرماں برداری کریں. اگر آپ بھی بڈھے ہیں تو جو کچھ مجھپر سختی ہوئی
ہے اسکو آپ یہ سمجھیے کہ آپ ہی پر ہوئی ہے. آئیے اور اگر میری جانب داری سمجھیے (گانزل
کی طرف مخاطب ہو کر) کیا تم اس ڈاڑہی کو دیکھکر کچھ شرمندہ نہیں ہوئیں؟ اور جگن! کیا تم
اس سے ہاتھ ملانا پسند کرتی ہو،

(باقی آیندہ)

اڈیٹوریل

گوالیار میں تعلیم نسواں. خوشی کی بات ہے کہ ہز ہائنس حضور مہاراجہ صاحب گوالیار نے اپنی
ریاست میں تعلیم نسواں کے پھیلانے کی طرف خاص توجہ مبذول فرمائی ہے. مختلف سبھائیں
کے واسطے قائم کی گئی ہیں کہ لوگوں کو اپنی بہنوں بیٹیوں اور اگر مناسب ہو تو بیویوں کو بھی تعلیم
دلانے کی ترغیب دیں، سبھاؤں نے بڑا کام یہ کیا ہے کہ ان لوگوں کو انعام دینے تجویز کیے
ہیں جو اپنی بہو بیٹیوں کو تعلیم دلائیں، اور یہ انعامات سرکاری طور پر دیے جانے کی بابت
منظوری ہوگئی ہے، اس کوشش کا خاطر خواہ اثر سننے میں آیا ہے، اور اب حضور مہاراجہ صاحب نے
مزید حوصلہ افزائی کے لیے تعلیم یافتہ عورتوں کی شادی بیاہ میں ریاست سے مدد دینا تجویز فرمایا ہے
خدا ہز ہائنس کے نیک ارادوں میں برکت دے، بے شبہ آپنے تمام والیان ریاست کے لیے
ایک عمدہ اور نہایت ضروری اور مفید نظیر قائم کی ہے،

زنانہ نمایش. مقام نوساری (گجرات) میں یکم مارچ کو زنانہ دستکاریوں کی نمایش کھولی
گئی تھی، تاکہ تمام خاندانوں کو صنعت و حرفت اور فنون لطیفہ کے ساتھ دلچسپی ہو. یہ
نمایش شیر والی پارک میں جو نہایت موزوں اور دلفریب جگہ ہے تھی، ۴. مارچ کو آخری

اسکے علاوہ ہندوستان کے بعض مشاہیر وغیرہ کی اور سات تصویریں ہیں، ہمیں امید ہے کہ اردو کی ادبی دنیا میں زمانہ ایک بے نظیر وقعت حاصل کریگا،

فیوضات یعنی حصہ اول مکتوبات مولانا محمد یعقوب علیہ الرحمہ دیوبندی، جناب حکیم امیر احمد صاحب عشرتی صدیقی نے شائع کیا ہے۔ مولانا موصوف علیہ الرحمہ کے نام سے ہندوستان کے غالباً تمام لوگ واقف ہیں۔ مولانا ان مقبول بزرگوں میں سے ہیں جو علم ظاہری اور باطنی دونوں میں کمال رکھتے تھے،

ان کے ان خطوط میں نصائح اور اخلاق اور تصوف اور قرآن کے اسرار بھرے ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کو عام طور پر ان مکتوبات سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ انکے دیکھنے سے نور ایمان اور دل کا اطمینان بڑہتا ہے۔ لکھائی، چھپائی معمولی تعداد صفحات ۵۲ قیمت ۶/

ملنے کا پتہ حکیم امیر احمد صاحب عشرتی صدیقی نانوتوی بالائی قلعہ علی گڈھ

رقومات مندرجہ ذیل تعلیم نسواں فنڈ میں وصول ہوئیں۔ عطا کنندگان کے اسمار گرامی نہایت شکریہ کے ساتھ درج کیے جاتے ہیں۔

۱۔ عطیہ گورنمنٹ گجرات از یکم اپریل ۱۹۱۰ء لغایتہ ستمبر ۱۹۱۰ء ال صہ / ۱۴ ، ۱۱ ء
۲۔ جناب منشی عبدالعزیز صاحب ہیڈ کلرک سپلائی آفس نوشہرہ لہ عہ
۳۔ جناب دختر امجد اللہ شاہ صاحب نائب تحصیلدار .. .. للعہ /
۴۔ عطیہ ریاست ٹونک از ستمبر ۱۹۰۹ء لغایتہ نومبر ۱۹۰۹ء .. .. ماصہ
۵۔ جناب لالہ بالکشن صاحب راولپنڈی .. .. لہ عہ
۶۔ جناب بنت نصیرالدین حیدر صاحبہ حیدر آباد دکن .. .. لہ عہ

۷۔ جناب ڈاکٹر الٰہی بخش صاحب سولور ملک کشمیر ۔۔ ۔۔۔ ۔۔ ۔۔ عمر/

۸۔ عطیہ ریاست خیرپور بابتہ ۱۹۰۹ء ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ سما/

۹۔ عطیہ ریاست بہاولپور ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ سما/

۱۰۔ عطیہ ریاست بھوپال بابتہ ۱۹۰۹ء ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ال مار

۱۱۔ جناب بیگم صاحبہ مسٹر ممتاز اللہ خاں صاحب رامپور اسٹیٹ ۔۔۔ عـــہ

۱۲۔ عطیہ گورنمنٹ گرانٹ بابتہ ماہ اکتوبر ۱۹۰۹ء ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ لــہ

۱۳۔ عطیہ جناب ہمشیرہ زوجہ امجد علی شاہ صاحب نائب تحصیلدار ۔۔۔ للعہ/

۱۴۔ عطیہ گورنمنٹ گرانٹ بابتہ ماہ نومبر ۱۹۰۹ء ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ لــہ ۸/

۱۵۔ ابونصر محمد احمد اللہ صاحب مہاجن کاچی گوڑ حیدرآباد دکن ۔۔۔۔ صہ/

۱۶۔ عطیہ گورنمنٹ گرانٹ بابتہ ماہ دسمبر ۱۹۰۹ء ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ للعہ

۱۷۔ سید خورشید علی صاحب حیدرآباد دکن ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ مے ۶/

۱۸۔ عطیہ گورنمنٹ گرانٹ بابتہ ماہ جنوری ۱۹۱۰ء ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ علعہ ۶/۶/۹

۱۹۔ ” ” بابتہ ماہ فروری ۱۹۱۰ء ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ مہ لعہ ۸/

مندرجہ ذیل رقومات وظائف نقدیں وصول ہوئیں۔

۱۔ مسز حشمت اللہ صاحبہ از گوالیار۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ عمر/

۲۔ ” ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ عمر/

۳۔ جناب بیگم صاحبہ نواب وقار الملک بہادر ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ صہ/

بی جی کی خوشی

اس نام کا ایک رسالہ مولود شریف پر جناب مسزب صاحبہ بدایوں سے ترتیب دیا ہے جو ہمارے پاس واسطے ریویو کے آیا ہے. مسزب صاحبہ مسز نظامی صاحبہ بدایونی ہیں۔ ہم کو رسالہ کی ترتیب دیکھنے سے معلوم ہوا کہ مسز نظامی صاحبہ نے اپنے قابل شوہر مولوی نظامی صاحب کی صحبت سے بہت کچھ فیض حاصل کیا ہے۔ اور ہم انکے اعلیٰ مذاق کے بالکل قائل ہیں اور ہم دل سے تعریف کرتے ہیں۔ یہ رسالہ محض میلاد میں بیویوں کے پڑھنے کیلیے بہت موزوں ہے۔ اور ہم سفارش کرتے ہیں کہ ہماری ناظرات اسکو منگوا کر پڑھیں اور اپنے یہاں کی محافل میں اسکو رواج دیں۔ ہم نے اور بھی بہت سے رسالے مولود شریف پر دیکھے ہیں. لیکن ہمارے نزدیک بیویوں کے پڑھنے کے لیے یہ سب سے بہتر مولود شریف ہے، قیمت ۱۰/ نظامی پریس بدایوں سے ملسکتا ہے،

لڑکوں پر زنانہ صحبت کا اثر مسٹر الگزینڈر فرانسس ایک انگریز مصنف نے امریکہ کے تمدنی و تعلیمی حالت پر ایک مبسوط کتاب اندنوں چھپوائی ہے، جس سے امریکن سوسائٹی کی بہت سی پوشیدہ باتوں پر روشنی پڑتی ہے، مسٹر فرانسس ظاہر کرتے ہیں کہ یونائیٹڈ سٹیٹس میں لڑکوں کو لڑکیوں کے ساتھ پڑھنے اور زنانہ معلمین سے تعلیم پانے کی وجہ سے سخت نقصان پہونچ رہا ہے۔

۱۸۷۰ء میں امریکہ کے پرائمری اور سیکنڈری مدارس میں ۷۷ ہزار مرد اور ایک لاکھ ۲۲ ہزار عورتیں معلم تھیں، اس زمانہ کی نسبت اب مردوں کی تعداد ۳۹ ہزار زیادہ ہوگئی ہے لیکن عورتوں کی تعداد نے قریباً سوا دو لاکھ کی ترقی پائی ہے جسکا نتیجہ یہ ہے کہ آجکل ۱۰۹۰۰۰ مرد

اور ۳۵۶۰۰۰ عورتیں امریکہ کی نئی نسل کو ابتدائی اور سیکنڈری تعلیم دے رہی ہیں اور لڑکے
اتنا پائے جاتے ہیں کہ زنانہ معلمین کا تناسب ان کی کم تنخواہ کے باعث روز بروز بڑھتا
جائیگا۔ عورتوں کا پرائمری مدارس میں خورد سال بچوں کو تعلیم دینا تو ہر طرح طمانیت بخش بلکہ مردوں سے
بہتر ہے لیکن مسٹر فرانسس اسکو بہت قابل اعتراض سمجھتے ہیں کہ اٹھارہ سال کے لڑکے عورتوں
کے زیر تعلیم ہیں۔ جن کلاسوں کو عورتیں تعلیم دیتی ہیں اُن میں لڑکوں کو لڑکیوں کے ساتھ
ایسے مضامین پڑھائے جاتے ہیں جو زیادہ تر لڑکیوں کے لیے موزوں ہیں۔

اس کے علاوہ لڑکوں کو زنانہ معلمین کے ہاتھوں وہ تربیت بھی حاصل نہیں ہوتی جو
لڑکیوں کو ملتی ہے۔ لڑکوں کی تعداد عموماً جماعت میں کم ہوتی ہے اور کثرت کی تقلید کا ناقابل
انسداد رجحان اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے۔ اسلیے لڑکے لڑکیوں کی ایک ادنیٰ نقل رہجاتے
ہیں یعنی اُن میں لڑکیوں کی نرمئ طبیعت اور ذی حس ہونے کی صفت تو آجاتی ہے مگر مردانہ
اوصاف کا نشوونما نہیں ہونے پاتا۔

مسٹر فرانسس نے لڑکوں اور لڑکیوں کی یکجائی خواندگی اور زنانہ معلمین کی تربیت کے
بارہ میں جو خیال ظاہر کیا ہے وہ نیا نہیں ہے بلکہ جرمنی کے بعض حصوں کی ایسی ہی تعلیمی سسٹم
کے متعلق وہاں کی سرکاری کمیشن تحقیقات بھی قریب قریب اسی قسم کی رائے ظاہر کر چکی ہے
جس سے وہاں کے اکثر تعلیمی ارگنوں نے اتفاق کیا تھا۔ ہندوستان کے پبلک مدارس
میں زنانہ معلمین کا داخلہ ابھی شروع نہیں ہوا ہے۔ اور تعلیم نسواں کی قلت کو دیکھتے ہوئے
سالہا سال تک اسکا اندیشہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن بنگال و دکن کے بعض مقامات میں
لڑکوں اور لڑکیوں کی یکجائی تعلیم جاری کر دی گئی ہے اور شمالی ہند میں بھی اس مشترکہ تعلیم کے
کچھ حامی پیدا ہو گئے ہیں۔

اس لیے ہم اُن احباب کو مسٹر فرانسس کے مذکورۂ صدر بیان پر توجہ دلاتے ہیں اور
جناب مولوی عبد الجبار صاحب سی۔ آئی۔ ای کے الفاظ جو انہوں نے پچھلے سال

بنگال لیک بہادر نشیں محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کے پریسیڈنشیل ایڈریس میں فرماتے ہیں
بتانا چاہتے ہیں کہ مشرق میں لڑکوں اور لڑکیوں کی جداگانہ تعلیم کا قدیم رواج بڑی مصلحت
پر مبنی ہے اور ہندوستان کی مجلسی پاکیزگی کے لیے وہ دن بڑا منحوس ہوگا جبکہ ہماری لڑکیاں
(خدانخواستہ) لڑکوں کے پہلو بہ پہلو مدارس میں تعلیم پاتی نظر آئیں۔

سنہ ۱۹۰۴ء میں تعلیم نسواں کے بارہ میں صوبہ جات متحدہ کو گورنمنٹ نے ایک کمیشن مقرر
کیا تھا جس کی مفصل رپورٹ سنہ ۱۹۰۵ء میں گورنمنٹ گزٹ میں شائع ہوئی اور جسکو گورنمنٹ نے
منظور کیا۔ اور جس پر لڑکیوں کی تعلیم کی پالیسی پر مبنی کی گئی ہے اس میں ایک بحث یہ بھی تھی کہ
آیا اوائل عمر میں لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم ایک ساتھ ہونی چاہیے یا نہیں۔ بعض ممبروں کی یہ
رائے تھی کہ ضرور ساتھ ہونی چاہیے،

لیکن خاکسار ایڈیٹر اور دو تین اور ممبروں نے اس کی سخت مخالفت کی کہ لڑکے اور لڑکیاں
کی ایک ساتھ تعلیم ہونے سے بہت سے نقصانات کا احتمال ہو سکتا ہے۔ لہذا کسی عمر کے بھی لڑکے
اور لڑکیوں کی ایک ساتھ تعلیم نہ ہونی چاہیے۔

اسی رائے کے موافق فیصلہ ہوا اور گورنمنٹ نے بھی اسی رائے کو پسند فرمایا ہم مطلوبین
مذکورہ بالا سے بالکل متفق ہیں،

رجسٹرڈ نمبر اے ۲۷۱

خاتون

جلد ۶	بابت ماہ اپریل سنہ ۱۹۱۰ء	نمبر ۴

اڈیٹر شیخ محمد عبداللہ بی اے۔ ایل ایل بی سکرٹری تعلیم نسواں سکشن

فہرست مضامین

محمد عبدالسلام پرنٹر کے اہتمام سے
مطبوعہ فیض عام پریس علی گڈہ
۸ اپریل سنہ ۱۹۱۰ء

خاتون

۱- یہ رسالہ ۴۰ صفحے کا علیگڈھ سے ہر ماہ میں شائع ہوتا ہی اور اسکی سالانہ قیمت (عے؍) اور ششماہی عہ۱۲؍ ہے

۲- اس رسالہ کا صرف ایک مقصد ہی یعنی مستورات میں تعلیم پھیلانا اور پڑھی لکھی مستورات میں علمی مذاق پیدا کرنا۔

۳- مستورات میں تعلیم پھیلانا کوئی آسان بات نہیں ہی اور جبتک مرد اس طرف متوجہ نہو نگے مطلق کامیابی کی امید نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ اس خیال اور ضرورت کے لحاظ سے اس رسالہ کے ذریعہ سے مستورات کی تعلیم کی اشد ضرورت اور بے بہا فوائد اور مستورات کی جہالت سے جو نقصانات ہورہے ہیں اُس کی طرف ہمیشہ مردوں کو متوجہ کرتے رہینگے۔

۴- ہمارا رسالہ اس بات کی بہت کوشش کریگا کہ مستورات کے لیے عمدہ اور اعلیٰ لٹریچر پیدا کیا جائے۔ جس سے ہماری مستورات کے خیالات اور مذاق درست ہوں اور عمدہ تصنیفات کے پڑہنے کی ان کو ضرورت محسوس ہو تاکہ وہ اپنی اولاد کو اس بڑے لطف سے محروم رکھنا جو علم سے انسان کو حاصل ہوتا ہی معیوب تصور کرنے لگیں۔

۵- ہم بہت کوشش کرینگے کہ علمی مضامین جہانتک ممکن ہو سلیس اور بامحاورہ اُردو زبان میں لکھے جائیں۔

۶- اس رسالے کی مدد کرنے کے لیے اسکو خریدنا گویا اپنی آپ مدد کرنا ہی اگر اس کی آمدنی سے کچھ بچیگا تو اس سے غریب اور یتیم لڑکیوں کو وظائف دیکر استانیوں کی خدمت کے لیے تیار کیا جائے گا۔

۷- تمام خط وکتابت و ترسیل زر بنام اڈیٹر خاتون علیگڈہ ہونی چاہیے۔

خواتین

ام سلیمؓ

نام رمیصا ہے، اور ملحان بن خالد کی بیٹی ہیں جو مدینہ کے باشندے اور انصار کے قبیلہ بنی نجار میں سے تھے، ان کی والدہ کا نام ملیکہ تھا۔ ولادت ہجرت سے تخمیناً تیس سال پہلے ہوئی تھی، ان کا نکاح انہیں کے قبیلہ کے ایک شخص کے ساتھ ہوا جنکا نام مالک تھا، انسے ایک لڑکا پیدا ہوا اسکا نام انس بن مالک رکھا۔

یہ انس وہی ہیں جنہوں نے دس سال تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینے میں خدمت گزاری کی، بڑے مشہور صحابیوں میں سے ہیں، بہت سی حدیثیں ان سے روایت کی گئی ہیں،

انسؓ ابھی دودھ پیتے تھے کہ مدینہ میں یہ خبر پہنچی کہ مکہ میں ایک نبی پیدا ہوا ہے، اور وہ اللہ کی طرف لوگوں کو بلاتا ہے، مدینہ سے لوگ سال بسال مکہ کو حج کے موقع پر جایا کرتے تھے، انہوں نے جب آنحضرت کو دیکھا اور کلام اللہ کی آیتیں سنیں تو ان میں سے بعض لوگ مسلمان ہو گئے۔

ام سلیم نے بھی انہیں مسلمانوں کی زبانی قرآن شریف کی آیتیں اور آنحضرت کے حالات سنے

ان کے دل میں بھی اسلام کی سچائی اثر کر گئی اور وہ مسلمان ہوگئیں ان کے شوہر مالک نے ان سے پوچھا کہ کیا تو بیدین ہوگئی؟ انہوں نے کہا کہ بیدین نہیں بلکہ دیندار ہوگئی، انسؓ کو بھی کلمہ سکھلانا شروع کیا، مالک بہت خفا ہوتے تھے کہ تونے خود بھی باپ دادا کے دین کو چھوڑ دیا اور میرے بیٹے کو بھی بگاڑنا چاہتی ہے۔ حضرت ام سلیم نے کہا کہ یہ تو خیر بچہ ہی میں تو یہ کوشش کرونگی کہ تم بھی اسلام کی سچائی سمجھو اور اللہ کی وحدانیت کا اقرار کرو،

اسی درمیان میں مالک کو کہیں باہر جانا پڑا۔ راستہ میں کسی دشمن نے ان کو قتل کر ڈالا حضرت ام سلیم کو انسؓ کے ساتھ کچھ معمول سے زیادہ محبت تھی، مالک کے مرنے کے بعد بہت سے لوگوں نے انکے ساتھ نکاح کرنے کی خواہش کی، لیکن انہوں نے کہا کہ جب تک میرا بیٹا اس قابل نہ ہوجائے کہ لوگوں میں بیٹھے اور مجلسوں میں گفتگو کرے اسوقت تک میں ہر قسم کی تنگی ترشی برداشت کرونگی اور نکاح نہ کرونگی۔ کیونکہ وہ یہ سمجھتی تھیں کہ سوتیلے باپ سے ممکن ہی کہ انس کو تکلیف ہو، چنانچہ حضرت انس بعد میں اپنی ماں کے اس احسان کو نہایت شکریہ کے ساتھ بیان کیا کرتے تھے، اور کہا کرتے تھے کہ میری ماں نے میری محبت اور تربیت کا حق ادا کردیا۔

جب آنحضرت مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ میں تشریف لائے اسوقت انس کی عمر دس سال کی تھی، ام سلیمؓ ان کو لیکر خدمت میں حاضر ہوئیں اور کہا کہ یا رسول اللہ اس بیٹے کو میں نے بڑی آرزوں سے پالا ہی، اور میری دلی تمنا یہ ہی کہ یہ آپ کی خدمت میں رہے، چنانچہ حضرت نے اس بات کو قبول فرمایا، اور اخیر عمر تک انسؓ خدمت گزاری کرتے رہے، یہی انسؓ بیان کرتے ہیں کہ دس سال تک میں نے رسالتمآب کی خدمت کی لیکن کبھی نہ فرمایا کہ انس تم نے ایسا کیوں کیا، ایسا کیوں نہ کیا۔

ام سلیمؓ جب انس کو حضور کی خدمت میں سپرد کر چکیں تو انہیں کے قبیلہ کے ایک معزز آدمی نے جنکا نام ابو طلحہ تھا نکاح کا پیغام بھیجا،

ام سلیم نے کہا کہ میں رسول اللہ پر ایمان لائی ہوں اور تو کافر ہے میں تیرے ساتھ کیوں کر نکاح کروں، ابو طلحہ افسوس ہے کہ تو بت کو پوجتا ہے، لکڑی کے بت کو پوجتا ہے جو زمین سے اُگتا ہے اور جسکو حبشی غلام بسولے سے گھڑ کر بناتا ہے، جو تجکو نہ نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان اور تو اس زندہ اور طاقتور اللہ کو نہیں پوجتا جس کی بادشاہت آسمان اور زمینوں میں ہے،

ابو طلحہ کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی، بُت کو توڑ کر چولہے میں جھونکا اور آنحضرت کے پاس جاکر کلمہ پڑھا،

چونکہ حضرت ام سلیم کے سمجھانے سے ابو طلحہ مسلمان ہوئے تھے اسوجہ سے ان کو اس بات کی نہایت خوشی ہوئی، اور بظاہر کے انکے ساتھ نکاح کرنے کو رضامند ہوگئیں چنانچہ ابو طلحہ کا اسلام ہی نکاح مہر قرار دیا گیا اور نکاح ہوگیا،

ان سے ایک بچہ پیدا ہوا جسکا نام ابا عمیر رکھا، یہ بڑا شوخ اور پیارا بچہ تھا،

آنحضرت کبھی کبھی ابو طلحہ کے گھر جایا کرتے تھے، ابا عمیر کی شوخیوں سے خوش ہوتے تھے ایک دفعہ آپ تشریف لے گئے، ام سلیم نے کچھ کھانا سامنے لاکر رکھا آپؐ نے تناول فرمایا، پانی پینے کے لیے کوئی برتن نہ تھا، مشکیزہ سے ہی موٹھ لگاکر پی لیا، ام سلیم نے مشکیزہ کا موٹھ جو حضورؐ کے دہن مبارک سے چھوگیا تھا برکت کے خیال سے فوراً کاٹ کر ایک ڈبیہ میں رکھ لیا۔ ابا عمیر اُس دن کچھ غمزدہ معلوم ہوتا تھا، آپؐ نے پوچھا کہ آج یہ کیوں سُست ہے، ام سلیم نے کہا کہ اسنے ایک نُغیر (مثل لال کے ایک چھوٹی سی چڑیا ہوتی ہے)، پالی تھی اسکے ساتھ کھیلا کرتا تھا آج وہ مرگئی۔ آپ مسکرائے اور قریب بلاکر اسکے سر پر ہات پھیرا اور فرمایا "یا ابا عمیر ما فعل النغیر" اے ابا عمیر تیری نغیر کیا ہوئی؟ بچہ ہنس پڑا،

یہی ابا عمیر بیمار پڑا، اور سخت بیمار پڑا، ایک دن صبح کو اس کی حالت زیادہ خراب ہوگئی ابو طلحہؓ کو اُس دن کوئی ضروری کام تھا مجبوراً جانا پڑا، ادہر لڑکا گذر گیا، ام سلیم نے گھر کے سب لوگوں کو منع کر دیا کہ ابو طلحہ کو اسکے موت کی خبر کوئی نہ دے، میں خود ہی اُنسے کہونگی

بچے کو نہلایا، کفنایا اور گھر کے ایک حجرہ میں اسکا جنازہ بند کر دیا، شام کو ابوطلحہ آئے ۔ آتے ہی پوچھا کہ بچہ کیسا ہے، ام سلیم نے کہا کہ جس حالت میں تم چھوڑ گئے تھے اس سے اچھی حالت میں ہے۔ وہ سمجھے کہ اب اچھا ہے۔ انکے سامنے کھانا لاکر رکھا جسے کھا پی کر فارغ ہوئے اور اطمینان کے ساتھ بیٹھے تو ام سلیم نے کہا کہ اگر ہم کو کوئی چیز عاریتاً ملے اور اس سے کچھ دن تک نفع اٹھائیں اور پھر وہ ہم سے واپس مانگی جائے تو کیا ہم کو رنج و غم کرنا چاہیے۔ حضرت ابوطلحہ نے کہا کہ وہ تو غیر کی تھی ہی اس پر رنج و غم کرنا حماقت ہے۔ ام سلیم نے کہا ابا عمیر بھی اللہ کی امانت تھا اب واپس لے لیا گیا۔ صبر کرو۔

ابوطلحہ نے جو یہ سنا تو کہا کہ اوہو، ام سلیم! تم چاہتی ہو کہ آج کی رات صبر میں مجھ سے سبقت لیجاؤ واللہ یہ کبھی نہوگا انا للہ وانا الیہ راجعون (ہم سب اللہ ہی کی امانت ہیں اور اسی کی طرف جائینگے) یہ کہکر اٹھے، اور بچے کو دفنایا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ واقعہ سنا تو بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ اللہ ان کو اس صبر کا اچھا بدلہ دیگا اور انکے لیے برکت کی دعا مانگی چنانچہ دس مہینے کے بعد اللہ تعالےٰ نے ابا عمیر کا نعم البدل انکو ایک دوسرا بیٹا دیا جسکا نام عبداللہ رکھا گیا، یہ **عبداللہ** عرب کے شیروں میں سے ایک شیر گزرے ہیں اور ان کی اولاد کو اللہ تعالےٰ نے بڑے بڑے رتبے دیئے،

جنگ احد میں ام سلیم معہ اپنے شوہر ابوطلحہ کے شریک تھیں، ابوطلحہ آنحضرت کی حفاظت میں سینہ سپر رہے۔ دشمنوں کے تیر اور بھالے اپنے جگر پر روکتے تھے اور حضرت ام سلیم پیاسوں کو پانی پلاتی تھیں۔ اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں

جنگ **حنین** میں جو بڑا بھاری معرکہ تھا باوجود اسکے کہ عبداللہ اسوقت پیٹ میں تھے موجود تھیں۔ ایک خنجر کمر سے بندھا ہوا تھا، ابوطلحہ نے آنحضرت سے کہا کہ یہ دیکھیے ام سلیم بھی خنجر باندھکر لڑنے کے لیے آئی ہیں، ام سلیم بولیں کہ میں نے یہ خنجر اسلیے رکھ چھوڑا ہے کہ اگر

کوئی کافر میرے قریب آیا تو اسکے پیٹ میں بھونک دونگی، حضور مسکرائے اور فرمایا کہ انشاء اللہ یہانتک نوبت ہی نہ پہونچیگی،

ایک مرتبہ آپ ابو طلحہ کے گھر گئے، روزہ رکھے ہوئے تھے، تھوڑی دیر بیٹھے اسکے بعد فرمایا کہ میں نماز پڑھونگا، ام سلیم نے ایک کونے میں چٹائی بچھا دی، آپنے نفل نماز پڑھی سلام پھیر کر ام سلیم کے گھرانے کے لیے دعا مانگی، ام سلیم نے اسوقت نبوت کے دریا کو جوش میں پایا، کہا کہ یا رسول اللہ میں سب سے زیادہ اپنے بیٹے انس کو چاہتی ہوں جو آپ کا خدمتگار ہے اسکے لیے خاص طور پر دعا فرمائیے، آپ نے دین اور دنیا کی کوئی بھلائی ایسی نہیں چھوڑی جس کی انس کے لیے دعا نہ کی ہو، اور کہا کہ یا اللہ تو اسکو مال دے، اولاد دے اور اس کی عمر میں برکت عطا فرما،

چنانچہ اس پاک دعا کا اثر دیکھیے، یہی مفلس خدمتگار انس بعد میں تمام انصار سے زیادہ دولتمند ہوئے اور سو سال سے زائد عمر پا کر ۹۳ھ میں تمام صحابہ کے بعد بصرہ میں انتقال کیا، اولاد کا یہ حال تھا کہ ایک سو انتیس ۱۲۹ بیٹے اور دو بیٹیاں ہوئیں،

جب رسالت مآب حج کے لیے تمام اہل و عیال کو ساتھ لیکر چلے اور تقریباً سارا مدینہ ہمراہ تھا تو ام سلیم کے پاس سواری نہ تھی کہ وہ حج کو چلتیں، آپنے ازواج مطہرات سے کہا کہ ان کو بھی اپنے ہمراہ سوار کرا لو، رستہ میں عورتوں کے اونٹ پیچھے رہ گئے، ہانکنے والے کا نام انجشہ تھا اس نے زور زور سے اونٹوں کو ہانکنا شروع کیا، آپ یہ دیکھکر جھٹ پلٹ آئے اور فرمایا کہ انجشہ آہستہ آہستہ، شیشوں کو کہیں ٹھیس نہ لگجائے۔ یعنی عورتیں جو مثل شیشہ کے نازک ہیں ان کو تکلیف نہ پہونچے،

حج سے فارغ ہو کر مقام منا میں جب آپنے موئے مبارک منڈوائے تو ام سلیم نے ابو طلحہ سے کہا کہ حجام سے ان بالوں کو مانگ لاؤ، برکت کی غرض سے حفاظت کے ساتھ ان کو ایک شیشی میں بند کر کے رکھا،

وفات کے متعلق صرف یہ معلوم ہوسکا کہ حضرت عثمان رضہ کی خلافت کے زمانے میں انتقال فرمایا۔

اسلم۔ جیراجپوری

طرز تعلیم

کئی مہینے کا عرصہ ہوا کہ بہن رابعہ بیگم نے عبادت یا نماز کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا۔ مجھے اس مضمون کو دیکھکر حضرت بابا فریدالدین گنج شکر کا قصہ یاد آیا۔ آپ کی والدہ نے ابتدا سے ہی آپ کو نماز کا پابند کر دیا تھا۔ بچپن میں آپ کو شکر سے بیحد رغبت تھی! آپ کی والدہ فرماتیں بیٹا فرید جو کوئی نماز پڑھتا ہے اللہ میاں اسکو شکر کھلایا کرتے ہیں۔ حضرت اس خواہش شکر کی وجہ سے نماز کو نہایت شوق سے گذارتے۔ آپ کی والدہ صاحبہ شکر کی ایک پوڑیہ مصلے کے نیچے رکھدیتیں۔ جب آپ نماز سے فارغ ہو کر مصلے اُٹھاتے تو وہ پوڑیہ آپ کو مجاتی۔ حضرت کو اپنی والدہ صاحبہ کے کہنے کا یقین ہوجاتا تھا اور دوسری مرتبہ پہلے سے زیادہ شوق سے دوگانہ ادا کرتے۔

اس واقعہ کے بیان کرنے سے صرف یہ مقصود تھا کہ سمجھدار ماں نے سعادتمند بیٹے کو کس طریقہ سے پابند نماز بنایا۔ اسی طور سے ہر تعلیم کے لیے ایک طریقہ ہوتا ہے۔ جب تک تعلیم طریقے اور اصول سے نہ دیجائیگی کبھی عمدہ نتیجہ نہیں پیدا ہو سکتا۔

ہم جہاں ہندوستان میں اور بہت سی باتیں قابل اصلاح دیکھتے ہیں وہاں ایک نماز کی عدم پابندی اور طرز تعلیم کا خراب ہونا بھی ہے، بچہ کا دل موم کی مانند ہوتا ہے جس طرف کو پھیر دیا جائے پھر جائے گا۔ اگر بچپن ہی سے عمدہ اور آسان طریقوں سے بچوں کو نماز کا پابند کیا جائے تو یقین ہے کہ وہ بڑے ہو کر اپنی اس اچھی عادت کو ترک نہ کریں۔ لیکن بدنصیب

ہندوستان میں اچھی باتوں کا ذکر کہاں۔

ذرا بچے کی ابتدائی حالت پر غور کیجیے۔ جہاں وہ کسی وجہ سے رویا فوراً ماں نے زبان میں انگلی ڈالی اور انگلی کو حرکت دیکر آواز نکالی۔ جس سے ایک نہایت بھیانک آواز پیدا ہوئی اُسکے ساتھ ہی کہا گیا! ہے ہے ہوّا آیا، دیکھ دال بھات کا ڈلا پیٹ میں ٹھس جائیگا بی بی چپاتی موںھ میں بیٹھ جائینگی۔ خبردار جو رویا ورنہ ہوّا آکر کاٹ لیگا۔ غرض کہ اس ننھی سی جان کو جو بمنزلہ ایک کونپل کے ہے اور جسکا نازک کلیجہ ان باتوں کا متحمل نہیں ہوسکتا ڈرا ڈرا کر سلا دیا۔ درحقیقت وہ سوتا نہیں ہی بلکہ بچے کا ڈر کر سہم جانا ہی چنانچہ اس امر کا یہ اثر ہوتا ہی کہ اُس کے دل میں خوف اور ڈر کا زبردست دیو قبضہ کر لیتا ہی۔

اب ذرا انصافاً اندازہ فرمایئے کہ وہ ہونہار بڑے ہو کر کیا کرینگے۔ یہی ناکہ اگر رات برات میں کہیں چلنے پھرنے کا موقع ملا تو وہی خیالی ہوّا اور ہوّا جو اُن کے ذہن میں بسے ہوتے ہیں پیش نظر ہو کر اُن کے دل کو دہلا دیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کمزوری قلب کمزوری دل و دماغ کی شکایت جوان ہوتے ہی شروع ہو جاتی ہے۔ بھلا اندھیری رات میں کہیں بھیج تو دیجیے۔

شاید بہنیں میرے اس خیال کو سُن کر ہنسیں لیکن میرا یقین ہی کہ ہندوستانی لوگ جو زیادہ کمزوری دل و دماغ میں مبتلا ہوتے ہیں اس کی بنا یہی بچپن کا طرز عمل ہے جو اُنکے والدین اُنکے ساتھ کرتے ہیں۔ بخلاف ترک لوگوں کے کہ وہ قوی الجثہ زبردست دل و دماغ کے لوگ ہوتے ہیں اس کی وجہ صرف یہی ہی کہ وہ بچپن سے ہی اپنے بچوں کے دلوں کو خوف اور ڈر کا عادی نہیں بناتیں، خوف اور ڈر یہ دونوں لفظ ترکوں نے اپنی ڈکشنری اور محاورے سے پھینک دیے ہیں، کیا یہ ضروری ہی کہ تم اپنے بچے کو سلاؤ تو انہیں ڈرانے والے الفاظ سے سلاؤ۔ اور بہت طریقے ہیں، ملاحظہ ہو!

لوری ننھے! (پیارے بچوں کو اکثر ننھا کہتے ہیں) بیٹا لے اب سو رہو ڈرے مت یہاں

کوئی ستے تجھے خوف دلانے والی نہیں، سامنے تیرے ابا میاں بیٹھے ہیں۔ بیٹا تمہارے باپ بڑے نمازی ہیں اور ہمیشہ اپنے قوت بازو سے کماکر کھایا۔ دس کو کھلاکر کھایا۔ بیٹا تم بھی اسطرح سے کرنا۔ پیٹ بھرنے کو تو کتا بلی بھی بھرتے ہیں مگر کس کام کا۔ شیر کی طرح رہنا۔ ایک شکار کیا۔ اور دس نے بچا ہوا کھایا۔ شاباش ننھے (بچہ ہنسنے لگتا ہی) ہاں میرا پوت بڑا متقی ہوگا بڑا نمازی پرہیزگار ہوگا! ہاں میرا لعل سو رہو۔ تو عربی پڑہنا فارسی پڑہنا اور اپنی بہنو بھائیوں کی فلاح میں محو رہنا۔ ننھے! سب سے اچھا وہ ہی جس سے دس کو فیض پہونچے خود نیک کام کرنا دوسروں کو ترغیب دلانا۔ ہمارے حضور نے فرمایا ہی الدال علی الخیر کفاعلہ جسکا مطلب یہ ہی کہ نیک کام بتانے والا بھی مثل نیک کام کرنے والے کے ہی اقوال رسول پر عمل کرنا، خدا کے احکام کو ماننا (بچہ سو رہتا ہی)

اب ذرا بتلایئے کہ وہ خرافات کے خیالات بچے کے ذہن میں جمانے مفید ہیں یا یہ خیالات جو مثالاً میں نے بیان کیے۔ قاعدہ کی بات ہی کہ جس طرح کے الفاظ بچہ سُنے گا ویسا ہی اسپر اثر پڑے گا،

بہنو! اسی طرح اور بہت سی باتیں ہیں جنکو اگر تھوڑا خیال کیا جائے تو مناسب ترمیم ہوسکتی ہے مطلب یہ ہی کہ جو بات اور خیالات بچے کے ذہن نشین کیے جائیں تو وہ مستحکم ہو جاتے ہیں۔

دوسرا طریقہ یہ ہی کہ اسکے سامنے وہ کام کیے جائیں جو آیندہ جاکر اسکو نفع دینگے مثلاً چھوٹوں کو لازم ہی کہ آپس میں آپ کے لفظ سے خطاب کریں بلکہ بڑے بھی چھوٹوں کے ساتھ انہیں الفاظ سے پیش آئیں جسکا پہلا نفع تو یہ ہوگا کہ وہ ہر شخص سے اسی خطاب سے پیش آئینگے۔ دوسرے وہ بچہ جو پرورش پا رہا ہی۔ ہوش سنبھالتے ہی گھر والوں کی تقلید کرے گا۔

ماں باپ کو لازم ہی کہ خود نماز کے پابند ہیں جسکو بچہ دیکھکر خود ہی اس نیک عادت کا

پابند نے۔ لیکن اگر ماں باپ ہی بے خبر ہوں تو بچہ کا کیا قصور ہے۔ ع

او خویشتن گم است کرا رہبری کند

آیندہ بھی بچے نافرمان ہو جاتے ہیں۔ اور جو اُن کے دل میں آتا ہی کرتے ہیں۔ یہ جو کچھ خرابی ہوتی ہی صرف طرز تعلیم کی وجہ سے ہوتی ہی۔ اگر تعلیم کا طرز ابتدا ہی سے سیدھا سادہ اور خوش اسلوب رکھا جائے تو پھر یہ جھگڑے پیش ہی کیوں آئیں۔ اسی طور سے اور تمام باتیں ہیں جو غور کرنے سے جلد سمجھ میں آسکتی ہیں۔

ابتدا میں جو حضرت بابا صاحب کا قصہ قلمبند کیا گیا۔ اسکا مفہوم یہ تھا کہ ہر بات ماں باپ کے اثر سے بچے میں پیدا ہوتی ہی۔ لیکن جبکہ ماں باپ ہی تعلیم سے کورے ہوں تو وہ دوسرے کو کیا خاک بنائیں۔

شکر ہی کہ اب کسی قدر توجہ ہو چلی ہی ورنہ پہلے تو عورتوں کا تعلیم پانا گناہ عظیم سمجھا جاتا تھا۔ یہ جہالت کی وجہ تھی۔ ورنہ اگر زمانہ سابق پر نظر ڈالی جائے تو صاف عیاں ہو جاتا ہی کہ تمام اعلیٰ خاندانوں کی خواتین زیور علم سے آراستہ ہوتی تھیں،

رقمہ،
زہرہ

خاتونان مہدی باغ

حسن اتفاق سے رنگون کے جلسۂ کانفرنس میں ایک بزرگ قوم سے خاصہ تعارف پیدا ہو گیا۔ یہ وہی بزرگ ہیں جن کی نسبت آنریبل صاحبزادہ آفتاب احمد خانصاحب بیرسٹرایٹ لانے اپنی ایک پُرجوش تقریر کے دوران میں قومی رہنماؤں کا تذکرہ کرتے وقت فرمایا تھا کہ منجملہ دیگر دردمندان قوم کے (ہاتھ سے آپنے اُن کی طرف اشارہ کر کے) "ایک وہ دیکھیے خان بہادر شیخ نیم ملک صاحب بیٹھے ہوئے ہیں جو ممالک متوسطہ کی تعلیم کے ناخدا ہیں"

سفر رنگون سے میرے دوسرے رفیق جناب میرزا نذیر بیگ صاحب تعلقدار ریاست نظام
بنگال ناگپور لائن سے واپس ہونے والے تھے اس لیے جناب ملک صاحب نے ہم سے یہ خواہش
ظاہر فرمائی کہ ہم ایک روز کے لیے ناگپور میں قیام فرمائیں مگر افسوس کہ مرزا صاحب کی رخصت
بالکل ختم ہو چکی تھی اس وجہ سے وہ تو وہاں نہ ٹھہر سکے مگر میں وہاں اتر پڑا۔ ملک صاحب کو
پہلے سے بذریعہ تار برقی اطلاع ہو چکی تھی اسلیے مولانا ملک اور جناب شیخ عبداللطیف صاحب
اسٹیشن پر رونق افروز تھے۔ انہوں نے جناب مرزا نذیر بیگ صاحب کو وہاں ٹھہرنے
کے لیے بہت کچھ فرمایا مگر مرزا صاحب نے نہایت افسوس کے ساتھ اپنی مجبوری کا اظہار فرمایا تھوڑی
دیر کے بعد ریل سیٹی دیکر چلتی ہوئی اور میں یہاں اپنے رفیق سفر سے جدا ہو گیا۔

جناب ملک صاحب کا سنٹرل پروونس میں جو اثر ہے اسکا اور وہاں ان کی قومی خدمت
کا تذکرہ چونکہ میں ایک علیحدہ مضمون میں لکھنے والا ہوں اس لیے یہاں اسے قلم انداز کرتا ہوں
اور اس وقت صرف وہی مضمون لکھتا ہوں جو زیادہ تر رسالہ خاتون کے لیے مناسب ہے۔

مجھے چونکہ مہدی باغ میں رہنے کی عزت حاصل ہو چکی ہے اس لیے میں کہہ سکتا ہوں کہ حقیقت
میں ناگپور آکر مہدی باغ کو دیکھنے کے بعد آنریبل صاحب کے اس جملہ کی پوری تصدیق ہو جاتی ہے
جو انہوں نے رنگون میں ملک صاحب کی نسبت ارشاد فرمایا تھا۔

یہ باغ ناگپور کی آبادی کے ایک ہوائی گوشہ میں واقع ہے جس میں کئی باترتیب خوشنما
مکانات اور کئی چھوٹے چھوٹے بنگلے بنے ہوئے ہیں اور یہ سب مل جل کر ایک فرحت بخش
باغ ہے جسے مہدی باغ کہتے ہیں۔ اس باغ میں رہنے والوں کے لیے اسی کے احاطہ میں
ایک چھوٹی سی خوشنما مسجد ایک مدرسہ، ایک کتب خانہ، ایک ڈبیٹنگ کلب اور ایک دواخانہ
موجود ہے۔

ملک صاحب نہ محض لڑکوں ہی کی تعلیم کے حامی ہیں بلکہ انہوں نے اسکے ساتھ ساتھ
اپنی پوری توجہ تعلیم نسواں پر بھی مبذول کر رکھی ہے اور اس میں ان کی بیگم صاحبہ ان کی

شریک غالب ہیں۔

امور خانہ داری اور دستکاری کے علاوہ یہاں عمدہ اخلاقی اور ادبی تعلیم بھی ہوتی ہے اور خاتونانِ مہدی باغ اُن ڈبیٹ کے جلسوں میں جو ہر مہینے میں دو دفعہ منعقد ہوتا ہے برابر شریک ہوتی ہیں اور بے خوف و خطر اپنے بھائیوں پر اعتراضات اور اُن سے مباحثے کرتی ہیں۔

مہدی باغ جسے میں فردوس بریں سے تعبیر کر سکتا ہوں حقیقت میں فرشتوں کے رہنے کا مقام ہے۔ یہاں کا ہر چھوٹا بڑا انسانی ہمدردی سچائی اور دولت خلوص سے مالامال نظر آتا ہے اور سارا فیضان ملک صاحب اول اور جناب مولانا ملک ایچ۔ یم۔ یعنی خان بہادر الدین غلام حسین صاحب ملک ثانی اور ان کی تعلیم یافتہ خاتون کا ہے۔

خاتونانِ مہدی باغ کو دیکھ کر اس بات کا بخوبی پتہ چلتا ہے کہ ہماری قوم تعلیم نسواں کی طرف غافل نہیں ہے اب عام طور پر وہ اگلی سی تعلیم نسواں سے منافرت باقی نہیں ہے اور تعلیم نسواں کی ضرورت محسوس ہو چکی ہے دردمندان قوم اس طرف بھی متوجہ ہو چلے ہیں جو اس وقت تک غافل ہیں انہیں ہمارے شیخ محمد عبداللہ صاحب بی اے ایل ایل بی جھنجوڑ جھنجوڑ کر بیدار کر رہے ہیں۔

خدا ان کی ہمت میں برکت دے

رنگون کی کانفرنس میں مجھ سے ایک بڑے سبز عمامہ اور سفید لمبی ڈاڑھی والے مولوی صاحب فرماتے تھے کہ "یعنی جبتک یہ قرآن مجید کے خلاف اور حد شرع سے متجاوز پردہ نسواں کے بیجا قیود اُٹھائے نہ جائیں تعلیم نسواں کے حامیوں کو کبھی خاطر خواہ کامیابی نہیں ہو سکتی" معلوم نہیں ہمارے مولوی صاحب کے بیان میں کس قدر سچ اور جھوٹ شامل ہے۔ اسکا جواب تو ہمارے شیخ صاحب ہی دے سکتے ہیں۔

عبدالغنی خاں رافت
از عثمان آباد، دکن

ایرانیوں کی شادی

آجکل چونکہ ایرانیوں میں انقلاب عظیم ہوا ہے اور مہذب دنیا میں ایرانیوں کی اتحاد اور وطن پرستی کو حیرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اس لیے میں اگر وہاں کی عورتوں کے حالات و زنانہ رسم و رواج کو جو چشم دید ہیں ناظرات خاتون کی دلچسپی کے لیے لکھوں تو بیجا نہوگا۔ اس مضمون میں صرف شادی کے رسومات بیان کیے جائینگے۔ اگر میری معزز بہنیں اسکو پسند فرمائیں گی تو آیندہ انشا اللہ ایرانی عورتوں کی طرز زندگی وغیرہ پر مضمون لکھوں گی۔

ایران میں کم سنی کی شادی بالکل عنقا ہی اگرچہ متوسط امرا میں منگنی کی رسم بہت جلد ادا کر دی جاتی ہی۔ لیکن شادی دولہا اور دولہن کے جوان ہونے تک نہیں ہوتی۔ مثل ہندوستان کے ایران میں بھی لڑکی کی تلاش لڑکے کے والدین کرتے ہیں یا دوسرے رشتہ دار کرتے ہیں، انتخاب کے بعد لڑکے کی ماں یا دوسری رشتہ دار عورتیں ایک انگشتری اور دو شال لیکر لڑکی کے گھر جاتی ہیں اور لڑکی کے والدین سے یہ کہتی ہیں کہ "میلے دارم فلاں پسر را در غلامی فرمایند" یعنی ہماری تمنا ہی کہ آپ فلاں لڑکے کو اپنی غلامی میں قبول فرمائیں۔ لڑکی کے والدین اس درخواست کو اگر کوئی خاص سبب مانع نہو تو قبول کر لیتے ہیں۔ اسکے بعد مہر و جہیز کا تصفیہ بھی اسی وقت ہو جاتا۔ ان امور کے طے ہونے پر دولہا کے جانب سے دولہن کی ماں کے لیے ایک کافی رقم حسب مقدرت بھیجی جاتی ہے جسکو ایرانی شیر بہا کہتے ہیں۔ دلہن کی ماں کے لیے کئی خوان میوہ کے اور متعدد کشتیاں لباس و زیور کی بھیجی جاتی ہیں۔ چند روز کے بعد شادی شروع ہو جاتی ہی۔

سب سے پہلے عقد کا دن معین کیا جاتا ہی جسکو ایران میں روز شیرینی خورند کہتے ہیں عقد کے بعد کئی روز تک دعوتیں ہوتی رہتی ہیں اور رسومات ادا کیے جاتے ہیں اور اس وقت تک دولہن اپنے ہی مکان میں رہتی ہی۔ شیرینی خورند کے روز دولہا معہ قاضی و دیگر ہمراہیوں کے دلہن کے گھر جاتا ہی اُس کے ساتھ کئی بیش قیمت میوے چھوارے بادام قند او شکر کی کشتیاں

لیے جاتے ہیں دولہن کے مکان پر پہنچکر عورتیں دُلہن کے پاس چلی جاتی ہیں اور مرد دولہ کے ساتھ ایک علیحدہ مکان میں بیٹھتے ہیں۔ عقد کے بعد دولہا اپنے دوستوں اور مہمانوں سے رخصت ہوکر زنانہ مکان میں جاتا ہے۔

وہاں تمام عورتیں اسکو مبارکباد دیتی ہیں دولہا بھی ہر ایک کو نذر دیتا ہے امیروں میں عموماً ایک ایک اشرفی نذر دیجاتی ہے پھر دولہا اور دلہن ایک ہی دسترخوان پر شیرینی میوہ وغیرہ کھاتے ہیں لیکن ایک دوسرے کو نہیں دیکھتا۔ جب تک رسومات ادا ہوں دلہن کو سرخ برقعہ اُڑھاتے ہیں۔ اسکے بعد دولہا مردانے میں جاتا ہے اور زنانہ مردانہ میں علیحدہ علیحدہ رقص وسرود کا انتظام کیا جاتا ہے محفل گرم ہوتی ہے مہمانوں کی تواضع خوب دل کھول کر کیجاتی ہے۔ میوہ اور مٹھائی کے کئی کئی دور ہوتے ہیں۔ اور اخیر میں کھانے سے فارغ ہوکر ہر ایک مہمان آیندہ رسم شادی میں شریک ہونے کا وعدہ کرکے رخصت ہوتا ہے۔

رسومات شادی دولہا کے مکان پر ادا کیے جاتے ہیں جو کئی روز تک ہوتے رہتے ہیں ان ایام میں ہر روز دعوتیں دیجاتی ہیں آخر روز دولہا جلوس کے ساتھ غسل کرکے جاتا ہے دُلہن کے جانے سے پہلے دولہا کے لیے قیمتی لباس وانگشتری آتی ہے۔ دلہن شام کے وقت اپنی ماں کے ہمراہ گھوڑے پر یا گاڑی میں جلوس کے ساتھ دولہا کے گھر آتی ہے۔

جب برات دولہا کے گھر پہنچ جاتی ہے تو کئی بکرے اور اونٹ دولہا کے مکان کی دہلیز میں ذبح کیے جاتے ہیں تاکہ دلہن اُن کے خون پر سے گزرے اسکو ایرانی نیک فال خیال کرتے ہیں۔ اس روز دولہا کی طرف سے پُرتکلف دعوت دی جاتی ہے اور شادی ختم ہوتی ہے۔

(باقی آیندہ)

افسر دلہن

از حیدرآباد دکن

ہمایوں نامہ

گلبدن بیگم بابر بادشاہ کی بیٹی ہیں اور ہمایوں کی بہن۔ انہوں نے اپنے گھرانے میں تین بادشاہ دیکھے۔ ایک باپ دوسرے بھائی تیسرے اپنا بھتیجا جسکو تاریخ نے اکبر اعظم کا خطاب دیا ہے۔ عرش آشیانی شہنشاہ کی علم دوستی تاریخ ان صفحات پر لکھی ہیں۔ اس نے اپنی محترمہ پھوپھی سے درخواست کی کہ فردوس مکانی حضرت بابر بادشاہ اور جنت آشیانی ہمایوں بادشاہ کے زمانے کے حالات جو آپ کے چشم دید ہوں ایک کتاب کی صورت میں جمع کر دیں۔ چنانچہ گلبدن بیگم نے ایک کتاب لکھی اور ہمایوں نامہ نام رکھا۔ خدا کی قدرت دیکھو یہ انمول موتی انقلاب سلطنت کے ساتھ زمانے نے تیموریہ خزانے سے نکال کر برٹش میوزیم (لندن کا شاہی کتب خانہ) میں سجا دیا۔

تاریخی اور علمی دنیا ابتک اس گوہر بے بہا کی قدر و قیمت سے ناواقف تھی۔ انگلستان کی ایک فاضلہ مسز بیورج ایم آر۔ اے ایس نے اسے برٹش میوزیم میں دیکھا تو چاہا کہ خود ہی اس کے عجیب مضامین کا لطف اٹھائیں اور دنیا محروم نہ رہے۔ لیڈی صاحبہ نے بڑی محنت و تحقیق کے ساتھ اسکا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ اصل کتاب سو صفحے کی ہے مگر یورپین لیڈی کی ہمت و محنت پر آفرین ہے کہ ترجمہ اور حاشیہ تین سو صفحے کا لکھا ہے۔

ہمایوں نامہ کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ محلات شاہی کے حالات اور بیگمات کے تذکرے لکھے ہیں۔ اس قسم کے واقعات کسی مورخ کو معلوم ہی ہونے مشکل ہیں لکھنا تو درکنار۔ اسی مناسبت سے مترجمہ لیڈی صاحبہ نے تاریخی دنیا پر یہ خاص احسان کیا ہے کہ تمام خاتونوں اور بیگمات کے حالات جنکے نام اس کتاب میں آئے ہیں جس قدر تاریخی کتابوں میں مل سکے نہایت محنت سے جمع کر دیے ہیں۔ یہ کتاب معہ ترجمہ ضمیمہ اور حاشیہ لندن میں چھپ گئی ہے۔

جی چاہتا تھا کہ جیسے ایک تیموری بیگم کی ہوئی کتاب کا ترجمہ ایک انگریزی بیگم نے انگریزی میں کیا ہے

ایسے ہی اسکا ترجمہ کوئی ہندوستانی بیگم اُردو میں کرتیں اسی غرض سے میں نے یہ کتاب چند تعلیم یافتہ خاتونوں کی خدمت میں بھیجی مگر افسوس ہے کہ ہماری قوم میں ایسی فاضلہ عورتیں بہت کم ہیں کہ فارسی اور انگریزی کی لیاقت کے ساتھ اعلیٰ علمی مذاق رکھتی ہوں اور تصنیف و ترجمے کے مشکل کام کو کر سکیں۔

یہ معلوم کرکے نہایت خوشی ہوئی کہ مولوی محمد محسن صاحب فاروقی ایم اے پروفیسر علوم مشرقی مستن کالج اندور اسکا ترجمہ کر رہے ہیں۔ پروفیسر صاحب کو ترجمہ کا خاص ملکہ ہے متعدد کتابیں ملک کے سامنے پیش کر چکے ہیں چنانچہ اس وقت بھی انجمن ترقی اُردو کے ہاں اُن کا ترجمہ فو الاصغر زیر اشاعت ہے

شاہی بیگمات کے حالات رسالہ خاتون کے لیے نہایت مناسب ہونگے اسلیے مولوی صاحب سے استدعا کی کہ کچھ حالات رسالہ کے لیے دیدیں اگر معزز ناظرات کو پسند ہوئے تو آیندہ مرتب کرنے کا وعدہ ہے۔

مجھے یہ معلوم کرکے نہایت خوشی ہوئی کہ میرے ناچیز مضمون کرشمہ فطرت کو معزز ناظرات نے دلچسپی کے ساتھ پڑھا افسوس ہے کہ ایم اے کے امتحان کی تیاری کی وجہ سے میں سلسلہ کو جاری نہ رکھ سکا۔ اگلے مہینے میں امتحان سے فارغ ہوکر لکھنے کا ارادہ ہے۔

صغیر علی۔ ہلکر کالج اندور

آفاق بیگم

لفظ آفاق کے معنی چاروں طرف آسمان کے ہیں جس سے تمام عالم مراد ہے لہذا آفاق بیگم کے معنی ہوئے دنیا کی بیگم یا شاہزادی۔ بابر نے اس بیگم کو سلطان حسین میرزا بایقرا کی زوجہ لکھا ہے لیکن اسکے والدین کا کوئی ذکر نہیں لکھا۔ دوسرے موقع پر اس بیگم کا میرزائے مذکور کی بیوہ بیگمات کے ساتھ بمقام ہرات ۹۱۲ھ (۱۵۰۷ء) میں دیکھنا بیان کیا ہے۔ توزک بابری فارسی و ترکی دونوں میں اس موقع پر ان الفاظ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ سلطان ابوسعید میراں شاہی کی دختر تھی۔

تزک کے فقرہ کو مسٹر ارسکن اس طرح ترجمہ کرتے ہیں" پایندہ سلطان بیگم میری پھوپی اور خدیجہ بیگم اور سلطان ابوسعید میرزا کی آور لڑکیاں" یہاں ترکی تورک میں "نیہ" کا لفظ ہے اور فارسی میں "دیگر" جسکا اردو ترجمہ" دوسری" یا" اور" کیا جا سکتا ہے۔

ایک تہنیت کے موقع پر بابر آفاق بیگم کو خدیجہ پر ترجیح و امتیاز بخشتا ہے اور یہ قصہ لکھتا ہے اسلیے کہ خدیجہ اعلیٰ خاندان کی نہ تھی۔

حسین بایقرا نے ابوسعید کی تین لڑکیوں سے شادی کی تھی۔ شہر بانو، پایندہ، آفاق۔ آفاق کے کوئی اولاد نہیں ہوئی لیکن اُس نے حسین بایقرا کے نو بچوں کی تعلیم و تربیت کی جو اُس کی رضاعی بہن بابا آغاچہ کے بطن سے تھے۔ ۹۳۲ھ ۱۵۲۵ء کے ابتدائی مہینوں میں وہ ہرات سے کابل کو گئی اور بابر نے اس کی نہایت تعظیم و تکریم کی۔ بابر نے ہندوستان کا سفر نومبر ۱۵۲۵ء میں کیا ہے یہ واقعہ اس سے پہلے کا ہے۔ بابر لکھتا ہے کہ وہ نہایت محبت کرنے والی اور جاں نثار صورت تھی اور یہ لکھا ہے کہ زمانہ علالت میں اُس نے اپنے شوہر کی ایسی خدمت و تیمار داری کی کہ حرم کی عورتوں میں سے کسی سے نہو سکی۔

بابر کو اس کی وفات کی خبر اُسوقت ملی جب وہ چندیری کا محاصرہ کیے پڑا تھا۔ ۹۳۴ھ مطابق جنوری ۱۵۲۸ء (از تزک بابری)

آغا بیگم بایقرا

سلطان حسین میرزا بایقرا اور پایندہ سلطان بیگم میراں شاہی کی لڑکی تھی۔ جبکہ دونوں طرف سے ایسی اعلیٰ نسل کی بیگم کا نام آغا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ معزز ہے ورنہ اکثر ادنیٰ درجہ کی عورتوں کے لیے اسکا استعمال پایا جاتا ہے۔ یہاں اس لفظ کے معنی شاہزادی یا رئیسہ کے پیدا ہوتے ہیں۔

اس بیگم کی شادی اسکے قریب کے رشتہ دار مراد سے ہوئی جو ربیعہ بیگم بیدکہ کا لڑکا تھا۔

حبیب السیر میں لکھا ہے کہ وہ جوان ہونے سے پہلے انتقال کر گئی لیکن بابر کا بیان اسکے خلاف ہے حبیب اس کی وفات سنہ ۹۱۲ھ ۱۵۰۶ء سے پہلے بتاتا ہے (توزک بابری و حبیب السیر)

آغا سلطان سلطانم دغلات

محمد حیدر میرزا دغلات کی دختر ہے لہذا مصنف تاریخ رشیدی کی پھوپی ہوئی اس کا نکاح عبد القدوس دغلات سے کاشغر میں سنہ ۹۲۳ھ ۱۵۱۷ء کے بعد ہوا۔ اسکا شوہر سنہ ۹۰۰ھ ۱۴۹۵-۹۴ء میں زندہ تھا اور سلطان محمود میرزا ایران شاہی کی طرف سے خوست کا حاکم ہوا (توزک بابری تاریخ رشیدی)

آئی بیگم میران شاہی

آئی ترکی لفظ ہے جسکے معنی چاند کے ہیں۔ اسکا نام توزک بابری میں نہیں ہے مگر مسٹر ارسکن نے لکھا ہے سلطان محمود میرزا میران شاہی کی خانزادہ بیگم ترمذی کے بطن سے چوتھی لڑکی ہے۔ اور جہانگیر میرزا بابر کے سوتیلے بھائی کی زوجہ ہے۔ اس کی منگنی سنہ ۹۰۰ھ ۹۵-۱۴۹۴ء میں ہوئی اور سنہ ۹۱۰ھ ۱۵۰۵ء شادی ہوئی۔ ایک لڑکی پیدا ہوئی سنہ ۹۱۴ھ ۱۵۰۹ء تک بیوہ ہوگئی (توزک بابری نوٹ ڈی کورٹیل)

آکا بیگم بایقرا

آکا ایک لقب ہے۔ اصلی حال نہ معلوم ہوسکا۔ اس کی بہن جو بیدکا کے لقب سے مشہور ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسکا نام ربیعہ سلطان تھا۔

منصور میرزا بایقرا اور فیروزہ بیگم میران شاہی کی بیٹی ہے سلطان حسین میرزا کی حقیقی بڑی بہن ہے۔ بابر کہتا ہے کہ اس کی شادی سلطان احمد میرزا (جو بابر کا چچا تھا) سے ہوئی اور ایک بچہ کیپک میرزا ہوا (کیپک میرزا کے معنی چھوٹا سا شاہزادہ۔ اسلیے کہ کوچک کا مخفف کیپک ہے) لیکن اس نے احمد کی بیبیوں کا ذکر کرتے وقت (توزک صفحہ ۲۲) اس بیگم کا ذکر نہیں کیا

نہ آکا کا نام لیا نہ کوئی دوسرا نام لیا۔ بابر کہتا ہے کہ احمد کے دو لڑکے ہوئے جو نوجوانی میں ہی مر گئے مگر کچک میرزا کی زندگی کا پتہ چلتا ہے اور وہ بجائے فوجی خدمات کے علمی اشغال میں مصروف رہا یہ عجیب بات ہے کہ یہ نکاح میران شاہی خاندان کی ایک لڑکی کا بایقرا خاندان کے لڑکے سے ہوا (جو غالباً یہ اور سب سے پہلا رشتہ ہوگا) مگر سلطان احمد میرزا کے حالات میں اسکا کچھ ذکر نہیں پایا جاتا۔ (توزک بابری)

آق بیگم بایقرا

ترکی میں آق کے معنی خوبصورت کے ہیں یہ لفظ بطور لقب یا خطاب مستعمل ہوتا ہے۔
بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اس قسم کے خطابات جن عورتوں کے ہیں انکا اصلی نام معلوم ہوجاتا ہے جیسے یاسین دولت کا لقب آق سلطان ہے اور سلیقہ بیگم کا آق بیگم۔ اکثر اصلی نام کا پتہ ہی نہیں چلتا اور وہ لقب ہی مشہور ہوتا ہے۔ یہ بیگم سلطان حسین میرزا بایقرا کی لڑکی پایندہ سلطان بیگم میران شاہی کے بطن سے ہے۔ بابر کی پھوپی زاد بہن تھی۔ اپنی بہنوں میں سب سے بڑی ہے۔ محمد قاسم ارلات کی زوجہ تھی۔ اس کی ایک لڑکی تھی قراقوز بیگم (سیاہ چشم) (توزک بابری)

عائشہ سلطان بیگم میران شاہی

سلطان احمد میرزا میران شاہی اور قوتوق (کتک) بیگم کی تیسری لڑکی تھی۔ بابر کی بڑی پھوپی زاد بہن اور اس کی سب سے پہلی بیوی تھی اس کی نسبت بمقام سمرقند ۸۹۴ھ/۱۴۸۹ء میں جب بابر پانچ برس کا تھا ہوئی تھی اور شعبان ۹۰۵ھ مطابق مارچ ۱۵۰۰ء میں بمقام خجند مصائب کے زمانے میں نکاح ہوا جبکہ خسرو شاہ اور احمد تنبول سے میدان جنگ و جدل گرم تھا۔
بابر کہتا ہے کہ مجھے پہلے ہی سے عائشہ سے محبت تھی اور بعد کو تو بالکل ہی جاتی رہی۔
بابر کی پہلی اولاد فخر النساء ولادت ۹۰۶ھ/۱۵۰۱ء اسی کے بطن سے ہوئی۔
تاشقند کی ویرانی جو شیبانی نے ۹۰۹ھ/۱۵۰۳ء میں کی ہے۔ اس سے پہلے عائشہ بابر سے علیحدہ

ہوگئی تھی۔ اور یہ جدائی اپنی بڑی بہن (شاید سلیقہ بیگم) کے ساتھ سازش میں شریک ہونیکے سبب تھی۔ کیونکہ سلیقہ ان چند رشتہ داروں میں سے ایک کی منکوحہ تھی جنھوں نے فرعاً کسن بادشاہ کو تخت سے اُتارنے کی کوشش کی تھی۔

گلبدن نے اپنی کتاب میں عائشہ سلطان بیگم کے طلسمی دعوت میں شرکت کا ذکر کیا ہی مگر کچھ اور تفصیل نہیں بیان کی۔ (ہمایوں نامہ تزک بابری)

محمد محسن

چائے

تقریباً چار سو برس کا زمانہ گزرا کہ چائے پہلے پہل چین سے انگلستان لائی گئی۔ اُس وقت اس قدر گراں قیمت تھی کہ ایک پونڈ (نصف سیر) دو سو روپے کو ملتی تھی۔ اور اس قدر نادرالوجود شے تھی کہ ایک مرتبہ ایک سوداگر نے بادشاہ انگلستان کے حضور میں ایک سیر چائے بطور تحفہ کے پیش کیا تھا تو بادشاہ نے اس تحفہ کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا تھا۔ ایک وہ زمانہ تھا۔ اور اب یہ زمانہ ہے کہ عمدہ سے عمدہ چائے کی قیمت پانچ روپے سیر سے زیادہ نہ ہوگی۔ انگلستان تو انگلستان ہندوستان میں بھی معمولی سے معمولی گاؤں میں چائے نوشوں کی کثرت ہے۔

چائے کی پیداوار پودوں سے ہوتی ہی۔ اسکے پودوں کا اصلی وطن چین ہی۔ جہاں کے لوگ اسکو صدہا سال پیشتر سے پیتے ہیں۔ بہت زمانہ تک تمام دنیا چائے کے لیے چین ہی کی محتاج تھی۔ لیکن تقریباً پچاس ساٹھ سال سے اس کی کھیتی سیلون، شمالی بنگال آسام اور ہندوستان کے پہاڑی خطے میں بھی ہونے لگی۔

چائے کا پودا اگر بڑھنے کے لیے چھوڑ دیا جائے تو وہ آٹھ نو فٹ تک بلند ہو جائیگا لیکن چائے کے باغوں میں یہ ہمیشہ چھانٹ دیا جاتا ہی تاکہ وہ تین فٹ سے زیادہ بلند

نہونے پائے۔ چائے کے پھول سفید رنگ کے یاسمن کے پھول سے کچھ مشابہ ہوتے ہیں مگر ویسی خوشبو نہیں ہوتی۔

چائے کی پیداوار کے لیے پہاڑ کے دامن کی زمین عمدہ ہوتی ہے۔ پودے چار چار فیٹ کے فاصلہ پر قطاروں میں لگائے جاتے ہیں۔ پودوں کی شاخوں کے چھانٹ دینے کے چند دن بعد نئے پتے اور کلیاں نکل آتی ہیں اور چھوٹی ٹہنوں پر چھا جاتی ہیں۔ درخت سال میں تین بار چھانٹے جاتے ہیں۔ اور سال میں تین ہی بار محاصل بھی دیتے ہیں۔

نئے پتے نہایت ہوشیاری سے چن لیے جاتے ہیں اور ٹوکریوں میں رکھ کر گھر لائے جاتے ہیں اول درجہ کی چائے کلیوں کی ہوتی ہے۔ دوم درجہ ننھی پتیوں کا ہے اور سوم درجہ بڑی پتیوں کا۔ پتیاں ایک ایسے مکان میں سکھائی جاتی ہیں جہاں آگ دہکتی رہتی ہے یا لوہے کے کسی بڑے اور چوڑے کڑاہ میں اولائی جاتی ہیں اس ترکیب سے پہلے وہ زرد ہو جاتی ہیں بعدہ بھوری اور آخر میں سیاہ۔ ہر پتی سکڑ کر اینٹھ جاتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے ریزے جو چھنچ کر الگ ہو جاتے ہیں جمع کیے جاتے ہیں وہ گرد چائے کہلاتے جاتے ہیں۔ اس حالت میں پہنچکر اب وہ چائے قابل استعمال ہوگئی اور کاغذ کے پیکٹوں یا ٹین کے بکسوں میں بند کرکے بازاروں میں پہنچا دی گئی۔

چائے ایک عمدہ اور قابل نوش چیز ہے۔ تکان دور کرنے میں بہت اکسیر ہے گرم و خشک ہے فہم و فراست و طبیعت میں جودت بخشنا۔ حرارت غریزی کا نگاہ رکھنا۔ حافظہ و بصارت کو تیز۔ نیند کا کم کرنا۔ نزلہ کا روکنا۔ رطوبات دماغی کا خشک کرنا دماغ و دل کو قوت دینا۔ غذا کا ہضم کرنا، خون کا صاف کرنا، شور مادہ کا خارج کرنا۔ جگر، گردہ، مثانہ کے نقصانات کو دفع کرنا اسکے خواص سے ہے۔ لیکن اس کی کثرت بے موقع یا بے طریقہ استعمال کرنا خصوصاً گرم مزاج والوں میں یا گرم فصلوں میں یا بہت گرم شہروں میں بالعکس نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ اسکا مصلح دودھ

یا روغن بادام ہی۔ خلوے معدہ میں اسکا پینا مضر ہے۔

کافی (قہوہ)

قہوہ نوشی بہت مقبول اور مرغوب عربوں اور ترکوں میں ہی۔ ان ملکوں میں اسکا رواج ٹھیک اسی طریقہ پر ہی جس طرح ہمارے ہاں حقہ اور پان کا ہی۔ جب کوئی کسی سے ملنے کے لیے جاتا ہی تو ایک فنجان قہوہ ضرور پیش کیا جاتا ہی۔ پینے سے انکار کرنا بہت ہی معیوب حرکت خیال کی جاتی ہی۔ نیند کے دفعیہ کے لیے قہوہ واقعی بہت کارآمد چیز ہے۔ کافی کے بیج چھوٹے اور سبز ہوتے ہیں۔ یہ بیج کسی چوڑے ظرف میں آگ پر بھونے جاتے ہیں یہانتک کہ وہ بھورے رنگ کے ہو جاتے ہیں۔ بھوننے سے اُن کی باس بہت بھلی معلوم ہوتی ہے۔ تب وہ پیسکر سفوف بنائے جاتے ہیں۔ اس سفوف کی تھوڑی سی مقدار کسی برتن میں ڈالکر اوپر سے کھولتا ہوا پانی ڈالدیا جاتا ہی۔ پانچ منٹ کے بعد وہ باریک کپڑے میں چھان لیا جاتا ہے۔ بعض آدمی اس کو سادی پیتے ہیں لیکن عام رواج دودھ اور چینی ملاکر پینے کا ہی

کافی کے پھل سے اسکے بیج نکال لیے جاتے ہیں۔ ہر پھل میں دو بیج ہوتے ہیں، پھل جب پکتا ہی تب سرخ ہو جاتا ہی، مقدار میں بچوں کی کھیلنے کی گولی کے برابر ہوتا ہی پھل کے گچھے درختوں کے تنے پر لٹکتے رہتے ہیں۔

بہت زمانہ گذرا کہ کافی کا درخت اس ملک میں ملک عرب کے بعض عربی سیاح لائے تھے اور جنوبی ہندوستان میں میسور کی پہاڑیوں پر لگایا گیا تھا۔ اب یہ میسور، کورگ، نیلگری وغیرہ کی پہاڑیوں میں بکثرت ہوتا ہی۔ کافی کے بہی باغ ہیں۔ جہاں ہزاروں درخت نظر آئینگے ہندوستان سے باہر عرب میں اور وہاں سے زیادہ برازل (جنوبی امریکہ) میں ہوتے ہیں۔

کافی کا اثر بھی قریب چائے کے ہی مگر اس میں یبوست بہت زیادہ ہی۔ قلب کے واسطے بہت مضر ہی۔ اس لیے ضرور ہی کہ اسکے استعمال کی حالت میں مفرحات کا استعمال رکھیں۔ بہت حار مزاج والوں کا اس سے احتراز ہی کرنا بہتر ہے۔ حکمائے متقدمین کے تجربہ سے ثابت

ہوتا ہے کہ کافی کے ہمراہ دودھ کا استعمال کرنا برص کا مورث ہوتا ہے۔

ابوالکمال دیسنوی

گناہ کا اگن کنڈ[1]

کنور پرتھی سنگھ مہاراجہ بسونت سنگھ کے بیٹے تھے زیورِ حسن و شجاعت سے آراستہ۔ ایران مصر، شام وغیرہ ملکوں میں سیر و سیاحت کی تھی۔ اور کئی زبانوں میں مہارت تام رکھتے تھے ان کی ایک بہن تھی۔ راج نندنی حسن و ملاحت کی تصویر، شیریں زبان، خوش ادا، اور بلند خیال، گناہ سے اُسے خلقی نفرت تھی۔ یہاں تک کہ وہ بارہا مہاراجہ صاحب سے اخلاقی مسائل پر دلیلیں کر چکی تھی۔ اور جب کبھی انہیں نظم و سیاست کے پردے میں کوئی غیر واجب کام کرتے دیکھتی تو حتی الوسع اُسے روکنے کی کوشش کرتی۔ اس کی شادی کنور دھرم سنگھ سے ہوئی تھی جو ایک چھوٹی سی ریاست کے ولی عہد تھے اور جسونت سنگھ کی فوج میں ایک اعلیٰ عہدہ پر مامور تھے۔ دہرم سنگھ بڑا شجاع اور کار پرداز آدمی تھا اسے ہونہار دیکھکر مہاراجہ صاحب نے راج نندنی کو اُس کی آغوشِ محبت میں سونپ دیا تھا اور یہ دونوں بڑے اخلاص سے رہتے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے شیدا تھے۔ دہرم سنگھ زیادہ تر جودہپور ہی میں رہتے۔ پرتھی سنگھ ان کے دلی دوست تھے۔

ایک جان دو قالب، ان میں وہ دوستی تھی جو برادرانہ تعلقات سے بھی زیادہ مضبوط ہوتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے رازدار اور ہمدرد، جس طرح ان دونوں راج کماروں میں یگانگت تھی۔ اسی طرح دونوں راجکماریاں بھی ایک دوسرے پر جان دیتیں۔

پرتھی سنگھ کی بیوی درگا کنور بہت ہی نیک مزاج۔ متین اور درگذر کرنے والی عورت تھی، عام طور پر نند بھاوج میں چشمکیں رہا کرتی ہیں۔ مگر یہ دونوں عورتیں ایک دوسرے کی عاشق زار تھیں۔ اور دونوں سنسکرت علم ادب کی شیدا۔

[1] آتشکدہ گناہ۔

ایک روز دونوں راجکماریاں باغیچہ میں محو خرام تھیں کہ ایک کنیز نے راج نندنی کے ہاتھ میں ایک پرچہ لاکر رکھدیا۔ راج نندنی نے کھولا تو وہ سنسکرت کا ایک رقعہ تھا۔ اسے پڑھکر اس نے کنیز سے کہا جاکر انہیں اندر بھیجدے۔ ذرا دیر میں ایک عورت بوسیدہ کپڑے پہنے آتی دکھلائی دی۔ اسکا سن پچیس سال سے زائد نہ تھا مگر رنگت زرد تھی۔ آنکھیں بڑی بڑی اور ہونٹ خشک چال ڈھال میں نزاکت تھی اور خط و خال نہایت دلفریب۔ قیاس یہ کہتا تھا کہ اس وقت زمانہ نے اس کی یہ حالت بنا رکھی ہے مگر کسی وقت میں وہ نہایت حسین عورت ہوگی۔ اُس عورت نے آکر چوکھٹ چومی اور دعائیں دیکر فرش پر بیٹھ گئی۔ راج نندنی نے اُسے سر سے پاؤں تک بغور دیکھکر پوچھا تمہارا نام کیا ہے۔ اُس نے جواب دیا مجھے برج بلاسی کہتے ہیں۔

راج نندنی۔ "کہاں رہتی ہو،،

برج بلاسی۔ "یہاں سے تین دن کے رستہ پر ایک گاؤں وکرم نگر ہے وہیں میرا مکان ہے،،

راج نندنی "سنسکرت کہاں پڑھی،،

برج بلاسی "میرے باپ سنسکرت کے بڑے پنڈت تھے انہیں نے تھوڑا بہت پڑھا دیا"

راج نندنی" تمہارا بیاہ تو ہوگیا ہے نہ،،

بیاہ کا نام سنتے ہی برج بلاسی کی آنکھوں سے موتی جھڑنے لگے۔ آواز سنبھال کر بولی اسکا جواب میں پھر کبھی دونگی میری رام کہانی بڑی دردناک ہے۔ آپ لوگوں کو سنکر رنج ہوگا۔ اسوقت معاف رکھیے"

آج سے برج بلاسی یہاں رہنے لگی، سنسکرت ادب میں اُسے بڑی رسائی تھی، اور شعرا کے کلام کی دلدادہ۔ وہ ہر روز دونوں راجکماریوں کو نظم و نثر کے کلام پڑھکر سناتی، اُسکے حسن مذاق اور وسیع علمیت نے رفتہ رفتہ راجکماریوں کے دل میں اُس کی محبت اور عزت پیدا کردی۔ یہانتک کہ پاس اور اُترے کی تمیز اُٹھ گئی۔ اور برج بلاسی سہیلیوں کی طرح بے تکلف رہنے لگی۔

(۲)

کئی مہینے گذر گئے۔ کنور پرتھی سنگھ اور دہرم سنگھ دونوں مہاراجہ صاحب کے ساتھ افغانستان کی مہم کو سر کرنے کیلئے گئے ہوئے تھے۔ جدائی کی یہ گھڑیاں یہاں میگدوت اور گھونیس کے مطالعہ میں کٹتیں برج بلاسی کو کالیداس کے کلام سے بہت رغبت تھی اور وہ اس کی توضیح ایسی خوبی سے کرتی اور ایسے لیسے نکتے نکالتی کہ دونوں راجکماریاں وجد کرنے لگتیں۔

ایک روز شام کا وقت تھا دونوں راجکماریاں پائیں باغ کی سیر کرنے لگیں تو دیکھا کہ برج بلاسی ہری ہری گھاس پر لیٹی ہوئی ہے اور اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ راجکماریوں کے حسن سلوک خاطر و مدارات اور بے تکلفانہ برتاؤ نے اسکا حسن بہت کچھ چمکا دیا تھا۔ وہ اب ان کے ساتھ خود بھی راجکماری معلوم ہوتی۔ مگر باوجود ان دلجوئیوں کے یہ غریب عورت اکثر تنہائی میں بیٹھکر رویا کرتی۔ اس کے دل پر ایک ایسا صدمہ تھا جو اُسے دم بھر بھی چین سے نہ بیٹھنے دیتا۔

راجکماریوں نے اسوقت اسے روتے دیکھا تو کمال ہی ہمدردی سے اسکے پاس بیٹھ گئیں۔ راج نندنی نے اسکا سر اپنے زانو پر رکھ لیا اور اسکے گلابی رخساروں کو تھپک کر بولی سکھی! تم اپنے دل کا حال ہمیں نہ بتاؤگی۔ کیا اب بھی ہم غیر ہیں تمہارا یوں اکیلے اکیلے غم کی آگ میں جلنا ہم سے نہیں دیکھا جاتا۔

برج بلاسی آواز سنبھال کر بولی "بہن میں ابھاگن ہوں۔ میرا حال مت سنو۔

راج نندنی۔ اگر بُرا نہ مانو تو ایک بات پوچھوں۔

برج بلاسی۔ کیا کہو۔

راج نندنی۔ وہی جو میں نے پہلے دن پوچھا تھا۔ تمہارا بیاہ ہوا ہے کہ نہیں۔

برج بلاسی۔ اسکا جواب میں کیا دوں ابھی نہیں ہوا۔

راج نندنی۔ کیا کسی کے پریم میں مبتلا ہو

برج بلاسی۔ نہیں بہن ایشور جانتا ہے۔

راج نندنی۔ تو اتنی اداس کیوں رہتی ہو محبت کی خوشی حاصل کرو

راج بلاسی۔ نہیں غم کے سوا دل میں محبت کی جگہ نہیں ہے۔

راج نندنی۔ ہم محبت کی جگہ پیدا کر دیں گے۔

راج بلاسی کنایہ سمجھ گئی بولی بہن ان باتوں کا چرچا مت کرو۔

راج نندنی۔ میں اب تمہارا بیاہ رچاؤں گی۔ لوان بے چھید کو تم نے دکھایا ہے۔

راج بلاسی۔ آبدیدہ ہوکر بولی۔

راجکماری! میں برت دھارنی ہوں اور اپنے برت کا پورا کرنا ہی میری زندگی کا خاص مقصد ہے اس عہد کے پورا کرنے کے لیے میں جیتی ہوں ورنہ میں نے ایسی ایسی آفتیں جھیلی ہیں کہ جینے کی آرزو دل میں باقی نہیں رہی میرے باپ وکرم نگر کے جاگیردار تھے میرے سوا انکے کوئی دوسری اولاد نہ تھی۔ مجھے جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ میری ہی خاطر انہوں نے برسوں تک سنسکرت پڑھا سیکھی تھی۔ فنون سپہ گری میں بڑے ماہر تھے۔ کئی بار لڑائیوں میں شریک ہوئے تھے۔ ایک دن شام کا وقت تھا گائیں مرغزار سے لوٹ رہی تھیں۔ میں اپنے دروازے پر کھڑی تھی اتنے میں ایک شخص بانکی پگیا باندھے۔ بدن پر ہتیار لگائے نشہ جوانمردی سے جھومتا ہوا آتا دکھائی دیا۔ میری پیاری گائے موہنی اسی وقت چراگاہ سے لوٹی تھی۔ اور اسکا بچہ ادھر ادھر کلیلیں کر رہا تھا۔ اتفاق سے بچہ اس نوجوان کے پیروں تلے دب گیا گائے نے اس آدمی پر جھپٹی۔ راجپوت بڑا دلیر تھا اس نے شاید خیال کیا کہ بھاگتا ہوں تو کلنک کا ٹیکا لگتا ہے۔ فوراً تلوار میان سے کھینچ لی اور گائے پر حملہ کر بیٹھا۔ گائے جھلائی ہوئی تھی مطلق نہ ڈری۔ میری آنکھوں کے سامنے راجپوت نے اس پیاری گائے کو جان سے مار ڈالا۔ دیکھتے دیکھتے صدہا آدمی جمع ہو گئے اور اس شخص کو سخت سست کہنے لگے۔

اتنے میں پتاجی بھی آ گئے۔ وہ سندھیا کرنے گئے ہوئے تھے دروازہ پر آ کر دیکھا تو صدہا آدمیوں کا مجمع ہے۔ گائے تڑپ رہی ہے اور اسکا بچہ کھڑا رو رہا ہے پتاجی کی آواز سنتے ہی گائے نے ایک پُر درد آواز سے کراہا اور اُن کی طرف کچھ ایسی دردناک نگاہوں سے دیکھا کہ پتاجی کو طیش آ گیا

میرے بعد انہیں یہ گائے ہی پیاری تھی للکار بولے "میری گائے کس نے ماری ہے" نوجوان شرم سے سر جھکائے سامنے آیا اور بولا میں نے،

پتا جی تم چھتری ہو؟

راجپوت - ہاں -

پتا جی - تو کسی چھتری سے ہاتھ ملاتے -

راجپوت کا چہرہ تمتما گیا بولا! کوئی چھتری سامنے آجائے -

ہزاروں آدمی کھڑے تھے مگر کسی کی ہمت نہ پڑی کہ اس راجپوت کا سامنا کرے - یہ دیکھ کر پتا جی نے تلوار کھینچ لی اور اس پر ٹوٹ پڑے - اس نے بھی تیغہ نکال لیا اور دونوں آدمیوں میں تیغے چلنے لگے - پتا جی بوڑھے تھے - سینہ پر زخم کاری لگا - گر پڑے - انہیں اٹھا کر لوگ گھر میں لائے ان کا چہرہ زرد تھا - مگر آنکھوں سے غصہ کی شعاعیں نکل رہی تھیں - میں روتی ہوئی ان کے سامنے آئی - مجھے دیکھتے ہی انہوں نے سب آدمیوں کو وہاں سے ہٹ جانے کا اشارہ کیا - جب میں اور وہ تنہا رہ گئے تو پتا جی بولے - بیٹی تم رجپوتنی ہو -

میں - جی ہاں -

پتا جی - راجپوت بات کے دھنی ہوتے ہیں -

میں - جی ہاں -

پتا جی - اس راجپوت نے میری گائے کی جان لی ہے - اسکا بدلہ تمہیں لینا ہوگا -

میں - آپ کا حکم بجالاؤں گی -

پتا جی - اگر میرا بیٹا زندہ ہوتا تو میں یہ بوجھ تمہاری گردن پر نہ رکھتا -

میں - آپ کا جو کچھ ارشاد ہوگا میں بسر وچشم بجالاؤں گی -

پتا جی - تم عہد کرتی ہو؟

میں - جی ہاں -

پتاجی۔ اس عہد کو پورا کر دکھاؤ گی۔

میں۔ جہانتک میرا بس چلے گا میں ضرور یہ عہد پورا کروں گی۔

پتاجی۔ یہ میرا تیغہ لو۔ جب تک تم یہ تیغہ اس راجپوت کے کلیجہ میں نہ پیوست کر لینا اپنے اوپر عیش و آرام حرام سمجھنا۔

یہ کہتے کہتے پتاجی کی جان نکل گئی میں نے اسی دن سے جوگن کا بھیس کیا اور اس تیغ کو پہلو میں چھپائے اس راجپوت نوجوان کی تلاش میں گھومنے لگی۔ برسوں گزر گئے۔ میں کبھی بستیوں میں جاتی کبھی کوہ و بیاباں کی خاک چھانتی۔ مگر اس نوجوان کا سراغ نہ ملتا۔ ایک روز میں ایک سنسان جنگل میں بیٹھی ہوئی اپنی حسرت نصیبوں پر رو رہی تھی کہ وہی نوجوان شخص آتا ہوا دکھائی دیا۔ مجھے دیکھ کر اس نے پوچھا کہ تو کون ہے؟

میں۔ میں ایک دکھیاری برہمنی ہوں آپ مجھ پر دیا کیجیے اور مجھے کچھ کھانے کو دیجیے۔

راجپوت۔ اچھا میرے ساتھ آ۔

میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ شخص بے خبر تھا میں نے بجلی کی طرح چمک کر پہلو سے تیغہ نکالا اور اس کے سینہ میں بھونک دیا۔ اتنے میں کئی آدمی آتے ہوئے دکھائی دیے میں اتنی خوف زدہ ہوئی کہ تیغہ چھوڑ کر بھاگی۔ تین سال تک پہاڑوں اور جنگلوں میں چھپی رہی۔ بار بار جی میں آیا کہ کہیں ڈوب مروں۔ مگر جان بڑی پیاری ہوتی ہے۔ نہ جانے کیا کیا ذلت و خواری جھیلنی بدی ہوئی ہے اور اب تک زندہ ہوں۔ آخر جب بہایم کی طرح جنگل میں رہتے رہتے جی اکتا گیا تو مجبور چلی آئی۔ یہاں آپ لوگوں کی غریب پروری کا شہرہ سنا۔ آپ کی سیوا میں آپہنچی اور تب سے آپ کی شفقتوں کی بدولت آرام سے زندگی بسر کر رہی ہوں۔ یہ میری مختصر ر‍‌ام کہانی ہے"

راج نندنی نے لمبی سانس لیکر کہا "افوہ دنیا میں کیسے کیسے لوگ پڑے ہوئے ہیں۔ خیر تمہارے تیغہ نے اسکا کام تو تمام کر دیا۔

برج بلاسی۔ کہاں بہن! وہ بچ گیا۔ زخم اوچھا پڑا تھا۔ اسی شکل کا ایک نوجوان راجپوت میں نے

جنگل میں شکار کھیلتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہیں معلوم وہی تھا یا اور کوئی شکل بالکل ملتی تھی۔

(۲)

کئی مہینے گزر گئے راجکماریوں نے جب سے برج بلاسی کی سرگذشت سنی تھی اس کے ساتھ اور بھی محبت اور ہمدردی کا برتاؤ کرنے لگی تھیں۔ پہلے بے تکلفی میں کبھی کبھی چھیڑ چھاڑ ہو جاتی۔ مگر اب دونوں ہر دم اس کی دلجوئی کیا کرتیں۔ ایک روز بادل گھرا ہوا تھا۔ راج نندنی نے کہا آج بہاری لال کی ست سئی سننے کو جی چاہتا ہے۔ برکھا رت پر اس میں بہت عمدہ دوہے ہیں۔

درگا کنور۔ بڑی انمول کتاب ہے۔ سہیلی! تمہاری بغل میں جو الماری رکھی ہوئی ہے۔ اس میں وہ کتاب ہے ذرا نکالنا۔

برج بلاسی نے کتاب اتاری اور اسکا پہلا ہی ورق کھولا کہ اسکے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی۔ اسکے سرورق پر ایک تصویر زیب دے رہی تھی۔ اسی ظالم کی تصویر تھی جو اس کے باپ کا قاتل تھا۔ برج بلاسی کی آنکھیں شعلہ بار ہو گئیں۔ تیوری پر بل پڑ گئے۔ اپنا عہد یاد آ گیا۔ مگر اسکے ساتھ ہی یہ خیال پیدا ہوا کہ اس شخص کی تصویر یہاں کیسے آئی اور اسے ان راجکماریوں سے کیا تعلق ہے کہیں ایسا نہو کہ مجھے زیربار احسان ہوکر اپنا عہد توڑنا پڑے؟

راج نندنی نے اس کی صورت دیکھکر کہا۔ سکھی کیا بات ہے؟ یہ غصہ کیوں۔ برج بلاسی نے آہستہ سے کہا کچھ نہیں نہ جانے کیوں چکر آ گیا تھا۔

آج سے برج بلاسی کے دل میں ایک اور فکر ہو گئی۔ کیا مجھے زیربار احساں ہوکر اپنا عہد توڑنا پڑیگا؟

(۴)

پورے سولہ مہینے کے بعد افغانستان سے پرتھی سنگھ اور دھرم سنگھ لوٹے۔ شاہی مہم کو بڑی بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ برف کثرت سے پڑنے لگی پہاڑوں کے درے برف سے ڈھک گئے۔ آمد و رفت کے راستے بند ہو گئے۔ رسد کے سامان کمیاب ہونے لگے۔ سپاہی بھی

ہوگوں مرنے لگے تب افغانوں نے موقع دیکھ کر شجون مات نے شروع کیے آخر نہ دامحمی دیر ہوا کام

و پسپا ہوکر واپس آنا پڑا۔

دونوں راجکماریوں جوں جوں جودھپور کے نزدیک پہنچتے تھے انکے دل خوشی سے ہلے جاتے تھے

تے دنوں کی جدائی کے بعد پھر وصال نصیب ہوگا شوق بڑا قدم آگے بڑھتا ہے۔ راستہ پورا

طے کرتے چلے آتے ہیں نہ تھکن معلوم ہوتی ہے نہ ماندگی۔ دونوں سے دھوکے ہیں

کی خوشی میں زخم کی تکلیف بالکل محسوس نہیں ہوتی۔ پرتھی سنگھ درگا کنور کے لیے ایک تحفہ لئے

لائے ہیں۔ دھرم سنگھ نے راج نندنی کے لیے کشمیر کی ایک بیش بہا شال مول لی ہے۔ دونوں کے

دل امنگ سے بھرے ہوئے ہیں۔

راجکماریوں نے جب سنا کہ دونوں ہیرو واپس آتے ہیں تو نشہ مسرت سے متوالی ہو گئیں

سنگار کیا جانے لگا۔ مانگ موتیوں سے بھری جانے لگی۔ اُن کے چہرے فرط مسرت سے

کھلا رہوئے جاتے تھے۔ اتنے دنوں کی جدائی کے بعد پھر ملاپ ہوگا۔ خوشی آنکھوں سے

ابلی پڑتی ہے دونوں ایک دوسری کو چھیڑتی ہیں اور خوش ہو ہو کر گلے ملتی ہیں۔

اگہن کا مہینہ تھا برگد کی ڈالیوں میں مونگے کے خوشے لگے ہوئے تھے جودھپور کے قلعہ

سے سلامیوں کی گھن گرج صدائیں آنے لگیں سارے شہر میں شور مچ گیا کہ کنور پرتھی سنگھ بخیر و عافیت

افغانستان سے واپس آئے

دونوں راجکماریاں تھالوں میں آرتی کے سامان لیے ہوئے دروازے پر کھڑی تھیں۔

پرتھی سنگھ درباریوں کے سلام لیتے ہوئے محل میں آئے درگا کنور نے آرتی اُتاری اور دونوں ایک

دوسرے کو دیکھ کر خوش ہو گئے۔ کنور دھرم سنگھ بھی جوش شجاعت سے اینڈتے ہوئے اپنے محل میں

داخل ہوئے مگر اندر قدم بھی نہ رکھنے پائے تھے کہ چھینک کی آواز سنائی دی اور داہنی آنکھ

پھڑکنے لگی۔ راج نندنی آرتی کا تھال لیکر لپکی۔ مگر پیر پھسل گیا اور تھال ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا

دھرم سنگھ کا ماتھا ٹھنکا۔ اور راج نندنی کا چہرہ زرد ہو گیا۔ یہ بدشگونی کیوں؟

(۵)

برج بلاسی نے دونوں راجکماروں کے آنے کی خبر پاکر ان دونوں کی شان میں دو پُر زور قصیدے کہہ رکھے تھے۔ صبح کو جب کنور پرتھی سنگھ سندھیا سے فارغ ہو کر بیٹھے تو وہ ان کے سامنے آئی اور ایک خوبصورت تھال کی طشتری میں قصیدہ رکھکر پیش کیا۔ پرتھی سنگھ نے دست شوق بڑھا کر قصیدہ لے لیا۔ شاعری اعلیٰ پایہ کی نہ تھی مگر کلام میں تازگی اور متانت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی پرتھی سنگھ نے نفیس شاعرانہ مذاق پایا تھا۔ اس قصیدے کو پڑھکر بہت محظوظ ہوئے اور ایک موتیوں کا ہار انعام دیا۔

برج بلاسی یہاں سے فرصت پاکر کنور دھرم سنگھ کے پاس پہنچی وہ بیٹھے ہوئے راج نندنی سے میدان جنگ کے واقعات بیان کر رہے تھے مگر جوں ہی برج بلاسی کی نگاہ اُن پر پڑی وہ بے اختیار جھجک کر پیچھے ہٹ گئی۔ کنور دھرم سنگھ نے بھی اُسے دیکھا اور چہرہ کا رنگ فق ہو گیا۔ ہونٹ خشک ہو گئے اور ہاتھ پاؤں میں رعشہ سا آگیا۔ برج بلاسی تو اُلٹے پاؤں واپس ہوئی اور دھرم سنگھ نے چارپائی پر لیٹ کر دونوں ہاتھوں سے موہنہ ڈھانپ لیا۔ راج نندنی نے یہ کیفیت دیکھی اور اسکا پھول سا بدن پسینے میں تر ہو گیا۔

دھرم سنگھ سارے دن پلنگ پر پڑے کروٹیں بدلتے رہے۔ چہرہ ایسا کمھلا گیا جیسے برسوں کا مریض۔ راج نندنی اُن کی دلجوئیوں میں مصروف تھی۔ دن تو یوں کٹا رات کو کنور صاحب سر شام ہی سے تھکن کا بہانہ کر کے لیٹ گئے۔

راج نندنی حیران تھی کہ یہ ماجرا کیا ہے۔ کیا برج بلاسی انہیں کے خون کی پیاسی ہے کیا ممکن ہے کہ میرا پیارا۔ میرا عالی دماغ دھرم سنگھ ایسا سنگدل ہو۔ نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہر چند چاہتی ہے کہ اپنی خوش اداؤں سے اُن کے دل کا بوجھ ہلکا کرے۔ مگر ناکام رہتی ہے۔ آخر اُسے بھی نیند نے اپنی آغوش میں لے لیا۔

رات زیادہ آگئی تھی۔ آسمان نے تاریکی کی چادر موہنہ پر لپیٹ لی تھی۔ سارس کی دردناک آواز

کبھی بھی سنائی دیجاتی ہے اور رہ رہ کر قلعہ کے سنتریوں کی آواز کان میں آپڑتی تھی۔ راج نندنی کی آنکھ یکایک کھلی تو دہرم سنگھ کو پلنگ پر نہ پایا۔ اندیشہ ہوا۔ تیزی سے اٹھ کر تین داسی کے کمرے کی طرف چلی۔ اور دروازہ پر کھڑی ہو کر اندر جھانکا۔ شک یقین کے درجہ تک پہنچ گیا کیا دیکھتی ہے چنچلا داسی ہاتھ میں تیغہ لیے کھڑی ہے اور دہرم سنگھ دونوں ہاتھ جوڑے۔ اسکے سامنے بیکسوں کی طرح گھٹنے ٹیکے بیٹھے ہیں۔

یہ نظارہ دیکھتے ہی راج نندنی کا خون خشک ہو گیا اور سر میں چکر سا آنے لگا پیر تھرتھرانے لگے معلوم ہوا گر ہی جاتی ہے۔ وہ اپنے کمرے میں آئی اور موںہ ڈہانپ کر لیٹ رہی مگر اس کی آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ بھی نہ نکلا۔

(۶)

دوسرے دن پرتھی سنگھ علی الصباح کنور دہرم سنگھ کے پاس گئے اور مسکرا کر کہا بھیا موسم بڑا سہانا ہے شکار کھیلنے چلتے ہو؟

دہرم سنگھ کسی گہرے خیال میں غرق تھے۔ سر اوپر اٹھایا تو چہرہ اداس تھا ہوائیاں اڑ رہی تھیں بولے "کیا کہا؟

پرتھی سنگھ۔ شکار کھیلنے چلتے ہو۔

دہرم سنگھ ہاں چلو۔

دونوں راجکماروں نے گھوڑے کسوائے۔ اور شکار گاہ کی طرف چلدیے۔ پرتھی سنگھ کا چہرہ شگفتہ تھا۔ جیسے کنول کا پھول کھلا ہو۔ ایک ایک حرکت سے تیزی اور چستی ٹپکی پڑتی تھی۔ مگر کنور دہرم سنگھ کے چہرہ پر زردی چھائی ہوئی تھی گویا بدن میں جان نہیں ہے۔ پرتھی سنگھ نے انہیں کئی مرتبہ چھیڑا۔ مگر جب دیکھا کہ یہ بہت زیادہ دلگرفتہ ہیں تو خاموش ہو گئے۔ چلتے چلتے دونوں آدمی ایک جھیل کے کنارے پر پہونچ گئے یکایک دہرم سنگھ ٹھٹک گئے اور بولے میں نے آج رات کو ایک سخت عہد کیا ہے" یہ کہتے کہتے ان کی آنکھیں پرنم ہو گئیں

پرتھی سنگھ نے گھبرا کر پوچھا کیسا عہد

دھرم سنگھ۔ تم نے بن بلا کی سرگذشت سُنی ہے۔

پرتھی سنگھ۔ ہاں۔

دھرم سنگھ۔ میں نے عہد لیا ہے کہ جس شخص نے اس کے باپ کا خون کیا ہے اُسے بھی جہنم میں بھیج دوں۔

پرتھی سنگھ۔ تم نے واقعی بڑا دلیرانہ عہد لیا ہے۔

دھرم سنگھ۔ ہاں بشرطیکہ پورا کر سکوں۔ کیوں تمہارے خیال میں ایسا شخص گردن زدنی ہے یا نہیں؟

پرتھی سنگھ۔ ایسے موذی کی گردن کند چھری سے کاٹنی چاہیے۔

دھرم سنگھ۔ بیشک میرا بھی یہی خیال ہے۔ اگر میں کسی وجہ سے یہ کام نا انجام دیسکوں تو تم میرا عہد پورا کر دو گے۔

پرتھی سنگھ۔ بڑے شوق سے۔ تم اُسے پہچانتے ہو نہ۔

دھرم سنگھ۔ ہاں اچھی طرح۔

پرتھی سنگھ۔ تو بہتر ہو گا کہ یہ کار خیر مجھی کو کرنے دو۔ تمہیں شاید اُس پر رحم آجائے۔

دھرم سنگھ۔ ہمت خوب۔ مگر یاد رکھو۔ وہ شخص بڑا خوش نصیب ہے کئی بار موت کے مونھ سے بچ نکلا ہے۔ کیا عجب ہے کہ تم بھی نرم ہو جاؤ اس لیے تم بھی عہد کرو کہ اُسے ضرور واصل جہنم کرو گے۔

پرتھی سنگھ۔ میں درگا کی قسم کھاتا ہوں کہ اس شخص کے خون سے اپنے تیغہ کی پیاس بجھاؤنگا۔

دھرم سنگھ۔ بس ہم دونوں ملکر یہ مہم سر کریں گے۔ تم اپنے عہد پر قائم رہو گے نہ۔

پرتھی سنگھ۔ کیوں! میں سپاہی نہیں ہوں۔ ایک دفعہ جو عہد کیا بس سمجھ لو کہ وہ پورا ہو کر رہے گا چاہے اس میں اپنی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔

دہرم سنگھ۔ ہر حالت میں۔

پرتھی سنگھ۔ ہاں ہر حالت میں۔

دہرم سنگھ۔ اگر وہ تمہارا کوئی عزیز ہو تو؟

پرتھی سنگھ (دہرم سنگھ کو ٹٹولتی ہوئی نگاہوں سے دیکھکر) کوئی عزیز ہو تو۔

دہرم سنگھ۔ ہاں ممکن ہے کہ وہ تمہارا کوئی رشتہ دار ہو۔

پرتھی سنگھ۔ (جوش سے) کوئی ہو۔ اگر میرا بھائی ہو تو زندہ چُنوا دوں۔

دہرم سنگھ۔ گھوڑے سے اُتر پڑے اُن کا چہرہ مُرجھایا ہوا تھا۔ اور ہونٹ کانپ رہے تھے انہوں نے کمر سے تیغہ کھول کر زمین پر رکھدیا۔ اور پرتھی سنگھ کو للکار کر بولے "پرتھی سنگھ تیار ہو جاؤ۔ وہ موذی ملگیا" پرتھی سنگھ نے چونک کر ادہر اُدہر دیکھا۔ مگر دہرم کے سوا اور کوئی دکھائی پڑا۔

دہرم سنگھ۔ تیغہ کھینچو۔

پرتھی سنگھ۔ میں نے اُسے نہیں دیکھا۔

دہرم سنگھ۔ وہ تمہارے سامنے کھڑا ہے۔ وہ سیہ کار موذی دہرم سنگھ ہی ہے۔

پرتھی سنگھ (گھبراکر) ایں! یہ سنگدلی۔

دہرم سنگھ۔ راجپوت! اپنا عہد پورا کر۔

اتنا سنتے ہی پرتھی سنگھ نے بجلی کی طرح کمر سے تیغہ کھینچ لیا۔ اور اُسے دہرم سنگھ کے سینہ میں چُبھو دیا۔ تیغہ دستہ تک چبھ گیا۔ خون کا فوارہ بہ نکلا۔ دہرم سنگھ زمین گر پڑے اور آہستہ سے بولے پرتھی سنگھ! میں تمہارا بہت مشکور ہوں۔ تم سچے بیر ہو۔ تم نے مرد کا فرض مرد کی طرح پورا کیا۔

پرتھی سنگھ نے یہ سُنا۔ اور زمین پر بیٹھکر رونے لگے۔

آج راج نندنی ستی ہونے جارہی ہے۔ اُس نے سولھوں سنگار کیے ہیں اور مانگ موتیوں سے بھری گئی ہے۔ کلائی میں سیاہ کانگن باندھا ہے پیروں میں سرخ مہندی رچائی ہے اور گلنار جوڑا زیب بدن کیا ہے اس کے بدن سے خوشبو اُڑ رہی ہے کیونکہ آج وہ ستی ہونے جاتی ہے۔

راج نندنی کا چہرہ بدر کامل کی طرح درخشاں ہے اس کی طرف دیکھتے ہی آنکھیں جھپک جاتی ہیں۔ نشۂ محبت سے اسکا رواں رواں مست ہوگیا ہے اس کی آنکھوں سے روحانی نور برس رہا ہے وہ آج آسمان کی دیوی معلوم ہوتی ہے اس کی چال کیسی مستانہ ہے نشۂ محبت میں جھوم رہی ہے وہ اپنے پیارے پتی کا سر گود میں لیے ہوئے آتی ہے اور اس چتا میں بیٹھ جاتی ہے جو صندل خس اور عود سے بنائی گئی تھی۔

سارے شہر کے لوگ یہ نظارہ دیکھنے کے لیے اُمڈے چلے آتے ہیں۔ باجے بج رہے ہیں پھولوں کی برکھا ہو رہی ہے۔ ستی چتا میں بیٹھ چکی ہے کہ اتنے میں کنور پرتھی سنگھ آئے اور ہاتھ جوڑ کر کہا "مہارانی میرا قصور معاف کرو۔"

ستی نے جواب دیا "معاف نہیں ہو سکتا تم نے ایک نوجوان راجپوت کی جان لی ہے۔ تم بھی جوانی میں قتل کیے جاؤ گے" ستی کے بچن کبھی جھوٹے ہوئے ہیں۔ یکایک چتا میں آگ کا شعلہ نمودار ہوا۔ جے جے کار کے نعرے بلند ہوئے آگ میں ستی کا چہرہ یوں چمکتا تھا جیسے افق کی سرخی میں آفتاب چمکتا ہے۔ ذرا دیر میں وہاں ایک تودۂ خاک کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

اس ستی کے مزاج میں کیسا ست تھا۔ پرسوں جب اس نے برج بلاسی کو جھجک کر دہرم سنگھ کے سامنے جاتے دیکھا تھا۔ اسی وقت اسکے دل میں شک پیدا ہو گیا تھا۔ مگر جب رات کو اُس نے دیکھا کہ میرا شوہر اس عورت کے سامنے بیکسوں کی طرح بیٹھا ہوا ہے۔ تو شک یقین کے درجے تک پہنچ گیا۔ اور یقین ست کا جذبہ اپنے ساتھ لیتا آیا سویرے جب دہرم سنگھ اُٹھے تو راج نندنی نے کہا کہ میں برج بلاسی کے دشمن کا سر چاہتی ہوں تمہیں لانا ہوگا۔ دہرم سنگھ نے کہا کہ شام تک تمہارے سامنے وہ سر آجائے گا۔ اور ایسا ہی ہوا۔ اپنے

سستی ہونے کے سب اسباب راج نندنی نے خود بخود جان بوجھکر پیدا کیے کیونکہ اسکے مزاج میں سُست تھا۔

کیسا اعلیٰ اخلاقی معیار ہی۔ اور کیسی عبرتناک داستان! گناہ کی آگ کیسی تیز ہوتی ہے اس کی لپٹ جانسوز ہوتی ہی۔ ایک گناہ نے کتنی جانیں جلا ڈالیں شاہی خاندان کے دو کنور اور شاہی خاندان کی دو کنوریاں دیکھتے دیکھتے اس آگ کنڈ کی نذر ہوگئیں۔ کیونکہ ستی کا بچن ست ہوا۔ اور ساتھ ہی ہفتہ کے اندر پرتھی سنگھ بھی دہلی میں قتل کیے گئے۔ اور درگا کنور نے اپنے تئیں اُن پر قربان کردیا۔

افسانۂ کہن

بقیہ شاہ لیر

گانرل (شاہ لیر سے) کیوں صاحب میری ہمشیرہ کا مجھ سے ہاتھ ملانا آپ کو کیوں بُرا معلوم ہوا۔ آپ میرا کوئی قصور بھی بتاتے ہیں یا نہیں۔ اگر کوئی زود رنج سترہ بہترہ آدمی دوسروں کو بات بات میں قصوروار ٹھہرائے تو اس میں دوسروں کا کیا قصور ہے۔

لیر او خاک کے پتلے تو کس درجہ سخت واقع ہوا ہی کہ باوجود اس درجہ سختیاں جھیلنے کے بھی ابھی تک قائم ہی۔ سخت جانی تیرا بُرا ہو۔ اچھا مجھے کوئی یہ تو بتاؤ کہ میرے ملازم کو کس نے قید کیا۔

کارنوال۔ صاحب میں نے اسکو قید کیا تھا۔ لیکن اسکو اپنے قصور کی سزا اس سے بھی زیادہ ملنی چاہیے تھی۔

لیر۔ تم نے قید کیا تھا! تم نے!!

ریگن۔ والد صاحب میں آپ سے التجا کرتی ہوں کہ آپ اس قدر کمزور اور بڈھے ہیں کہ آپ کو ان بیہودہ رسمیوں سے باز آنا چاہیے۔ اب اگر آپ لوٹ کر میری ہمشیرہ کے ہاں جانا چاہیں تو جائیے اور ایک ماہ تک حسب قرارداد اُنکے پاس رہیے اور اسکے بعد اپنے ہمراہیوں میں سے آدمیوں کو موقوف

کرنے کے بعد اگر میرے ہاں آپ آئینگے تو میں اپنے گھر میں آنے کی آپ کو اجازت دونگی اور اس وقت آپ جانتے ہیں کہ میں خود اپنے گھر سے دور پڑی ہوں میرے پاس آپ کی خاطر مدارات کے لیے کوئی سامان نہیں ہے۔ میں مجبور ہوں اور آپ کو اپنے پاس نہیں رکھ سکتی معاف فرمائیے۔

لیر۔ اب گانرل کے ہاں لوٹ کر جاؤں۔ اور پچاس آدمیوں کو موقوف کرکے پھر آؤں۔ نہیں نہیں یہ مجھ سے ہرگز نہ ہوگا۔ اب میں کسی کے گھر میں نہیں رہ سکتا۔ میں گھروں میں رہنا بھی ترک کرتا ہوں۔ میں بہتر سمجھتا ہوں کہ مینہ اور سرد ہوا کی سختی اور تکلیف برداشت کروں بہ نسبت اسکے کہ تم لوگوں کی سختیاں جھیلوں۔ میں مناسب سمجھتا ہوں کہ جنگل کے رہنے والے بھیڑیے اور بستر کو اپنا ہمنشیں بناؤں اور محتاجی کے تیز دانتوں کے سامنے اپنے جسم کو پیش کروں کہ وہ پھاڑ پھاڑ کر کھالے

اسکے مکان پر لوٹ کر چلا جاؤں! کیوں میں شاہ فرانس کے تخت کے سامنے ہی جاکر ہاتھ جوڑکر سجدہ میں کیوں نہ گر پڑوں جو بلا کسی جہیز کے طیش میں آکر ہماری سب سے چھوٹی بیٹی کو بیاہ کرلے گیا ہے اور ایک ادنیٰ خادم کی طرح اس سے اپنی پنشن مقرر کرالوں تاکہ یہ ذلیل زندگی کچھ دنوں تک اور بسر کرسکوں۔ اسکے ہاں لوٹ کر جاؤں! تم یوں ہی کیوں نہیں کہتی ہو کہ اس قابل نفرت سائیس (آسولڈ کی طرف اشارہ کرکے) کی غلامی اور خدمت گزاری اختیار کروں۔

گانرل۔ ہزار مرتبہ دل چاہے تو کیجیے ورنہ مت کیجیے۔

لیر بیٹی مجھپر تمہاری مہربانی ہوگی اگر تم ایسی سخت باتوں سے مجھے رنج پہنچا پہنچا کر بالکل ہی دیوانگی کی حالت تک نہ پہنچا دوگی۔ میری بیٹی میں اب کبھی بھی آپ کو تکلیف نہ دونگا۔ خدا حافظ! اب میں آیندہ کبھی بھی تم سے نہیں ملونگا۔ اب ہماری تمہاری زندگی بھر کبھی ہی ملاقات نہ ہوگی۔ خون کے رشتے کو میں کیسے مٹا سکتا ہوں۔ تم میری لڑکی ہو۔ میرا خون اور گوشت پوست تم میں بھی موجود ہے نہیں نہیں تم میرے خون اور گوشت میں ایک بیماری کے طور پر ہو کہ میں تم کو اس طریقہ سے اپنی کہنے پر مجبور ہوں جیسے ایک بیمار آدمی بیماری کو اپنی بیماری کہنے پر مجبور ہوتا ہے۔ تم میرے

بگڑے ہوئے خون میں ایک پھوڑا ہو۔ بلکہ ناسور ہو۔ نہیں بلکہ اڈیٹ پھوڑا ہو جو جسم سے ابھرا ہوا نظر آتا ہے
لیکن میں تم کو اب شرمندہ کرنا نہیں چاہتا۔ ندامت اور شرمندگی خود بخود کبھی تو تم تک پہونچیگی
میں اس وقت ان کو بلانا نہیں چاہتا۔ میری اس وقت یہ خواہش نہیں ہے کہ آسمانی گولا تمہارے سر پر
گرے اور نہ میری خواہش ہے کہ بجلی تمہاری نالائقی کا قصہ اُس حاکم تک پہنچائے جو انصاف کی غرض
سے سب سے اعلیٰ عرش پر بیٹھا ہے۔ جہانتک تم سے ہو سکے تم اپنی اصلاح کرلو اور اطمینان سے
فرصت پاکر اپنے کو اچھا ثابت کرنے کی فکر کرو۔ میں تحمل اور برداشت سے کام لونگا میں اب اپنی
بیٹی ریگن کے پاس معہ اپنے ایک سو ہمراہیوں کے رہجاؤنگا۔

ریگن۔ والد صاحب معاف کیجیے آپ کا یہ خیال ٹھیک نہیں۔ اسوقت میرے ہاں رہجانیکا
خیال اپنے دماغ سے نکال ڈالیے۔ مجھے یہ امید نہیں تھی کہ آپ اس قدر جلد میرے ہاں آکر
رہنے لگینگے۔ آپ کے خیر مقدم کے لیے میرے پاس کوئی سامان نہیں ہے جو بات ہمشیرہ صاحبہ
آپ سے کہہ رہی ہیں آخر اسکے ماننے میں آپ کو کیا عذر ہے۔ جو لوگ آپ کو طیش میں آنے پر
نیک مشورہ دیتے ہیں۔ وہ یہ جانتے ہیں کہ بڑھاپے کی وجہ سے آپ کی عقل ٹھیک نہیں رہی
ہے اسلیے درگذر ہی مناسب ہے لیکن میری بہن اپنے کاموں کو خود ہی اچھی طرح سمجھتی ہے۔

لیر۔ کیا ریگن تم کو مجھ سے ایسی باتیں کرنی مناسب ہیں۔

ریگن۔ جناب میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ میں نے کوئی بات نامناسب نہیں کہی۔ کیا
پچاس ہمراہی آپ کے لیے کافی نہیں ہیں۔ اس سے زیادہ کی آپ کو ضرورت ہی کیا ہے۔
بلکہ یہی زیادہ ہیں۔ اس قدر بڑی تعداد کا صرف اور انکو ایک جگہ رکھنے کا اندیشہ یہ دونوں باتیں
آپ کی ضد کے مقابل میں ملحوظ رکھنی پڑینگی۔ آپ ہی فرمائیے کہ ایک گھر میں دو مختلف آقاؤں کی
ماتحتی میں اتنی بڑی تعداد کا اتفاق کیسے ممکن ہے۔ یہ میرے خیال میں ناممکن ہے۔

گانرل۔ کیوں صاحب کیا آپ ریگن کے اور میرے ملازموں سے بھی تو خدمت لے
سکتے ہیں۔

ریگن۔ اگر ہمارے ملازموں سے آپ خدمت لینے پر رضامند ہوں تو جب کبھی وہ آپ کی خدمتگزاری میں کوتاہی یا غفلت کرینگے۔ تو ہم ان کو مجبور کر سکتے ہیں یا سزا دیسکتے ہیں۔ اب مجھے آپ کے بہت ملازموں کے متعلق ایک ڈر اندیشہ پیدا ہوتا ہی۔ آپ مہربانی سے میرے ہاں جب تشریف لائیں تو پچیس آدمیوں سے زیادہ نہ لائیگا۔ اور اگر آپ زیادہ لائینگے تو میرے ہاں انکا ٹھکانا نہیں ہے۔

لیر۔ بیٹی تمہارے پاس یہ سب کچھ میرا ہی تو دیا ہوا ہے۔

ریگن۔ ہاں ہی تو سہی اور آپ نے بہت مناسب وقت پر میرے حوالہ کر دیا۔

لیر۔ مینے تم کو اپنا سرپرست اور محافظ بناکر صرف اپنے لیے یہ شرط لگائی تھی کہ میرے ساتھ اتنے ہمراہی رہا کرینگے۔ کیا ریگن واقعی تمہارا یہ خیال ہی کہ مجھے صرف پچیس ہمراہیوں کے ساتھ تمہارے ہاں آنا چاہیے۔

ریگن۔ جناب میں پھر آپسے کہے دیتی ہوں کہ اس سے زیادہ تعداد میرے ہاں نہ لائیگا۔

لیر۔ بعض وقت جب برے آدمی بھی اپنے سے بروں کے مقابل میں کھڑے ہوتے ہیں تو اچھے معلوم ہونے لگتے ہیں (گانرل کی طرف مخاطب ہوکر) میں اب تمہارے ساتھ جانے پر رضامند ہوں۔ تم میرے پچاس ہمراہیوں کو رکھنے پر رضامند ہو۔ اور یہ تو صرف پچیس ہی رکھنا چاہتی ہی۔ تمہاری مجھ پر دوچند مہربانی ہی۔

گانرل۔ حضور کو پچاس یا پچیس یا دس یا پانچ ہمراہیوں کو بھی کیا ضرورت ہی۔ آپکے لیے میرے ہاں خدمت گزاروں کی کیا کمی ہے۔

ریگن۔ ایک آدمی کی بھی ضرورت نہیں۔

لیر۔ بیٹی ضرورت کا کیا ذکر کرتی ہو۔ ذلیل فقیروں کے پاس بعض وقت کم سے کم اور ذلیل سے ذلیل اشیا بھی زائد از ضرورت معلوم ہوتی ہیں۔ اگر محض زندگی کا قائم رکھنا ہی مقصود ہوتا تو ہماری ضروریات جانوروں کی ضروریات سے زیادہ نہیں ہوسکتیں۔ تم بیگم صاحبہ ہو اگر تم کو

بنے کو گرم رکھنا مد نظر ہوتا تو تم ایسی بھڑکدار پوشاک جو مشکل سے تم کو گرم رکھ سکتی ہے کیوں پہنتیں۔ لیکن اے خدا میری اصلی ضرورت جس کی میں آپ سے خواہش کرتا ہوں وہ صبر ہے۔ مجھکو صبر عطا کر میرے خدا تو اس بڑھاپے میں میری مصیبت زدہ حالت کو اپنی آنکھ سے دیکھ رہا ہے۔ میرا بڑھاپا اور میرا موجودہ رنج دونوں میرے لیے سخت مصیبت خیز ہیں۔ اے خدا اگر ان بیٹیوں کے دل تو نے میری مخالفت پر آمادہ کیے ہیں تو مجھ پر اتنا تو رحم کر کہ میں بے عزتی اور رسوائی سے ان کی ناحقانہ سختیوں کو تو نہ برداشت کروں۔ مجھکو شریفانہ عزت عطا کر تاکہ میں عورتوں کی طرح آنسو بہا کر اپنے مردانہ رخساروں کو ذلیل نہ کروں۔

تم ناخلف چڑیلوں میں تم دونوں سے ایسا بدلہ لونگا کہ جس سے تمام دنیا کو عبرت ہوگی ابھی تک میں نہیں کہہ سکتا کہ میں کیا کرونگا مگر یاد رکھو کہ میں تمہاری ایسی درگت کرونگا کہ دیکھنے والوں کا دل دہل جائے۔ کیا تم خیال کرتی ہو کہ میں صرف رونے دھونے پر اکتفا کرونگا۔ نہیں ہرگز نہیں میں ایک آنسو بھی نہیں بہانے کا۔ گو میرے رونے کے لیے تو آپ لوگوں نے بہت سے سامان ہم پہنچا دیے ہیں۔ اگر یہ دل آئینہ کی طرح ٹوٹ کر اس کے ہزار ٹکڑے بھی ہوجائینگے تو بھی میں نہیں روؤنگا۔ میرے دیوانے اب میں بھی پاگل ہو چلا ہوں۔

(لیر، گلاسٹر، کینٹ اور دیوانہ اسٹیج سے چلے جاتے ہیں)

کارنوال (دور سے زور کی آندھی اٹھتی دیکھکر) چلو یہاں سے چلدو سخت آندھی آرہی ہے۔

ریگن۔ بھلا اس چھوٹے سے مکان میں اس بڈھے اور اسکے ہمراہیوں کا گذارہ کیسے ہو سکتا تھا۔

گانرل۔ یہ انکا اپنا قصور ہے۔ خود اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی ماری اور اپنے کو آرام سے الگ کیا ہے۔ اب اپنی حماقت کا مزہ چکھیں۔

ریگن۔ اگر وہ خود تن تنہا میرے ہاں رہنا چاہیں تو میں خوشی سے رکھ لونگی لیکن انکے ایک

ہمراہی کی بھی روادار نہیں ہوں۔

گانرل۔ میرا بھی بالکل یہی خیال ہی۔ شاہزادہ گلاسٹر کہاں تشریف لے گئے۔

کارنوال۔ وہ اسی بڈھے کے ساتھ گئے ہیں۔ وہ واپس آگئے۔

(گلاسٹر پھر اسٹیج پر آتا ہی)

گلاسٹر۔ بادشاہ سلامت تو سخت طیش کی حالت میں تھے۔

کارنوال۔ وہ کس جانب کو گئے ہیں۔

گلاسٹر۔ وہ اپنے گھوڑ کسواتے ہیں۔ یہ نہیں معلوم ہوا کہ کہاں جائینگے۔

کارنوال۔ ان کو اپنی مرضی پر چھوڑ دو وہ کسی کی سنتے ہیں۔

گانرل۔ مہربانی سے ان کو ہرگز نہ روکیے۔

گلاسٹر۔ افسوس! رات کی تاریکی بڑہتی جاتی ہی اور تیز ہوا کا جھکڑ طوفان برپا کر رہا ہی یہاں آس پاس میلوں تک کہیں درخت یا جھاڑی کا نشان بھی نہیں پایا جاتا۔

ریگن۔ صاحب ضدی آدمی جو اپنے لیے خود مصیبت ڈہونڈھ کر لاتے ہیں انکو مصیبت اٹھانے دو کہ وہ آیندہ کے لیے سبق حاصل کریں۔ مکان کے دروازے بند کرا دیجیے۔ آپ جانتے ہیں کہ ان کے ساتھ ایک نہایت بدمعاش خودسروں کا گروہ ہے۔ نہ معلوم وہ ان کو کس کس بات پر نہ آمادہ کرینگے اور دور اندیشی اور احتیاط کا یہ مقتضے ہے کہ ہم ہوشیار رہیں۔

کارنوال۔ صاحب ضرور دروازے بند کرا دیجیے آج بہت ہی سخت اور مصیبت کی رات ہی۔ میری پیاری ریگن نے آپ کو بہت اچھا مشورہ دیا ہی۔ آپ مینھ اور طوفان میں سے ہٹ جائیے۔

(باقی آیندہ)

اڈیٹوریل

مدرسہ نسواں علی گڈھ میں اکثر موقعوں پر شہر کی بیویوں کو مدعو کیا جاتا ہے تاکہ ان میں اپنی بچیوں کی تعلیم کے لیے دلچسپی پیدا ہو۔ اب کے ایک بہت اچھا موقع ہاتھ آیا جس کی وجہ سے ہمنے کسی قدر اہتمام سے شہر کے معزز گھرانوں کی خواتین کو بلا کر ایک شاندار جلسہ کیا۔

موقع یہ تھا کہ مدرسہ کی چھ لڑکیوں نے قرآن شریف ختم کیا تھا اور ان میں سے پانچ لڑکیوں کے والدین نے خواہش کی کہ آمین کی مبارک رسم مدرسہ میں ادا کی جائے۔ لڑکیوں میں سے ایک لڑکی ہمارے محب قوم مولوی بشیر الدین صاحب اڈیٹر اخبار البشیر کی سگی بھانجی ہیں دوسری مولوی رشید احمد صاحب سالم کی صاحبزادی اور مولانا عبداللہ صاحب انصاری ناظم دینیات علیگڈھ کالج کی نواسی ہیں اور تیسری مولوی سعید احمد صاحب تھانوی کی صاحبزادی ہیں اور چوتھی اکرم علیخاں صاحب رئیس علیگڈھ کی نواسی ہیں اور پانچویں مطبع فیض عام جس میں ہمارا رسالہ خاتون چھپتا ہے اسکے مالک مولوی عبدالسلام کی بہن ہیں۔

مسز عبداللہ نے تقریباً ایک سو چھپے ہوئے دعوتی خطوط شہر اور چھاونی کی معزز بیویوں کے نام جاری کیے ان میں سے ستر بیویاں تشریف لائیں اور جلسہ میں شریک ہوئیں۔ یہ جلسہ ۲۔ اپریل سنہ ۱۹۱۰ء کو ہوا۔ مدرسہ کے مکان میں سامنے کے بڑے وسیع چبوترے پر ایک شامیانہ نصب کر دیا گیا تھا اور اسکے نیچے قرینے سے کرسیاں لگا دی گئی تھیں۔ نیز اندر دالان میں چاندنی کا فرش کر دیا گیا تھا

اول دس بجے سے ایک بجے تک مدرسہ کی طالب علم لڑکیاں قریب سو کے آ آ کر جمع ہوتی رہیں اور دو بجے سے مہمان بیویاں آنی شروع ہوئیں۔ کچھ بیویاں تو اندر دالانوں میں چاندنی پر بیٹھ گئیں۔ کیونکہ علی گڈھ شہر میں ابھی تک زیادہ علم کی روشنی نہیں پھیلی ہے اسلیے پرانے خیال کی بیویاں چاندنی کے فرش کو کرسیوں پر ترجیح دیتی تھیں۔ لیکن بعض شہر کی بیویاں اور تقریباً کل وہ بیویاں جو چھاونی سے تشریف لائی تھیں کرسیوں پر بے تکلف بیٹھ گئیں۔

تین بجے کے بعد اول مولود شریف پڑھا گیا۔ ایک استانی اور ایک مہمان بیوی نے

نہایت خوش الحانی کے ساتھ پڑھا جس سے سب بیبیاں اور بچیاں محظوظ ہوئیں۔ کیونکہ دو بیویوں کا آواز ملا کر پرلطف لہجے میں پڑھتے ہوئے علیگڈھ میں شاید یہ پہلے ہی بار تھا۔ میلاد شریف کے ختم ہونے کے بعد مدرسہ کی ہیڈ معلمہ محمدی بی بی صاحبہ نے لڑکیوں کو ایک ایک کرکے آمین پڑھائی ہم اس موقع پر محمدی بی صاحبہ کی قابلیت اور محنت اور پوری توجہ کا اعتراف کرتے ہیں جو انکو مدرسہ کی کامیابی کے لیے ہے۔

آمین ختم ہونے کے بعد اُستانی شفاعت فاطمہ بیگم صاحبہ نے ایک دعائیہ نظم جو اُنہوں نے خود تصنیف کی تھی خوش الحانی کے ساتھ پڑہی جسکو سُنکر حضرات کو بہت لطف آیا۔ اسکے بعد تمام لڑکیوں اور بیویوں میں شیرنی تقسیم ہوئی۔ اور پان وعطر بھی تقسیم ہوا۔ جن لڑکیوں کی آمین ہوئی تھی۔ اُنکے والدین نے بڑی اُستانی صاحبہ کو کچھ نقد اور کپڑے نذر کیے لیکن ہماری سیر چشم ہیڈ معلمہ صاحبہ نے وہ کل رُپیے اور کپڑے وغیرہ مدرسہ کی اعانت کے لیے دیدیئے۔ ہم اسکے لیے ہیڈ معلمہ صاحبہ کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ ہمارے مسلمان مردوں کے لیے ان استانیوں کی مثال قابل تقلید ہے۔

نمایش۔ گذشتہ نمایش رنگون کے متعلق ہندوستان میں جو کچھ دلچسپی تھی اس سے ناظرین و ناظرات واقف ہیں لیکن ہم کو اس بات کے دیکھنے سے بہت خوشی ہوئی کہ دوسرے اسلامی ممالک میں بھی ہماری نمایش کے متعلق دلچسپی لیجانے لگی ہے۔ اور سب سے زیادہ خوشی کی بات ہے کہ کانفرنس کی اس خاص شاخ کی یہانتک قدردانی ہوئی ہے کہ مفصلہ ذیل مضمون میں جو مصر کے اخبار المؤید سے ترجمہ کیا جاتا ہے نمایش کو کانفرنس کا بہترین شعبہ بیان کیا گیا ہے۔ اُسکا نامہ نگار لکھتا ہے۔

اس سے پہلے مراسلے میں مینے جو آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا حال لکھا تھا اُس مین زنانہ نمایش کا ذکر کرنا بھول گیا تھا حالانکہ وہ کانفرنس کا بہترین شعبہ ہے۔ اس نمایش کا افتتاح برہما کے گورنر صاحبہ کی اہلیہ صاحبہ نے کیا تھا۔ اور اس موقع پر شہر رنگون کے

عمائدین سر چارلس فاکس چیف جسٹس اور خود گورنر صاحب تشریف لائے تھے۔ مسٹر ڈانٹر صاحب نے نہایت فصیح و بلیغ زبان میں لیڈی واٹ کو ایڈریس پیش کیا۔ اسکے بعد حضرت فاضل صاحبزادہ آفتاب احمد خان صاحب نے ایک نہایت پُرزور اور شاندار اسپیچ دی۔ جس میں اس نمائش کی تاریخ بیان کی اور بتایا کہ مسلمان اسکے انعقاد کے لیے کس قدر اہتمام کرتے ہیں۔ اور نیز یہ کہ اس سے کس قدر فوائد حاصل ہوتے ہیں برٹش گورنمنٹ کی بھی تعریف کی کہ وہ ترویج علم اور حامیان تعلیم کی امداد میں کیا قدر کوشش کرتی ہے۔

بینڈ باجہ بج رہا تھا۔ اور اسپیچوں کے درمیان میں زور زور کی چیرز ہوتی تھیں اسکے بعد پھر لیڈی واٹ نے نمائش کے افتتاح کا اعلان کیا اور حاضرین نے اشیاء نمائش کا ملاحظہ کیا۔ جن میں کارچوبی اور ریشم کے کام کے نہایت نفیس نمونے موجود تھے۔ ان کے علاوہ اور بھی متعدد قسم کی چیزیں تھیں جنکی مجموعی تعداد پانچ سو نمونوں سے زیادہ تھی۔ اس نمائش کی ترتیب و نظم جنس لطیف کے ذوق سلیم کا نتیجہ تھا۔ برمی لڑکیوں نے اپنی دستکاریوں کے عمدہ عمدہ نمونے پیش کیے تھے دیگر اقوام نے بھی اس ملکی اور وطنی خدمت میں شرکت سے گریز نہیں کیا تھا برما کی مسلمان لیڈیوں کی مصنوعات میں ایک سفید ریشم کا پردہ جس پر سرخ دھاریاں تھیں خصوصیت کے ساتھ نہایت دلفریب نمونہ تھا اسپر خوبصورت عربی خط میں جملہ لکھا ہوا تھا۔ السلطان ظل اللہ

داخلہ کے دروازہ کے سامنے ہی یہ پردہ لگایا گیا تھا تاکہ ہر شخص کی نگاہ پڑے اور اس صنعت اور اسکے صانع کی ذوق کی داد دے۔ نمائش کے منتظمین نے ایک دن خصوصیت کے ساتھ اس غرض کیلیے مخصوص کر دیا تھا کہ صرف مسلمان پردہ دار خواتین آکر اس دن نمائش کو دیکھیں کاتب سطور نے اس موقع کو غنیمت سمجھکر اپنی قوم کی خدمت کی کہ اس نمائش میں ترکی مصنوعات کے بھی پچاس نمونے رکھدیے۔ جو سب از قسم پارچہ جات تھے۔ ان کو سب لوگوں نے بہت

پسند کیا جتنی کہ جسکو امید نہ تھی۔

اعلان۔ گو امسال الہ آباد میں ایک بہت بڑی نمایش کی وجہ سے جسکا افتتاح دسمبر ۱۹۱۰ء میں ہوگا۔ ہم یہ چاہتے تھے کہ زنانہ نمایش ملتوی کردی جائے۔ لیکن بعض معاونین کا یہ خیال ہے کہ کسی حالت میں بھی نمایش ملتوی نہیں ہونی چاہیے۔ اُنکا یہ خیال ہے کہ اگر نمایش نہو تو کانفرنس میں کوئی لطف باقی نہیں رہیگا۔ ہم اِس حد تک تو اُنسے اتفاق نہیں کر سکتے۔ لیکن پھر بھی نمایش کو کانفرنس کا ایک نہایت ہی اہم شعبہ خیال کرکے ہم بھی اسکے سلسلے کو توڑنا پسند نہیں کرتے اور عام طور پر اعلان کرتے ہیں کہ دسمبر کانفرنس کے ساتھ ناگپور میں زنانہ نمایش ضرور ہوگی۔ عام طور پر پبلک کو معلوم ہے کہ نمایش میں کس قسم کی اشیاء اور مصنوعات بھیجی جاتی ہیں اور وقت بھی بہت کافی ہے جو بیویاں اس میں حصہ لینا چاہتی ہیں وہ ابھی سے اشیاء تیار کرنا شروع کریں۔ خط و کتابت یا تو سکرٹری تعلیم نسواں علی گڈھ سے ہونی چاہیے۔ یا ایم ایم ملک صاحب رئیس ناگپور سے۔ تمغے اور انعامات حسب معمول دے جائینگے۔

مدرسہ دائیان دہلی کا اجلاس ۱۹۔ اپریل کو اس مدرسہ کا پہلا سالانہ اجلاس اسکے اپنے مکان میں منعقد ہوا۔ شہر کے تمام ہندو مسلمان معززین بہ تعداد کثیر جلسہ میں موجود تھے۔ حکیم اجمل خانصاحب کی تحریک اور آنریبل لالہ سلطان سنگھ صاحب لالہ ایشر پرشاد صاحب سرکاری خزانچی کی تائید سے صدر نشین جلسہ ہز ہائنس نواب صاحب مالیر کوٹلہ بنائے گئے۔

سالانہ کیفیت۔ شیخ عطاء اللہ صاحب آنریری سکرٹری نے سالانہ رپورٹ مدرسہ کی سُنائی اور بتایا کہ کس طرح ابتدا ہی میں مدرسہ کامیابی کے ساتھ کام کر رہا ہے۔ چنانچہ ۱۲ لڑکیاں جن میں ۷ مسلمان اور ۵ اہل ہنود ہیں اسمیں داخل ہوئیں۔ ۸۰۷۰ ان ڈور اور آٹھ ہزار تین سو دس آؤٹ ڈور مریض عورتوں کا اور بچوں کا مدرسہ کی معرفت معالجہ ہوا۔ ۸۷ (اپریشن) طبی عمل نہایت کامیابی کے ساتھ مریضوں پر کیے گئے۔ مدرسہ کی کل آمدنی ۲۳ ہزار ۲۰۴ رُپیے ہوئی جس میں ۱۱ ہزار روپیہ ہندوستانی دواخانہ

دہلی نے دیا۔ اسکے مقابلہ میں مصارف کا اندازہ امسال ۵ ہزار ۵ سو ۲۲ روپیے رہا۔ اگرچہ دربار فنڈ سے اسکو کوئی خاص اعانت (سپیشل گرانٹ) نہیں ملی۔ تاہم وہ اپنے بل پر نہایت استقلال کے ساتھ ترقی کر رہا ہے جس کی ایک خاص وجہ نئے مہتمم صاحب کی حسن سعی بھی ہے۔

شکریہ پھر کمیٹی نے حضور بیگم صاحبہ بھوپال نواب صاحب رامپور۔ ہز ہائنس میر صاحب خیرپور سندھ۔ کرنل لوڈن سول سرجن دہلی۔ سردار محمد اسمٰعیل خانصاحب اور دوسرے معززین کا شکریہ ادا کیا کہ اس مدرسہ سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔ نیز ہز ہائنس نواب صاحب مالیر کوٹلہ ہز ہائنس مہاراجہ صاحب دربھنگہ اور ہز ہائنس میر صاحب خیرپور سندھ کی نسبت اس درسگاہ کے مربی ہونے کا اعلان کیا گیا۔ کمیٹی نے توقع ظاہر کی کہ گورنمنٹ اپنی معمولی مہربانی سے جو وہ ایسے مفید کاموں کی حوصلہ افزائی کیلیے کرتی ہے۔ اس مدرسہ کو بھی عمارت کیلیے ایک قطعہ زمین دیکر مرہون منت فرمائیگی۔ پھر نواب سراج الدین احمد خانصاحب سائل کی نظم کے بعد کرنل لوڈن نے کھڑے ہوکر اجمل خانصاحب کا شکریہ ادا کیا۔ کہ انہوں نے اس مفید مدرسے سے پردہ نشین مستورات کے علاج کے بہترین انتظام کی بنیاد رکھی ہے۔

پریسیڈنٹ کی تقریر۔ نواب احمد علیخانصاحب نے اپنی پرمغز تقریر میں ان تکالیف کا ذکر کیا جو عورتوں کو جاہل دائیوں کے باعث برداشت کرنی پڑتی ہیں اور اسکے انسداد کا ذریعہ سوچنے کیواسطے حاذق الملک کا شکریہ ادا کیا اور دعا کی کہ خدا اس نہایت ضروری مدرسہ کے بانی کو اپنی کوششوں کی بارآوری تک زندہ سلامت رکھے۔ پھر مدرسے میں دلچسپی لینے والے معاونین و سما کا ذکر خیر کرتے ہوئے ہندو مسلمانوں سے اسمیں فیاضی سے مدد کرنے کی اپیل کی اور ریاست مالیر کوٹلہ کیجانب سے ایک ہزار روپیہ عطیہ کا نیز بیگم صاحبہ ریاست مالیر کوٹلہ کی جانب سے پانچسو روپیہ کا اعلان کیا۔ بعد اس تقریر کے حاذق الملک حکیم اجمل خانصاحب نے صدر نشین کا اتنی دور سے زحمت سفر گوارا فرمانے دہلی آنے پر ووٹ آف تھینکس تجویز کیا۔

زنانہ مجلس۔ اسی شام کو مدرسہ کی کامیاب متعلمات کو ایک زنانہ جلسے میں انعام تقسیم کئے گئے۔ بہت سی ہندو مسلمان خواتین کے علاوہ چند پارسی مستورات بھی تھیں۔ ہز ہائنس بیگم صاحبہ مالیر کوٹلہ اور مہارانی صاحبہ بسنگھ گڈھ کی عدم تشریف آوری میں مسز لالہ سلطان سنگھ صاحبہ صدر جلسہ قرار پائیں۔ مسز محمد اکرام اور فاطمہ اکرم نے خیر

مدرسہ کی ضرورت پر اور آیندہ نسلوں کے فوائد کے لحاظ کو ملحوظ رکھ کر تقریریں کیں اور حاذق الملک حکیم اجمل خانصاحب کا اس مبش بہا درسگاہ جاری کرنے پر شکریہ ادا کرنیکے علاوہ اسکو حتی الامکان اعانت دینے کی صلاح دی، اسکے بعد کچھ تو الطاف سے مہمانوں کی تواضع کی گئی اور میر مجلس کے ووٹ آف تھینکس کے ساتھ جلسہ برخاست ہوا۔

ایک ترک شہزادی سے ملاقات

گریس میں نامی ایک انگریز لیڈی نے ولایت کے مشہور رسالہ ٹی ہرٹ ویکلی میں ایک ترک شہزادی سے ملاقات کا دلچسپ حال لکھا ہے۔ چونکہ اس سے ترکی خواتین کے اخلاق اور ان کی کئی مراسم پر روشنی پڑتی ہے۔ اسلیے ہم بھی ترجمہ کے ذریعہ سے اسکا ضروری اقتباس ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔

جولائی ۱۹۰۸ء کے دستور سے پیشتر عثمانی شہزادیوں کو یورپین لیڈیوں سے ملاقات کرنے کی سخت ممانعت تھی دول غیر کے سفراء متعینہ باب عالی بھی اس کلیہ سے مستثنی نہ تھے یہانتک کہ جب سلطان عبدالحمید خاں کے عہد میں قیصر جرمنی معہ قیصرہ کے قسطنطنیہ گئے ہیں اور قیصرہ نے سلطانہ سے ملاقات کی خواہش کی ہے تو اسکو نہایت صفائی کے ساتھ رد کر دیا گیا تھا۔ ناکتخدا شہزادیوں کے لیے یہ قاعدہ اب بھی جاری ہے میں (اسوقت کے) وزیر اعظم کی لڑکی کے ہاں مقیم تھی اور جب انہوں نے مجھے وہ تمام مشکلات بتائیں (جو ممبران خاندان شاہی کے ساتھ ملاقات کرنے میں پیش آتی ہیں) اور پھر باوجود اسکے جب انہوں نے میری ملاقات شہزادی خنانیہ سے کرادی تو میں اُنکی بہت ممنون ہوئی۔ یہ شہزادی سلطان مراد مرحوم کی صاحبزادی اور سلطان معزول عبدالحمید خاں کی بھتیجی ہیں۔ میں پہلی یورپین عورت ہوں جسکو شہزادی نے دیکھا اور اسکے ساتھ ہمکلام ہوئیں۔ اُنہیں حرم سے نکلنے کا سوائے اسکے اور کبھی موقع نہیں ملتا کہ جمعہ کے روز مسجد کو جائیں پس اسوقت پردہ میں سے ان دختران مغرب کو دیکھ لیتی ہوں تو دیکھ لیتی ہوں جو سلاطین کے دیکھنے کیلیے راستے میں مکانوں کے چھجوں وغیرہ پر موجود ہوتی ہیں۔ شہزادی سے ملاقات کرنے کیلیے میری میزبان نے کپڑے بدلے اور بال سنوارے جسمیں کئی گھنٹے صرف ہوئے۔ انکی پوشاک میں بعض چیزیں پیرس کی بنی ہوئی تھیں۔ پیرس کے ایک سے زیادہ من چلے کارخانے سال میں دو بار اپنے ہوشیار ایجنٹوں کو قسطنطنیہ میں بھیجتے ہیں جو ترکی خواتین سے فرمائشیں حاصل کرتے ہیں۔ اس طرح ان کارخانوں کی معقول بکری ہوجاتی ہے اور یہ لوگ منہ مانگے دام حاصل کرتے ہیں۔ کیونکہ ترکی عورتیں نرخ چکانا

اپنے دو۔ دوسرے کے رتبہ نے خلاف اوسکی عزت پر ایک قسم کا حملہ سمجھتی ہیں جس طرح انگلستان میں مشرقی دستکاری
کے عجیب و غریب نمونوں کی قدر ہوتی ہی۔ اسی طرح ترکی خواتین مغربی اشیاء سے اپنے مکانات کو آراستہ کرنا پسند کرتی ہیں
میں نے ارزاں چیزیں مشرقی مکانات میں بہت تکلف کیساتھ سجی دیکھیں۔ جب میری میزبان جانیکے لیے تیار ہو چکیں
اور قہوہ بنایا جا چکا تو مینے ترکی لباس کو اتار کر دو جو میں قسطنطنیہ کے قیام کے زمانہ میں پہنا کرتی تھی) اپنا انگریزی لباس پہنا۔ اسوقت
معلوم ہوا کہ سارے محل کی خواتین میرے کپڑوں کو باری باری سے شوقیہ پہن چکی تھیں۔ کسی شہزادی سے ملاقات کیلیے
جاتے وقت زیورات پہننے کا دستور نہیں ہی۔ مگر جن خواتین کو تمغۂ شفقت ملا ہوا ہو وہ ایسے موقع پر زیور پہن سکتی ہیں
لیکن مجھے معلوم ہوا کہ ترکی میں عورتوں کو زیور کا زیادہ شوق نہیں ہوتا حالانکہ یورپین ممالک میں سمجھا جاتا ہی کہ ترکی عورتیں
زیورات کے طوق و سلاسل میں ہمیشہ جکڑی رہتی ہیں، خود میری میزبان زیورات کی صرف اسوجہ سے قدر کرتی تھیں کہ انکے
ذریعہ سے ضرورت کیوقت روپیہ فوراً دستیاب ہو جاتا ہی۔ میں نے ترکی کے امیر سے امیر گھروں میں مشتبہا۔ یورت
نہایت بیقدری کیساتھ پڑے پھرتے دیکھے ہیں ترک عورتیں زیور پہنتی بھی ہیں تو بہت ارزاں مثلاً ایسے جو انگلستان میں
سنگ دو شلنگ (۱۲ آنے یا ڈیڑھ روپیہ) میں آجاتے ہیں، حرم کی زندگی میں صرف ایک چیز جسکا میں اپنے آپ کو عادی
نہ بنا سکی وہ خواجہ سراؤں کا سردار تھا۔ حرم سراؤں میں خواجہ سراؤں کا سردار گویا مختار کل ہوتا ہی وہ آپکے کمرہ میں بغیر
دستک دیے چلا آتا ہی اور اس طرح گفتگو کرتا ہی گویا آپ کا بھی افسر ہی۔ وہ بڑے طمطراق سے رہتا ہی، میری میزبان نے
اسکا لمبا اور مشکل نام کئی بار لکھ کر مجھے یاد کرانا چاہا، مگر مجھے وہ نہ یاد ہونا تھا نہوا، میں اسے ہمیشہ چاکلیٹ (ایک قسم کی
انگریزی مٹھائی کا نام) کہا کرتی تھی جسپر وہ اکثر بڑبڑایا کرتا تھا۔ جس روز ہم شہزادی کی ملاقات کو جانے والے تھے تو اس نے
نہایت سنجیدگی سے مجھ سے کہا کہ آپکا یہ خیال غلط ہی کہ آپ شہزادی کے محل سے پھر واپس آئینگی کیونکہ انہوں نے کسی یورپین
لیڈی کو کبھی نہیں دیکھا اسلیے وہ ضرور آپ کو عجائب چیز سمجھ کر قید کر لینگی، یہ سنجیدہ مذاق کر کے اسنے اپنے نزدیک مجھ سے
اسکا بدلہ لیا کہ میں اسکا نام بگاڑ کر لیا کرتی تھی، غرض ہم شہزادی کے محل کو روانہ ہوئے جو باسفورس کے کنارہ پر واقع ہی،
جب محل کے سامنے پہنچے تو اسکے بلند پھاٹک کو پانچ خواجہ سراؤں نے ہمارے لیے کھول دیا۔ اور خواجہ سراؤں کے
سرور نے شہزادی کی طرف سے ہمارا استقبال کیا، اور ہمیں لیجا کر ایک کمرہ میں بٹھایا جہاں مرصع ظروف میں قہوہ پیش ہوا
قہوہ اور سگرٹ نوشی کے بعد ہمیں شہزادی کے حضور میں باریاب ہونے کے لیے زینہ پر جانا پڑا۔ شہزادی نے تخت سے اتر کر

ہمارا خیر مقدم کیا۔ یہاں فرش تک مکمل جواہر تھا۔ اور یہ میری زندگی میں پہلا (اور شاید آخری) موقع تھا کہ میں فرش جواہر پر چلی تھی، اوہ! جواہرات کے فرش پر چلنے کا خیال کیسا دل آویز ہے۔ میری میزبان نے شہزادی کے دامن کو بوسہ دیا، لیکن قبل اسکے کہ میں ان کی تقلید کروں شہزادی مجھ سے لپٹ گئیں اور میری پیشانی کو بوسہ دیا اور لیجا کر تخت پر اپنے پہلو میں بٹھایا، تخت پر بٹھاتے ہوئے شہزادی نے مجھ سے کہا کہ "اس سے تمہیں خوش نصیبی حاصل ہوئی" میں نے سوال کیا کہ شہزادی! خوش نصیبی آپ کس چیز کو سمجھتی ہیں؟ جواب دیا "نیک شوہر کو" میں نے عرض کیا کیا "نیک شوہر ایسی نایاب چیز ہے" فرمایا "ہاں تمہارے وہاں تو بیشک یہ کوئی نایاب چیز نہیں" میں نے اس کی تردید کرنی مناسب سمجھی، گو میں اس ریمارک سے بالکل متفق نہ تھی، میری میزبان ہمارے قدموں پر بیٹھی ہوئی ہمارے درمیان ترجمانی کا کام کر رہی تھیں۔ میری تمام ترکی دوست اپنی لونڈیوں کے ساتھ برتاؤ تقریباً بہنوں کا سا کرتی ہیں، اگر لونڈیاں کام میں غفلت کریں تو ان کو اتنی ہی اور اسی قسم کی تنبیہ کی جاتی ہے جتنی خاندان کے دوسرے لوگوں کو ہو اگر وہ اپنے فرائض میں سستی کریں۔ بعینہٖ یہی کیفیت شہزادی کے محل کی لونڈیوں کی تھی۔ اتنی دیر میں شہزادی مجھ سے بے تکلف ہو گئیں اور میں نے اُن سے (دربار کے آداب کو خیرباد کہکر) ہر قسم کی باتیں کرنی شروع کیں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ میرے ایک چھوٹا بچہ بھی ہے جس کی میں ہر روز تصویر لیتی ہوں، شہزادی موسیقی کی بے حد شایق ہیں اور خود بھی اعلیٰ درجہ کی موسیقی داں ہیں؛ تفریحی کھیلوں کا بھی اُنہیں شوق ہے اور وہ اپنے باغ میں ایک شائستہ گھوڑے پر سوار ہو کر پھرا کرتی ہیں؛ شہزادی مطالعہ کتب کی بہت زیادہ شایق نہیں ہیں؛ بخلاف دوسری ترکی خواتین کے کہ مطالعہ کتب جنکا بہترین مشغلہ ہوتا ہے۔ شہزادی سوائے ترکی کے اور کوئی زبان نہیں جانتیں؛ اور انہوں نے یہ معلوم کرنیکے لیے کہ انگریزی بولی کیسی ہوتی ہے، مجھ سے انگریزی بلوا کر سنی۔ ہم ایک گھنٹہ تک باتیں کرتے رہے۔ اسکے بعد شہزادی میرا ہاتھ پکڑ کر کھانے کے کمرے میں لیگئیں اور وہاں چاہے وغیرہ پلائی۔ میز پر بیس پچیس مہمانوں کا انتظام تھا۔ کیونکہ شہزادی کو امید تھی کہ میرے ساتھ اس قدر عورتیں اور بھی ہونگی۔ شہزادی نے مجھے یقین دلایا کہ میں آپ سے ملکر ہمیشہ خوش ہونگی، رخصت کے وقت انہوں نے بہت افسوس کیا اور کئی بار مجھے اللہ کے سپرد کیا۔ ہماری مشایعت اسی طریقہ سے ہوئی جس طرح استقبال ہوا تھا۔ مجھے یہ دور افتادہ شہزادی اکثر یاد آتی ہے۔

عجیب چالاکی۔ ایک عورت دربار صاحب امرتسر کا طواف کر رہی تھی بچہ گود میں تھا۔ ایک نہایت چالاک عورت اُس کو ملی۔ اُس نے جلدی سے بڑھکر نہایت تپاک سے اُس کی طرف دیکھا اور کہا کہ بہن بہت دن میں دکھائی دیں۔ میں تو تمہارے ملنے کو تڑپ رہی تھی، آج حسن اتفاق سے ملاقات ہوئی۔ یہ کہتے ہوئے اُس نے بچے کو اپنی گود میں لے لیا اور پیار کرنا شروع کیا۔ نوکر کو بھیجکر فوراً ایک روپیہ کی شیرینی منگائی اور بچے کو معہ ایک روپیہ نقد کے دی۔

بچے کی ماں نہایت حیران تھی کہ یہ کون عورت ہے جو اس قدر محبت سے پیش آتی ہے وہ شرما گئی اور یہ پوچھ نہ سکی کہ تم کون ہو۔ اس نے سوچا کہ یہ کیا کہے گی کہ مجھے پہچانا بھی نہیں۔ آخر چپ ہی رہی اور سمجھی کہ شاید میرے شوہر کے کسی دوست کی بیوی ہوگی۔

وہ عورت بچے کو چومتی چاٹتی رہی۔ اور تھوڑی دیر کے بعد کہا کہ جی تو نہیں چاہتا مگر اب لیا کر دیں۔ اچھا پرسوں تمہارے گھر آؤں گی۔ عورت نے بچے کو گود میں لے لیا اور حیران اور خوش گھر آئی۔

گر گھر آکر یہ عقدہ کھلا۔ جب اُس نے یہ دیکھا کہ بچے کے ہاتھوں کے سونے کے کڑے غائب ہیں۔ تب یہ معلوم ہوا کہ پیار کرنے والی خالہ نے دو روپے دیکر ۲۵ پچیس روپے لے لیے۔

زراعتی کالج۔ انگلینڈ میں عورتوں کے لیے بھی ایک زراعتی کالج ہے۔ اس میں عورتوں کو کھیتی اور باغیچہ لگانے کا علم سکھایا جاتا ہے۔ ایک نہایت نامی اور دولتمند عورت نے جس کا نام لیڈی باریک تھا ۱۸۹۵ء میں اس کالج کو قایم کیا۔ اسی کے نام سے یہ کالج باریک کالج کہا جاتا ہے۔

لیڈی منٹو کی یادگار۔ لاہور میں ہندوستانی بیگمات کا ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں بیگم صاحبہ ذوالفقار علی خاں صاحب جاگیردار مالیرکوٹلہ نے پنجابی خواتین سے لیڈی منٹو کی یادگار قائم کرنے کی تحریک کی۔ اور کہا کہ لیڈی صاحبہ کی نیک دلی۔ مہربانی اور ہندوستانیوں سے ہمدردی کا معاوضہ یہ ہے کہ ہم پنجاب کی رہنے والیاں خلوص کے ساتھ اُن کی یادگار قائم کرنے کی کوشش کریں تاکہ عرصہ تک اُن کا نام نیک لوگوں کو یاد رہے۔

بیگم صاحبہ بھوپال کی علم دوستی۔ مسلمانوں کو ہر ہائنس علیا حضرت بیگم صاحبہ بھوپال کا تہ دل سے شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ مورخہ ۱ اپریل ۱۹۱۰ء کو ایک اعلان عام کے ذریعے سے حضور عالیہ نے اپنے تمام ملازمین ریاست کو جو دیوبند کے جلسہ دستار بندی میں شریک ہونا چاہیں ایک ہفتہ کی رخصت عطا فرمائی اور یہ رخصت استحقاقی رخصت میں نہیں محسوب ہوگی۔

تصحیح نومبر ۱۹۰۹ء کے خاتون میں "رسالہ خاتون اور تعلیم نسواں" کے عنوان سے جو مضمون درج ہوا ہے وہ ہمشیرہ خورد مولوی کمال الدین احمد صاحب ایم اے کا لکھا ہوا ہے۔ غلطی سے اڈیٹوریل نوٹ میں اہلیہ مولوی کمال الدین صاحب لکھا گیا ہے۔ ہم کو اس نادانستہ غلطی پر افسوس ہے۔ امید ہے کہ ناظرین تصحیح فرمائینگے۔

[illegible]

بابت ماہ مئی سنہ ۱۹۱ ء

[illegible] ایل ایل بی۔ [illegible]

فہرست مضامین

[illegible]

خاتون

۱۔ یہ رسالہ ۴۰ صفحے کا علی گڈہ سے ہر ماہ میں شائع ہوتا ہی اور اس کی سالانہ قیمت ع‌ ۲ اور ششماہی ع‌ ۱؎ ۴ ہے۔

۲۔ اس رسالہ کا صرف ایک مقصد ہی یعنی مستورات میں تعلیم پھیلانا اور پڑھی لکھی مستورات میں علمی مذاق پیدا کرنا۔

۳۔ مستورات میں تعلیم پھیلانا کوئی آسان بات نہیں ہی اور جب تک مرد اس طرف متوجہ نہونگے مطلق کامیابی کی امید نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ اس خیال اور ضرورت کے لحاظ سے اس رسالے کے ذریعہ سے مستورات کی تعلیم کی اشد ضرورت اور بے بہا فوائد اور مستورات کی جہالت سے جو نقصانات ہورہے ہیں اس کی طرف مردوں کو ہمیشہ متوجہ کرتے رہیں گے۔

۴۔ ہمارا رسالہ اس بات کی بہت کوشش کریگا کہ مستورات کے لیے عمدہ اور اعلیٰ لٹریچر پیدا کیا جائے جس سے ہماری مستورات کے خیالات اور مذاق درست ہوں اور عمدہ تصنیفات کے پڑھنے کی اُن کو ضرورت محسوس ہو تاکہ وہ اپنی اولاد کو اُس بڑے لطف سے محروم رکھنا جو علم سے انسان کو حاصل ہوتا ہی معیوب تصور کرنے لگیں۔

۵۔ ہم بہت کوشش کرینگے کہ علمی مضامین جہانتک ممکن ہو سلیس اور بامحاورہ اُردو زبان میں لکھے جائیں۔

۶۔ اس رسالہ کی مدد کرنے کے لیے اسکو خریدنا گویا اپنی آپ مدد کرنا ہی اگر اس کی آمدنی سے کچھ بچے گا تو اس سے غریب اور یتیم لڑکیوں کو وظائف دیکر استانیوں کی کمی کے لیے طیار کیا جائے گا۔

۷۔ تمام خط و کتابت و ترسیل زر بنام اڈیٹر خاتون علی گڈہ ہونی چاہیے۔

خاتون

سوکن

اس سے قبل خاتون میں سوکن کے مضمون پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ سب سے اول اصغری کی سرگزشت سے ہم نے اس رنج دینے والے مضمون کو شروع کیا تھا اور پھر خاتون میں اور مختلف اخبارات میں خوب بحثیں ہوئیں اور ہمیں یہ توقع تھی کہ کم سے کم تعلیم یافتہ حضرات اگر اس نہایت نامناسب رواج کی بیخ کنی کرنے میں کامیاب ہوئے تو کم از کم خود اس سے پرہیز کرینگے اور قوم کے سامنے ایک عمدہ مثال اور نمونہ اپنی زندگی کا پیش کرینگے۔ لیکن ز۔م صاحبہ کے مضمون سے جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ بری رسمیں مثل متعدی بیماریوں کی مشکل سے انسان کا پیچھا چھوڑتی ہیں۔ گو طبیب اور ڈاکٹر کتنی ہی کوشش کریں مگر ایسی بیماریوں کا زہریلا اثر کم ہوتے ہوتے ہی ایک زمانہ لگتا ہے

تعدد ازدواج کے مسئلے پر ہم نے اس وقت تک اپنی دلی خواہش کے موافق قلم نہیں اٹھایا کیونکہ اسکو ہنوز قبل از وقت خیال کرتے ہیں اور اس بات کا انتظار کر رہے

ہیں کہ خود بیبیاں اس مسئلہ کی طرف توجہ کریں کیونکہ عورتوں کی حق تلفی کے جس قدر طریقے مردوں نے ایجاد کیے ہیں ان سب میں سخت اور نہایت اذیت پہونچانے والا طریقہ دوسری شادی کا ہے۔

اگر بیبیاں اس معاملہ میں ہم کو تھوڑی سی بھی مدد دیں اور محض وقتاً فوقتاً ایسے واقعات جیسا کہ ز۔م صاحبہ نے تحریر فرمایا ہے اور جو ہمارے علم میں اس وقت بکثرت موجود ہیں ہمارے پاس تحریر کرکے بھیجتی رہا کریں تو ہم آیندہ ایک بڑے ہماد ے لیے میدان ورسامان تیار کر سکتے ہیں۔

سوکن کے جلاپے سے ہم ہندوستان کی مستورات کو نجات دلانے کی فکر میں ہیں اور بشرط زندگی ہم اس کی کوشش کرینگے اور اگر خدا کو منظور ہوا تو ہمیں کامیابی ہوگی۔ مگر سب سے پہلی شرط یہی ہے کہ بیبیوں میں خود ایک حس پیدا ہو جائے اور وہ اصلاح کی طرف متوجہ ہو جائیں۔

ایک مقولہ مشہور ہے کہ "ہر چہ بر خود نہ پسندی بر دیگراں مپسند" اگر ماں دوسری بی بی پر اپنی لڑکی دینے کو رضامند ہو جاتی ہے۔ اگر بہن کو یا دادی یا نانی کو یہ بات معیوب نہیں معلوم ہوتی کہ ایک بدنصیب کے سر پر جو گھر کی مالک ہے اپنی بہن یا بیٹی اسکو بیاہ کر اُس بدنصیب کی کُل زندگی تلخ کر دی جائے تو پھر اُن کو اس بات کی شکایت کا کیا حق ہو سکتا ہے کہ ہم کو سوکن کے جلاپے سے نجات دلوائی جائے۔ اگر اس تکلیف اور رنج سے نجات منظور ہے تو سب سے اول بڑی مضبوطی سے اس اصُول کی پابندی کیجیے کہ کبھی کسی اپنی رشتہ دار لڑکی کو دوسری بی بی دینے پر رضامندی ظاہر نہ کیجیے۔

مردوں کو رفتہ رفتہ معلوم ہو جائیگا کہ ہم ابتک بڑی غلطی میں پڑے ہوئے تھے۔ دنیا میں اہل اور سچی خوشی کا خون ہماری ہی گردن پر ہوگا اور سخت ظلم اور ناجائز سختی کا الزام ہمارے سر پر رہے گا۔ پھر تو باز آ ئینگے۔

اس وقت بعض لوگ ایک سے زیادہ شادیوں کی حمایت میں مذہبی روایات سے کام لیتے ہیں مگر ہم اپنے ناظرین کو یقین دلاتے ہیں کہ ہمارا پاک مذہب اس قسم کی لغویات کا ملزم قرار نہیں پا سکتا۔ ہمارے مذہب نے ہمارے لیے سہولیت اور آرام کے سامان بہم پہونچائے ہیں اور کوئی بات معقولیت کے خلاف نہیں کی اور نہ کسی نامعقول بات کے اختیار کرنے پر ہم کو مجبور کیا ہے۔ ہندوستان کے تمدن کے لحاظ سے **ایک گھر کی مالک ایک ہی بی بی ہو سکتی ہے اور یہی معقول بات ہے اور اسی کو اختیار کرنی چاہیے۔**

اڈیٹر

سوکن! ہائے افسوس کس قدر دل دکھانے والا لفظ ہے کسی بیکس مظلوم جس پر یہ صدمہ ہوا ہو اس کے دل سے پوچھنا چاہیے کہ بیچاری کے دل پر کیا گذرتی ہے۔ افسوس! بجز رات دن جلنے رنج غم کھانے رونے کے اور کیا کر سکتی ہے۔ مگر افسوس ظالم بے رحم کو خدا کا خوف اور نہ مظلوم کی شرم! افسوس کیسے کیسے دنیا میں سنگدل لوگ ہوتے ہیں مگر کوئی توجہ نہیں کرتا۔

آج کل کے تعلیم یافتہ مرد اور عورت تمام دنیا کی لغویات کی طرف جن کی کہ فی الحال کوئی ضرورت بھی نہیں۔ بہت متوجہ ہوتے ہیں مگر اسکے اوپر کوئی غور بھی نہیں کرتا۔ کیسا ظلم ہے کہ ایک غریب جس کی تمام زندگی جینا۔ مرنا۔ خوشی۔ رنج و راحت غرض کہ تمام دنیا کی باتیں صرف اس کی وجہ سے پامال ہوتی ہیں۔ مگر اسکو کچھ اسکا خیال نہیں۔ وہ مرے تو بلا سے مرے۔ اور جیے تو صدقے سے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جو لوگ ایسا کرتے ہیں کہ ایک بیوی اچھی خاصی۔ کوئی خاص عیب نہیں۔ اسکو چھوڑ اس کے ساتھ بچوں کو بھی چھوڑ۔ دوسرا نکاح کر کے کیونکر خوشی سے زندگی گزار سکتے ہیں۔ کس طرح اُن کے دل کو چین آتا ہوگا جس وقت وہ یہ خیال کرتے ہونگے کہ ایک

غریب مظلوم کی تمام زندگی ہماری وجہ سے تلخ ہوگئی۔ اور اس بیوی کو کیونکر اطمینان یا خوشی ہوسکتی ہی جبکہ وہ یہ جانتی ہے کہ یہی شخص جو مجکو اتنا سمجھتا ہی۔ میری خوشیاں پوری کرتا ہی کسی دوسری خدا کے بندی پر جو بالکل میری مانند جاندار ہی ایسا ظلم کرتا ہی کہ اُس کی خبر بھی نہیں لیتا، بالکل ممکن ہی کہ کل وہ کسی تیسری کو اُن پر ترجیح دے۔ ان کو پہلی کی طرح چھوڑ تیسری کے ساتھ رہنے لگے۔ اس وقت ان کا دل کیا کہے گا۔ اسی طرح اس عیب کو سمجھنا چاہیے۔

جاہل ہی۔ تو اس میں اس غریب کا کیا قصور ان کا فرض تھا کہ پہلے اچھی طرح دریافت کرتے۔ نہ کہ اس مظلوم کا۔

بدصورت ہی۔ تو اس بیچاری سے کیا لڑائی۔ خدا سے لڑو۔ کہ اس کی شکل ایسی بُری کیوں بنائی۔ یا بنائی تھی تو ہماری ہی قسمت میں اس سے بیاہ ہونا کیوں لکھا۔ یا ہماری تقدیر میں یہی لکھا تھا تو اس کی شکل اچھی اور ہمارے مزاج کے مطابق اسکو پیدا ہی کیا ہوتا نہیں تو کسی ایسے ہی جاہل بدصورت بے وقوف کے پالے ڈالا ہوتا۔

جو لوگ یہی یہی نکتہ چینی کرکے دوسرا نکاح کرتے ہیں وہ یہ کیونکر خیال کرتے ہیں کہ اب جس سے ہوگا وہ ہماری پسند ہی آجائے گی۔

لڑکی کے والدین کو یہ کیونکر یقین ہوتا ہی کہ ان کی لڑکی ضرور ایسے دماغدار نکمے جس شخص کے مزاج کے مطابق ہوگی۔ کیا معلوم ہی۔ کہ وہ شخص کس کو اچھا کہتا ہی اور لوگ کس کو اچھا سمجھتے ہیں۔ اپنی اپنی پسند الگ ہوتی ہی۔

جاہل ہونے کا نقص تو میری رائے میں کوئی ایسا نقص نہیں کہ اس کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکے۔ صرف ذرا سی محنت درکار ہے۔ پھر سب معاملہ درست ہوسکتا ہے۔

اگر ذرا توجہ کرے اور عقل اور صبر سے کام لے تو اس کو بھی تعلیم یافتہ لائق

ہوشیار بنا سکتا ہے۔

غریب عورتیں اپنے میاں ماں باپ بھائی بہن کی خاطر اپنی جان کو بے جان سمجھتی ہیں پھر بھی بیچاریوں پر کیسے کیسے ظلم ہوتے ہیں۔ مگر شاباش ہے کس صبر سے برداشت کرتی ہیں مرد اگر چاہے تو جاہل سے جاہل عورت کو روشن خیال اور تعلیم یافتہ بنا سکتا ہے اگر نہ چاہے تو کچھ بھی نہیں۔

اب تو لوگ وحشی نہیں رہے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ وحشیانہ حرکت کیوں کرتے ہیں افسوس! کہلائیں تو تعلیم یافتہ اور حرکتیں کریں ایسی چھوٹی چھوٹی۔ کیا فائدہ ہوا ان کے تعلیم یافتہ ہونے۔ بی۔ اے اور ایم۔ اے بنے۔ کیمبرج اور اکسفورڈ کی ڈگریاں حاصل کرنے سے جبکہ ان میں اتنی بھی تمیز نہ آئی۔

بہنوں کو چاہیے کہ اس کی طرف متوجہ ہوں۔ اور ناممکن ہے کہ بہنیں اپنا اثر ڈالیں اور کامیاب نہوں۔

میری رائے میں تعلیم یافتہ اور روشن خیال بیویوں کو یہ کرنا چاہیے کہ لڑکی کے والدین سے ملنا جلنا چھوڑ دینا چاہیے۔ خواہ وہ کیسے ہی معزز اور شریف تعلیم یافتہ اور روشن خیال ہوں۔

آخر اس کے کیا معنی کہ ایک دوسرا شخص جو بالکل ان کے ہی بیٹی کی طرح ہے اسکے ساتھ تو یہ سلوک کریں کہ اس کے لیے دنیا میں ہی دوزخ بنائیں اور اپنی بیٹی کو چین کرتے دیکھکر خوش ہوں۔

کیسی سنگدل ہیں وہ عورتیں جن کو کسی کے رنجیدہ ہونے کا رنج وافسوس نہ ہو۔ البتہ اگر وہ اس کو بھی اسی طرح رکھتا ہے۔ جیسا کہ خدا کا حکم ہے۔ بالکل برابر ہر بات میں سمجھتا ہے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ برائیوں سے بچنے کے لیے اگر کوئی بات کرے اور بشرطیکہ دونوں کو یکساں سمجھے تو بیشک ان بیویوں کو خوش ہونا چاہیے۔ لڑکی بیچاری بیشک

سب بے قصور ہے کہ وہ والدین کے آگے کچھ نہیں بول سکتی۔

افسوس آتا ہے قوم پر کہ وہ لوگ کہتے ہیں اپنے کو تعلیم یافتہ روشنخیال بنتے ہیں قوم کے لیڈر۔ اے کاش کہ وہ جاہل۔ کم لیاقت۔ بے وقوف۔ نالائق ہوں۔ تو بلا سے صبر تو آئے کہ خیر یہ بھی جاہل ہیں۔ کیا کریں ان کو خدا نے کچھ سمجھ سوچنے کی عقل ہی نہیں دی۔

بیسے افسوس کی بات ہے کہ وہی لوگ جو تمام دنیا کی باتوں پر غور کریں۔ انجمنیں قائم کریں۔ جلسے کریں۔ اور اس بات پر غور نہ کریں۔ ہم نے تو جب سے ایک بیکس مظلومہ کو دیکھا ہے اس قدر اُسکا ہر وقت خیال رہتا ہے۔ مگر افسوس ان ظالموں کو کچھ خیال نہیں۔ بیچاری بیمار پلنگ پر پڑی ہوئی۔ اور چھوٹا سا چھ سات مہینے کا بچہ اس کے سینے پر کھیل رہا تھا۔ آہ کیسے ارمان بھرے دل اور حسرت بھری نگاہ سے اسکو دیکھ رہی تھی۔ اور بیچاری اپنی زندگی کو سب بے کار سمجھ رہی تھی۔

بیچاری کے دل میں کیا کیا امیدیں ہونگی اپنے لیے اور کیا کیا اپنے بچوں کے لیے چاہتی ہوگی۔ مگر افسوس اب سب خاک میں مل گئیں۔ افسوس اب اس کے ارمان اس کے دل میں ہی رہیں گے اور اس کا بچہ یوں ہی خراب وخستہ ہوگا۔

چاہیے تو یہ تھا کہ نئی بیگم جو تعلیم یافتہ روشنخیال آئی تھیں۔ جاہل غریب کو اپنے زیر سایہ رکھ کر تعلیم یافتہ روشن خیال بنایا ہوتا۔ بچوں کو تربیت کرائی ہوتی تاکہ اسکو بھی معلوم ہوتا کہ تعلیم کیا ہے۔ اور لوگ جو دیکھتے یا سُنتے وہ سمجھتے کہ ہاں یہ قوم کے بہی خواہ ہیں۔

اگر مرد جو دوسرا بیاہ کرے ایسا نہ کرے تو اُن کی تعلیم یافتہ بیگم صاحبہ کا فرض ہے کہ وہ مجبور کریں تاکہ ان کی تعلیم تربیت ولیاقت سے دوسرے لوگ فائدہ اُٹھائیں۔ اور معلوم ہو کہ ہاں تعلیم یافتہ میں اور جاہل میں کیا فرق ہے۔

اس سے کیا فائدہ ہوا کہ تعلیم یافتہ کہکر بیاہ کیا۔ اور جاہلوں کی طرح بیوی کو الگ کر دیا اور تعلیم یافتہ ہونے کا کوئی فائدہ نہ نکلا۔ ایسی تعلیم سے کیا فائدہ جو اپنے ہی تک محدود رہے اور دوسرے شخص کو فائدہ نہ پہنچے۔

بچوں کو اچھی طرح تربیت کرے۔ تعلیم دے۔ اسکے ساتھ محبت سے پیش آئے اسکو تعلیم کے فائدے بتائے تو خیر کچھ تعلیم یافتہ ہونے کا فائدہ بھی معلوم ہو

ہائے افسوس کیسا مجکو صدمہ ہوا جس وقت اس کے ہمساؤں سے یہ معلوم ہوا کہ بیچاری تمام دن رو رو کر گزارتی ہے۔ کیا کرے غریب اپنی جان کے سوا اور کس پر بس چلتا ہے۔ روتی ہے اور جان کھوتی ہے۔ افسوس! صد افسوس!

اب مجکو یہ دیکھنا ہے کہ کون کون تعلیم یافتہ بہنیں اس کی طرف متوجہ ہوتی ہیں اور کیا رائے دیتی ہیں۔ اخباروں اور رسالوں - انجمنوں اور جلسوں میں کیا فیصلے ہوتے ہیں۔ جو مرد عورتیں تعلیم وغیرہ پر زور دیتے ہیں وہ کیا اس پر رائے قائم کرتے ہیں اور کیا نتیجہ نکلتا ہے۔

اگر اسپر کسی کی توجہ نہ ہو۔ تو یہ خیال کرنا چاہیے کہ کسی تعلیم یافتہ میں سچی انسانی ہمدردی اور روشن خیالی نہیں۔ بلکہ جو کچھ کہتے ہیں صرف اپنی شہرت اور ناموری کے لیے،

خاکسار
ز ۔ م

غذا

حفظان صحت کا جس قدر گہرا اور ضروری تعلق عورتوں سے وابستہ ہے اس قدر مردوں کے ساتھ نہیں ہے۔ عورتیں خاندان اور گھرانہ کے تمام امور کی نگاہداشت رکھتی ہیں۔ اُن کا یہ بھی فرض ہے کہ اپنی اور خاندان کے بچوں کی حفظ صحت کا بھی خیال رکھیں۔ لیکن اسکے لیے یہ امر نہایت

ضروری ہے کہ وہ حفظان صحت کے اصول سے بھی واقف ہوں۔

ہمارے دوست سید خورشید علی صاحب جو قومی ہمدردی میں مشہور ہیں وہ فزیالوجی یعنی علم ترکیب اجسام حیوانی پر مضامین کا ایک سلسلہ جاری رکھنا چاہتے ہیں جسکا پہلا حصہ ذیل میں شائع کیا جاتا ہے۔ ان مضامین کی غرض یہ ہے کہ عورتوں کی معلومات اصول صحت میں اضافہ ہو اور وہ اس کی خاطر خواہ نگہداشت کرنے کے قابل ہو جائیں۔ ہم کو امید ہے کہ اس ضروری سلسلہ مضامین کو مستورات نہایت غور سے پڑھیں گی اور ان کو دستور العمل کے طور پر سمجھ کر اس سے نفع اُٹھانے کی کوشش کرینگی

اڈیٹر

ہم لوگ روزانہ جو غذائیں کھاتے ہیں ان میں کی ہر چیز مختلف کیمیاوی اجزا سے مرکب ہوتی ہے۔ علمائے فزیالوجی (علم ترکیب اجسام حیوانات و نباتات) نے غذا کے ان اجزا کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے جو یہ ہیں۔

(۱) پروٹینڈس

(۲) کاربوہائیڈرس

(۳) روغن۔

(۴) نمک

(۵) پانی

انسانی جسم بھی ان ہی اجزا سے مرکب ہوتا ہے جو مندرجہ بالا حصوں میں پائے جاتے ہیں اس لیے انسانی جسم کی بقا کے لیے ان تمام اجزا کا غذا کے ذریعہ ہمیشہ مہیا ہوتے رہنا نہایت ضروری ہے۔

ایک زندہ انسان کا جسم ہمیشہ متحرک رہتا ہے۔ بلکہ حرکت ہی کا نام زندگی ہے۔ جب یہ حرکت موقوف ہو جاتی ہے تو اس کو موت سے تعبیر کیا جاتا ہے اور آدمی کا مُردوں میں شمار ہوتا ہے

حرکت سے مطلب یہاں چلنا پھرنا اٹھنا بیٹھنا نہیں ہی بلکہ جسم انسانی کے کسی عضو کا بھی متحرک ہونا ہی۔ ہم لوگ خواہ سوتے ہوں یا جاگتے ہمارے بعض اعضا برابر کام کیے جاتے ہیں اور متحرک ہوجاتے ہیں۔ خصوصاً دل اور سینہ کا ہر حالت میں متحرک ہونا نہایت ضروری ہی۔ دل کی حرکت سے دوران خون کا عمل ہوتا ہی اور سینہ کی حرکت سے جسم میں ہوا پہونچتی ہے۔ یہ دونوں حرکتیں حیات انسانی کے لیے لازمی ہیں۔ جب تک دل اور سینہ کی حرکت جاری رہتی ہی انسان زندہ رہتا ہی۔ جہاں یہ حرکت موقوف ہوئی آدمی کا رشتۂ حیات منقطع ہوجاتا ہی۔

ان دونوں اعضا یعنی دل اور سینہ کے فعل کی ایک خاص غرض یہ ہی کہ جسم کی تمام کوٹھریوں میں آکسیجن پہونچ سکے۔ سانس لینے سے ہوا پھیپھڑوں میں کے خون سے ملتی ہی اور خون ہوا میں کے آکسی جن کو جذب کرلیتا ہی۔ اس کے بعد اس خون کو جو آکسی جن سے بھرا ہوا ہوتا ہی دل تمام جسم کے اندر کی کوٹھریوں میں پہنچاتا ہی۔ جو جو اعضا دل اور سینہ کے اس فعل میں حصہ لیتے ہیں اور جسم کے جو جو حصے اس سے متاثر ہوتے ہیں ان میں اس عمل سے فرسودگی پیدا ہوجاتی ہی اور وہ تحلیل ہونے لگتے ہیں۔ اس تحلیل و فرسودگی کا علاج غذا اور ہوا سے ہوتا ہی۔ کیونکہ غذا میں بھی وہ اجزا موجود ہوتے ہیں۔ جن سے انسان کا جسم مرکب ہے اس لیے غذا کے ذریعے جسم کے مستعمل اور فرسودہ حصوں کی درستی اور تجدید ہوتی رہتی ہی۔ یہ عمل تحلیل و تجدید کا جب تک جسم میں جان باقی ہی برابر جاری رہتا ہے۔

انسانی جسم کا جو جو ہر روزانہ اس طرح ضائع ہوتا اور پھر غذا کی بدولت پیدا ہوتا ہے اس کے اجزائے بسیط خصوصاً کاربون، نیٹروجن، ہائیڈروجن، اور آکسی جن ہوتے ہیں۔ ان میں سے آکسی جن ہی ایک ایسی چیز ہے جو اپنی اصلی حالت میں سانس کے ذریعے انسانی جسم کو حاصل ہوجاتی ہی۔ دوسری چیزیں اس طرح مہیا نہیں ہوتیں بلکہ مختلف شکلوں میں

دوسرے اجزا کے ساتھ مل ہوئی غذا کی صورت میں حاصل ہوتی ہیں۔ پس غذا ایسی ہونی چاہیے جس سے تمام مستعملہ اجزا کی تجدید ہو سکے کیونکہ سب اجزا ایک ہی چیز کے ذریعہ مہیا نہیں ہو سکتے اور ہر چیز اپنے اجزائے کیمیادی کے لحاظ سے دوسری سے ضرور فرق رکھتی ہے کسی میں کاربن کا جزو زیادہ ہوتا ہے کسی میں نائٹروجن کا۔ کسی میں کسی چیز کا۔ کسی میں کسی چیز کا اس لیے غذا کا کھانے کی مختلف چیزوں سے مرکب ہونا نہایت ضروری ہے۔

حساب لگایا گیا ہے کہ معمولی حالت میں ایک آدمی کے جسم سے چار ہزار گرین کاربن کے ہر روز صرف ہوتے ہیں۔ جن میں سے تین ہزار آٹھ سو چالیس (۳۸۴۰) گرین سانس کے عمل میں خارج ہوتے ہیں۔ نائٹروجن کے صرف تین سو گرین اسکے ساتھ خرچ ہوتے ہیں۔ اب غذا ایسی ہونی چاہیے جن سے ان ضائع شدہ چار ہزار گرین کاربن اور تین سو گرین نائٹروجن کی تجدید و تکمیل ہو سکے۔ یعنی غذا میں کاربن اور نائٹروجن کا جزو اسی مناسبت سے ہونا چاہیے۔

یہ بات صرف مرکب غذا ہی سے حاصل ہوتی ہے اسی لیے غذا کا مرکب ہونا نہایت ضروری ہے۔ اس صورت میں کیمیادی اجزا کی مقررہ اور ضروری مقدار بلا وقت مہیا ہوتی ہے غذا کی کسی چیز میں کوئی جزو زیادہ ہوتا ہے کسی میں کوئی جزو اس لیے جب مختلف چیزوں کو ملا لیا جاتا ہے تو ان میں ایک تناسب قائم ہو جاتا ہے اور کسی چیز کے زیادہ یا کم پیدا ہونے کی مضرت سے حفاظت ہو جاتی ہے۔

اگر کوئی شخص صرف روٹی کھایا کرے تو اُس کو نائٹروجن کی روزانہ مقدار تین سو گرین حاصل کرنے کے لیے دو سیر روٹی ہر روز کھانا پڑے گی۔ مگر ان تین سو گرین نائٹروجن کیساتھ دو سیر روٹی میں کاربن کے نو ہزار گرین پیدا ہونگے۔ یعنی اس کو پانچہزار گرین ضرورت سے زیادہ ملیں گے۔

اسی طرح اگر کوئی شخص گوشت کھایا کرے تو اس کو کاربن کی روزانہ مقدار چار ہزار

گرین حاصل کرنے کے لیے ہر روز تین سیر گوشت کھانا پڑیگا مگر کاربن کے ان چار ہزار گرین کے ساتھ تین سیر گوشت میں نائٹروجن کے ایک ہزار گرین پیدا ہوں گے یعنی سات سو گرین نائٹروجن کے بالکل بے ضرورت مہیا ہو جائیں گے۔

غرض اس قسم کی غذا سے آلات ہاضمہ کو بے ضرورت مشقت برداشت کرنی پڑتی ہی اور نظام اعضا میں بہت بڑی خرابی واقع ہوتی ہے۔ بخلاف اس کے مرکب غذا میں چونکہ تمام اجزا ٹھیک طور پر شامل ہوتے ہیں اور ایک چیز کی کمی کو دوسری چیز کی زیادتی درست کر دیتی ہے اس لیے جن جن اجزا کی جسم کو ضرورت ہوتی ہے وہ برابر مہیا ہو جاتی ہیں۔

یہ حساب لگایا گیا ہی کہ ایک معتدل موسم میں ایک متوسط حال شخص جس کا وزن اور ڈیل ڈول اوسط درجے کا ہو ایسی غذا کھانے پر جس میں حسب ذیل اجزا موجود ہوں قوی اور تندرست رہ سکتا ہے۔

پروٹینڈس	۱۰۰ گرام (۳/۵ اونس)
روغن	۵۰ گرام (۱/۸ اونس)
کاربوہائیڈریٹس	۵۰۰ گرام (۱۷/۵ اونس)
نمک	۳۰ گرام (ایک اونس)
پانی	۲۸۰۰ گرام (۱۰۰ اونس)

پروٹینڈس سے نائٹروجن۔ کاربن اور ہائیڈروجن اور اسی طرح کاربوہائیڈریٹس اور روغن سے کاربن اور ہائیڈروجن پیدا ہوتے ہیں۔ اگرچہ ان میں آکسیجن کا بھی کسی قدر حصہ ہوتا ہی مگر وہ چنداں قابل التفات نہیں۔ کیونکہ آکسیجن کی ضروری اور بہت بڑی مقدار سانس کے ذریعہ مہیا ہو جاتی ہے۔

ذیل میں سر مائکل فاسٹر اور ڈاکٹر لیوس ٹی شور کی کتاب فزیالوجی سے ہماری

بعض روزمرّہ کی غذاؤں کے اجزا کا ایک نقشہ درج کیا جاتا ہے جس سے ان چند غذاؤں کے اجزا کا باہمی تناسب معلوم ہوگا۔

غذا	پانی	پروٹینڈ	نشاستہ[۱]	شکر[۲]	روغن	نمک
روٹی	۳۷	۸	۴۷	۳	۱	۲
چانول	۱۳	۶	۷۹	٫۴	٫۷	٫۵
مٹر	۱۵	۲۳	۵۵	۲	۲	۲
آلو	۷۵	۲	۱۸	۳	٫۲	٫۷
گوشت	۷۲	۱۹	۰	۰	۳	۵
دودھ	۸۶	۴	۰	۴	۴	٫۸
انڈا	۷۴	۱۴	۰	۰	۱۰	٫۵

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ غذا کی عمدگی صرف اجزا کی کثرت پر منحصر نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کے سریع الہضم اور خوش ذائقہ ہونے کا زیادہ لحاظ رکھا جاتا ہے۔ چنانچہ مٹر میں بمقابل گوشت کے پروٹینڈس اور کاربوہائیڈریٹس کے اجزا زیادہ ہوتے ہیں مگر باوجود اس کے مٹر گوشت سے عمدہ غذا نہیں کہی جاسکتی کیونکہ مٹر گوشت کی طرح سریع الہضم اور ہلکی غذا نہیں ہے۔

سید خورشید علی
حیدرآباد۔ دکن

[۱و۲] یہ دونوں اجزا کاربوہائیڈریٹس کی ذیل میں شمار ہوتے ہیں۔

مُومیاتِ مصر

سرزمین مصر کا چپہ چپہ اس کی گزشتہ تہذیب اور قدیم عظمت کی یادگاروں سے لبریز ہے دنیا کے کسی ملک میں اس کے قدیم باشندوں کی پُرانی نشانیاں اس قدر نہیں ملتیں جتنی کہ مصر میں۔ اس کی خاک کے نیچے وہاں کی قدیم شایستگی کی خاموش تاریخ کا ایک عظیم الشان ذخیرہ مدفون ہے۔ جو سیکڑوں سال سے ابتک برابر نکلتا جارہا ہے اور ایک نہ گھٹنے والے خزانہ کی طرح نہیں معلوم کب تک نکلتا چلا آئے گا۔ مصر کی سرزمین دنیا میں قدیم تاریخی یادگاروں کا ایک بے نظیر عجائب خانہ ہے۔

یہ یادگاریں مختلف شکلوں میں نکلتی آتی ہیں مثلاً جانوروں کی مورتیں۔ دیوتاؤں کے بت۔ بادشاہوں کے مجسمے۔ کتبے۔ عمارتیں عبادت خانے۔ تہ خانے وغیرہ جن کی عمریں پانچ پانچ اور چھ چھ ہزار سال کی ہیں۔ اور گو مصر کے قدیم طرز تحریر کا پورا علم نہ ہونے کے سبب سے آثار قدیمہ کے مُبصرین بہت سی یادگاروں کے صحیح معنی نہیں سمجھ سکے ہیں۔ تاہم لگاتار غور و فکر کرنے سے اس کا کچھ حصہ سمجھ میں آگیا ہے جس سے قدیم اہل مصر کی تمدنی اور مذہبی تاریخ پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔

ان سب قدیم یادگاروں میں جو دنیا کی دوسری قوموں کی پُرانی نشانیوں سے اپنی نوعیت میں مختلف لحاظ سے ممتاز ہیں۔ سب سے عجیب اور حیرت میں ڈالنے والی وہ یادگاریں ہیں جن کو "مومیہ" کہتے ہیں۔ یعنی مرے ہوئے آدمیوں کی دواؤں سے بنائی ہوئی مُستحکم لاشیں جو چار چار اور پانچ پانچ ہزار سال سے زمین کے نیچے دفن تھیں اور ابتک اُن میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں پیدا ہوا۔ بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ آج کل کے مرے ہوئے آدمیوں کی لاشیں ہیں۔ یہانتک کہ بعض طبیب جوان لاشوں کے چہرے کے رنگ سے ماہر ہیں

یہ بھی پہچان سکتے ہیں کہ یہ شخص کس مرض میں مرا تھا۔

قدیم اہل مصر مُردوں کے اعزاز و احترام میں انتہا درجہ کی توجہ رکھتے تھے۔ ان کی لاش کی حفاظت میں جس قدر انسانی طاقت سے ممکن تھا کمی نہیں کرتے تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ انہوں نے ایسے ذرائع ایجاد کر لیے جس سے مُردہ کی لاش ایک غیر محدود زمانے تک سڑنے اور خراب ہونے سے محفوظ رہ سکے۔ وہ صرف دو ایک چادروں یا خوشنما کفنوں میں مُردہ کو لپیٹ دینا کافی نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ اُس کے لیے طرح طرح کے دواؤں سے بنے ہوئے کفن تیار کراتے تھے۔ جس پر ہزاروں روپیہ صرف ہوتے تھے۔ اور تابوت جس میں مُردہ رکھا جاتا تھا۔ بڑی کاری گری اور نقش و نگار کے ساتھ بنائے جاتے تھے۔ ہزاروں قسم کی دعائیں اُن پر لکھی جاتی تھیں اور ان کے دفن کرنے کے لیے بڑی بڑی پختہ عمارتیں تیار کی جاتی تھیں۔

چنانچہ دنیا کی قدیم ترین اور نہایت مستحکم اور مشہور عمارتیں اہرام مصر مردوں ہی کے مدفن ہیں جن میں سے ایک "ہرم" کے بانی نے یہ دعوے کے ساتھ لکھا ہے کہ "میں نے اس ہرم کو ساٹھ سال کی مدت میں تعمیر کیا ہے۔ لیکن میں آیندہ نسلوں کا بڑا زبردست سمجھونگا اگر وہ چھ سو سال میں بھی اس کو گرا سکیں"۔

اکثر مدفن زمین کے نیچے بنائے جاتے تھے ان کے ساتھ تہ خانے اور عبادت خانے بھی تعمیر کرائے جاتے تھے۔ اُن مدفنوں میں مومیات کے تابوت مختلف قسم کے مضبوط صندوقوں میں رکھ کر دفن کیے جاتے تھے۔

صدیوں سے مصر کا محکمہ آثار قدیمہ پرانی یادگاروں کی تلاش میں مصروف ہے۔ قدیمی قبرستان جو اب "کفریہ" کے نام سے مشہور ہیں کھودے جا رہے ہیں۔ ابتک صرف چند گورستان کھدے ہیں۔ اور اُن میں سے سیکڑوں مومیات دستیاب ہوئی ہیں۔

یہ مومیات عام طور پر تو کالی کالی اور بھاری بھاری نکلتی ہیں۔ دور سے یہی معلوم ہوتی ہیں جیسے آبنوس کا ایک بُرادہ۔ لیکن قریب سے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ انسان کی لاشیں ہیں۔ جو کفن میں لپیٹ کر کسی کالے مادہ سے لیسی گئی ہیں تاکہ ہوا اندر نہ جا سکے مگر بعض بعض مومیہ ایسی بھی نکل آتی ہیں جو انسان کے طبعی رنگ کی ہوتی ہیں مثلاً سرخ و سپید گندم گوں یا زرد ان میں سے خوشبو بھی آتی ہے اور اگرچہ وہ کئی کئی ہزار سال کی ہوتی ہیں لیکن ان میں وہی طراوت اور تازگی پائی جاتی ہے جو ایک زندہ انسان کے جسم میں ہوتی ہے اگر ان میں انگلی دھنسائیے تو اسی طرح دھنسے گی جس طرح کہ زندہ انسان کے جسم میں۔

پہلی قسم کی کالی مومیہ سے کفن کا جدا کرنا مشکل ہوتا ہے۔ لیکن دوسری قسم کی مومیہ کا کفن صرف اسی آسانی کے ساتھ نکالا جا سکتا ہے جس آسانی سے ایک زندہ آدمی اپنا لباس اُتارتا ہے۔ بہت بڑے بڑے محقق عرصہ سے اُن دواؤں کی جستجو میں مصروف ہیں جن کے ذریعہ سے یہ لاشیں محفوظ رکھی جاتی تھیں لیکن اب تک بالکل پتہ نہیں چل سکا۔ پرانی تاریخوں اور خود مصر کے پرانے کتبوں سے بھی اب تک اس بے نظیر نسخہ کا سراغ نہیں لگ سکا۔

یونان کا مشہور سیاح اور دنیا کا پہلا مورخ ہیرو ڈوٹس مصر کے ان مراسم کے حالات جو مُردوں کے متعلق وہاں انجام دیے جاتے تھے لکھتا ہے۔

مصر کے ملک میں جب کوئی مرتا ہے تو اُس گھر کی تمام عورتیں اپنے سر اور مُنہ پر کیچڑ ملتی ہیں۔ مُردے کو مکان کے اندر چھوڑ کر وہ باہر نکلتی ہیں۔ کمر باندھ کر سینہ کھول دیتی ہیں اور چھاتی پیٹتی ہوئی شہر میں گھومتی ہیں۔ ان کی تمام رشتہ دار عورتیں بھی ان کے ساتھ ساتھ پھرتی ہیں۔ گھر کے مرد بھی عورتوں کی طرح سینہ کوبی کرتے ہیں۔ لیکن وہ عورتوں کے ساتھ ساتھ نہیں رہتے۔ بلکہ ان کی ٹولی عورتوں کی ٹولی سے الگ رہتی ہے۔ جب اس طرح پر تمام شہر کا گشت ہو لیتا ہے تو ماتم ختم ہو چکتا ہے۔

اس کے بعد مُردہ اس مقام پر لایا جاتا ہی جہاں اس کی تصبیر (دواؤں سے لاش کو صاف کرنا کہ وہ سڑنے سے محفوظ رہے) کی جاتی ہی۔ تصبیر کرنے والے یہاں بہت کثرت کے ساتھ ہیں۔ جن کا یہی پیشہ ہی۔ وہ مذہبی قانون کے مطابق لاش کی تصبیر کرتے ہیں۔ جب انکے یہاں کوئی مُردہ پہنچایا جاتا ہی تو اُس کے رشتہ داروں کو مصبّر کئی قسم کی مومیہ کے نمونے دکھلاتے ہیں۔ کوئی اپنے طبعی رنگ اور حالت پر کوئی مصنوعی رنگ اور کوئی اس سے کم درجہ کی وغیرہ میت کے رشتہ دار جس قسم کی تصبیر پسند کرتے ہیں بتا کر لاش کو مصبّروں کے حوالے کر دیتے ہیں اور اپنے گھروں کو واپس چلے آتے ہیں۔

مصبّر اس لاش پر اپنا عمل شروع کرتے ہیں۔ وہ پہلے ایک ٹیڑھے آلہ کے ذریعے سے اسکا دماغ ناک کے راستے سے نکال لیتے ہیں یا چند دوائیں ناک کے راستہ سے دماغ میں پہنچاتے ہیں اور پھر کنپٹی میں سوراخ کر کے آسانی کے ساتھ دماغ نکال لیتے ہیں۔ بعد ازاں اُس کا ایک پہلو چاک کر کے اس کی تمام آلائش آنتیں وغیرہ نکال کر صاف کر کے کھجور کی شراب میں ڈالدیتے ہیں اور مختلف قسم کی خوشبودار دوائیں کوٹ کر ان میں بھرتے ہیں۔ جب وہ صاف ہو چکتی ہیں تو پھر اسی طرح ان کو شکم کے اندر رکھ کر گندہ کے تاروں سے سی کر لاش کو نطرون میں (ایک کب سیال جس میں نمک کا حصہ زیادہ ہوتا ہی) ڈال دیتے ہیں۔ یہ لاش ڈھائی مہینے تک اس میں پڑی رہتی ہی۔ بعد ازاں اسکو دھو کر گوند چڑھائے ہوئے کفن میں لپیٹتے ہیں۔ اور تابوت میں جو اسی کے ڈھانچہ کا بنایا جاتا ہی رکھ کر اسکے رشتہ داروں کے حوالے کر دیتے ہیں ۔ وہ اس تابوت کو لا کر گھر میں کسی دیوار سے لگا کر کھڑا کر دیتے ہیں۔

تصبیر کا یہ طریقہ جو اوپر بیان کیا گیا ہے بہتر ہے۔ لیکن اس میں اخراجات بہت پڑتے ہیں۔ اگر میت کے اقربا اتنا صرفہ برداشت نہیں کر سکتے تو دوسری طرح پر ان کی تصبیر کی جاتی ہے یعنی لاش سے آنتیں اور دماغ نہیں نکالا جاتا بلکہ ایک خاص قسم کی شراب اس کے دل کے ذریعے سے تمام رگوں اور جسم کے ہر حصہ میں پہنچائی جاتی ہے اور بدن کے خارجی سوراخ بڑی مضبوطی سے بند کردیے جاتے ہیں۔ پھر نطرون میں ڈالکر مدت معینہ کے بعد نکال کر بندشیں کھول دی جاتی ہیں بدن کے اندر سے وہ شراب نکل جاتی ہے اور لاش صاف کرکے رشتہ داروں کے سپرد کر دی جاتی ہے۔

ایک تیسرا طریقہ اور بھی ہے جسکو صرف غربا استعمال کرتے ہیں۔ وہ یہ کہ ایک معمولی دوا سے بدن کو صاف کرکے نمک کے ذریعہ سے اسکا گوشت تحلیل کردیا جاتا ہے اور صرف پوست استخواں باقی رہ جاتے ہیں اسکو تابوت میں رکھ کر اہل میت کو دیدیتے ہیں۔

عورتوں کی لاش تصبیر کے لیے تین دن کے بعد حوالہ کی جاتی ہے۔"

ایک دوسرا یونانی مورخ "دیوڈورس" جو ہیروڈوٹس کے بعد مصر میں آیا ہے اُس نے بھی تصبیر کی کیفیت کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھی ہے اس کے کلام کا خلاصہ حسب ذیل ہے

مصریوں کے عجیب و غریب مراسم جو وہ مُردوں کے متعلق ادا کرتے ہیں نہایت حیرت انگیز ہیں۔ جب کوئی شخص مرتا ہے تو اسکے گھر کے مرد اور عورتیں اپنے سر اور منھ پر کیچڑ ڈالتے ہیں۔ اور تمام عزیز و رشتہ دار بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ پھر ماتم شروع ہوتا ہے۔ وہ روتے اور چلاتے ہوئے تمام شہر میں گھومتے ہیں اور جب تک مُردے کو دفن نہیں کرلیتے اس وقت تک نہانا۔ شراب پینا۔ اچھے کھانے کھانا۔ عمدہ لباس پہننا سب کچھ ترک کردیتے ہیں۔ وہ اپنے مُردوں کی

تصویر کراتے ہیں جو کئی طرح کی ہوتی ہے۔ اچھی تصویر کی لاگت ایک ہزار دینار
(تقریباً ڈھائی ہزار روپیہ) اور درمیانی درجہ کی دو سو دینار ہوتی ہے۔ معمولی
تصویر بہت سستے داموں ہو جاتی ہے۔ تصویر کرنے والی ایک خاص جماعت ہے
جنکا باپ دادا کے زمانہ سے وراثتاً یہی پیشہ چلا آتا ہے۔ اہل میت لاش کو انکے
پاس لیجاتے ہیں۔ مصبر انکے سامنے ایک کتاب لاتا ہے جس میں ہر قسم کی
تصویر کی اجرت اور کیفیت درج ہوتی ہے وہ جس قسم کی تصویر پسند کرتے ہیں
اسکا صرفہ دیکر لاش کو حوالے کرتے ہیں مصبروں کی جماعت میں سے ہر شخص
کے متعلق ایک ایک کام ہوتا ہے۔

مثلاً پہلے ایک شخص آتا ہے اور لاش میں جہاں سے وہ چاک کی جائے گی
نشان بنا دیتا ہے۔ اس کا صرف اسی قدر کام ہے۔ اسکے بعد دوسرا شخص آتا ہے
جو لاش کو چیرتا ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ جب چیرنے والا اپنا عمل ختم کر چکتا ہے تو فوراً بھاگتا ہے
تمام حاضرین اس کو لعنت ملامت کرتے ہوئے اور پتھر مارتے ہوئے
اس کے پیچھے دوڑتے ہیں۔ یہانتک کہ وہ نگاہ سے غائب ہو جاتا ہے
اس فعل سے گویا وہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ شخص مُردے کو زخم لگا کر ایک گناہ
کبیرہ کا مرتکب ہوا ہے۔ اس وجہ سے یہ سزا کا مستحق ہے اور اس لیے اس کو
مارنے کو وہ دوڑتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک کسی مُردے کی
بے ادبی ایک ایسا گناہ ہے جو بخشش کے قابل نہیں ہے۔ بخلاف اس کے مصبروں
کی جماعت کے اور لوگ ایسے خیال نہیں کیے جاتے ان کی بہت عزت
کی جاتی ہے۔ وہ کاہنوں کی محرابوں اور عبادت گاہوں میں بھی
جاتے ہیں۔

تصبیر کا طریقہ یہ ہے کہ مصبر لاش کے ارد گرد بیٹھ جاتے ہیں۔ ایک شخص شگاف میں ہاتھ ڈال کر انتیں وغیرہ باہر کھینچ لیتا ہے۔ دوسرا اٹھ کر اس کو دھوتا ہے اور شراب میں بھگو دیتا ہے۔ جسم پورے ایک مہینے تک ایک خاص قسم کے تیل سے روزانہ صاف کیا جاتا ہے پھر مصبر ایک تلخ دوا ہے جسکو اردو میں ایلوا کہتے ہیں) قرفہ اور چند خوشبودار دوا میں اس میں کوٹ کر بھری جاتی ہیں تاکہ کسی قسم کے کیڑے اس کو نہ کھائیں اور وہ سڑنے سے محفوظ رہے۔

یہ سب کام اس صفائی اور خوبی سے انجام دیئے جاتے ہیں کہ مُردے کی ہیئت میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں واقع ہونے پاتا۔ جب یہ سب کام ختم ہو چکتے ہیں تو اقربا اس کو تابوت میں رکھ کر اپنے مکان کی دیوار سے لگا کر کھڑا کر دیتے ہیں اور اس طرح پر وہ اپنے گزشتہ آبا و اجداد کو ہمیشہ اپنا ہمعصر بنائے رکھتے ہیں اور ان کی صورتیں دیکھ کر روحانی خوشی حاصل کرتے ہیں۔

ایک یہ امر بھی عجیب و غریب ہے کہ جب لاش کو تابوت میں رکھ کر چلتے ہیں تو تمام شہر میں ایک خط گشت کرایا جاتا ہے کہ فلاں شخص کا جنازہ اُٹھتا ہے سب لوگ جمع ہوں۔ وہ تابوت ایک کھُلے ہوئے میدان میں رکھدیا جاتا ہے۔ تمام لوگ اس کے آس پاس کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کاہنوں کی ایک جماعت جن کی تعداد چالیس سے زیادہ ہوتی ہے ایک چبوترے پر جو ان کے لیے بنایا جاتا ہے بیٹھتی ہے۔ پھر پکار ہوتی ہے کہ جس کو اس میت پر کسی قسم کا دعوے ہو وہ پیش کرے۔ اگر کسی شخص کو میت پر کوئی دعوے نہیں ہوتا تو اہل میت اسی وقت اپنا ماتمی لباس اُتار دیتے

ہیں اور نہایت خوشی کے ساتھ اس کی تعریف کرنے لگتے ہیں کہ اس نے بہت عمدہ اور قابلِ تقلید زندگی بسر کی کہ بعد مرنے کے اس سے کوئی ناخوش نہیں ہے۔ اس کی ایک ایک نیکی کو جو اس نے اپنی زندگی میں کی ہے فخر کے ساتھ وہ لوگ بیان کرتے ہیں اور اُس کی پرہیزگاری اور اخلاقی خوبیوں کی مدح کرتے ہیں۔ کاہنوں کی جماعت ایسے مُردے کو گورستان میں دفن کرنے کی اجازت دیتی ہے۔ لوگ ہنسی خوشی سے اس کے جنازے کو اُٹھا کر آگ کے دیوتا کی مورت کے سامنے لیجا کر رکھتے ہیں اور تمام حاضرین اس کی نجات کے لیے رو رو کر دعائیں مانگتے ہیں۔

اگر کسی نے مُردے پر دعویٰ کیا اور اس کا ثبوت بھی دیدیا تو اسکا تاوان میت کے اقربا کو دینا پڑتا ہے اگر قرضہ ہو تو وہ قرضہ ان کو ادا کرنا پڑتا ہے اور تاوقتیکہ یہ قرضہ یا تاوان ادا نہ کر دیا جائے اُس وقت تک مُردہ کو گورستان میں دفن کرنے کی اجازت نہیں دیجاتی۔ بلکہ رشتہ دار اس کے تابوت کو لاکر گھر میں دیوار کے سہارے کھڑا کر دیتے ہیں ہاں جب اس قسم کے بہت سے مُردے کسی گھر میں جمع ہو جائیں تو کاہن خاص طور پر ان کے دفن کی اجازت دیدیتے ہیں۔

میت کے جنازے پر اس قسم کے دعووں کی سماعت اور اس کو لوگوں کی نارضامندیوں اور ہر قسم کی دنیاوی ذمہ داریوں سے پاک وصاف کرکے دفن کرنا ایک ایسا زبردست اخلاقی سبق ہے کہ جس کی بدولت مصر کے لوگ عام طور پر نیک۔ پرہیزگار اور بے آزار ہیں۔ اور وہ اپنی آخری رسوائی کے خوف سے ہر وقت گناہ اور ایذا رسانی سے بچتے رہتے ہیں۔"

قدیم اہلِ مصر کا مُردوں کا اعزاز و احترام کرنا کئی سبب سے تھا۔ پہلا سبب تو یہ تھا کہ ان کا

یہ عقیدہ تھا کہ حشر جسمانی ہوگا اور عالم آخرت میں انسان ہمیشہ زندہ رہیگا اس کی روح جو دنیا میں جسم سے بوجہ موت کے جدا ہو جاتی ہی ایک نامعلوم زمانے کے بعد پھر جسم میں داخل ہوگی اس لیے لازم ہی کہ جس کوشش سے ممکن ہو جسم اپنی حالت پر باقی رکھا جائے تاکہ روح اسکو پہچان لے اور اُسی میں داخل ہو اور پھر روح اور جسم کا اتصال دائمی ہو کیونکہ انکے اعتقاد میں جنت صرف بقار کا نام تھا۔

دوسرا سبب یہ تھا کہ مصر کے لوگ بھی اہل فارس وغیرہ قدیم اقوام کی طرح یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ دنیا دو فریقوں کا میدان جنگ ہی جو ہر وقت دن اور رات ایک دوسرے سے لڑائی میں مشغول ہیں۔ وہ دونوں فریق نیکی اور بدی ہیں۔ وہ لوگ بدی کو خدا کی مخلوق نہیں مانتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ ناممکن ہی کہ خدا ایسی ناپاک چیز کو پیدا کرے وہ خدا کی نورانی سلطنت میں اس کو ایک جنبی دشمن سمجھتے تھے جو اس کی بادشاہت کو برباد اور تباہ کرنے کے لیے گھس آئی ہی۔ اسی وجہ سے وہ خدا کی ساری مخلوق کا یہ فرض قرار دیتے تھے کہ جس طرح سے ممکن ہو وہ بدی کا مقابلہ کرے۔ یہاں تک کہ اُس کو خدا کی خدائی سے نکال دے چونکہ بعد موت کے جسم کا تلف ہو جانا بھی ایک قسم کی بدی تھی اس لیے وہ اس کے مقابلے کے لیے آمادہ ہو گئے اور انھوں نے ایسے وسائل مہیا کیے کہ انسانی جسم ہر قسم کی خرابی اور فساد سے محفوظ رہے۔

موسیو ماریٹ جو مصر کے انتیقہ خانہ خدیوی (عجائب گھر) کا کسی زمانے میں مہتمم رہا ہی ایک اور بھی عجیب وغریب وجہ لکھتا ہی۔ وہ کہتا ہی کہ اصلی سبب مومیہ بنانے کا یہ تھا کہ ملک مصر کی طبعی خاصیت نے اہل مصر کو اس بات پر مجبور کر دیا تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جبتک مصر میں مومیات بنتی رہیں اس وقت تک وہاں کوئی عام مہلک وبا نہیں پھیلی اور جب سے یہ رسم مٹ گئی اس وقت سے بارہا مہلک وبائیں دورہ کر چکی ہیں۔

موسیو موصوف کی اس توجیہ سے یہ معلوم ہوتا ہی کہ انھوں نے مصر کی قدیمی تاریخ پر

پورا عبور حاصل کرلیا ہے اور انہیں یقینی طور پر معلوم ہوگیا ہے کہ قدیم زمانے میں مصر میں کبھی کوئی مہلک وبا نہیں آئی۔ لیکن افسوس ہے کہ مصر کی کوئی مفصل قدیم تاریخ ہی موجود نہیں ہے۔

جہانتک وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اہل مصر کا لاشوں کی حفاظت میں کوشش کرنا اور اس پر اپنی تمام ہمت اور دولت صرف کر دینا کسی طبّی خیال سے نہیں تھا بلکہ مذہبی اعتقادات پر مبنی تھا۔ ایک قدیم سیاح نے جو مصر میں اسلام سے تین ہزار سال پہلے گیا تھا لکھا ہے " اہل مصر اپنے گھروں کو گذرگاہ اور اپنی قبروں کو دائمی آرام گاہ سمجھتے ہیں "

وہ اس بات کا اعتقاد رکھتے تھے کہ انسان کی روح میں ہمیشہ زندہ رہنے کی قابلیت موجود ہے۔ اگر وہ کوشش کرے تو دائمی زندگی حاصل کر سکتا ہے یعنی اگر خدا کے حکم اور مرضی کے مطابق وہ زندگی گزارے اور نیک کاموں میں اُسکو صرف کرے تو اس کو خوش آیند اور دائمی زندگی نصیب ہوگی جس پر موت کو کبھی دسترس نہ ہو سکے گی۔ لیکن اگر اس نے خدا کے فرمان کی اطاعت نہ کی اور بُری زندگی بسر کی تو اُس پر عذاب کیا جائے گا۔ اور وہ عذاب یہ ہے کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فنا کر دی جائے گی۔ وہ لوگ جنت اور دوزخ کے قائل تھے لیکن بقار کو جنّت اور فنا کو دوزخ سمجھتے تھے۔

بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اہل مصر تناسخ کے قائل تھے۔ یعنی وہ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ انسان کی روح مرنے کے بعد اپنے اعمال کی جزا یا سزا میں کسی دوسرے انسانی یا حیوانی قالب میں چلی جاتی ہے۔ لیکن یہ خیال بے بنیاد ہے کیونکہ مصری اس عقیدہ سے کبھی آشنا نہیں ہوئے۔ ان کی کسی پُرانی یادگار سے مطلق اس کا پتہ نہیں چلتا۔ البتہ یونان کے چند فلسفیوں نے اس خیال کو ظاہر کیا ہے لیکن اہل مصر کا یہ عقیدہ کبھی نہیں رہا وہ دنیاوی زندگی کو دن کی روشنی سے مشابہ سمجھتے تھے اور موت کو غروب آفتاب

ے تشبیہ دیتے تھے جس طرح رات میں تاریکی ہو جاتی ہے اُسی طرح بعد موت کے روح سرگشتگی اور آوارگی کی تاریکی میں پڑ جاتی ہے اور یہ تاریکی کا زمانہ اس کے امتحان کا زمانہ ہوتا ہے۔

ان کا یہ خیال تھا کہ نیک بندوں کی روح مرنے کے بعد "اوزیریس" (روح کا رہنما دیوتا) کے پاس جاتی ہے جو اس کی رہبری کرتا ہوا موت کی تاریکی میں اسکو آگے لے چلتا ہے۔ اس تاریکی میں روح کو آگے جابجا بند دروازے ملتے ہیں جن پر نہایت سخت نگھبان ہوتے ہیں۔

ان دروازوں پر پہنچ کر روح نے زندگی میں جو اچھے اچھے کام کیے ہیں ان کو بیان کرتی ہے اگر نگھبان اس کو ترقی کے قابل سمجھتے ہیں تو دروازہ کھول دیتے ہیں۔ روح آگے جاتی ہے پھر اسی طرح دوسرا اور علی ہذا تیسرا دروازہ ملتا ہے اور ہر ایک پر اس کا امتحان لیا جاتا ہے اور آخرکار روح اس طرح پر امتحان کے برزخ کو طے کرتی ہوئی عالم قدس کو پہونچتی ہے جہاں اسکا آخری فیصلہ ہونے کو ہے۔

اس نورانی مقام میں رب الارباب عدل کی کرسی پر بیٹھا ہوا نظر آتا ہے۔ روح اس کی تعظیم کے لیے سجدہ میں گر جاتی ہے اور نہایت سریلی راگ میں ادب اور نیازمندی کے ساتھ اپنے تمام نیک کاموں کو گاتی ہے جو اس نے دنیا میں کیے تھے۔ مثلاً میں نے پڑوسیوں کو سُکھ دیا۔ چھوٹے بچوں پر ترس کھایا۔ بھوکوں کو روٹی کھلائی۔ پیاسوں کو پانی پلایا۔ ننگوں کو کپڑا پہنایا۔ امیدواروں کی امیدیں پوری کیں۔ ماں باپ کی اطاعت کی وغیرہ۔

رب الارباب یہ راگ سُن کر مہربان ہو جاتا ہے اور اس وقت ۴۲ حاکم جو اُسکے پاس بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں یہ فیصلہ دیتے ہیں کہ اس روح کو خوشی کا دائمی مُہر عنایت کیا جاتا ہے۔ پھر اس روح کا موت کی تاریکی کا سفر ختم ہو جاتا ہے۔

اور وہ صبح کے آفتاب عالمتاب کی طرح جنت میں جو حقیقی اور دائمی انبساط کا مقام ہے خوشی سے چمکتی رہتی ہے نہ بڈھی ہوتی ہے نہ مرتی ہے۔ البتہ اس کو اس بڑی قیامت کا انتظار رہتا ہے جس میں جسم اُٹھائے جائیں گے۔

اسی غرض سے مومیات کے تابوت پر اکثر اوزیریس دیوتا کی مورت اور وہ دعائیں جن کے ذریعہ سے روح امتحان کے مرحلوں کو طے کرتی ہے نقش کی جاتی تھیں تاکہ روح ان کو یاد رکھے اور دیوتا اس پر مہربان رہے۔ مدفن کے قریب پختہ حجرے اور عبادت خانے بھی بنائے جاتے تھے کہ میت کے اقربا آئیں اور وہاں عبادت کریں اور روح کو ثواب پہنچانے کی غرض سے زکات و خیرات کریں تاکہ وہ امتحانوں میں کامیاب ہو اور اس کو حیات ابدی ملے۔

قبروں پر گائے کی تصویر بنائی جاتی تھی۔ یہ ہاتور دیوتا کی مورت تھی جو گائے کی شکل میں تھا۔ یہ نہایت مہربان دیوتا تھا روح پہلے اسی کے پاس جاتی تھی یہ اس کو اوزیریس کے پاس پہنچاتا تھا جس کے اندر روح حلول کر جاتی تھی۔ اور پھر امتحان کی کڑی منزلیں طے کرتی تھی اوزیریس ان کے اعتقاد میں نیکیوں کا بادشاہ ہے۔ دنیا میں جس قدر نیکیاں اچھی اچھی باتیں۔ علوم و فنون۔ صنعت و حرفت ہیں۔ سب اوزیریس ہی نے سکھائے ہیں۔ وہ پہلے انسانی شکل میں دنیا میں آیا تھا اور ان سب چیزوں کی اُس نے آدمیوں کو کو تعلیم دی۔ اس کے بھائی تیفون کو جو بُرائیوں کا سرغنہ ہے اوزیریس پر غصہ آیا۔ اُس نے کئی دیوتاؤں کو اپنا ہمراز کر لیا اور ایک دن اچانک پہنچ کر اوزیریس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے دریائے نیل میں ڈال دیے۔ اوزیریس کی بیوی ایزیس کو جب یہ خبر معلوم ہوئی تو وہ اپنی بہن کو لیکر اپنے شوہر کی تلاش میں نکلی۔ اُس نے سارے ٹکڑے دریائے نیل سے نکالکر جمع کیے اور اُن پر نیکیوں کی تعریف کا راگ سُریلی آواز میں گانے لگی۔ اس راگ کو سُنکر وہ زندہ ہو گیا لیکن پھر دنیا میں نہیں آیا بلکہ اُسی وقت سے وہ دونوں

غائب ہو گئے۔

یہ بھی ایک حیرت انگیز امر ہے کہ بعض بعض مدفنوں سے کاغذ پر لکھی ہوئی کتابیں بھی نکلی ہیں جو ابتک ہر قسم کے نقصان سے محفوظ ہیں فرعون (حضرت موسےٰ علیہ السلام کے زمانے کا) جس کا نام غالباً منفطاح ہے اس کی لاش بھی تقریباً تین سال ہوئے ایک گورستان سے بجنسہ نکلی اس کی قبر میں بھی کاغذ پر لکھی ہوئی ایک کتاب ملی ہے جو کئی گز لمبی ہے۔

کاغذ کی ایجاد کو چھ سات سو برس سے زیادہ زمانہ نہیں گزرا لیکن مصریوں نے آج سے چار پانچ ہزار سال پہلے کاغذ بنانا شروع کر دیا تھا۔ وہاں ایک قسم کا درخت ہوتا ہے جس کو بردی کہتے ہیں اس درخت کے پتوں کو پانی میں سڑا کر کوٹ کر کوئی مصالحہ ڈالکر بڑے بڑے تختے بنا لیتے تھے۔ دھوپ میں خشک ہونے پر وہ سفید ہو جاتے تھے۔ انہیں پر ایک طرف لکھتے تھے اور ایک تختے کے ساتھ دوسرا تختہ جوڑتے ہوئے چلے جاتے تھے یہاں تک کہ بعض بعض اسی قسم کی کتابیں تیس تیس گز لمبی پائی گئی ہیں جو لپیٹ کر رکھی جاتی تھیں۔ ان کتابوں میں زیادہ تر روح کی نجات کی دعائیں اور معبودوں کی تعریفیں لکھی ہوئی ہیں۔

الغرض مصر کی اس قدیم تہذیب سے جس کی نہ مٹنے والی بے انتہا یادگاریں اس کی خاک کے نیچے دفن ہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ زمانے میں وہاں کے باشندے روح کے تزکیہ کو جو انسان کی علت غائی ہے اپنا حقیقی مقصد سمجھتے تھے اور اس لحاظ سے وہ شائستگی اور انسانیت کی اعلیٰ شاہراہ پر تھے۔ فقط

(از زمانہ) اسلم۔ جیراج پوری

صغر سنی کی شادی کے بُرے نتائج

اور

تعلیم نسواں و تعلیم مذہبی کی ضرورت

میں اضعف العباد و احقر الانام محمد ایوب ایک فرد قوم میمن سے ہوں۔ میرے والد بزرگوار سیٹھ محمد ہاشم ولد حاجی عبد القادر ایک معزز تاجر سکندرآباد کے تھے۔ ان کو انتقال کیے ہوئے آج دس ماہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ خداوند کریم غریق رحمت کرے۔ آمین۔

چونکہ مرحوم ایک خداترس و متقی شخص تھے۔ انہوں نے ۱۹۰۴ء میں تجارت سے قطع تعلق کرکے گوشہ نشینی اختیار کی۔ اور چند مکانات خرید کر اُن کی ماہانہ آمد پر بسر اوقات کیا کیے۔ لیکن مشیت ایزدی اس طرح تھی کہ ۱۹۰۶ء سے ان سے ایسے افعال سرزد ہونے لگے جن سے یہ بات تسلیم کی جاسکتی تھی کہ ان کے قواء دماغی میں فتور نے کچھ اپنا گھر کرلیا ہے

والد مرحوم کی اس حالت کو جو کہ سطور ماسبق سے ظاہر ہے دیکھتے ہوئے ہمشیرہ صاحبہ اور دیگر اقرباء کو (واضح ہو کہ والدہ ماجدہ ۱۳۱۶ھ ہی میں اس دارفانی سے رحلت فرماچکی تھیں) یہ خیال گزرا کہ مرحوم کے حین حیات ہی میری کہیں نسبت مقرر کیجائے اور رسم نکاح بھی جلد ظہور پذیر ہو۔ اور وہ لوگ جو کہ اس ارادہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مستعد ہوئے تھے آج تک تہ دل سے خدا کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ اُس نے اپنے فضل و کرم سے اُن لوگوں کو ان کے ارادہ میں بہت جلد کامیاب کیا۔

حاصل مقصود یہ ہے کہ میری نسبت میرے چچا سیٹھ حاجی محمد عبد اللہ کی دوسری لڑکی سے قرار پائی۔ اور میں ان دنوں سکنڈ فارم میں تعلیم پا رہا تھا اور میری عمر ۱۵ سال کی تھی۔ بعد ازاں بفضل ایزد باری ۱۹۰۸ء کے امتحان مڈل اسکول میں جو کہ ممالک محروسہ بندگان عالی متعالی

والی دکن نظام حیدرآباد میں سالانہ ہوا کرتا ہے میں درجۂ آنرس میں کامیاب ہوا۔
ماہ مئی ۱۹۰۸ء میں میری شادی بحیثیت تاجر ایک طمطراق سے بسرپرستی خسر وغیرہ مطابق مراسم مروجہ کہ جن کی نسبت فقرۂ نتیجہ نادانی وجہالت کہنا بیجا نہ ہوگا۔ ظہور پذیر ہوئی۔

اب اُن اسباب کو سُنیئے کہ جنہوں نے مجکو حصول علم کے زینے پر عروج کرنے سے متوی رکھا۔ اس کے کہنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی کہ میں مڈل اسکول میں کامیاب ہونیکے بعد ففتھہ فارم یعنی پری میٹرکولیشن میں تعلیم پا رہا تھا اور اسی سال میری شادی ہوئی۔ شادی کے دو ماہ قبل واسطے لانے ہمشیرہ صاحبہ کے جو کہ اپنے خاوند کے ساتھ بہاری میں سکونت پذیر تھیں مجکو بہاری جانا پڑا۔ یا یوں کہو کہ چند روز تک اسکول کو خیرباد کہنا پڑا۔ اور بعد شادی کے ان کو ان کی جای سکونت پر پہنچانے کا ذمہ بھی میرے گلے باندھا گیا۔
اس ذمہ سے سبک دوش ہونے کے بعد بھی چند درچند وجوہ ایسے درپیش ہوئے کہ میں نصف آخر ۱۹۰۸ء میں کوئی ہفتہ کلاس میں بلاناغہ حاضر نہ ہوسکا۔ اور اسی سبب سے گو میں ایک ذہین۔ محنتی وچست طالب علم مانا جاتا تھا لیکن سالانہ امتحان میں پوری طور سے کامیاب نہ ہوسکا تاہم مجکو ان وجوہ ونیز دوسرے کلاسوں کی شہرت کے باعث ایک کامیاب شدہ طالب علم تصور کرکے میٹرکولیشن میں داخل کرلیا گیا۔ لیکن سال گزشتہ بھی مجکو بسا اوقات امور خانہ داری کے باعث غیر حاضر ہونا پڑا۔ اور ان تمام پر مزید مصیبت پڑی کہ والد بزرگوار نے ماہ جون ۱۹۰۸ء میں انتقال فرمایا انا للہ وانا الیہ راجعون بہرکیف مجکو سالانہ امتحان یونیورسٹی میں شریک ہونے کی اسکول سے اجازت ملی اور میں ماہ دسمبر سال گزشتہ کے امتحان میں شریک ہوا۔ لیکن وجوہ مذکورہ بالا سے میں ناکامیاب رہا اور ابتک اسی کلاس میں تعلیم پا رہا ہوں۔
اب میں چند کلمات اپنی اہلیہ کی نسبت کہنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ زمانہ شادی میں انکی

عمر ۱۱ سال کی تھی اور شادی کے ۲ ماہ قبل تعلیم کی یہ حالت تھی کہ قرآن شریف کے چند ہی پارے ختم کئے تھے لیکن جب شادی کو ایک ماہ باقی رہا تو ہماری ساس صاحبہ نے ۱۵ یا ۲۰ روز کے عرصہ میں بقیہ پارہائے قرآن شریف برائے نام ختم کروا ڈالے۔ اور انہی دنوں میں آمین (ایک رسم کا نام ہے) بھی کر دی پھر بعد شادی کے میں نے ان کی تعلیم کو بند نہ کروایا بلکہ اسی ہستانی کے زیر نگرانی تعلیم دلوایا گیا۔ لیکن خاطر خواہ ترقی ہونے نہ پائی

معزز ناظرین مجکو اس کیفیت کے درج کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ مجکو میٹرکیولیشن کے امتحان میں بیٹھنے کے بعد نتیجہ کے انتظار میں ڈیڑھ ماہ کاٹنا پڑا۔ میرے ایک محب صادق نے مجھ سے یوں کہا کہ اگر تم اس ماہ میں کتب بینی کیا کروگے اور اخبارات و رسائل دیکھا کروگے تو تمہاری معلومات اور خیالات وسیع تر ہو جائینگے۔ اس لیے میں کتب خانۂ اسلامیہ واقع جیمیس اسٹریٹ سکندرآباد دکن میں شریک ہوا اور چند مفید اخبارات ورسائل مثلاً وطن۔ البشیر۔ انتخاب لاجواب۔ ہندوستان۔ مخبر مشیر۔ پیسہ اخبار مخزن صحیفہ۔ خاتون۔ عصمت۔ زمانہ وغیرہ جو کہ کارکنان کتب خانہ مشارٌالیہ برائے افادۂ عام ہر وقت لائبریری میں رکھا کرتے ہیں پڑہنا شروع کیا۔ اور خصوصاً ان مضامین سے مجکو زیادہ تر دلچسپی ہونے لگی۔ جو کہ ذرائع بہبودی اہل اسلام کے لقب سے ملقب ہو سکتے ہیں۔ اور جن کے مطالعہ سے یہ پایا جاتا ہے کہ بعض صحاب اشاعت اسلام کو مسلمانوں کی ترقی کا ایک ذریعہ تصور کرتے ہیں

بعض صحاب تعلیم نسواں کو۔ بعض مذہبی و اخلاقی تعلیم کو۔ بعض صنعتی و حرفتی تعلیم کو۔ بعض ترقی زبان اردو کو۔ بعض اتفاق مابین ہنود و مسلمین کو۔ بعض امداد سرکاری کو وغیرہ وغیرہ۔ اس سے میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ فرق مذکورۂ بالا سے کوئی ایک فرقہ دوسرے فرقہ کی مخالفت کرتا ہے۔ نہیں نہیں بلکہ ایک دوسرے کو وقعت کی نظر سے دیکھتا ہے اور ہر ایک فرقہ ایک ایک ذریعہ کے بہم پہنچانے میں کوشاں ہے اور شکریہ کا مستحق ہے۔ میں اپنی رائے میں

تعلیم نسواں و مذہبی تعلیم کو مقدم شمار کرتا ہوں اور اس کے چند وجوہ پیش کرتا ہوں۔
(۱) جب تک کہ مستورات کسی ایک کسب کو حقارت آمیز نظروں سے دیکھا کریگی۔ نوجوان مسلمانان ہند جوق جوق صنعتی و حرفتی تعلیم پانے کے لیے آمادہ نہونگے کیونکہ یہ مقولہ مسلمہ و عین الیقین ہے کہ جیسی ماں ویسا بچہ۔ یعنی جس قسم کے خیالات کہ ماں بچپن میں بچے کے ذہن نشین کر دیتی ہے وہی خیالات اس کی بقیہ زندگی میں نمایاں و ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں۔
(۲) اگر عام طور پر تعلیم نسواں رائج ہو جائے تو ابتدائی تعلیم مفت میں ہو سکتی ہے یعنی بچے اپنی ماں کی گود ہی گود میں تھوڑا سا حصہ ابتدائی اخلاقی و مذہبی تعلیم کا پا سکتے ہیں۔
(۳) اکثر دیکھا گیا ہے کہ بعض لوگ فہرست چندہ میں اپنا نام بڑے جوش سے درج کرتے ہیں در صرف ایک رات کے گزرتے ہی ان کے کچھ اور ہی خیالات ہو جاتے ہیں۔ اور وہ جوش اور وہ ہمت جو کہ ایک روز قبل پائی جاتی تھی کہیں کی کہیں چلی جاتی ہے اور وعدہ خلافیاں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ یہ سب کیا ہے؟ جہالت نسواں کا ظہور ہے۔
(۴) یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بعض تعلیم یافتہ لوگ جب کہ تقریر کرتے ہیں تو ہر سامع ان کے خیالات وسیع ہونے کی داد دیتا ہے۔ لیکن جبکہ وہ گھر میں قدم دھرتے ہیں تو گویا اُن کے ساتھ ہی ان کے خیالات بھی گھر کی چار دیواری ہی میں چھوٹے چھوٹے اور چھوٹے تفکرات اور بے سود رنج و غم سے ٹکراتے ہیں اور ساتھ ہی ان تفکرات کو دور کرنے سے عاجز آجاتے ہیں۔ اور جو جو اصلاحات کہ وہ اپنی فصیح و بلیغ اسپیچ میں بیان کرتے ہیں۔ ان کو عملی جامہ پہنا نہیں سکتے۔ اسکا کیا سبب ہے؟ اسکا سبب بھی وہی "جہالت نسواں" کا ظہور ہے۔ اور ایسے ہی لوگوں پر حافظ کا یہ شعر صادق آتا ہے۔

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر میکنند — چوں بخلوت میروند آں کار دیگر میکنند

کیا یہ لوگ اپنے گھر والوں کو تعلیم دیکر اپنا ہمخیال نہیں بنا سکتے ہیں۔ اور کیا ان کو اس کام

کے کرنے سے مدد نہ ملیگی۔ کیوں نہیں ضرور مدد ملیگی۔ اگر وہ اپنے گھر والوں کو اپنا ہمخیال بنا لینگے تو صرف ان کو اپنے نیک ارادوں میں ہی مدد نہ ملے گی بلکہ وہ اپنے بقیہ دن راحت میں گزار دینگے۔ چانکیہ (نام ہے ایک معتبر سانسکرت فلاسفر کا) کا قول ہے کہ "جس کا بیٹا فرماں بردار ہوتا ہے اور جس کی عورت مرضی کے موافق چلتی ہے اور حالت موجودہ میں خوش اور اس پر قانع ہوتی ہے اسکے لیے دنیا بہشت سے کم نہیں ہوتی" دوسری جگہ کہتا ہے کہ "عورت وہی ہے کہ جس سے راحت حاصل ہو" ایک اور مقام پر کہتا ہے کہ "جو لوگ دنیا کی تکلیفوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ان کو راحت پہنچانے والی تین چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک دوست۔ دوسرے عورت خندہ رو۔ تیسرے نیک اور خدا پرستوں کی صحبت" ایک اور مقام پر کہتا ہے کہ "عورت وہی ہے جسکا خیال ہمیشہ نیک کاموں کی طرف ہو۔ اور جو لائق۔ باعصمت اور رہت گفتار ہو اور جسکو شوہر کے ساتھ بے انتہا محبت ہو ایسی ہی عورت خانہ داری کے قابل ہے"

(۵) تعلیم نسواں کے ساتھ ساتھ مذہبی تعلیم مرد اور عورتوں کو دیجائے تو مسلمانوں کی ترقی کو چار چاند لگ جائیں گے اور کسی قسم کی خرابی اصلاحوں میں سد راہ نہو گی۔

ناظرین اب میں بیان کرونگا کہ کس طرح میں اپنے اس خیال کو جو کہ آپ کو بخوبی معلوم ہو گیا ہو گا عملی کارروائی میں لایا۔ میں آپ سے پہلے عرض کر چکا ہوں کہ میرے مکان میں استانی جی کی تعلیم سے خاطر خواہ ترقی نہوئی۔ اس لیے میں خود تعلیم دینے پر ماہ گزشتہ میں آمادہ ہوا۔ لیکن پہلے تو میں اس اندیشہ سے رُک گیا کہ عورتیں میری مخالفت کرینگی اور نیز اس خیال سے کہ شاید وہ مجھ سے تعلیم پانے پر راضی نہو۔ لیکن میں نے بعد ازاں دو ایک کتابوں میں اس طرح لکھا پایا کہ مذہبی و اخلاقی مسائل (مثلاً مسائل طہارت۔ نماز۔ روزہ۔ تیمارداری و پرورش و تربیت شیر خواراں) نہ سکھانے کے باعث ایک عورت کے لیے چار مرد پکڑے جائیں گے۔ باپ۔ بھائی۔ شوہر۔ بیٹا۔

اور ایک کتاب میں اس طرح لکھا پایا کہ "جاننا چاہیے کہ مردوں کو لازم ہے کہ اپنی بیویوں کو علم دینی سکھاویں کہ فرمایا ہے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم ومسلمۃ یعنی طلب کرنا علم کا فرض ہے ہر مسلمان مرد اور ہر مسلمان عورت پر۔ ہکذا فی المشکوٰۃ۔ تاکہ وہ بسبب جہالت کے کفر و گناہ میں گرفتار نہوں اور دونوں کی دنیا و آخرت میں اچھی گزرے۔ بڑا فساد دین و دنیا کا تو اسی سے ہوتا ہے کہ مرد نہ آپ علم دین پڑھتے ہیں اور نہ بیویوں کو پڑھاتے ہیں۔ پس بھلائی برائی دین و دنیا کی کیونکر معلوم کریں اور حق ہے مردوں پر کہ اپنی بیویوں اور بچوں اور گھر والوں کو شرک اور کفر اور گناہ کی باتوں سے باز رکھیں اور بجالانے طاعت کے لیے تاکید کریں کہ اللہ جل شانہ فرماتا ہے یا ایہا الذین آمنوا قوا انفسکم واھلیکم نارا وقودھا الناس والحجارۃ یعنی اے ایمان والو بچاؤ اپنے نفسوں کو اور اپنے گھر والوں کو اس آگ سے کہ اسکا ایندھن آدمی اور پتھر ہونگے۔ اس کی تفسیر میں صاحب مدارک نے یوں لکھا ہے کہ آپ بھی طاعت بجالاؤ اور ترک معصیت کرواؤ اپنے گھر والوں کو بھی طاعات کرنے کو کہو اور گناہوں سے باز رکھو۔ انتہیٰ"

معزز ناظرین میں نے اس قسم کی اور بہت سی آیات اور احادیث صحیحہ دیکھیں اور آخر الامر میرے دل میں یہ بات آئی کہ میں جو محض حیا و لحاظ کے خیال سے رُک گیا تھا وہ دراصل عین بے حیائی ہے کہ اپنے مالک حقیقی سے تو شرم نہ کیا اور لوگوں سے شرم کیا، اس لیے مصمم ارادہ کر لیا کہ ضرور اسی روز سے پڑھائی شروع کر دونگا۔ شعر

ہر کارے کہ ہمت بستہ گردد　　اگر خارے بود گلدستہ گردد

اور میں تہ دل سے خدا کا شکریہ ادا کر رہا ہوں کہ اُس نے میری مطلب برآری کی یعنی میں نے تعلیم دینا شروع کر دیا۔

جب یہ بات ہماری ساس صاحبہ اور دوسرے اقربا کو پہونچی تو انہوں نے مجھ سے اس قسم کے سوال کیے کہ کیا لڑکی کو منشی بنا کر کہیں نوکر رکھے گا۔ کیا تیرا ارادہ ہے کہ

اسکو لکھا پڑھا کر اپنے ساتھ روز گاڑی میں بٹھا کر ہوا خوری کو لیجایا کریگا۔ ایسا تو ہم لڑکی کو بگاڑنا نہیں چاہتے اور تو بھی کب تک پڑہتا رہیگا۔ کیا بڈھا ہونے تک پڑہتا رہیگا۔ زیادہ پڑھنے سے آدمی دیوانہ ہوجاتا ہے

ناظرین اب آپ خیال کرسکتے ہیں کہ انکے خیالات کا دائرہ کس قدر محدود ہے لیکن پھر بھی میں ان لوگوں کی تائید میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ جہانتک ان لوگوں کا تجربہ ہے وہ دیکھتے ہوئے آئے ہیں کہ وہ لوگ جو کہ یورپ کی ہوا کھائے ہوئے ہیں یا جو یورپ کی طرز معاشرت کو مطابق عقل کے تصور کرتے ہیں وہ کسی کی نہیں مانتے اور تعلیم نسواں کے ذریعہ سے پردۂ نسواں کو توڑنا چاہتے ہیں۔ اور حقیقت میں تو ان ہی لوگوں کی کہنی ناشایستہ حرکتوں سے تعلیم نسواں معیوب ہوچلی ہے۔

افسوس صد افسوس! کہ عورتوں کی تو ایسی نازک حالت ہو اور ابھی ہی سے تعلیم نسواں بھی ساتھ ہی ساتھ معیوب تصور ہو۔ ہمیں حتی الامکان کوشش کرنی چاہیے کہ آیندہ ایسی شکایتیں ظہور پذیر نہوں۔ میں اپنی اس شکستہ تحریر و ناکمل و خام خیالات کو زیادہ طوالت دینا پسند نہیں کرتا اور دست بدعا ہوں کہ اے پاک پروردگار تو اپنے فضل و کرم سے جملہ مسلمان مرد و عورتوں کو راہ رہست پر لا اور نار جہنم سے نجات دے۔ آمین۔

محمد ایوب
سکندر آباد دکن

اندلس کا طلسمی برج

رقم ہے یہ طلسم باستانی سُنا جو کچھ زمانے کی زمانی

خاصب رازریق اخیر شہنشاہ اسپین کو اپنے اقبال کے زمانے میں شوق ہوا کہ وہ اس راز سربستہ کی حقیقت دریافت کرے جو شاہ ہرقلس نے بقائے سلطنت کے لیے ایک برج

بند مقفل رکھا تھا۔ اس برج کے کھولنے کی ہر شخص کو ممانعت تھی۔ وہ برج نہایت مضبوط اور مدور بنا ہوا تھا۔ اور اس کی دیواریں کسی ایسے مصالحہ سے بنائی گئی تھیں جو بالکل آہنی معلوم ہوتی تھیں۔ وہ سالہا سال سے اسی طرح بند چلا آتا تھا اور یہیں کوئی ایسا زبردست طلسمی کارخانہ تھا جس کے دیکھنے سے ہر شخص خائف تھا۔

اس کے متعلق ایک وصیت تھی وہ یہ کہ ہر بادشاہ ایک قفل اسکے مضبوط اور آہنی دروازہ میں ڈالتا جائے۔ چنانچہ یہی درخواست شاہ راذریق سے کی گئی جس کی تعمیل کرنیکے بجائے اس نے اس قدیم وصیت کے توڑنے کا ارادہ کیا۔ یعنی اُس نے چاہا کہ وہ اس برج کو کھول کر اس کے عجائبات مشاہدہ کرے۔ اس کے اس خوفناک ارادہ کو سُن کر اس کے تمام خیرخواہوں اور بڑے بڑے عالموں نے نہایت سختی سے اُسکو روکا مگر وہ ظالم اور ضدی بادشاہ کس کی سنتا تھا۔ ناچار سب کو خاموش ہونا پڑا اور اس نے اس عجیب برج کے لاتعداد فولادی قفل کھولنے کا حکم دیا۔ سارا دن اس کے قفل کھولنے پر صرف ہوگیا قریب شام کے وہ دروازہ کھولا گیا۔ مگر کسی کے ہاتھ سے وہ نہیں کھلتا تھا۔ چنانچہ شہنشاہ راذریق نے خود اسکو کھولا۔ جس وقت دروازہ کھولا گیا ہے تو اُس میں سے ایک آواز آہ کی سنائی دی۔ اس وقت سب کے دل دھڑکنے لگے۔

دروازہ کھلتے ہی ایک جانفزا دالان دکھلائی دیا جس کے بیچ میں ایک ہیبت ناک شکل نظر آئی۔ اس شکل کے ہاتھ میں ایک چوب تھی جو بے تحاشہ دالان کی سنگین زمین پر پڑ رہی تھی۔ اُس کے سینہ پر بحروف جلی کندہ تھا "میں اپنا فرض ادا کر رہی ہوں"۔ یہ ماجرا دیکھ کر کسی کو آگے بڑھنے کی جرأت نہوتی تھی۔ مگر کم بخت راذریق نے جسکو اس کے دیکھنے کی دُھن لگی ہوئی تھی آگے بڑھ کر کہا "مجکو نکل جانے دے"۔ یہ سُن کر وہ ٹھہر گئی۔ بادشاہ اور اُس کے ہمراہیوں کو رستہ دیدیا۔

آگے بڑھ کر اس نے اس مکان میں عجیب عجیب اور مشاہدے کیے۔ یہاں سے

آگے جاکر ایک اور مکان دیکھا جو سب سے زیادہ دلچسپ تھا۔ اس مکان میں کوئی رستہ روشنی کے آنے کا مطلق نہیں تھا۔ مگر اس مکان کی ہر شے بیش بہا جواہرات کی تھی جس سے یہ تمام مکان جگمگا رہا تھا۔

اس میں ایک خوبصورت کمرہ کے وسط میں ایک عجیب الصنعت میز دیکھی جس پر کندہ تھا کہ یہ برج پیدائش آدم کے حساب سے ۲۰۰۰ء میں بنایا گیا ہے۔ وسط میز پر ایک طلائی مرصع صندوقچی تھی۔ جس پر لکھا تھا اس میں وہ راز ہے جسکو سوائے بادشاہ کے اور کوئی نہیں کھول سکتا اس کے کھولنے پر اسکو ان عجیب غریب باتوں کا انکشاف ہوگا جو اسکو اس کی زندگی میں پیش آئیں گی۔

یہ دیکھ کر شاہ راذریق نے نہایت اشتیاق اور بے صبری کے ساتھ اس خوفناک صندوقچی کو کھولا جو اسکو اس کی قسمت کا فیصلہ سُنانے والی تھی۔ صندوقچی کھولنے پر اسکو تانبے کی تختیوں پر ایک باریک کاغذ لپٹا ہوا نظر آیا۔ کاغذ کھولنے پر اسکو مسلح عربوں کی تصویریں نظر پڑیں جو سنہ نئے نشان لیے گھوڑے دوڑاتے ہوئے چلے آتے تھے۔ ان تصویروں پر تحریر تھا "اے بدبخت بادشاہ یہ وہ لوگ ہیں جو تیرا ملک اور تخت و تاج چھین لیں گے اور جبکہ تو خواب غفلت میں ہوگا یہ تیری سلطنت پارہ پارہ کر دینگے"

یہ دیکھکر راذریق سراسیمہ ہوگیا اور ساتھی بھی چلا اُٹھے۔ وہ کپڑا اُبرا ہونا شروع ہوا اور اس قدر تنا کہ ابر کی مانند تمام برج پر محیط ہوگیا۔ دفعتاً تصویروں کو حرکت ہوئی اور تمام آوازیں لڑائی کی آنی شروع ہوگئیں۔ ایک طرف گاتھک علم لہرانے لگا۔ دوسری طرف عربی جھنڈا۔ اور وہ مسلح عرب سیلاب کی طرح بڑھنے شروع ہو جنہوں نے سرزمین ہسپانیہ کو ہلا ڈالا۔ اس نے دیکھا کہ بالکل اسی کی شکل کا ایک سوار گھوڑے سے اُتار گیا اور اسپین کا نشان سرنگوں کر دیا گیا۔

یہ دیکھ کر فوراً اسکے سامنے اپنی تباہی اور خوفناک جنگ کا نقشہ پھر گیا۔ اس خوفناک

منظر کو دیکھ کر ظالم بادشاہ تھرّا گیا اور اس کے ساتھیوں کے ہوش اُڑ گئے۔ اُسنے جلدی جلدی اس صندوقچی کو بند کرنا شروع کیا۔ اور چاہا کہ اس طلسمی برج کو بند کر دیا جائے ناگاہ ایسا سخت طوفان آیا جس سے زمانہ ہل گیا اور تمام باشندگان اسپین میں کھلبلی مچ گئی مصیبت زدہ راذریق اور اُس کے ساتھی بمشکل گھر تک پہونچے۔

دوسرے دن اس نے یہی ارادہ کیا کہ وہ اس خوفناک برج کو بند کر دے۔ مگر دیکھتا کیا ہے کہ ایک عقاب آسمان سے اُتر کر اس برج پر بیٹھا۔ اس کے مونہ میں ایک دہکتا ہوا انگارہ تھا جسکو اُس نے اپنے پروں سے خوب دہکایا۔ تھوڑی دیر میں اس خوفناک عجیب غریب برج کی مضبوط عمارت جل کر خاکستر ہو گئی۔

تھوڑی دیر میں ایک جھنڈ ابابیلوں کا نہایت شور سے اُڑتا ہوا آیا جسکے پروں کی ہوا سے خاکی اسپین اُڑ کر آسمان کو جا لگی۔ پھر وہ خاک خون کی شکل میں منتقل ہو کر پھیل گئی کہتے ہیں کہ وہ خون جس پر گرا وہ تیغ عرب سے نہ بچا۔

اسکے بعد جو کچھ تباہی شاہ راذریق پر آئی وہ اظہر من الشمس ہے۔ صرف اتنا کہدینا کافی ہوگا کہ چند روز کے بعد جبکہ غافل اذریق نے اپنے مظالم سے ہسپانیہ میں اندھیر مچا رکھا تھا تو خدائے واحد کے سچے پرستش کرنے والے عربوں نے اسپین کو فتح کر لیا اور اس خوفناک پیشین گوئی کے بالکل مطابق ہو گیا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

خاکسار

بنت اشفاق حسین وکیل۔ از سنبھل

بقیہ شاہ لیر

ایکٹ ۳ سین ۱ ایک جنگل کا مقام

(ایک زور کی آندھی چل رہی ہے۔ قیامت کا طوفان برپا ہے۔ بجلی چمک رہی ہے۔

بادل گرج رہے ہیں۔ سرد رات کی تاریکی اور موسم کی سختی نہایت خطرناک صورت میں ظاہر ہوتی ہیں۔
کینٹ معہ ایک افسر کے اسٹیج پر آتے ہیں۔

کینٹ یہ کون ہے۔ کیا اس وقت طوفان کے علاوہ اور بھی کوئی باہر پھر رہا ہے؟

افسر ہاں اس وقت وہ لوگ بھی باہر پھر رہے ہیں جنکے دلوں میں رنج اور افسوس کا طوفان برپا ہے۔ اور جو بدقسمتی سے نہایت بے چینی کی حالت میں ہیں

کینٹ۔ میں نے آپ کو پہچان لیا۔ بتائیے بادشاہ کہاں ہیں۔

افسر۔ بادشاہ ہوا اور طوفان سے مقابلہ کر رہے ہیں اور آندھی سے التجا کر رہے ہیں کہ کل زمین کو اٹھا کر سمندر کے اندر غرق کر دے یا سمندر کی موجوں کو زمین پر لے آئے تاکہ تمام روئے عالم کی حالت بالکل بدل جائے یا سب موجودات بالکل نیست و نابود ہو جائے۔ وہ اپنی سفید لمبی ڈاڑھی نوچ نوچ کر آندھی اور جھکڑ کی نظر کر رہے ہیں اور ہوا کے سخت جھونکے اسکا ایک ایک بال بکھیر کر کہیں نہ کہیں اڑائے لیے جا رہے ہیں۔ اپنے کمزور جسم سے وہ سخت طوفان اور مینھ کا مقابلہ کر کے ان کی تحقیر کرنا چاہتے ہیں۔ آج کی وہ رات ہے کہ جس میں بچوں والی ریچھنی اپنے بھٹ میں جا کر گھس کر بیٹھے گی۔ اور شیر اور بھوک سے نڈھال بھیڑیا بھی کسی مقام پر چھپ کر بیٹھیں گی۔ کہ اپنا جسم خشک اور گرم رکھ سکیں۔ ایسی رات میں بادشاہ سلامت ننگے سر ادہر اُدہر بھاگ رہے ہیں اور اس چیز کا مقابلہ کر رہے ہیں جو کہ سب کو خاک میں ملا سکتی ہے۔

کینٹ۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ اُن کے ساتھ کون ہے؟

افسر۔ سوائے دیوانہ کے اور اُن کے ساتھ اس وقت کوئی نہیں ہے۔ غریب دیوانہ بہت کوشش کر رہا ہے کہ ہنسی مذاق سے بادشاہ سلامت کے زخم دل پر کچھ مرہم پٹی کرے۔

کینٹ ۔ صاحب میں تو آپ کو اچھی طرح سے جانتا ہوں اور اپنی گزشتہ واقفیت کے لحاظ سے میں ایک نہایت ہی ضروری راز تم پر ظاہر کرنے کی جرأت کرتا ہوں ۔ یہ مجکو معلوم ہوا ہے کہ شاہزادہ البینی اور کارنوال کے درمیان دلوں ہی دلوں میں رنج پیدا ہو گیا ہے گو دونوں اپنی ہوشیاری اور ظاہر داری سے اس معاملہ کو ظاہر نہیں ہونے دیتے لیکن ان دونوں کے بعض بعض ملازم ایسے ہیں اور یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ کونسا بڑا آدمی یا بادشاہ ہے جس کے پاس ایسے ملازم نہیں ہیں جو جاسوسی کا کام کر رہے ہیں اور یہاں کی تمام خبریں فرانس میں پہنچاتے ہیں ۔ اب یہ معلوم نہیں کہ آیا ان دونوں شاہزادوں کے ظاہری طرز عمل سے یا اُس سختی اور نہایت سخت بدسلوکی سے جو انہوں نے مہربان بڈھے بادشاہ سے کی یا اس سے بھی کوئی گہری بات ہے اور یہ وجوہات محض ایک حیلہ قرار دیے گئے ہیں ۔ بہرحال کوئی وجہ ہو لیکن یقینی امر ہے کہ فرانس سے ایک فوج اس پریشان اور خستہ حال ملک پر چڑھائی کرنے کی غرض سے آ رہی ہے جو ہماری غفلت سے فائدہ اُٹھا کر پہلے ہی بعض بعض بڑی ضروری بندرگاہوں پر پورے طور پر مسلط ہو گئی ہے ۔ اور اب ظاہرا طور پر اپنا جھنڈا کھڑا کرنے کے لیے بالکل آمادہ ہے ۔ اب اگر تم میرے اعتبار پر اتنا بھروسہ کر سکو تو تم ڈاور کی بندرگاہ پر نہایت عجلت کے ساتھ پہونچ جاؤ وہاں پر تم کو کوئی ایسا شخص ملیگا جو تمہاری اس محنت کے لیے عملی طور پر شکرگزاری کریگا ۔ وہاں جا کر تم کل حالات کہہ سناؤ اور بادشاہ سلامت کے اوپر جو سختیاں ہوئی ہیں اور جو جو مصیبتیں اُن کو برداشت کرنی پڑی ہیں اور کر رہے ہیں اور جو جو رنج اُن کو پہنچائے گئے ہیں ۔ اُن سب کا حال مفصل بیان کر دو ۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں ایک باوقعت خاندانی آدمی ہوں اور جو بات میں تم سے کہتا ہوں یہ کسی بڑے اعتبار اور بھروسہ پر کہتا ہوں اور تمہارے سپرد یہ ایلچی کا عہدہ کسی معتبر وجہ سے

کرتا ہوں۔

افسر۔ لیکن مجھے آپ کے بارے میں کچھ اس سے زیادہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے

کینٹ۔ نہیں تم کو کچھ ضرورت نہیں ہے۔ تم کو یقین دلانے کے لیے تو میں اس سے بہت زیادہ عزت اور عمدہ رکھتا ہوں جو تم میرے ظاہری لباس سے سمجھتے ہو۔ میں یہ اشرفیوں کی تھیلی تمہارے سامنے رکھتا ہوں۔ تم سب اشرفیاں اس میں سے نکال لو۔ وہاں پر مجھے یقین ہے کہ تمہیں شاہزادی کارڈیلیا ملے گی ان کو یہ انگوٹھی دکھا دینا وہ تمہیں بتا دینگی کہ میں کون ہوں۔ اُف اُف کس درجہ سختی کے ساتھ آندھی چل رہی ہے اور مینھ برس رہا ہے۔ اب میں جاتا ہوں تاکہ بادشاہ کو دیکھوں کہ وہ کہاں ہیں۔

افسر خدا حافظ۔ کیا آپ کو اور کچھ نہیں کہنا ہے ؟

کینٹ۔ اب صرف اتنا کام کرتے جاؤ کہ تم ادھر سے جاؤ اور میں ادھر سے جاتا ہوں جس شخص کو بادشاہ سب سے پہلے ملیں وہ دوسرے کو پکارے۔

دوسرا سین جنگل کا دوسرا مقام

ابھی تک آندھی اور مینھ اسی سختی سے برپا ہو رہے ہیں لیر اور دیوانہ اسٹیج پر آتے ہیں

لیر۔ اے طوفان اور آندھی تمہیں قسم ہے کہ تم اپنی سختی تمام آج ہی ختم نہ کر دو۔ تم اس قدر جوش میں آؤ اور چلو کہ خود بھی پاش پاش ہو جاؤ۔ اے سمندر کے گرداب اور طوفان اُبل کر زمین پر چلا آ یہاں تک کہ ہمارے بڑے بڑے گرجاؤں اور میناروں کی چوٹیاں بھی ڈوب جائیں۔ اے شرربار بجلی جو اپنے گولوں سے شاہ بلوط کے زبردست درختوں کے ٹکڑے کر دیتی ہے میرے سفید سر کو

عکس کرخاک سیاہ کر دے۔ اے تختۂ دنیا کے رزلانے والی گرج اس گول زمین کے اوپر اس طور پر آکر گر اور اسکو ایسا صدمہ پہنچا کہ وہ بالکل چپٹی ہو جائے تاکہ وہ قدرتی سانچے یعنی ماں کے رحم پھٹ جائیں اور ایکبار گی تمام حمل گر جائیں تاکہ ناشکرے انسان کا بالکل ہی خاتمہ ہو جائے۔

دیوانہ۔ جناب چچا صاحب کسی خوش گھر میں بیٹھ کر مرنا بہتر ہے۔ بنسبت اسکے کہ اس ٹھنڈی ہوا اور مینہ میں کوئی جینے کی خواہش کرے۔ آپ گھر میں تشریف لے چلیے اور اپنی بیٹیوں کے سامنے اپنا سر جھکائیے۔ دیکھیے یہ آج کی کیسی رات ہے کہ نہ عقلمند پر رحم کرتی ہے نہ دیوانہ پر۔

(باقی آیندہ)

اڈیٹوریل

وفات حضور ملک معظم ایڈورڈ ہفتم

نہایت رنج و قلق کے ساتھ آج ہم ایسی خبر لکھتے ہیں جس کے تصور تک سے کلیجہ مونھ کو آتا اور دل خون کے آٹھ آٹھ آنسو روتا ہے۔ افسوس ۶ اور ۷ مئی کی درمیانی شب کے پونے بارہ بجے کی گھڑی ہندوستان بلکہ کل جہان کے لیے کیسی منحوس تھی جس میں اجل نے ہمارے رحم دل نیکی مجسم شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم جنت آرام گاہ کو ان کی وفادار رعایا سے یکایک جدا کر لیا۔

اس سخت اندوہناک وقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ حضور ممدوح اپنی عزیز رعایا کی فلاح کی فکر میں ہمہ تن و ہمہ وقت مستغرق رہنے کی وجہ سے اکثر نادرست مزاج رہتے تھے

چنانچہ ان دنوں بھی بغرض حصول صحت بیارٹز (فرانس) گئے ہوئے تھے۔ اور حال ہی میں انگلستان تشریف لائے تھے۔ ۵ مئی کا تار تھا کہ "ملک معظم پر خناق کا سخت حملہ ہوا ہے اور حضور کمرہ سے برآمد نہیں ہوتے، حالت اضطراب انگیز ہے۔ بیارٹز میں حضور کو جو زکام ہوا تھا اس کا پورے طور پر ازالہ نہیں ہوا" ساتھ ہی یہ بھی خبر تھی کہ حضور نے ملاقاتیں موقوف نہیں کیں اور بدستور مصروف کار ہیں" ۶ تاریخ کا یہ تار تھا کہ "سانس کی نالیوں پر پہلے سے زیادہ زور ہے۔ حالت نازک ہے۔ اضطراب پھیلا ہوا ہے۔ پرنس آف ویلز کو بلیٹن (پرچہ خبر علالت) کا سخت انتظار ہے۔ تمام ارکان خاندان شاہی حضور کے بستر کے قریب طلب کیے گئے ہیں۔ یہ یقین بڑھتا جاتا ہے کہ ہز مجسٹی کی حالت بالکل مایوسانہ ہے"

(بعد کی خبر) ملک معظم کی شب خیریت سے گزری اور اب وہ کسی قدر اچھے ہیں ہز مجسٹی نے ایک دوست سے بیان کیا کہ مجھے زکام تھیٹر میں ہوا تھا۔ قصر بکنگھم میں مزاج پرسی اور ہمدردی کے تاروں کی بارش ہو رہی ہے"

تار مورخہ ۷ مئی "ہز مجسٹی شاہ ایڈورڈ رات کے پونے بارہ بجے ملکہ معظمہ پرنس و پرنس آف ویلز، پرنسس رائل، ڈیوک آف فائف۔ پرنسس وکٹوریہ اور پرنسس لوئی کے سامنے بہ آرام تمام جاں بحق ہو گئے"

بعد کی خبر" دم واپسیں ملک معظم کے تمام بچے سوائے ملکہ ناروے کے (جو یکشنبہ کو پہنچنے والی تھیں) موجود تھے۔ ڈیوک و ڈچس آف کناٹ نہر سوئیز سے آرہے ہیں۔ ۹۔ اور ۱۰ بجے کے درمیان افاقہ ہو گیا تھا۔ مگر اس کے بعد غافل ہو گئے۔ قصر بکنگھم کے باہر لوگوں کا ایک جم غفیر و انبوہ کثیر باوجود بارش کے خیر نیک کی امید میں ہمہ تن گوش وچشم کھڑا ہوا تھا۔ سوا بارہ بجے حضور پرنس و پرنسس آف ویلز کی مالبرا ہاؤس کو روانگی انجام کی پہلی خبر تھی۔

لارڈ میئر لنڈن کے نام حضور پرنس آف ویلز کے تار کا مضمون یہ تھا" میں نہایت رنج کے ساتھ آپ کو اطلاع دیتا ہوں کہ میرے پیارے والد پونے بارہ بجے بہ آرام گزر گئے" لارڈ میئر نے منجانب باشندگان لندن ہمدردی اور تعزیت کی اور کہا کہ "خدا اپنے فضل سے آپ کو اور شہزادی صاحبہ کو صبر دے۔ قوم کی دعا آپ کے ساتھ ہے۔ قوم دل سے آپ کے غم میں شریک ہے" لارڈ میئر نے اسی مضمون کا تار ملکہ الگزنڈر ا کو بھی بھیجا ہے۔

اس خبر وحشت اثر کا اعلان ہندوستان میں سرکاری طور پر اُن الفاظ میں ہوا ہے۔ گورنر جنرل بہادر با اجلاس کونسل گہرے رنج کے ساتھ ایڈورڈ ہفتم شاہ سلطنت متحدہ برطانیہ عظمیٰ و آئرلینڈ و برٹش مقبوضات ماوراے بحر دقیصر ہند کی وفات کا اعلان کرتے ہیں۔ تا صدور حکم ثانی تمام سول و فوجی افسر ماتم میں رہیں گے۔ قلعہ ولیم اور تمام دوسرے قلعوں کے جھنڈے نصف بلندی پر رہیں گے اور تمام گیریزنون اور اسٹیشنوں میں ۶۸ توپیں سر کی جائیں گی،" (شملہ مورخہ ۹ مئی) ہز مجسٹی شاہ جارج پنجم (بادشاہ بخیر) کی تخت نشینی کا اعلان ہوگیا۔ ۱۰۱ توپوں کی سلامی سر ہوئی اور جھنڈے صرف شام تک کے لیے پوری بلندی پر پہنچائے گئے۔ اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنے ناظرین کو اپنے سابق شہنشاہ کی بیش قیمت زندگی کے حالات سے بھی مطلع کریں۔

ہز مجسٹی کی ولادت ۹ نومبر ۱۸۴۱ء کو ہوئی تھی۔ آپ انیسویں صدی کے بہترین والدین پرنس البرٹ اور ملکہ وکٹوریہ کے دوسرے فرزند تھے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم بہ مادر مشفقہ ملکہ وکٹوریہ کی نگرانی میں ہوئی تھی۔ اور بعد ازاں علی الترتیب ایڈنبرگ۔ آکسفورڈ اور کیمبرج کی یونیورسٹیوں میں۔ ۱۸۵۹ء میں اٹلی اور اسپین کا اور ۱۸۶۰ء میں کینیڈا کا سفر کیا۔ ۱۸۶۱ء میں تکمیل تعلیم کی۔ ۱۸۶۲ء میں اپنے والد ماجد مرحوم کی خواہش کی ایفا کی غرض سے ارض مقدس کا دورہ کیا۔

سنہ ۱۸۶۳ء میں پریوی کونسل کے ممبر ہوئے اور ہاؤس آف لارڈز میں بحیثیت ڈیوک آف کارنوال کے نشست کی۔ اسی سال ڈنمارک کی شہزادی الگزنڈرا سے شادی ہوئی۔ سنہ ۱۸۷۱ء میں آپ پر موتی جھرے کا ایسا سخت حملہ ہوا کہ زیست سے مایوسی ہوگئی۔ سنہ ۱۸۷۵ء میں آپ نے ہندوستان کو اپنے قدوم فرخی لزوم سے افتخار بخشا اور ۱۷ ہفتے یہاں قیام فرمایا۔ ۱۴۔ جنوری سنہ ۱۸۹۲ء کو آپ کے فرزند اکبر پرنس البرٹ وکٹر نے صرف پانچ روز علیل رہ کر انتقال کیا۔ دسمبر سنہ ۱۸۹۹ء میں سینٹ پیٹرسبرگ جاتے ہوئے بمقام برسلز آپ پر ایک دیوانہ نوجوان انارکسٹ نے گولی فیر کی۔ ۲۲۔ جنوری سنہ ۱۹۰۱ء کو آپ اپنی مادر مہربان ملکہ وکٹوریہ مرحومہ کے تخت پر متمکن ہوئے۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں آپ نے آسٹریلیا کو آزادی کا پروانہ عطا کیا۔ آپ ہی کے عہد میں جنوبی افریقہ کو پارلیمنٹ عطا ہوئی۔ جون سنہ ۱۹۰۲ء میں جب کہ ولایت میں آپ کا دربار تاج پوشی ہونے کو تھا آپ کو ایک نہایت شدید مرض لاحق ہوا۔ اس وقت بھی آپ کی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ آخر ولایت میں ۹ اگست سنہ ۱۹۰۲ء کو اور ہندوستان میں یکم جنوری سنہ ۱۹۰۳ء کو دربار تاج پوشی ہوا۔ سنہ ۱۹۰۵ء میں آپ نے اپنے فرزند ارجمند حضور پرنس آف ویلز کو معہ پرنسس آف ویلز ہندوستان کی سیاحت کے لیے بھیجا۔ یکم نومبر سنہ ۱۹۰۸ء کو ملکہ وکٹوریہ مرحومہ کے مشہور اعلان شاہی کی پچاسویں برسی کے موقع پر آپ نے بھی اپنی ہندوستانی رعایا کو ایک پیغام شاہی سے معزز و ممتاز فرمایا۔ نومبر سنہ ۱۹۰۹ء میں آپ کی ہندوستانی رعایا کو قانون توسیع کونسل کے ذریعہ سے حکومت میں حصہ ملنے کی نعمت حاصل ہوئی۔

آپ طبعاً نہایت امن پسند اور صلح جو واقع ہوئے تھے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دنیا نے آپ کو "صلح جو" کا خطاب دیا۔ فرانس اور انگلستان کی صدیوں اور نسلوں کی دشمنی دلوں سے محو ہو کر دونوں قوموں کے مابین رابطۂ اتحاد قائم ہوا۔ بحیثیت شہنشاہ کے آپ کو جو سطوت و جبروت حاصل تھا وہ تو ظاہر ہے۔ لیکن یہ بتانا بھی ہمارا فرض ہے کہ آپ

بحیثیت انسان نہایت شریف النفس اور وسیع الاخلاق تھے ۔ روس کے اخبار نوووریما میں آپ کے حال کے قیام بیارٹز کی جو کیفیت شائع ہوئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں محض ایک معمولی امیر کی سی زندگی بسر کرتے تھے اور بازاروں میں نہایت بے تکلفی کے ساتھ چلتے پھرتے تھے جس سے آپ وہاں کے باشندوں میں بہت ہر دل عزیز ہوگئے تھے ۔ آپ کے ناگہانی اس دنیاے فانی سے رخصت ہوکر عالم جاودانی کی کو سدھار جانے سے ایک عالم وقف ماتم ہو رہا ہے ۔ جگہ جگہ جلسے ہو رہے ہیں اور اظہار غم کے لیے تار دوڑ رہے ہیں ۔

چنانچہ ۹ مئی ۱۹۱۰ء کو صبح کے آٹھ بجے ایک ماتمی جلسہ علی گڑھ کالج میں اس کے اسٹریچی ہال کے اندر بصدارت مسٹر جے ایچ ٹول پرنسپل منعقد ہوا جس میں ٹرسٹیان ممبران یورپین وانڈین اسٹاف ۔ طلباے سابق وحال ، دیگر بہی خواہان کالج ۔ اور اسٹیشن کے یورپین وہندوستانی حکام شریک تھے ۔ مسٹر ٹول نے جلسہ کی غرض بیان کی ۔ بہ تحریک نواب وقار الملک بہادر وبتائید راجہ نوشاد علی خاں صاحب بہ اتفاق رائے حاضرین ذیل کا رزولیوشن پاس ہوا ۔

"یہ کہ یہ جلسہ چاہتا ہے کہ اپنا گہرا اور دلی رنج اس نقصان کی نسبت ظاہر کرے جو سلطنت کو اس کے نامور شہنشاہ حضور ملک معظم ایڈورڈ ہفتم کی ناگہانی وفات سے پہنچا ہے نیز یہ کہ خاندان شاہی کی خدمت میں اپنی نہایت مودبانہ ہمدردی پیش کرے ۔ مزید براں یہ جلسہ ہز مجسٹی ملک معظم کی ذات شاہانہ کی نسبت اپنی ناقابل تغیر وفاداری کا نہایت سچے یقین کا عاجزی کے ساتھ اظہار کرتا ہے ۔"

اس رزولیوشن کو حاضرین نے نہایت احترام کے ساتھ کھڑے ہوکر پاس کیا ۔ قرار پایا کہ یہ تار حضور ملک معظم جارج پنجم کی پیشگاہ کو بتوسط حضور کے وزیر ہند کے روانہ کیا جائے ۔

دوسرا رزولیوشن بہ تحریک آنریبل صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب و بتائید خان بہادر نواب محمد مزمل اللہ خاں صاحب بہ اتفاق رائے حاضرین اس مضمون کا پاس ہوا ٹرسٹیان، اسٹاف. طلبا اور اولڈ بوائز علی گڑھ کالج جو آج اس جلسہ میں شریک ہیں اپنا گہرا اور دلی رنج اس نقصان پر ظاہر کرتے ہیں جو سلطنت کو اسکے نامور شہنشاہ حضور ملک معظم ایڈورڈ ہفتم کی ناگہانی اور نہایت المناک موت سے پہنچا ہے۔ اور اپنی نہایت وفادارانہ اور مؤدبانہ ہمدردی خاندان شاہی کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ مزید براں وہ ہز مجسٹی ملک معظم کی ذات شاہانہ کی نسبت اپنی ناقابل تغیر وفاداری کی نہایت سچے یقین کا عاجزی کے ساتھ اظہار کرتے ہیں" قرار پایا کہ یہ رزولیوشن حضور وایسرائے کشور ہند اور ہز آنر لفٹنٹ گورنر صوبجات متحدہ کی خدمت میں مرسل ہو۔

اس قدر کارروائی کے بعد صاحب صدر نے جلسہ برخاست کیا اور بحیثیت پرنسپل کالج کے ایک روز کے لیے بند رہنے کا اعلان کیا

کالج کی طرف سے غربا و مساکین کو غلہ بھی تقسیم کیا گیا۔

اعلان تخت نشینی

ہز موسٹ گریشس میجسٹی جارج پنجم بفضل خدا شاہ سلطنت متحدہ برطانیہ عظمی و آئرلینڈ و برٹش مقبوضات ماورائے بحر قیصر ہند کی تخت نشینی کا اعلان ۱۲ مئی ۱۹۱۰ء کو کل ہندوستان میں ہوا۔ مختلف صدر مقاموں پر اعلان پڑھا گیا۔ جھنڈے پوری بلندی پر پہنچائے گئے اور ایک سو ایک توپوں کی سلامی سر ہوئی۔ حضور کی تخت نشینی کے موقع پر ہندوستان میں ہر طبقہ رعایا کی جانب سے کثرت سے جلسے ہو رہے ہیں۔ ان سب میں حضور کے تخت کے ساتھ وفاداری کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس موقع پر جناب مولانا محمد عزیز مرزا صاحب بی۔ اے

سکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ نے پرائیویٹ سکرٹری حضور ویسرائے کو حسب ذیل تار ارسال کیا ہے
ہز موسٹ گریشس مجسٹی شاہ جارج پنجم کے قیصر ہند ہونے کے اعلان پر میں مسلمانان ہند کا
دلی اور وفادارانہ خیر مقدم پیش کرتا ہوں۔ یہ کہ حضور ممدوح کا عہد طویل، شاندار اور اپنی وسیع
ہمدردی انصاف اور نفع رسانی کے لیے مشہور ہو ہز مجسٹی کی وفادار مسلمان رعایا کی عاجزانہ
اور مخلصانہ دعا ہے۔"

ہمارے نئے ملک معظم

جب معرکۂ ٹریفلگر میں انگلستان کے امیر البحر نیلسن نے دشمن کی گولی کے صدمہ سے
عین اس وقت جان دی ہے جب کہ غنیم شکست کھا چکا تھا اور نیلسن کی موت اور برٹش بیڑہ کی فتح
کی خبریں ساتھ ساتھ انگلستان پہنچی ہیں تو مورخوں کا بیان ہے کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ نیلسن کے
مرنے کا غم یا برٹش بیڑہ کی فتح ان دونوں میں سے کس کا اثر زیادہ ہے۔ کہنا چاہیے کہ بعینہٖ یہی
حالت اس وقت برٹش سلطنت کی ہے۔ باشندگان سلطنت برطانیہ کو اپنے موجودہ نقصان میں
اگر کچھ تسکین ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ ملک معظم آنجہانی نے ایسا جانشین چھوڑا ہے جو اپنی ذمہ داریوں
کو بخوبی سمجھتا ہے۔ اور سلطنت کے بار عظیم کے اٹھانے کے ہر طرح قابل ہے۔ ہمارے نئے
ملک معظم حضور جارج پنجم نے اپنی ۴۵ سالہ عمر میں دو نہایت کامیاب عہد دیکھے ہیں۔ اور
کئی موقعوں پر انھوں نے ایسے اوصاف کا اظہار کیا ہے جو ایک کامیاب بادشاہ کے لیے
ضروری ہیں۔ وہ اپنی سیر و سیاحت (جس کی وسعت کا سلاطین عالم میں کوئی مقابلہ نہیں
کر سکتا) اس کے ذریعہ سے عظیم الشان برٹش سلطنت کے مختلف حصوں اور ان کے
باشندوں سے براہ راست واقف ہو گئے ہیں۔
۱۹۰۶ء میں ہندوستان سے واپس جا کر بمقام گلڈ ہال (لندن) اور پھر اب
تخت نشینی کے موقع پر آپ نے جو تقریریں کی ہیں وہ آپ کی اعلیٰ تدبیر پر دال ہیں۔

حضور ملک معظم آنجہانی نے اپنی تخت نشینی کے وقت جس طرح اپنی والدہ محترمہ کے نقش قدم پر چلنے کا وعدہ کیا تھا۔ اسی طرح حضور ملک معظم جارج پنجم اپنے پدر بزرگوار کے نقش قدم چلنے کا اپنی رعایا کو اطمینان دلاتے ہیں جو آپ کے عہد ہمایوں کے لیے ایک نہایت مبارک فال ہے۔ ذیل میں ہم حضور کے حالات زندگی لکھتے ہیں۔

جارج اول	۱۷۱۴ — ۱۷۲۷	(۱۳ سال)
جارج دوم	۱۷۲۷ — ۱۷۶۰ کو	(۳۳ سال)
جارج سوم	۱۷۶۰ — ۱۸۲۰	(۶۰ سال)
جارج چہارم	۱۸۲۰ — ۱۸۳۰	(۱۰ سال)
جارج پنجم	۱۹۱۰ — مدعہدہ	

حضور ملک معظم جارج پنجم شاہ ایڈورڈ ہفتم کے دوسرے فرزند ہیں۔ آپ کی پیدائش ۳۔ جون ۱۸۶۵ء کو ہوئی۔ ۷۔ جولائی کو قصر ونڈسر میں نام رکھنے کی رسم ادا ہوئی۔ ۱۲ برس کی عمر تک آپ کو مختلف علوم اور مختلف زبانوں کی تعلیم دیجاتی رہی۔ ۵ جون ۱۸۷۷ء کو آپ بحری تعلیم کے لیے جہاز برطانیہ پر بھیجے گئے۔ اس شاہی طالب علم اور دوسرے طالب علموں کے مابین سوائے اس کے اور کوئی امتیاز نہ تھا کہ آپ کے کمرہ میں کسی دور کو شریک نہیں کیا گیا تھا۔

۱۸۷۹ء سے ۱۸۹۲ء تک آپ دنیا کے گرد سفر کرتے رہے اور سفر سے واپس ہو کر اپنے برادر پرنس وکٹر البرٹ ڈیوک آف کلیرنس کے انتقال پر ملازمت سے سبکدوش ہو کر وارث تاج و تخت انگلستان کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے لگے۔ مئی ۱۸۹۳ء میں آپ کی شادی پرنسس وکٹوریا آف ٹک سے ہوئی۔ جن کی نسبت ابتدا میں ڈیوک آف کلیرنس آنجہانی سے ہوئی تھی۔ ۱۹۰۱ء میں آپ ملکہ وکٹوریہ کے انتقال پر پرنس آف ویلز ہوئے۔

۱۹۰۱ء ہی میں آپ برٹش بیڑہ کے امیر البحر بنائے گئے۔ ۱۹۰۶ء میں آپ نے ہندوستان کی سیاحت فرمائی۔ آپ بچپن ہی سے خوش مزاج فیاض اور ذہین ہیں۔ ۱۸۹۷ء کے قحط ہند کے موقع پر آپ نے قحط فنڈ میں رقم کثیر عطا فرمائی تھی۔ آپ کے ذرائع تفریح میں کتب بینی، سیر و شکار اور بائیسکل رانی شامل ہے۔ زمانہ شہزادگی میں آپ کو پرانے ٹکٹ اور عجیب و غریب کھلونے جمع کرنے کی بھی عادت تھی۔

حضور ملک معظم کے شہزادوں اور شہزادیوں کے نام یہ ہیں (۱) ایڈورڈ البرٹ کرسچین جارج اینڈرو پیٹرک ڈیوڈ (پیدایش ۲۳ جنوری ۱۸۹۴ء) جو اب ولی عہد سلطنت ہیں (۲) شہزادہ البرٹ (پیدایش ۱۸۹۵ء)۔ (۳) شہزادی میری (پیدایش ۱۸۹۷ء) (۴) شہزادی ہنری (پیدایش ۱۹۰۰ء) (۵) شہزادہ جارج (پیدایش ۱۹۰۲ء) (۶) شہزادہ جان (پیدایش ۱۹۰۵ء)

۷۔ مئی ۱۹۱۰ء کو آپ برٹش سلطنت کے تخت پر متمکن ہوئے۔ یہ یقین رکھنے کی ہر ایک وجہ ہے کہ ہمارے نئے ملک معظم جارج پنجم داد دادگستری دینے میں نہ صرف اپنے اسلاف کرام کی شہرت اور آزادی انگلستان کی روایات کو قائم رکھیں گے بلکہ اس میں معتدبہ اضافہ فرمائیں گے۔ خدا ہمارے قیصر کو تا دیر گاہ سلامت رکھے۔"

عورتوں کی تعلیم اور آزادی

ہم دیکھتے ہیں کہ مذہب اسلام نے مسلمان عورت پر علم لازم کر دیا ہے۔ یعنی عورت پر بھی طلب و تحصیل علم فرض ہے۔ دوسری طرف ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بخلاف بعض دیگر ادیان کے اسلام نے عورت کو حق ملکیت بھی عطا کیا ہے۔ یعنی جن چیزوں کی عورت مالک ہے۔ ان کی بیع ہبہ۔ وقف غرض ہر قسم کے تصرف میں بالکل آزاد ہے اور اس بارہ میں اس کے شوہر یا باپ یا کسی اور رشتہ دار کو روک ٹوک کرنے کا مطلق

حق نہیں ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ شرع اسلام کا یہ حکم ہے۔

کون مسلمان ہے جو عورت کے مکلف بالعلم ہونے میں شک کریگا؟ کون مسلمان اس کے حق تملک میں شک کریگا؟ اور کون انسان اس میں شک کریگا کہ عورت بطن مادر سے آزاد پیدا ہوئی ہے؟ لیکن اس زمانہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ مردوں نے عورتوں کے یہ دونوں حقوق غصب کرلیے ہیں وہ نہ ان کو تعلیم دیتے ہیں نہ ان کی املاک میں انہیں تصرف کا پورا حق دیتے ہیں۔

آج کل کی مسلمان عورت کی یہ حالت ہے کہ ہم اس کو اپنی آنکھ سے جاہل دیکھتے ہیں اور اسکو اس قدر مجبور پاتے ہیں کہ اُسے اپنی مملوکہ اشیا سے آزادی کے ساتھ فائدہ اٹھانے کا کوئی حق ہی نہیں ہے۔ وہ اپنی ذرا ذراسی ضروریات کے لیے اپنے اقارب کی دست نگر رہتی ہیں۔ اگر ضرورت ہوتی ہے تو مرد عورت کو اس کی آزادی تصرف سے محروم کرنے کے لیے اس کے ساتھ دہوکہ کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔

اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ آج کل کی مسلمان عورت جاہل ہے۔ اُسے اپنے اور دوسروں کے حقوق کا مطلق علم نہیں ہے۔ افسوس ہے کہ لوگوں نے اصول اسلام کو فراموش کر دیا اور اس کے اجتماعی قواعد کو پس پشت ڈال دیا ہے۔

جب حالت یہ ہے تو پھر کیسے ممکن ہے کہ وہ ترقی کریں؟ محال ہے کہ کوئی قوم ترقی کرے بحالیکہ اُس کی عورتوں کی یہ حالت ہو کہ وہ جاہل اور حق تصرف سے محروم ہوں ممکن نہیں کہ مسلمان مجرد اس دعوے کی بنا پر عروج حاصل کرسکیں کہ اسلام نے عورت کو مکلف بالعلم اور آزاد کیا ہے۔

ہماری دلی آرزو ہے کہ مسلمان عورت قوم کا ایک کارآمد عضو ہو۔ اور اس درجے پر پہنچے جو اسلام نے اسکو عطا کیا ہے۔ اپنے جائز حقوق سے متمتع ہو۔ اپنی اولاد کی تربیت کرے۔ اپنے گھربار کی نگرانی کرے۔ اور زندگی کی کشمکش میں اپنے شوہر کی مدد کرے

کیونکہ ان دونوں کی زندگی ایک ہی۔ جس طرح اسلام عورت سے یہ چاہتا ہی کہ وہ ذی عفت و عصمت ہو اسی طرح وہ اس سے یہ بھی خواہش کرتا ہی کہ وہ علم اور آزادی سے متمتع ہو۔

اسلام عورتوں کے لیے ایسی تربیت چاہتا ہی کہ وہ قوم کے لیے شریف اور آزاد بچے پیدا کریں۔ پس اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی اولاد شریف اور آزاد ہو تو آپ اپنی عورتوں کو تعلیم اور آزادی دیں۔ اور اگر آپ نے اپنی عورتوں کو جاہل اور غیر آزاد رکھا تو وہ آپکے لیے اولاد بھی ایسی پیدا کریں گی جو کمزور ناعاقل اور بزدل ہوگی۔ کاش ہمارے برادران اسلام غور کریں کہ ان کو کیسی اولاد کی ضرورت ہی اور جیسی اولاد چاہتے ہیں ان کو کس طرح حاصل ہو سکتی ہی؟ (مصر کے ایک عربی اخبار سے)

ندوۃ العلما اور ایک قابل تقلید مثال

جناب حافظ حکیم عبد الولی صاحب نے جو لکھنؤ کے مشہور خاندان طبابت کے نامور ممبر ہیں اپنی ایک عزیزہ کی وفات کے موقع پر ایک ایسے امر کی بنیاد ڈالی ہی جسکا اتباع نہ صرف اسراف اور ایک مختلف فیہ مسئلہ کے ارتکاب سے بچائیگا بلکہ جس سے کار خیر کا ایک حقیقی مصرف ظاہر ہوگا۔ جناب حکیم صاحب نے اس موقع پر اپنے خاندان کے ممبروں کو جمع کیا اور اس طریقہ کو ناکافی بتاکر یہ قرار دیا ہی کہ اس مصرف میں جو صرف ہوتا ہی اس کو ایسے نیک کام میں صرف کیا جائے جس سے مرحومہ کو ثواب پہنچے اور مسلمانوں کی قومی اور مذہبی ضرورت اس سے پوری ہو۔ اس بنا پر جناب ممدوح نے دار العلوم ندوۃ العلما کے بورڈنگ ہوس میں ایک کمرہ کی تعمیر کے لیے سات سو روپیہ علیحدہ کر دیے ہیں۔ یہ ایک ایسی مثال ہی جس کی عام مسلمانوں کو تقلید کرنی چاہیے۔

نمایش الہ آباد

سکرٹری صاحب نمایش صوبجات متحدہ نے ہم سے حسب ذیل اعلان کے شائع کرنیکی درخواست کی ہی

نمایش ممالک متحدہ کے متعلق مختلف پیشوں کے جدید آلات کو کام کرتے ہوئے دکھانے کے مقابلہ کی بابت قواعد بن رہے ہیں اور جلد شائع کیے جائینگے۔ مختلف وقتوں میں بہت قسم کے فلائی شٹل کرگے کم و بیش کامیابی کے ساتھ فروخت کے لیے بازار میں آئے۔ ہوشیار جولاہوں میں نمایش کے موقع پر مقابلہ ان لوگوں کے لیے جنکو ہندوستان کے ہاتھ کے کرگے کی آیندہ ترقی میں دلچسپی ہی بہت مفید ثابت ہوگا۔ جبکہ کمیٹی انتظامیہ بہت سے قیمتی تمغے اور انعام نہ صرف ان مقابلوں کے لیے بلکہ ہر طبقہ کے کامیاب نمایش کرنے والے کے لیے بھی دینے کا اعلان کرتی ہی۔ ہم کو یہ بات سن کر خوشی ہوئی کہ تاجر اور اور لوگ بھی انعام دینے کا وعدہ کر رہے ہیں۔

کلکتہ کے مشہور کارخانہ انڈر ویول کمپنی کے مسٹر ڈیوڈ یول نے کوئلہ سے روٹی اور دیگر قسم کے ہندوستانی کھانا پکانے کے سب سے عمدہ چولھے کے لیے ایک ہزار روپیہ انعام دینے کا وعدہ کیا ہی یہ ظاہر ہی کہ کل ملک کو بیحد فائدہ پہونچیگا۔ اگر کم قیمت چولھے کو جن میں سستا کوئلہ جلے اوسط درجے کے ہندوستانی بکثرت استعمال کریں بجائے اسکے کہ وہ کنڈہ استعمال کریں جو کہ زمین کے زرخیز کرنیکے لیے چھوڑ دینا چاہیے۔ انڈین و ایسٹرن انجینیر اخبار کے مالکان نے طبقہ انجنیرنگ میں ہندوستانی صنعت و حرفت کی ترقی کے متعلق تین سو روپیے کا پیالہ انعام دینے کا وعدہ کیا ہی دیگر انعام دینے والے راجہ چندر چور سنگہ صاحب چنڈا پور ضلع رائے بریلی کے (جنھوں نے دو سونے کے تمغے ہر ایک پانچسو روپیہ قیمت کا دینے کا وعدہ کیا ہی) اور لالہ جوتی پرشاد سرکاری خزانچی سہارنپور ہیں کمیٹی انتظامیہ کی یہ خوش قسمتی کی بات ہی کہ ممالک متحدہ اور دیگر مقاموں میں اسکو ایسے اصحاب ملیں جو کہ نمایش کے صیغہ صنعت و حرفت سے اس طرح دلچسپی رکھتے ہوں۔

رجسٹرڈ نمبر اے ۲۷۱

خاتون

جلد ۴	بابت ماہ جون سنہ ۱۹۱۰ء	نمبر ۶

ایڈیٹر شیخ محمد عبداللہ بی اے ایل ایل بی سکرٹری تعلیم نسواں اسکشن

فہرست مضامین

محمد عبدالسلام پرنٹر کے اہتمام سے

مطبع فیض عام علی گڑھ میں چھپا

یکم جولائی سنہ ۱۹۱۰ء

شیخ عبداللہ بی اے پبلشر نے علیگڑھ سے شائع کیا

خاتون

۱۔ یہ رسالہ ۴۸ صفحے کا علی گڑھ سے ہر ماہ میں شائع ہوتا ہے اور اس کی سالانہ قیمت ہے
اور ششماہی عمہ ہے۔

۲۔ اس رسالہ کا صرف ایک مقصد ہے یعنی مستورات میں تعلیم پھیلانا اور پڑھی لکھی مستورات میں علمی مذاق پیدا کرنا۔

۳۔ مستورات میں تعلیم پھیلانا کوئی آسان بات نہیں ہے اور جب تک مرد اس طرف متوجہ نہونگے مطلق کامیابی کی امید نہیں ہوسکتی چنانچہ اس خیال او ضرورت کے لحاظ سے اس رسالہ کے ذریعہ سے مستورات کی تعلیم کی اشد ضرورت اور بیبہا فوائد اور مستورات کی جہالت سے جو نقصانات ہو رہے ہیں اس کی طرف مردوں کو ہمیشہ متوجہ کرتے رہیں گے۔

۴۔ ہمارا رسالہ اس بات کی بہت کوشش کریگا کہ مستورات کے لیے عمدہ اور اعلیٰ لٹریچر پیدا کیا جائے جس سے ہماری مستورات کے خیالات اور مذاق درست ہوں اور عمدہ تصنیفات کے پڑھنے کی اُن کو ضرورت محسوس ہو تاکہ وہ اپنی اولاد کو اس بڑے لطف سے محروم رکھنا جو علم سے انسان کو حاصل ہوتا ہے معیوب تصور کرنے لگیں۔

۵ ہم بہت کوشش کرینگے کہ علمی مضامین جہانتک ممکن ہو سلیس اور بامحاورہ اُردو زبان میں لکھے جائیں۔

۶۔ اس رسالہ کی مدد کرنے کے لیے اسکو خریدنا گویا اپنی آپ مدد کرنا ہے اگر اس کی آمدنی سے کچھ بچے گا تو اس سے غریب اور یتیم لڑکیوں کو وظائف دیکر استانیوں کی خدمت کے لیے تیار کیا جائیگا۔

۷ تمام خط و کتابت و ترسیل زر بنام اڈیٹر خاتون علی گڈہ ہونی چاہیے۔

خاتون

ام عمارہ

حضرت ام عمارہ عرب کی بہادر تھیں۔ محبت رسول اور اسلامی حمیت کا بے نظیر نمونہ تھیں [illegible]ء میں سیرۃ ابن ہشام کا مطالعہ کرتے وقت جنگ احد کے بیان میں ان کا ذکر دیکھنے میں آیا۔ اسی وقت سے میں ان کے حالات کی جستجو میں پڑ گیا لیکن اگلی تاریخوں میں عورتوں کے حالات نہایت مختصر لکھے گئے ہیں۔ سیرۃ النبویہ اور سیرۃ محمدیہ میں وہی ابن ہشام والی روایت دہرائی گئی ہے۔ سیرۃ الحلبیہ میں بھی صرف وہی واقعہ ہے لیکن کسی قدر تفصیل کے ساتھ۔

اصابہ۔ اسد الغابہ اور استیعاب میں ان کے حالات اس قدر کم ملے کہ اس شبنم سے میری پیاس نہ بجھ سکی۔ تاریخ طبری۔ تاریخ الخمیس اور بعض دوسری مستند تاریخوں میں بھی ان کا نام آتا ہے لیکن مورخ ان کے کارناموں کی طرف سرسری اشارہ کرتے ہوئے گزر جاتا ہے۔

ان کے جنگ یمامہ کے کارنامہ کا ذکر اکثر مورخین نے کیا ہے لیکن تفصیل کسی نے نہیں لکھی البتہ فتوحات اسلامیہ کے مصنف نے اپنے معمول کے خلاف اس واقعہ کا کسی قدر بسط کے ساتھ ذکر کیا ہے

باقی مستند کتابیں ان کے حالات سے یکسر خالی ہیں۔ البتہ ابن سعد نے طبقات کی آٹھویں جلد میں ان کا تذکرہ کیا ہے اور اگرچہ یہ تذکرہ دوسرے مورخوں سے زیادہ لکھا ہے لیکن پھر بھی ناکافی ہے۔ تاریخ وفات تک کا پتہ نہیں۔

تہذیب التہذیب کا خلاصہ تو صرف ناموں کی فہرست ہے۔ اب اصل کتاب چھپ رہی ہے اس کی نو جلدیں چھپ کر آ بھی چکی ہیں مگر افسوس کہ ان کا تذکرہ بارہویں جلد میں ہے اور وہ ابھی تک نہیں آئی۔

بی بی زینب فواد کی کتاب در المنثور مصر میں چھپی ہے اس کے لیے دو خط بھیجے کہ شاید انہوں نے کچھ مفصل لکھا ہوگا۔ ہرچند وہاں تلاش کی گئی لیکن بدقسمتی سے نہیں ملی۔ ان سب کوششوں کے بعد مجبور ہو کر جو حالات مل سکے ہیں بالفعل انہی کو پیش کرتا ہوں۔

ابھی تک میں نے ہمت نہیں ہاری ہے جستجو کا سلسلہ انشاء اللہ جاری رکھوں گا یہاں تک کہ اس شیر دل بہادر صحابیہ کی جو آنحضرت کے لیے سینہ سپر ہو کر لڑی ہے مکمل سوانح عمری لکھنے کے قابل ہو جاؤں۔

مرا عہدیست با جاناں کہ تا جاں در بدن دارم ہواداران کویش را چو جان خویشتن دارم

ام عمارہ کا نام نسیبہ ہے لیکن یہ اپنی اسی کنیت کے ساتھ زیادہ مشہور ہیں۔ باپ کا نام کعب تھا۔ وہ قبیلہ بنی نجار میں سے تھے۔ ان کی والدہ رباب بنت عبد اللہ قبیلہ خزرج میں سے تھیں۔ ولادت ہجرت سے تخمیناً چالیس سال پہلے مدینہ میں ہوئی۔ ان کا نکاح

انہی کے چچا زاد صحابی زید بن عاصم کے ساتھ ہوا۔ ان سے دو بیٹے پیدا ہوئے۔ عبد اللہ اور حبیب۔ زید بن عاصم کے انتقال کے بعد ان کا دوسرا نکاح انہی کے قبیلے کے ایک شخص غزیہ بن عمرو سے ہوا۔ ان سے ایک بیٹا تمیم اور ایک بیٹی خولہ پیدا ہوئی۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت عطا ہوئی اور آپ نے لوگوں کو اسلام کی دعوت دینا شروع کیا تو مکے کے اکثر لوگ دشمن ہو گئے اور انھوں نے اسلام کی سخت مخالفت شروع کی۔ جو لوگ مسلمان ہوتے تھے ان کو تکلیفیں پہنچاتے تھے۔ ان کی ایذا رسانی سے بچ کر مسلمان مکے میں مشکل سے ٹھہر سکتا تھا چنانچہ آپ ان کو حبشہ کی طرف بھیج دیا کرتے تھے کیونکہ وہاں کا بادشاہ مسلمانوں کا بڑا حامی تھا اور ان کو آرام دیتا تھا۔ جب آپ نے دس سال کوشش کر کے دیکھ لیا کہ وہ لوگ اسلام نہیں لاتے اور اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔ اور ان کی عداوت اور دشمنی برابر بڑھتی چلی جاتی ہے تو ان کا پیچھا چھوڑ دیا اور بڑے بڑے بازاروں اور مجمعوں میں جہاں عرب کے تمام لوگ جمع ہوتے تھے لوگوں کے سامنے اسلام کو پیش کرنے لگے۔ یہ خواہش بھی تھی کہ اگر کوئی دوسرا قبیلہ اسلام کی حمایت کے لیے آمادہ ہو جائے تو آپ مکہ والوں کو چھوڑ کر انہی میں جا ملیں۔

اتفاق سے ایک سال مدینہ کے چھ آدمی آپ کا وعظ سن کر مسلمان ہو گئے۔ دوسرے سال چھ اور بڑھے۔ اب حضور نے ایک صحابی کو جن کا نام مصعب بن عمیرؓ تھا ان لوگوں کے ساتھ مدینہ کو روانہ کر دیا کہ وہاں قرآن کی تعلیم دیں حضرت مصعب اور ان بارہ مسلمانوں کی کوشش سے مدینہ کے بڑے بڑے سردار اسلام لائے اور بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے۔ انہی اسلام لانے والوں میں حضرت ام عمارہ اور ان کا گھرانہ تھا۔

تیسرے سال مدینے سے ۷۵ مسلمان مکے پہنچے۔ مشرکوں کے خوف سے

حج کے دو تین دن کے بعد رات کو پچھلے پہر ایک پہاڑ کی گھاٹی میں یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے ۔ وہاں حضور کے ہاتھ پر ان سب لوگوں نے بیعت کی اور یہ عہد پیمان ہوا کہ حضور مدینہ تشریف لے چلیں ۔ ہم جان مال اور اولاد سب کچھ اللہ کے دین کی مدد میں قربان کر دیں گے" اسی بیعت کو بیعت عقبہ کہتے ہیں ۔ جو لوگ اس میں شریک تھے اُن کا درجہ تمام انصار میں بلند ہے ۔ اس بیعت میں دو عورتیں بھی تھیں ایک تو بی بی ام عمارہؓ اور دوسری ام منیعؓ

اس عہد و پیمان کے مطابق آنحضرت مکے سے ہجرت کر کے مدینے چلے آئے کفار مکہ نے یہاں بھی چین نہ لینے دیا کئی بار چڑھائی کر کے آئے اور لڑائیاں کیں یہاں تک کہ بدر کی لڑائی ہوئی جس میں مکے کے کافروں کے اکثر بڑے بڑے سردار مارے گئے اور اللہ تعالیٰ نے اسلام کو کفر پر نمایاں فتح عطا فرمائی ۔ کفار نے اپنے سرداروں کا بدلہ لینے کی غرض سے بڑی سخت تیاری کی اپنے آس پاس کے تمام قبیلوں کو جمع کیا سب کو ہتھیار اور سواری دی اور تین ہزار سے کچھ زیادہ جنگی آدمی جمع کر کے بڑے جوش و خروش کے ساتھ مدینے پر چڑھائی کی ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خبر سن کر مسلمانوں کو جمع کیا ۔ تقریبا ایک ہزار آدمی تھے ان کو لیکر جب لڑائی کے لیے نکلے تو ان میں سے بھی تین سو منافق راستہ سے واپس چلے آئے ۔ اب صرف سات سو مسلمان رہ گئے ۔ منافقوں کے بھاگ آنے سے اُن کا حوصلہ بھی پست ہو گیا تھا ۔ مگر آنحضرت نے اُن کو ہمت دلائی اور اللہ پر بھروسہ کر کے مقابلہ کے لیے بڑھے ۔

مدینے سے دو تین میل کے فاصلہ پر ایک پہاڑ ہے جس کا نام احد ہے اسکے دامن میں شنبہ کے دن ۱۱ شوال ۳ھ کو مقابلہ ہوا ۔ مسلمان اچھے موقع پر پہنچ گئے تھے کافروں میں سات آٹھ سو سوار تھے ۔ حضرت خالد بن ولیدؓ جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے ان سواروں کے سردار تھے ۔ ایک نہایت محفوظ درہ تھا اور سوائے

اس درہ کے ان سواروں کے آنے کا اور کوئی راستہ نہ تھا۔ آنحضرت نے اس درہ پر
پچاس مسلمانوں کو مقرر کر دیا کہ اس طرف سے جب سوار حملہ کریں تو تم لوگ ان کو روکنا آگے
بڑھنے دینا اور جب تک ہم حکم نہ دیں اس وقت تک ہرگز اس جگہ سے نہ ہٹنا۔ یہ لوگ
چٹان کی دیوار کی طرح وہیں جم گئے۔ جب کفار ادھر سے آنے لگے تو ان تھوڑے
سے مسلمانوں نے ان کو تیروں پر رکھ لیا۔ مجبور ہو کر رک گئے اور میدان میں نہ آسکے
ادھر مسلمانوں کی لڑائی شروع ہوئی۔ قریب تھا کہ مشرکوں کو شکست ہو جائے کہ اتنے میں
مسلمانوں کا علم بردار شہید ہو گیا۔ بعض کافروں نے سمجھا کہ یہی رسول اللہ تھے۔
انہوں نے خوشی کا نعرہ لگایا کہ ہم نے نبی کو قتل کر دیا۔

مسلمانوں نے جب یہ آواز سنی تو اکثر بدحواس ہو گئے۔ ان کو کسی چیز کی خبر نہیں
رہی۔ کوئی جہاں تھا وہیں مایوس ہو کر بیٹھ گیا۔ کوئی گر پڑا۔ کوئی بیہوش ہو گیا۔ کسی کی
آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور ہاتھ سے ڈھال تلوار گر پڑی۔ مشرک خوشی کے جوش میں
ٹوٹ پڑے۔ درہ پر جو مسلمان تھے وہ بھی سراسیمہ ہو کر دوڑے کہ یہ کیا ماجرا گزرا۔
ان لوگوں کا وہاں سے ہٹنا تھا کہ خالدؓ نے اپنے سواروں کو لیکر حملہ کیا اور قیامت پر
قیامت برپا کر دی۔ سرور کائنات کے عم محترم امیر حمزہؓ اور بہت سے مسلمان شہید ہو گئے
اور بہتوں کے میدان سے قدم اکھڑ گئے۔

اس سخت وقت میں حضورؐ کے ارد گرد صرف چند مسلمان جن کی تعداد دس سے
زیادہ نہ ہوگی حفاظت کے لیے رہ گئے۔ انہی میں ام عمارہؓ ان کے دونوں بیٹے
عبداللہ اور حبیب اور ان کے شوہر غزیہ بن عمر تھے۔ خود حضرت ام عمارہؓ کی زبانی
مورخوں نے اس واقعہ کی کیفیت لکھی ہے ہم اس کا ترجمہ کرتے ہیں۔

"ام عمارہ نے کہا کہ میں اپنے کندھے پر مشک لیے ہوئے پیاسوں کو پانی
پلا رہی تھی یکایک مسلمانوں نے شکست کھائی اور ان کے قدم اکھڑ گئے

کفار نے چاروں طرف سے سخت حملہ کیا۔ میں نے اسی وقت مشک پھینکی اور ایک تلوار اٹھا کر آنحضرت کی حفاظت کے لیے کھڑی ہو گئی۔ میرے پاس ڈھال نہ تھی کسی ہٹ کر جانے والے کی طرف حضرت نے اشارہ کیا وہ اپنی ڈھال پھینکتا گیا۔ میں دشمنوں کے تیروں اور تلواروں کو اسی ڈھال پر روکنے لگی۔ مصیبت یہ تھی کہ ہم پیدل تھے اور غنیم سواریوں پر اگر وہ بھی ہماری طرح پیدل ہوتے تو ہم آسانی سے اُن سے بھگت لیتے سوار اپنی پوری قوت سے ہمارے اوپر حملہ کرتے تھے۔ اُس کا روکنا بہت دشوار ہوتا تھا۔ میں نے تو یہ ترکیب نکالی کہ جب کوئی سوار وار کرتا تو اسکو روک لیتی اور جوں ہی وہ آگے بڑھتا پیچھے سے ایک ایسا وار کرتی کہ اُسکے گھوڑے کا پاؤں کٹ جاتا اور وہ معہ سوار کے گر پڑتا۔ یہ دیکھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم میرے بیٹے عبداللہ کو زور سے آواز دیتے کہ اپنی ماں کی مدد کر۔ وہ فوراً آجاتا اور میں اور وہ دونوں مل کر اس سوار کا خاتمہ کر دیتے۔"

حضرت ام عمارہ کے بیٹے عبداللہ کی زبانی روایت ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ "میں اور میری ماں دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کر رہے تھے میں دوسری طرف مشغول تھا کہ ایک مشرک نے پیچھے سے آکر میرے بازو پر ایک تلوار ماری۔ زخم بہت کاری پڑا۔ میں نے مڑ کر اُس پر حملہ کیا لیکن وہ سیدھا نکل گیا۔ میں لڑ رہا تھا مگر میرا خون بند نہیں ہوتا تھا حضورؐ نے ام عمارہ کو حکم دیا کہ اس کے زخم پر پٹی باندھو۔ وہ اپنے ساتھ اسی غرض کے لیے بہت سی پٹیاں لائی تھیں فوراً ایک پٹی نکال کر زخم کو خوب مضبوط باندھا اور بولیں کہ بیٹا اٹھو اور لڑو۔ میں خون کے نکلنے سے بہت کمزور

ہو گیا تھا اُٹھنے کی طاقت نہیں تھی۔ آنحضرت نے فرمایا کہ اے ام عمارہ ہر شخص میں وہ طاقت کہاں ہوتی ہے جو تجھ میں ہے۔ اتنے میں وہ شخص جس نے مجھے زخمی کیا تھا پھر پلٹ کر اسی طرف آیا۔ آنحضرت نے اسکو فرمایا کہ اے ام عمارہ دیکھ وہی شخص آرہا ہے جس نے عبد اللہ کو زخمی کیا ہے۔ ام عمارہ نے لپک کر اس پر تلوار کا وار کیا۔ اس کی ایک پنڈلی صاف کٹ گئی۔ اور وہ اسی جگہ دھم سے گر پڑا۔ پھر انہوں نے آگے بڑھ کر اس کا سر کاٹ لیا۔ حضور مسکرائے اور فرمایا کہ ام عمارہ اللہ تعالےٰ نے بڑا اچھا بدلہ تجھکو عطا کیا۔

کئی گھنٹے تک یہی حالت رہی۔ حضرت ام عمارہ کے زخموں کا کچھ شمار نہ تھا لیکن ان کے جسم میں فولاد کے تاروں کی رگیں تھیں۔ ذرا بھی تو ان زخموں کی پروا نہیں کرتی تھیں اور برابر چستی و چالاکی کے ساتھ حضور کی حفاظت میں مشغول تھیں۔ اسی درمیان میں کسی کافر نے ایک پتھر پھینک مارا جس سے سرور کائنات کا بھی نیچے کا لب زخمی ہو گیا۔ اور نیچے کے سامنے کے دو دانتوں میں سے داہنا دانت شہید ہو گیا۔ پھر ایک مشہور کافر نے جس کا نام ابن قمئہ تھا اور جو بہت بہادر اور مشہور سوار تھا آپ پر تلوار کا وار کیا جس سے خود کے دو حلقے رخسار مبارک میں دھنس گئے۔ حضرت ابی عبیدہ بن الجراح رضہ نے ان حلقوں کو نکالا۔ رخسار مبارک سے خون کے قطرے ٹپکنے لگے یہ دیکھ کر حضرت ام عمارہ نے بے تابی کے ساتھ اُچھل کر ابن قمئہ پر حملہ کیا۔ اس نے ان کے مونڈھے پر بھی ایک تلوار ماری جس سے بڑا گہرا زخم آیا۔ باوجود اس زخم لگنے کے بھی حضرت ام عمارہ نے اس پر تلوار کے پے در پے کئی وار کیے لیکن وہ دشمن خدا دوہری زرہ پہنے ہوئے تھا۔ ابن قمئہ تو بھاگ گیا۔ لیکن حضرت ام عمارہ کو بڑا کاری زخم لگا تھا خون میں لت پت ہو گئیں۔ حضور نے اپنے سامنے کھڑے ہو کر ان کے زخم پر پٹی

بندھ دائی اور فرمایا کہ واللہ ام عمارہ کا آج کا کارنامہ فلاں فلاں (چند بہادر صحابہ کے نام لیکر) کے کارناموں سے بہت بڑھ کر ہے۔ ام عمارہ نے کہا کہ یارسول اللہ میرے لیے دعا فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے ہمراہ مجکو جنت میں داخل کرے۔ آپ نے دعا فرمائی۔ ام عمارہ نے کہا کہ بس اسکے بعد دنیا میں جو مصیبت چاہے میرے سر پر گزر جائے مجھے ذرا بھی پرواہ نہیں۔

میدان جنگ سے جن مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے تھے اُن میں سے بعض بعض مدینہ کے قریب تک پہونچ گئے۔ ایک صحابیہ جنکا نام ام ایمنؓ تھا مدینہ سے مشک لیکر ان ہی کی طرف آرہی تھیں کہ مسلمانوں کو پانی پلائیں۔ دیکھا کہ لوگ بھاگے آرہے ہیں کیفیت پوچھی اُنھوں نے واقعہ بیان کیا حضرت ام ایمن نے زور سے چلا کر ان کو ڈانٹا اور مٹھی میں خاک بھر کر ان کی طرف پھینکی اور کہا کہ رسول اللہ کو چھوڑ کر تم لوگ کس مونھ سے یہاں چلے آئے۔ مرد بنے ہو۔ لو۔ یہ ہماری چوڑیاں پہنو۔ گھر کا چولھا چکی سنبھالو۔ اور اپنی تلواریں ہم کو دیدو ہم جاکر لڑیں۔ ان کے اس کہنے سے وہ غیرت مند مسلمان پلٹے۔ اُدھر یہ بھی معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم محفوظ ہیں۔ اب ان کی ٹوٹی ہوئی ہمت پھر بندھی اور میدان میں جم گئے ظہر کے وقت لڑائی ختم ہوگئی۔ حضرت ابوبکر۔ حضرت عمرؓ اور بڑے بڑے صحابہ کے ساتھ آپ پہاڑ پر گئے وہاں نماز پڑھائی پھر مدینے کی طرف روانہ ہوئے۔

ایک اور صحابیہ کا حال سنیے۔ مدینہ میں جب آنحضرت کے شہید ہو جانے کی خبر اڑی تو وہ رنج و غم سے بیتاب ہو کر نکل کھڑی ہوئیں۔ دونوں آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور گرتی پڑتی اُحد کی طرف چلی جارہی تھیں۔ راستہ میں ایک شتر سوار ملا دوڑ کر اس سے پوچھا کہ کیا خبر ہے؟ اُس نے کہا کہ خیریت ہے لیکن تمھارا باپ۔ بیٹا۔ شوہر تینوں شہید ہوگئے انھوں نے کہا اور رسول اللہ؟ کہا کہ وہ ٹیلہ کے پاس دیکھو فوج کے ہمراہ تشریف لائے ہیں

بلکہ خوشی سے اچھل پڑیں اور کہا کہ جب رسول اللہ زندہ ہیں تو ہم کو کسی کی کچھ پروا نہیں ہے
یہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے شہادت عطا فرمائے۔

حضور کو ام عمارہ کا بڑا خیال تھا۔ آپ نے کے ساتھ ہی عبداللہ بن کعبؓ کو ان کے
دیکھنے کے لیے بھیجا۔ معلوم ہوا اب حالت اچھی ہے۔ زخم مہلک نہیں ہے۔ تب آپ کو
اطمینان ہوا۔ پورے ایک سال تک علاج کرنے کے بعد یہ زخم اچھا ہوا۔

بالاتفاق تمام مورخ لکھتے ہیں کہ واقعہ حدیبیہ۔ خیبر اور حنین کی لڑائیوں میں بھی
ام عمارہ آنحضرت کے ہمراہ شریک ہوئیں لیکن مجکو اب تک کسی کتاب سے ان لڑائیوں
میں ان کے کارناموں کی تفصیل معلوم نہیں ہوسکی ہے جنگ یمامہ کا حال جو کچھ معلوم ہوا
ہے وہ لکھتا ہوں۔

اہل یمامہ کا سردار مسیلمہ کذاب ایک نہایت زبردست اور بڑا جابر شخص تھا۔
پہلے تو مسلمان ہوا لیکن پھر دنیا کے لالچ میں مرتد ہوگیا۔ آنحضرت کے انتقال کے بعد
اس نے بڑی سرکشی پر کمر باندھی۔ اسکا قبیلہ بہت بڑا تھا لڑنے والے تقریباً چالیس ہزار
آدمی تھے اس نے اپنی اس قوت کے گھمنڈ میں آکر نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ اور سب سے
اپنے آپ کو نبی کہلانا شروع کیا۔ جو نہ کہتا اسکو طرح طرح کی سزائیں دیتا۔

حضرت ام عمارہ کے بیٹے حبیب عمان سے مدینہ شریف کو آرہے تھے مسیلمہ نے
راستے سے ان کو پکڑوا لیا اور کہا کہ تم گواہی دیتے ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے
رسول ہیں؟ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ اس نے کہا نہیں۔ یہ گواہی دو کہ مسیلمہ رسول اللہ ہے
انھوں نے کہا ہرگز نہیں۔ تب اس نے ان کا ایک ہاتھ کاٹ ڈالا۔ پھر یہی سوال کیا۔
انھوں نے پھر وہی جواب دیا۔ دوسرا ہاتھ کاٹ ڈالا۔ الغرض پھر پاؤں کاٹے۔ زبان
کاٹ ڈالیں لیکن انھوں نے اس کذاب کی نبوت کا اقرار نہ کیا پر نہ کیا۔ اور جان دیدی
حضرت ام عمارہ نے جب یہ واقعہ سنا تو کلیجہ تھام کے رہ گئیں۔ اور اپنے دل میں

ٹھان لیا کہ اگر مسلمانوں نے لشکر کشی کی تو اس مرتد ظالم کو میں انشاء اللہ خود اپنی تلوار سے جہنم رسید کروں گی۔

حضرت ابوبکرؓ خلیفہ نے جب مسیلمہ کذاب کے حالات سنے تو حضرت خالد بن ولید کو چار ہزار فوج کے ساتھ اس کے مقابلہ کے لیے روانہ کیا۔ حضرت ام عمارہ حضرت ابوبکر کے پاس گئیں اور ان سے اجازت چاہی کہ اس لڑائی میں مجھے بھی جانے دیجیے۔ انھوں نے فرمایا کہ ہم تمھاری بہادری اور جرأت بہت اچھی طرح دیکھ چکے ہیں اس لیے تم شوق سے جاؤ ہم تم کو روک نہیں سکتے۔ مسیلمہ کذاب نے بڑا سخت مقابلہ کیا اور بڑی گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ قدم قدم پر لاشوں کے ڈھیر لگ گئے بارہ سو مسلمان شہید ہوئے اور آٹھ نو ہزار کافر مارے گئے۔ اس کش مکش اور ہنگامہ میں حضرت ام عمارہ نے اپنی نگاہ کے سامنے مسیلمہ کو رکھ لیا جنگی بہادروں کو اپنے سامنے سے ہٹاتی برچھی کی نوک اور تلوار کی دھار سے اپنا راستہ نکالتی ہوئی غنیم کی بیچ فوج میں گھستی چلی جارہی تھیں نیزے اور تلوار کے گیارہ زخم لگے اور جب مسیلمہ کے بالکل قریب پہنچ گئیں تو کلائی پر سے ایک ہاتھ بھی کٹ گیا لیکن مطلق پرواہ نہ کی اور آگے بڑھی تھیں کہ مسیلمہ پر وار کریں۔ اتنے میں کیا دیکھتی ہیں کہ ایک دم سے اس پر دو تلواریں پڑیں اور وہ کٹ کر گھوڑے سے گر پڑا۔ انھوں نے دیکھا تو اُن کے بیٹے عبداللہ کھڑے ہیں۔ پوچھا کہ تو نے اسکو قتل کیا ہے؟ اُنھوں نے کہا کہ ایک تلوار میری پڑی ہے دوسری وحشی کی (یہ وحشی وہ ہے جسنے اپنی کفر کی حالت میں جنگ اُحد میں حضرت امیر حمزہ کو شہید کیا تھا) اب معلوم نہیں کہ کس کے وار سے وہ مرا ہے۔ یہ دیکھکر ام عمارہ اسی وقت سجدہ میں گر گئیں اور اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کیا۔

زخموں کی وجہ سے اور خاصکر ہاتھ کے کٹ جانے سے وہ کمزور ہوگئی تھیں۔ حضرت خالد جو فوج کے سردار تھے اور جن کی بہادری ضرب المثل ہے وہ ام عمارہ کی

نجابت اور بزرگی کی وجہ سے ان کا بڑا ادب کرتے تھے۔ انھوں نے ان کے زخموں کے علاج اور تیمار داری میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ چنانچہ حضرت ام عمارہ نے بعد میں کمال شکرگزاری کے ساتھ خالد کی تعریف کی کہ "وہ نہایت ہمدرد نیک النفس اور متواضع سردار ہیں انھوں نے بہت غمخواری کے ساتھ ہماری تیمار داری کی"

جب حالت کچھ ٹھیک ہوگئی تو عبداللہ ان کو مدینے میں لائے خود خلیفہ وقت حضرت ابوبکرؓ ان کو دیکھنے کے لیے ان کے گھر آتے تھے۔

حضرت عمرؓ خلیفہ دوم کے زمانے میں ایک مرتبہ مال غنیمت میں چند بیش قیمت کپڑے آئے۔ ان میں سے ایک دوپٹہ مزرکش نہایت قیمتی تھا۔ کسی نے حضرت عمرؓ کو رائے دی کہ آپ اسے اپنے بیٹے عبداللہ کی بیوی کو دیں۔ کسی نے کہا نہیں بلکہ اپنی بیوی ام کلثوم کو دیجیے جو حضرت علیؓ کی بیٹی ہیں۔ غرض مختلف لوگوں نے مختلف رائیں ظاہر کیں۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ تمام لوگوں میں میں سب سے زیادہ اسکا حق دار ام عمارہ کو سمجھتا ہوں۔ انہی کو دونگا۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے احد کے دن سنا تھا۔ (آپ فرماتے تھے) کہ میں جدہر نظر ڈالتا تھا ام عمارہ ہی ام عمارہ مجھے نظر آتی تھیں۔ دائیں دیکھتا ہوں تو ام عمارہ۔ بائیں دیکھتا ہوں تو ام عمارہ۔ چنانچہ انہی کے پاس اسکو بھیجدیا۔

راقم کو اس وقت تک اس سے زیادہ حالات نہیں معلوم ہوسکے۔ فقط

(از الناظر)

راقم
اسلم جیراج پوری

مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے

رباعی

ناصح مشفق ہیں ہم ان کے نہ مصلح اور مشیر — دردمندان کے نہ انکے درد کے دل میں ہم
پھوٹ پڑتے ہیں بہار اس باغ کی ہم دیکھ کر — نالۂ بے اختیار بلبل نالاں ہیں ہم

الحمد للہ اسلام ہی ایسا مذہب ہی جس نے عالم ایجاد میں قدم رکھتے ہی اس سچے اور عظیم الشان **کلمہ** کی تصدیق کی جو دنیا میں ہماری دل کی زندگی اور روشنی اور آخرت میں مسرت دائمی اور نجات ابدی کا وسیلہ ہی۔ آسمان کی گردش ستاروں کی چمک موسموں کا تغیر دریاوں کا مدّ وجزر، دن رات کا ہونا راحت وتکلیف نفع ونقصان شادی وغمی عبادت وخدا پرستی، غفلت اور خود فراموشی کے متواتر دورے ہونگے اور ختم ہو جائیں گے مگر اس کلمۂ پاک کی سچائی جس طرح قایم ہی قائم رہے گی۔ یہ وہ پھولا پھلا باغ ہی کہ جسکو نہ باد صرصر کا خطرہ ہی نہ موسم خزاں کا کھٹکا نہ کسی باغبان کی حاجت ہی۔ اس کے شگفتہ اور خوشگوار پھول ہمیشہ مہکتے رہتے ہیں اور کبھی نسیم سحر کے بارِ منت کے ممنون نہیں ہوتے۔

اوائل اسلام کے لوگوں کے دلوں میں جس عظمت کے ساتھ اس پاک کلمے کی وقعت تھی ویسی ہی انھوں نے دینی و دنیوی عزت وبرکت حاصل کی۔ مگر افسوس ہی کہ اب نہ وہ لوگ ہیں نہ وہ اسلام ہی یہ مشہور ضرب المثل (مسلماناں در گور ومسلمانی در کتاب) بالکل اس زمانہ کے موافق ہی۔

اللہ اکبر اس پاک کلمہ کی تصدیق کرنے والے ایک وہ لوگ تھے کہ جن کی سچی نیت اور راسخ الاعتقادی کی وجہ سے یہ حالت تھی کہ ایک دوسرے کی معاونت

ہیں ایسے ملے ہوئے تھے کہ جس طرح ایک جسم میں متعدد اعضا کو باہمی نسبت ہوتی ہے۔ وہ اسی پاک کلمہ کی بدولت ہر ادنیٰ و اعلیٰ کو گرویدہ اور مسخر بنا لیتے تھے علوم کے بحر ذخار ان کے دماغوں کے خانہ زاد اور اسرار قدرت اُن کی چشم بینا کا نور تھی وہ عزت سے مرنے کو زندگی پر ترجیح دیکر دنیا کو محل امتحان سمجھے ہوئے تھے۔ وہ مغرور اور سرکش لوگوں کی خدا کے سامنے جھک کر گردن جھکا دینے والے تھے۔ طلب میں جینا اور جستجو میں مرنا اور کسی حالت میں ہمت نہ ہارنا ہی اُن کا ایمان تھا۔ وہ سفر کی تکالیف درس کی دشواریاں اور غیر معمولی محنت اُٹھا کر علم اور دنیا اور عقبیٰ حاصل کر کے خدای عزوجل کی خوشنودی حاصل کرتے تھے۔ وہ ایسے بے ریا اور منکسر اور عالی ظرف تھے کہ باوجود دولت وحکومت کے بھی کبر اور طمع سے اپنے قلب مصفا کو پاک رکھتے عدل اور احسان اور وفا میں کوئی قوم ان کی نظیر نہ تھی۔ اپنے دشمنوں کی تحقیر یا دل تنگی بھی ان کے نزدیک گناہ عظیم سمجھے جاتے تھے۔

برخلاف ان کے ایک ہم ہیں کہ نخوت و غرور میں سرشار دانش و بینش سے معرا غیرت و حمیت سے عاری خواب غفلت سے مدہوش، اتفاق سے بیزار نفاق میں مبتلا۔ جھوٹی خوشامد کرنے والے چاپلوسی پسند کرنے والے۔ قوم کی مصیبت و ذلت سے بے پروا۔ عزیز و اقارب کے افلاس سے بے غم اپنی فارغ البالی پر آسودہ ہمدردی اور ذوق حق پرستی کا نام نہیں جسکو دیکھیے اپنے غرض کا شہید ہے۔ خلاصہ یہ کہ یہی ہمارا تقویٰ یہی ہماری عبادت ہے۔ شعر

دیکھیے کس حال سے کس حال کو پہنچا دیا　　بخت تیرے عاشقوں کے نارسا کہنے کو ہیں

کیا یہ افسوسناک بات نہیں ہے کہ جس قوم کے اسلاف کی یہ خوبیاں ہوں انکے خلاف میں برائے نام بھی کوئی خوبی نہ ہو۔ کیا یہ لوگ بھی مثل گزشتہ گروہ کے اس کلمے کی اسی سرگرمی اور صدق سے تصدیق کرنے والے ہیں۔ یہ نہایت

شبہ کی بات ہے۔
یہ شبہ کیوں پیدا ہوتا ہے؟ غیرت و حمیت کے نہ ہونے سے تحصیل علوم کے شوق نہ ہونے سے ذلیل رہنے پر قناعت کرنے سے۔
کیا یہ لوگ بھی اسلام کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ ضرور رکھتے ہیں پس ہمیں یہ کہنے کی اجازت چاہتے ہوں کہ وہ اسلام کے ساتھ نہایت بیدردی سے پیش آتے ہیں۔ اسلام نے ان کو وہ خوبیاں عنایت فرمائیں کہ جن کا شکر ہر طرح سے ناممکن ہے اسلام نے ان کو اخوت سکھائی اسلام نے اُن کو قوت دی اسلام نے ان کو سلطنت اور ان کی سلطنت کو عظمت اور جلال بخشا۔ ان کو اخلاق حسنہ کی راہ بتائی انسانی معاشرت کے طریقے سکھائے۔ خدا کی رضامندی کا دستور العمل پیش کیا۔ اتفاق کے فوائد اور نفاق کی خرابیاں ذہن نشین کیں۔
کیا اس احسان اور مبارک تعلیم و تلقین کا یہی بدلہ ہے کہ ہم ان سب سے چشم پوشی کر کے کفران نعمت پر آمادہ ہوں اور کبھی بھول کر بھی اپنی اصلاح کی طرف متوجہ نہ ہوں اور نہ اس پر غور کریں کہ ہم کون ہیں اور ہمارے فرائض کیا ہیں اور ہم دنیا میں کس لیے آئے ہیں اور ہم کو یہاں کب تک رہنا ہے اور ہمارے ان کرتوتوں کا کوئی حساب لینے والا بھی ہے یا نہیں۔
یہ جو کچھ کہ ہم نے کیا اور کر رہے ہیں اس کے پھل ہم کو مل چکے اور مل رہے ہیں اور ملتے رہیں گے ہمارے اعمال ہمارے ہی سامنے نئے نئے رنگ بدل کر اور طرح طرح کے بھیسوں میں روپ اختیار کر کے کبھی وبا کی شکل میں کبھی گرانی کی صورت میں کبھی موسیٰ ندی کی ہیئت کذائی میں نمودار ہوتے ہیں اور ہم کو زبان حال سے پکار پکار کر خبردار کرتے ہیں کہ اب تو ہوش میں آؤ اب تو سنبھلو مگر ہم ایسے تھوڑا ہی سوئے ہیں کہ جو یہ باتیں ہمارے عبرت اور خوف دلانے کو کافی ہوں اس غفلت کے

یہ تمام نتیجے اُٹھا چکے ذلیل ہوئے خوار ہوئے جاہل کہلائے اور اپنی دولت وعزت گنوا کر دوسری قوموں کا حلقہ غلامی کانوں میں ڈالے ہوئے ہیں اور اس حلقہ گوشی پر جائے اسکے کہ شرم کریں فخر کرتے ہیں۔ پس اب ہم کو یہ دیکھنا ہے

(۱) کہ زیادہ تر ہماری ذلتوں اور خرابیوں کے اسباب کیا ہیں۔

(۲) ہماری موجودہ حالت کے انتقام کس طرح سے دور ہو سکتے ہیں۔

(۳) ہم کو اپنی بہتری کے متعلق کیا چارہ اختیار کرنا چاہیے۔

پس ہم ان تینوں امور تنقیح طلب کی تجویز اپنی عقل کے موافق اس طرح کرتے ہیں۔

ہمارے امر اول کا جواب یہ ہے کہ وہ خدائے پاک کہ جس نے اپنی کریمی اور باعث ہونے کے۔ ابتدائے پیدائش سے ہی نہیں بلکہ اس زمانہ سے کہ جب انسان ایک نطفہ مذبوش تھا طرح طرح کی فیاضیوں کے ساتھ اس کے آرام و آسایش پہنچانے میں بلا کسی غرض یا مطلب کے کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا اور اس کے عالم ظہور میں آنے کے بعد زمانہ طفلی و جوانی و پیری میں تمام وقت اس کی تمام ضرورتوں کا کفیل رہا ہمارے قلب پر اس کی عظمت و جلال کے اثر نہ رہنے سے یہ نتیجہ ہوا کہ ہمدردی خدا ترسی، حق شناسی، عدل و احسان اور وفا۔ غرض جتنی خوبیاں تھیں وہ سب ہم سے متنفر ہو کر چلی گئیں اور بجائے ان کے خود غرضی، فریب، دغا اور ریاکاری وغیرہ وغیرہ ہماری رفیق ہو گئیں۔ ان تمام اسباب سے ہم اپنی سابقہ عظمت کو خیرباد کہہ کر طرح طرح کے عذابوں میں تعذیباً و تنبیہاً مبتلا ہیں اور اپنے کیے ہوئے کو بھگت رہے ہیں۔

جواب دوم کا یہ ہے کہ سب سے پہلے ہم کو خدائے قادر مطلق کی عظمت و شکوہ و جلال اور اس کے دانا اور بینا ہونے کے اوصاف اور اپنے کاموں کی جزا و سزا پانے کا

واثق یقین اور اسکا ازلی اور ابدی ہونا اور اپنے کو اور تمام چیزوں کو کہ جن کے ہم عارضی طور پر مالک کہلاتے ہیں اُسی کی ملک تصور کرنا اور دنیا وی تمام چیزیں و نیز وہ چیزیں جو اس وقت ہمارے قبضہ میں ہیں ان کو فانی اور متغیر اور چھوٹ جانے والی سمجھ کر بقدر ضرورت ان سے تعلق رکھنا اور خدای پاک کی محبت کو کہ جو باقی ہے اور ہمیشہ رہنے والی ہے تمام محبتوں پر افضل اور اعلیٰ خیال کرنے سے پھر وہی خوبیاں کہ جو ہم کو نااہل اور ناپاک سمجھ کر دور اور علیحدہ ہو گئی تھیں عود کر آئینگی۔ اور وہ ہمارے تمام اسقام دور کرنے کے لیے کافی و وافی ہیں۔

جواب امر سوم کا یہ ہے کہ ہم کو باہمی اتفاق کی سخت ضرورت ہے۔ اتفاق کے فوائد بیان کرنے کی ہم کو چنداں اسلیے حاجت نہیں ہے کہ کمی و بیشی کے ساتھ تقریباً اسکو ہر شخص جانتا ہے۔ لیکن اولاً کس بات پر اتفاق کیا جائے۔ دوئم اس بات کے حاصل کرنے کے لیے کون سے وسائل کام میں لائے جائیں۔ سوئم وہ وسائل کیونکر بہم پہونچائے جائیں اور کیا عملی کارروائی کی جائے۔

یہی تین باتیں ایسی ہیں کہ جن سے قوم دوسری قوموں کے مقابل میدان ترقی میں بہت پیچھے ہے۔ لیکن ان امور تنقیح طلب کا فیصلہ کوئی معمولی بات نہیں ہے اور ہر شخص اس کے فیصلے کی قابلیت نہیں رکھتا ہے۔ البتہ یہ بڑے بڑے ذی علم مصنفوں کا کام ہے جنکو اقوام کی پہلی تاریخ اور دنیا کی موجودہ حالت اور قوموں کے باہمی برتاؤ سے پوری آگاہی ہو۔ اور قانون قدرت کی تاثیرات سے ایک حد تک واقفیت رکھتے ہوں کیونکہ ایک بہت بڑے قوم کے عمدہ حالت کا انقلاب مقصود ہے۔ اور وہ حالت یکساں نہیں ہے۔ بلکہ باعتبار مختلف مواقع کے۔ اس کی مختلف صورتیں ہیں۔

ہم کو کسی بڑے ذی علم اور صاحب فراست اور اہل تصنیف سے اس سوال کا

جواب قابل اطمینان نہیں مل سکتا۔ مذہب کہتا ہے کہ تقدیر ساری باتوں کا ایک دن میں فیصلہ کر سکتی ہے لیکن اس کی کوئی مدت معین نہیں کر سکتا جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ فیصلہ کب تک ہو سکتا ہے۔

پس اس امر پر غور کرنے کے بعد کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ ہم خدا کی دی ہوئی دولت سے (یعنی اپنے ہاتھ پاؤں کو) ہلا کر کوئی کام لیں کیونکہ حرکت ہی سے برکت ہوتی ہے اور یہ کونسی دانشمندی ہے کہ آثار تنزل سے ترقی کے امیدوار رہیں۔ کیوں کہ آیت لیس للانسان الا ما سعیٰ۔ کے بموجب ہم کو اپنی کوششوں ہی کے پھل ملنے کی امید ہو سکتی ہے۔

کیا ہم سب پر یہ فرض نہیں ہے کہ اعلیٰ درجہ کے علوم دینی اور دنیوی کے ذریعہ سے کافی تعداد ایسے عالموں کی اپنی قوم میں موجود کریں جو قافلہ قومی کو دشوار گزار اور تیرہ و تاریک رستہ سے علوم کی روشنی میں خدا کی مدد سے آگے بڑھا لیجائیں۔

مفید اور کارآمد اتفاق اُن ہی لوگوں کا ہوتا ہے جن کے خیالات ہموار ہوں اور عوام بھی اُن ہی لوگوں پر بھروسہ کر سکتے ہیں جنھوں نے اپنے کو دانشمند ثابت کیا ہو۔ ناہموار اور پیچیدہ لکڑیاں کیسی ہی احتیاط کے ساتھ اگر ایک جگہ باندھی جائیں تاہم جدا جدا رہیں گے۔ یہی حال آج کل ہمارے جلسوں کا ہے۔

خیالات کی ہمواری علم سے ہوتی ہے۔ تا وقتیکہ علم خیالات کو ہموار نہ کرے اُس وقت تک ترقی قومی کا ظہور ناممکن الوقوع ہے۔ غرض علم سے خیالات ہموار ہو سکتے ہیں۔ اور خیالات کی ہمواری سے اتفاق کے ساتھ ترقی علوم و فنون متعلقہ تجارت و زراعت صنعت و حرفت اور سارے کام جن سے راحت اور عزت اور دولت ملسکتی ہے۔ خوش اسلوبی کے ساتھ سر انجام پا سکتے ہیں۔

اب ایسی پیاری اور دلکش آواز سے اس وقت کوئی پکارنے والا نہیں ہے کہ

مخلوق جسکو سُن کر صدیوں کے کینے اور عناد دل سے ایک لخت دور کرکے آپس میں بھائی بھائی بن گئے۔ اور اُس قوم نے جو نان شبینہ کو محتاج تھی شتربانی سے جہانبانی کا رتبہ حاصل کرکے غیر قوموں کو حیرت اور استعجاب میں ڈال دیا۔

وہ تو ایک حالت تھی جو گزر گئی۔ اور جن کی تقدیر میں اُس خوش آیند آواز کے مزے لینے تھے وہ لے چکے۔ اب وہ نہایت آرام سے بستر خاک پر میٹھی میٹھی نیند پڑے سوتے ہیں۔ مگر اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ تمھارے واسطے اس میں سے کچھ حصہ باقی نہیں رہا۔ اور حریفاں بادہا خوردند ورفتند، کا مضمون ہمارے واسطے ہے اگر خیال کریں اور عمل کریں تو بہت کچھ باقی ہے۔ وہ یہ ہے کہ تمھارے گوش دل میں بھی تو ہادی کی وہ آواز پہونچی ہے جس نے عرب سے عجم تک ہلا دیا اور ہمارا تعلق بھی تو اسی برگزیدۂ آفرینش سے ہے کہ جس کی آواز میں یہ اثر تھا اور ہم کو بھی تو اُسی آقا کی غلامی کا دعویٰ ہے۔ جس کے ایسے فرماں بردار اور جاں نثار غلام تھے جن کے کارناموں سے تاریخوں کے صفحات بھرے پڑے ہیں اور جنکا مجملاً ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں۔ ہاں اگر فرق ہے تو اتنا ہی جتنا فرماں بردار اور نافرمان غلام میں ہوتا ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ نسبت ضرور ہے۔ شعر

گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں ۔۔۔ کعبہ سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

اہل یورپ ہی کو دیکھو علم نے ان کو کیا سے کیا کر دیا پس حقیقت میں علاج ساری خرابیوں کا تحصیل علم ہے۔ مگر علوم سیکھنے سے یہ غرض ہماری بالکل نہیں ہے کہ نوکری کے ذریعہ سے اپنی آزادی کو بیچ کر غلامی خرید کی جائے بلکہ علوم صنعت وحرفت فنون متعلقہ تجارت و زراعت کو اشاعت کرکے اپنی اور اپنی قوم کی آزادانہ زندگی بسر کرنے کی کوشش کیجائے۔

علوم دنیاوی کے ساتھ مذہبی و دنیوی تعلیم بھی نہایت ضروری ہے کیونکہ قومی ترقی

مذہب سے بہت کچھ تعلق ہی خداوند عالم ہماری قوم کے دلوں میں مذہب کی عزت وقعت اور محبت پیدا کرے۔ آمین۔

خاکسار
رابعہ سلطان بیگم

کعبہ

وہ دنیا میں گھر سب سے پہلا خدا کا ۔ خلیل ایک معمار تھا جس بنا کا
ازل میں مشیت نے تھا جسکو تاکا ۔ کہ اس گھر سے اُبلے گا چشمہ ہدا کا
وہ تیرتھ تھا اک بت پرستوں کا گویا
جہاں نام حق کا نہ تھا کوئی جویا

دنیا میں سب سے پہلا گھر جو اکیلے اللہ کی پرستش کے لیے بنایا گیا وہ کعبہ ہی جو ملک عرب کے شہر مکہ شریف میں ہے اور جس کی طرف تمام دنیا کے مسلمان رخ کرکے نماز پڑھتے ہیں۔

اللہ کے نزدیک اس معبد سے زیادہ کوئی دوسرا معبد متبرک اور مقدس نہیں ہی اسکے بعد مسجد نبوی کا جو مدینہ میں ہی اور مسجد اقصیٰ کا جو شام میں ہی درجہ ہی۔

مخلوق کا خالق کے ساتھ حقیقی رشتہ عبودیت وبندگی جس پاک معبد سے سب سے پہلے قائم ہوا ہے وہ یہی کعبہ ہے۔

ح رخ بیگم صاحبہ نے اس معبد کے فضائل میں وہ روایتیں لکھی ہیں جو اُن مورخوں کی ہیں جو بہت زیادہ مذہبی جذبے اور جوش محبت میں سرشار تھے۔ امید ہی کہ ہم کسی وقت اس مقدس خانہ خدا کی تفصیلی تاریخ بھی چھاپ سکیں گے۔

اڈیٹر

حق سبحانہ تعالی نے اس جہان فانی میں ایک ایسا گرامی قدر گھر قائم کیا ہے کہ

جس کی خوبی و بزرگی سے واقفیت نہ رکھنے والا شاید اس عالم میں پیدا ہی نہ ہوا ہوگا بلکہ از آدم تا ایندم کوئی متنفس ایسا نہ گزرا کہ اس والا شان مکان کی آگاہی سے کچھ بھی خبر نہ رکھتا ہو۔

واضح ہو کہ قبل از تخلیق کل کائنات عالم کے ارض کعبہ مکرم معین ہو کر موجب پیدائش دو جہاں کا ہوا۔ چنانچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ خالق ذوالجلال نے چالیس برس پیش از خلقت ارض وسما کعبہ شریف پیدا کیا تھا۔ اور جب ارادہ الٰہی خلقت زمین کی طرف مائل ہوا تو بچھانا شروع کیا اسکو زیر کعبہ سے اور رکھا کعبہ کو اُس کے وسط میں۔ پس شان اُس کی یہیں سے عیاں ہے کہ اسی کی زیر سایہ اس جہان نے یہ مرتبہ پایا اور وہی جزو اول تھا اس کی بنا کا۔ اس خانۂ ذیشان کی جس قدر تعریف ہو کم ہے۔ در اصل وصف میں اسکے ناقص قلم ہے۔

کتاب حدیث سے نقل کیا ہے کہ حضرت رسول خدا نے فرمایا ہے کہ جب کسی امت پر امم پیشیں سے کچھ عذاب نازل ہوتا تھا تو اسی گھر سے رجوع لاتے تھے اور اسی جگہ مشغول عبادت ہوتے تھے۔ عجائبات اور واقعات اس بیت شریف کے شمار سے باہر ہیں۔ بعض اُن میں سے تحریر کرتی ہوں۔

حضرت ابن عباس اور مجاہد وغیرہ مفسرین کہتے ہیں کہ اللہ جل شانہ نے ہر شخص کے دل میں اس کی زیارت کا شوق ایسا ڈالا ہے کہ اس کے دیکھنے سے دل سیر نہیں ہوتا اور جو کوئی وہاں جاتا ہے پھر اسکا دوبارہ جانے کو جی چاہتا ہے۔ چنانچہ بہ تجربہ معلوم ہوا ہے کہ جو شخص ایک مرتبہ حج کو گیا اور پھر آیا وہ مدت العمر مشتاق رہا۔ اگرچہ راہ میں قسم قسم کے شدائد اور مصائب بھی اُٹھائے ہوں۔ پس تعظیم و تکریم اس خانۂ منورہ کی گویا اضطراری ہے کہ دل سے جوش مارتی ہے بلکہ یہ تعظیم جبلی ہے کہ خصوصیت نفع اور ضرر پر موقوف نہیں اور یہی سبب ہے کہ حیوانات بھی اس پاک گھر کی تعظیم کرتے ہیں۔

کتاب معتبر سے مروی ہو کہ طلق ابن حبیب نے بیان کیا ہی کہ میں عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ سایۂ کعبہ میں بیٹھا تھا۔ یہانتک کہ آفتاب بلند ہوا اور دہوپ لگی سایہ جاتا رہا کہ مجلس اُٹھ چلی یکایک ایک چمک دروازۂ مسجد الحرام سے ظاہر ہوئی تو میں نے دیکھا کہ ایک سانپ آتا ہی پھر سب لوگوں نے اسکو دیکھنا شروع کیا وہ سیدھا خانہ کعبہ میں آیا اور سات مرتبہ اس نے طواف کیا بعد اس کے مقام ابراہیم علیہ السلام کے نیچے اُس نے دو رکعت نماز ادا کی اور عبد اللہ ابن عمر وغیرہ کبرائے مجلس نے اس سانپ کے پاس جاکر کہا کہ اے عزیز تیرا طواف اب ہوچکا یہاں شہر کے لوگ تجھ سے ناواقف ہیں شاید تجکو ضرر پونچائیں اور غلام و خدمتگار بھی یہاں بہت ہیں بہتر ہی کہ اپنے آپ کو ان سے پوشیدہ رکھ ورنہ ایذا دینگے ۔ بمجرد اس کلام کے وہ سانپ اپنا سر دُم میں دباکر آسمان کی جانب اُڑا اور نظروں سے غائب ہوگیا۔

ابو طفیل نے نقل کیا ہی کہ ایک نوجوان ذی طوی کا رہنے والا سانپ کی صورت بنکر ہمیشہ طواف کو آتا اور مقام ابراہیم پر نماز پڑہتا۔ ماں اس کی جنیہ تھی وہ اکثر شفقت سے منع کرتی اور کہتی کہ ایسا نہ ہو تجکو آدمی مار ڈالیں لیکن وہ باز نہ آتا تھا آخرکار جماعۂ ابو سہم نے اسکو مار ڈالا۔ بعد اسکے ایک غبار عظیم اُٹھا اور جماعۂ مذکور ساری مرگئی۔

تواریخ مکہ میں ایک حکایت اونٹ کی مشہور ہی خلاصہ اُسکا یہ ہی کہ ۳۱۳ھ ہجری جمادی الثانی کے مہینے میں ایک اونٹ فاروقی اپنے مالک سے کعبہ کی طرف گریزاں ہوا اور مسجد الحرام میں سات بار طواف کرکے حجر اسود کو چوما بعد اسکے مقام حنفیہ پر ٹھہرا اور میزاب الرحمۃ پر کھڑا ہوکر رونے لگا پھر زمین پر گرکے مرگیا آدمیوں نے اسکو صفا اور مروہ کے درمیان دفن کردیا۔

پوشیدہ نرہے کہ جذب اور میلان قلوب کی چار وجہیں ظاہر میں معلوم ہوتی ہیں

ایک یہ کہ اخذ میثاق بطن نعمان میں ہوا ہی کہ مواضع عرفات سے ہی اسی جگہ ذریات
ادم علیہ السلام کو ظاہر فرما کر خطاب الست بربکم سے مخاطب فرمایا ہی اور ذریات آدمؑ
نے اقرار کر لیا ہی وہ اقرار صحیفہ حکمت پر لکھا گیا اور حجر اسود میں امانت ہوا۔ پس گویا وطن
اوّل آدمیوں کا وہی ہی اور کشش طبع جانب وطن اگرچہ اُسے نہ پہچانتا ہو جبلّی ہے۔
ومن الایمان حب الوطن اور عدد مکہ کہ ہنیشہ ہیں مطابق ہیں عدد وطن کے۔

دوسری یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا مانگی تھی کہ یا اللہ قلوب خلائق کو
اس مکان سے منجذب کرے۔

تیسری یہ کہ حجار بیت المقدس مقناطیس ارواح ہیں اور جذبۂ شوق سے ارواح کو
اپنی طرف کھینچتے ہیں اور جملہ اجسام تابع ارواح ہیں۔

چوتھی اخبار صحیحہ سے واضح ہی کہ بشب نیمۂ شعبان اس گھر پر نظر عنایت حق ہوتی ہے
اور قلوب مومنین بھی منظور نظر الٰہی ہیں۔ پس بسبب جنسیت کے یہ میلان حاصل ہوتا ہی
اور ایک سبب رجوع کا یہ بھی ہی کہ کئی جگہ کعبہ میں دعا قبول ہوتی ہی۔ اہل تحقیق نے کعبے
اور اسکے اطراف میں دعا کی مقبولیت کے مقام بہت لکھے ہیں کہ میں اس مختصر صفحے میں
اُس کی توضیح کی گنجایش نہیں رکھتی ہوں۔

ارزقی نے حویطب سے روایت کی ہی کہ میں ایک روز ایام جاہلیت میں کعبے
کے سایہ میں بیٹھا تھا یکایک ایک عورت آئی اور پردۂ کعبہ پکڑ کر فریاد کرنے لگی کہ یا الٰہی
میں اپنے شوہر کے ہاتھوں سے تنگ ہوں کہ مجھے بے سبب مارا کرتا ہی۔ بمجرد اس دعا
کے ہاتھ اُس کے شوہر کے شل ہوگئے۔ چنانچہ حویطب نے اسکو اسلام میں ہاتھوں سے
شل دیکھا۔

پھر اسی نے اپنی تاریخ میں بسند صحیح بیان کیا ہی کہ ایک عورت عقیمہ نے ایام جاہلیت
میں ایک لڑکا اپنے اقارب سے لیکر پرورش کیا اور آپ اکثر اوقات اسکو تنہا چھوڑ کر

کسب معاش کے لیے جاتی۔ ایک روز اُس لڑکے نے تنہائی کی شکایت کی تب اُس نے کہا اے لڑکے اگر کوئی ظالم تجھ پر بحالت تنہائی کچھ ظلم کرے تو بے تامل خانۂ خدا میں جاکر فریاد کرنا کہ مالک خانہ تیری فریاد کو پونچے گا۔ اتفاقیہ ایک ظالم نے ایک دن اُسے تنہا پاکر اُٹھا لیا اور لے بھاگا ایک مدت تک اپنے پاس رکھا۔ ایک مرتبہ کعبہ شریف میں آیا تو وہ لڑکا بھی اسکے ساتھ تھا۔ چنانچہ اُس نے جوں ہی کعبہ معظم کو دیکھا تو آدمیوں سے پوچھا کہ یہ کیا مکان ہے۔ سب نے کہا خانۂ خدا ہے اُس نے اپنی ماں کی بات یاد کرکے کعبے شریف کی طرف ارادہ کیا دوڑکر پونچ گیا اور پردے کو مضبوط پکڑکر کھڑا ہو رہا۔ وہ غاصب بھی اُس کے پیچھے دوڑتا ہوا اسی کے ساتھ کعبے میں پونچا۔ چاہا کہ داہنا ہاتھ بڑھاکر پکڑوں ہاتھ شل ہوگئے پھر بایاں ہاتھ بڑھایا وہ بھی شل ہوگیا۔ جب اُس نے یہ معاملہ دیکھا تو سرداران قریش سے اپنا حال کہا اور یہ بھی کہا کہ میں اس لڑکے سے دستبردار ہوں جہاں چاہے چلا جائے مگر میرے ہاتھ درست ہوجائیں پس تم اسکا علاج جو کچھ جانتے ہو بتلاؤ اکابر قریش نے کہا دونوں ہاتھوں سے قربانی ایک ایک اونٹ کی کر چنانچہ اس نے قربانی کی اسکے ہاتھ اچھے ہوئے۔

نقل ہے کہ ایک شخص بنی کنانہ کا اپنے چچازاد بھائی پر ظلم کیا کرتا تھا اور یہ بیچارہ ہرچند عاجزی کرتا لیکن یہ ظالم اپنے ظلم سے باز نہ آتا۔ ناچار مظلوم نے خانۂ کعبے سے پناہ پکڑی اور دعا کی کہ یا الٰہی فلاں شخص مجھ پر ظلم کرتا ہے سو تو اسکو ایسے درد میں مبتلا کرکہ لادوا ہو۔ اور یہ دعا کرکے اپنے گھر چلا آیا تو اس ظالم کا پیٹ پھول گیا۔ ہرچند معالجہ کیا مگر کچھ مفید نہ ہوا آخر کو پیٹ پھٹ گیا۔

ابن عباس سے منقول ہے کہ اُنھوں نے دیکھا کہ ایک شخص خانہ کعبہ میں کھڑا ہوا اپنے ظالم پر فریاد کر رہا تھا کہ یا الٰہی وہ اندھا ہوجائے۔ فی الفور وہ اندھا ہوگیا۔ چنانچہ لوگ اسکا ہاتھ پکڑے لیے جاتے تھے۔

اسی طرح کے کرشمے اور عجائبات اس مکان معجز نشان کے بیکراں ہیں اور ہمیشہ ظاہر ہوتے رہتے ہیں اور یہی وجہ ہی کہ ہمیشہ یہ مکان محفوظ و مصئون رہا ہی اسواسطے کہ کوئی فرد بشر بخوف عقوبت عاجلہ ساکنان مکہ معظمہ سے تعرض نہیں کرتا اور سب لوگ بہتک حرمت سے اس مکان کے بدل پرہیز رکھتے ہیں اور اصلا اس مکان میں باہم مناقشہ نہیں کرتے ۔

قطع نظر ان سب باتوں کے یہ مکان معبد خلائق اور قبلہ عبادات اور مرجع عاشقان صادق اور مطاف محبان واثق ہوا ۔ پس تخصیص اس بیت شریف کی ظہور تجلی الٓہی ہے کہ یہ سب تعظیمات اور محبت اسی تجلی پر واقع ہوتی ہیں اور اسی تجلی کا انبیاے سابقین کے کلام میں اشارہ ہی کہ اسکو کتب بنی اسرائیل میں ذکر کرتے ہیں جس طرح سے کہ پاک ہے وہ صاحب کہ اس نے تجلی فرمائی کوہ طور پر اور روشن ہوا نور اسکا بیت المقدس کے پہاڑ ساعیر سے اور بے پردہ ظاہر ہوا کوہستان فاران سے اور فاران نام ہی کعبۂ معظم کا ۔ اور اسی تجلی کی یہ خاصیت ہی کہ جو کوئی زائرین سے ذکی ہو یا بلید جب اس بیت مکرم پر نظر ڈالتا ہی عجب عظمت اور وقار مقرون بجلال پاتا ہی اور سمجھ جاتا ہی کہ یہاں ایسی شان عظیم ہی کہ دوسری جگہ نہیں ۔ اور محبوبیت اور انجذاب قلوب خاصہ اسی تجلی کا ہی ۔

مخفی نہ رہے کہ معالم التنزیل میں لکھا ہی کہ خانہ کعبہ ام رحم بھی کہلاتا ہی بایں وجہ کہ اسمیں رحمت الٓہی نازل ہوتی ہی ۔ طائفین اور عاکفین پر کہ جو کوئی محتاج فقیر معہ تحفۂ افلاس روے نیاز اس مامن اناس پر لایا خازن خزائن لطف و عنایت نے اس قدر نقد و جنس اپنی رحمت سے عنایت کیا کہ دامن امید میں گنجایش نہ رہی ۔ کون مفلس بے سروپا اس درگاہ میں آیا کہ نقد مراد اس کے دامن افلاس میں نہ رکھا گیا اور کس عاجز بیکس نے سر عجز اور نیاز اس عتبۂ مکرم پر رکھا کہ دُر مقاصد اُس کے دست توقع میں مکشوف نہ ہوا بمصداق اس شعر کے ۔

کدام بندہ بریں آستاں نہاد سرے   کہ لطف خواجہ نہ بر روی او کشادرے

حمد بے قیاس و بیحد سپاس اس خالق کبریا کو زیبا ہی کہ جسنے اپنی قدرت کاملہ سے ایک مشت خاک کو ایسی برکت بخشی کہ باعث عظمت دو عالم ہوا اور خدا پرستوں کا قبلہ قرار پایا۔ اور کل نوع بنی آدم کا موجب تسکین قلوب ہوا۔ یہ بات غور طلب ہی کہ اگر خداوند عالم کعبہ شریف کو قائم نہ فرماتا تو علاوہ تسکین عارفاں ہزارہا اہل اسلام راہ راست سے گمراہ ہوتے رہتے اور یہ جوش و خروش جو کہ مذہب اسلام میں بالخصوص پایا جاتا ہے بہت ہی کم ہوتا بلکہ کچھ بھی نہ ہوتا کہ ہر سال لاکھوں مسلمان واسطے حج کے یکجا جمع ہوتے ہیں جس میں شان اہل اسلام کے علاوہ ایک بہت بڑی شان وحدانیت خدائے لایزال کی عیاں ہی

اگر کعبہ نہ ہوتا تو حج نہ ہوتا اور حج نہ ہونے سے ہمیشہ لوگ اپنے ہی ارادے میں خواہ حق پر ہوں یا باطل سرگردان رہتے۔ ہر سال کیا مدت العمر میں ایک بار بھی مجمع مسلمین اور بجاآوری فرمان حق تعالیٰ نصیب نہ ہوتی اور نہ حکمت الٰہی و رحمت ایزدی کے ایک شمہ تعریف میں اس طرح سرگرم گفتار ہوتے۔ اور دبدبۂ اہل ایمان اور شوکت سبحانی جو اس کی وجہ سے نمایاں ہی معدوم ہوتا۔ ظاہر ہی کہ عدم موجودگی میں اسکے مذہب اسلام ضعیف اور کل مسلمان نحیف رہتے۔

ہر برس زمانۂ حج میں اکثر ادنیٰ و اعلیٰ کی زبان پر زیادہ ذکر درباب حج و حجاج ہی رہا کرتا ہی جو واسطے استظہار شوق جبلّی و تعظیم بزرگی کعبہ کافی ہے۔

(باقی ارم)

رقمہ

ح خ از کلکتہ

آئینۂ وفا

سلسلے کے لیے فروری نمبر ملاحظہ ہو

لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا ساوتری کو اسکے شوہر کے مرنے کے خوفناک خیالات پریشان رکھنے لگے اور وہ الفاظ جو نارو کی زبان سے نکلے تھے ایک آن بھی اُسکے دل سے نہ بھولتے۔ جیتنے دن گزرتے جاتے وہ اُن کو گنتی جاتی تھی۔ جس قدر موت کا سال نزدیک آتا گیا ساوتری خدا سے دعا مانگنے میں زیادہ مصروف رہنے لگی۔

آخر کار اُس سال کے چار روز باقی رہ گئے۔ ساوتری نے منت مانی کہ تین دن اور تین رات تک نہ تو میں کچھ کھاؤں گی نہ پیونگی بلکہ تین روز روزے رکھکر خدا کی عبادت میں گزاروں گی۔ اسکا خاوند یا ساس یا سسر کوئی اس راز سے آگاہ نہ تھا اور نہیں جانتے تھے کہ ساوتری کا ایسے کام کرنے سے کیا مطلب ہے۔

یہاں تک کہ موت کا دن آپہنچا اور ساوتری اپنے شوہر کی حیات کے لیے درگاہ باری میں بڑی بیقراری سے دعائیں مانگنے لگی۔ صبح تو خیریت سے گزری اور دوپہر بھی جوں توں کرکے کٹ گئی۔ اب شام کا وقت تھا۔ سورج نے آسمان کا نصف سے زیادہ حصہ طے کر لیا تھا۔ درودیوار کا سایہ زمین پر پڑ رہا تھا جس سے ساوتری کی پریشانی دمبدم بڑھتی جاتی تھی۔ لیکن ستی وان میں ابھی تک کوئی غیر معمولی بات نہیں پائی جاتی تھی۔ ساوتری نے اُسے دم بھر بھی آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دیا۔ اور ذرا سی دیر کو بھی اُسے تنہا نہ چھوڑا۔

ساوتری کی ساس نے اس سے کہا۔ لو اب تمہاری منت کے دن پورے ہوگئے کچھ کھاؤ پیو۔ ساوتری نے جواب دیا جی ہاں کھالوں گی رات کا اور انتظار ہے۔

اب رات ہوگئی تھی اور ستی وان نے بھی حسب معمول کلہاڑی کندھے پر رکھ جنگل

کی راہ لی۔ ساوتری نے جو اس وقت تک طرح طرح کے خیالات میں محو تھی جوں ہی اسکو جاتے دیکھا آنکھوں میں آنسو بھر لائی اور ایک آہ سرد کھینچ کر اپنے دل سے مخاطب ہوئی۔

" افسوس یہ جنگل نہیں جارہا ہی بلکہ بدقسمتی اسکو موت کے موںھ میں لیے جاتی ہے دیکھیے جنگل میں تقدیر کیا گل کھلاتی ہی۔ دل چاہتا ہی اسے روک لوں اور جانے سے باز رکھوں لیکن یہ مصلحت کے خلاف ہی۔ اور اگر جانے دیتی ہوں تو جیتے جی یہ نہیں دیکھا جاتا۔ بس اب غیرت اور وفاداری کا تقاضا مجھے اسی بات پر مجبور کرتا ہے کہ اٹھوں اور میں بھی اسکا ساتھ دوں (دل ہی دل میں) ستی دان تیرے ساتھ مجھے جنگل میں بھی رہنے سے عار نہیں اور تجھ بن مجھے گل بھی خار معلوم ہوگا۔ جب قدرت نے ہم دونوں کی قسمت کو ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ کر دیا تو پھر جدائی کیسی"

یہ سوچ کر اور آنکھوں کے آنسو پونچھ کر اس طرح جھٹ سے کھڑی ہوگئی کہ گویا خود بھی اپنے پتی کے ساتھ جانفروشی کے لیے تیار ہی۔

ساوتری جو خوب سیرتی کی مجسم تصویر تھی اس حالت میں بھی بغیر والدین کی رضامندی کے اس کے ساتھ جانے پر راضی نہ ہوئی۔ فوراً ان کے سامنے گئی اور ان سے اجازت کی درخواست کی۔ اُنھوں نے کہا بیٹی شوق سے جا۔ مگر تیری یہ حالت دیکھ کر جو ان تین دن کے فاقوں میں ہوگئی ہی۔ رات کے وقت سنسان جنگل میں بھیجنے کو دل نہیں چاہتا۔

ساوتری جو ستی دان کے ہمراہ ہونے کی اجازت پاکر ظاہرا خوش تھی غمزدہ صورت بنائے اس کے ساتھ ہولی۔

ستی دان تمام راستے جنگل کی ہوا اور وہاں کے خوشنما منظر سے محظوظ ہوتا گیا۔ برخلاف اسکے ساوتری کو درختوں کی سائے مہیب شکلیں معلوم ہوتی تھیں۔ اور وہاں کی

ہر چیز اُسے کاٹنے کو دوڑتی تھی۔ اسکو یہ تمام چیزیں ایسی معلوم ہوتی تھیں کہ گویا وہ خواب دیکھ رہی ہے۔ اُس کی باتیں اور شادی کا زمانہ اُسے خواب وخیال ہو گیا۔ ستی وان اسکو مثل اس شخص کے معلوم ہوتا تھا جو مدتیں گزریں کہ اس دنیا سے کوچ کر گیا ہو۔ وہ چپ تھی اور خاموشی سے اسکے ساتھ ساتھ چلی جاتی تھی۔ وہ اسکے چہرے کو یا تو اس غرض سے کہ اسکے پیارے شوہر کا آخری وقت تھا یا کسی اور مصلحت سے بہت غور سے دیکھتی جاتی تھی۔ اس کی ایک ایک قدم پر نگاہ تھی کہ دیکھیے گھڑی کی گھڑی میں کیا ہونے والا ہے۔

چلتے چلتے وہ ایک جگہ ٹھہر گیا اور کلہاڑی سے درختوں کی لکڑیاں کاٹنے لگا۔ یہانتک کہ پسینہ میں شرابور ہو گیا۔ رات کا وقت تھا اور اوپر سے جنگل کی سرد ہوا چلی ستی وان کو یکایک سردی محسوس ہوئی اور اسکے ہاتھ سے کلہاڑی گر پڑی۔

ساوتری ہر ایک بات کو غور سے دیکھ رہی تھی اور خوب جانتی تھی کہ اب کیا ہونے والا ہے۔

ستی وان (سر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر) میرے سر میں سخت درد ہو رہا ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی سوئیاں چبھو رہا ہے۔ اُف! اُف!! میری آنکھیں بند ہوئی جاتی ہیں۔ بہتر ہے کہ میں سو جاؤں" اتنا کہا اور زمین پر گر پڑا۔

ساوتری بھی بیٹھ گئی اور اسکو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔

ستی وان (کمزور لہجے میں) میری آنکھوں کے نیچے اندھیرا آیا جاتا ہے۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہوتے جاتے ہیں۔ تمام چیزیں ہیچ معلوم ہوتی ہیں۔ آہ سانس بھی رُک رُک کر آنے لگا۔ یہ درد موت کا درد ہے۔ مجھے کوئی چیز نہیں سوجھتی (ٹٹول کر) پیاری ساوتری کہاں ہے۔ (اسکے چہرے کو حسرت کی نگاہ سے دیکھکر) اے نیک اور وفادار بیوی اچھا اب تجکو میں آخری سلام کرتا ہوں۔ بس۔ یہ کہا اور ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔

دم واپسیں یا ہر شے کا پچھلا حصہ ایک درد بھرا ہوتا ہے۔ ناظرین آپ خیال کر سکتے ہیں کہ ساوتری پر کتنا بڑا صدمہ پہنچا ہوگا۔ لیکن ہنوز اسکے ماتم کرنے کی فرصت نہیں ملی تھی کہ ساوتری کو ایک عجیب شکل اس کے پاس کھڑی ہوئی دکھلائی دی۔ سرخ کپڑے تھے۔ سر پر تاج تھا۔ سیاہی مائل رنگ۔ سرخ اور بڑی بڑی آنکھیں شکل پر رعب برستا ہوا۔ ہاتھ میں بانس جس میں ایک پھندا لگا ہوا تھا۔

ساوتری نے جب یہ عجیب شکل دیکھی تو جگہ سے اُٹھی۔ لیکن خوف اس درجہ غالب تھا کہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اُٹھ کر بہت تعظیم کی اور کہا۔

اگرچہ یہ تیری شان وشوکت تیرے دیوتا ہونے کا ثبوت دے رہی ہے۔ لیکن میں جاننا چاہتی ہوں کہ تو کون ہے اور اس وقت یہاں آنے سے کیا مطلب ہے؟

اس نے جواب دیا۔ میرا نام یَم ہے اور ستی وان کی روح قبض کرنے آیا ہوں۔ کیونکہ وہ نہایت نیک آدمی ہے۔ اس واسطے بجائے اپنے کسی نوکر کو بھیجنے کے میں خود آیا ہوں یہ کہہ کر اُس نے ستی وان کی روح جسم سے علیحدہ کرلی جو ساوتری کو انگوٹھے کی برابر دکھائی دی۔ یَم اُسے پھندے میں باندھ کر ایک سمت کو روانہ ہوا۔

ساوتری بھی جو اب تک خاموش کھڑی یہ دیکھ رہی تھی اس کے پیچھے پیچھے ہولی۔ اگرچہ وہ ستی وان کی طرف سے بالکل مایوس ہوگئی تھی۔ مگر امید نے اس وقت بھی اسکا دامن پکڑ رکھا تھا۔ اور اپنے پیارے شوہر کو اسی حالت میں چھوڑنے کو دل نہیں مانتا تھا۔

یَم نے پیچھے مُڑ کر دیکھا اور کہا۔" لڑکی تو کیوں میرے پیچھے آتی ہے۔ وہ جگہ زندہ آدمیوں کے جانے کی نہیں ہے۔ جو کچھ تیرے امکان میں تھا سو تو کر چکی۔ بس اب واپس جا۔

ساوتری نے جواب دیا۔ جہاں میرا خاوند جائیگا۔ خواہ خوشی سے یا مجبوراً میرا فرض ہے کہ اسکا ساتھ نہ چھوڑوں۔

اسی طرح اس سے سوال و جواب کرتی اسکے پیچھے پیچھے چلی گئی۔

یم پھر ٹھہر گیا اور اس کی اپنی شوہر کے ساتھ جاں نثاری اور محبت پر صد آفریں کی اور کہا۔ اے لڑکی بس اب واپس لوٹ جا۔ بہت دور تک آچکی۔ اور دیر زیادہ ہو تی جاتی ہی۔ راستہ دمبدم خوفناک اور دشوار گزار آتا جاتا ہی۔ تیرے پاؤں تھک کر زخمی ہو گئے ہونگے"

ساوتری نے کہا اے یم اپنا ساتھ چھوڑنے کو مجھے منع مت کر۔ میں بھی دوسری دنیا میں جاؤں گی۔ مجھے مرنے کا مطلق خوف نہیں کیا میں نے اپنی زندگی عمدہ طرح سے بسر نہیں کی ہی۔ میں اس دنیا کی جس کی ہر چیز فانی ہی مطلق پروا نہیں کرتی۔ یہ زندگی محض ایک خیال ہی اور ایسی جگہ جہاں ہر ایک کو موت آنے والی ہی کون سکونت گزیں ہونا چاہیے گا۔ علاوہ ان سب باتوں کے جو فرض ہی اسکو پورا کرنا چاہیے۔ اور میرا فرض اس دنیا فانی ہی میں نہیں بلکہ عالم جاودانی تک بھی اپنے خاوند کا ساتھ دینا ہے۔ اسواسطے تو ہی بتادے کہ میں کس طرح اسے تنہا چھوڑ سکتی ہوں۔

یم نے کہا میں تیری ان باتوں سے بہت خوش ہوا۔ اگر تیری ایسی ہی خوشی ہی تو مجھ سے کوئی مراد مانگ (سوائے ستی وان کی جانبری کے جو میں نہیں کر سکتا) اُسے البتہ میں پوری کر دونگا۔

ساوتری نے کہا اچھا ستی وان کے باپ کو اُس کی آنکھیں اور سلطنت جو وہ کھو چکا ہی دوبارہ حاصل ہوں۔

یم نے کہا اچھا مجھے منظور ہی لیکن اب تو واپس لوٹ جا۔ بہت تھک گئی ہوگی، لیکن ساوتری کو اب یم سے وہ دہشت نہیں رہی جو پہلے تھی۔ اس کی مہربانی نے اس کی زیادہ ہمت بڑھا دی۔ اور بولی۔ مجھے کیا تکان محسوس ہو سکتی ہی۔ جب میں اپنے شوہر کے ساتھ ہوں۔ اور تیرے ہمراہ ہونا کیا میرے لیے ایک دیوتا کے حضور

میں موجود ہونا نہیں ہے۔ کیا اس سے زیادہ اور بھی کوئی بات میرے لیے فخر کی ہوسکتی ہے۔ اے یم لوگ تجھ سے ڈرتے ہیں۔ لیکن میں دیکھتی ہوں کہ تو بڑا مہربان ہے۔ لوگ تجھے یم کہتے ہیں کیونکہ تیرا حکم کوئی رد نہیں کر سکتا۔ دیوتا ہر ایک پر مہربان ہوتے ہیں میں تجھ پر پورا بھروسہ رکھتی ہوں۔ میں تیری پرستش کرتی ہوں تیرے پاؤں پر گرنا باعث فخر سمجھتی ہوں۔ اے یم تو بھی مجھ پر رحم کر۔"

ان الفاظ نے یم کو بہت خوش کیا اور کہنے لگا۔ اچھا میں ایک اور مراد (سوائے ستی دان کی جان کے) پوری کردونگا۔

ساوتری نے کہا میرے باپ کے کوئی لڑکا نہیں ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ اس کے سو بیٹے ہو جائیں تاکہ اُس کی نسل مدت تک قائم رہے۔

یم نے کہا اچھا یہ بھی منظور ہے اب لوٹ جا تو بہت دور تک چلی آئی ہے۔ ساوتری نے کہا مجھے اپنے خاوند کے ساتھ ہونے میں راستہ کی دوری کی کچھ پروا نہیں۔ اے یم تو مہربانی اور انصاف کا مالک ہے۔ مجھے تجھ پر اعتماد کلی ہے۔ وہ جو نیک اور مہربان ہوتے ہیں اپنے اوپر بھروسہ رکھنے والوں کو کبھی نا امید اور شکستہ دل نہیں کرتے۔

اس پر یم نے کہا آج تک کسی نے مجھے اس طرح سے خطاب نہیں کیا۔ آدمی مجھ سے ڈرتے ہیں لیکن مہربان اور منصف مجھے کوئی نہیں کہتا اس واسطے اے ساوتری کوئی اور خواہش ظاہر کر (سوائے ستی دان کی زندگی کے)

ساوتری نے کہا اچھا میرے اور ستی دان کے سو لڑکے پیدا ہوں۔ یم نے کہا اچھا میں نے قبول کیا۔ یہ کہا اور منہ پھیر کر چلنے پر آمادہ ہوا۔ مگر ساوتری پھر اسکے پیچھے۔ مختصر یہ کہ وہ اسی طرح یم کے ساتھ ساتھ اپنے موثر الفاظ میں اس کی تعریف کرتی چلی گئی۔

یم ایک دفعہ اور ٹھہرا اور کہا ایک اور مراد مانگ ساوتری! اور پھر واپس چلی جا

ساوتری اسکے قدموں پر گر کر کہنے لگی۔

اے زبردست اور عالیشان یم انصاف پسند لوگ وہی کرتے ہیں جو بجا اور درست ہوتا ہے۔ تو نے مجھے اور ستی وان کو سٹو بیٹے دینے کا اقرار کر لیا ہے۔ اور یہ ممکن نہیں جب تک اس کی جان بخشی نہ کیجائے۔ آہ! اب مجھے اس بغیر جنت بھی درکار نہیں۔ اے یم تو نے اس وقت کوئی شرط بھی نہیں لگائی تھی۔ اس واسطے پھر میرے پیا کو مجھ سے ملا۔

یم نے کہا اے پاک اور اپنے خاوند کی جان نثار بیوی میں تیری خواہش پوری کرونگا اس سے پیشتر آج تک کوئی ذی روح مرنے کے بعد جاں بر نہوا۔ تو اور تیرا خاوند ایک مدت تک عیش و عشرت کی زندگی بسر کرینگے اور تیرا نام پاک طینتی اور وفاداری کے ساتھ صفحہ ہستی پر تاابد قایم رہے گا۔

اب ساوتری جنگل میں تنہا کھڑی ہے۔ لیکن دل باغ باغ ہے۔ اپنے نقش پا پر قدم رکھتی ہوئی اُسی جگہ پہنچی جہاں ستی وان بستر مرگ پر پڑا تھا۔ ساوتری نے ایک دفعہ اور اسکا سر اپنے زانو پر رکھا۔

سر رکھتے ہی ستی وان کی آنکھیں کھُل گئیں اور تمام ماجرا دریافت کیا۔ ساوتری نے تمام سرگذشت بیان کی۔ دونوں بامراد گھر لوٹے۔

اب پھر وہی خوشی کے دن آگئے۔ دیتسن کو مسند شاہی پر جلوہ افروز پایا۔ اور افسران ملک اس کے گرد۔ اس کے بعد مدت تک اُس نے بادشاہت کی۔ اور ساوتری کا پیارا نام وفاداری کے ساتھ ہر خاص و عام میں مشہور ہوگیا۔

رقمہ

انور علی طالب علم

حسن آرا بیگم

جس طرح سے رضیہ سلطانہ کا نظم سلطنت اور نورجہاں بیگم کی نازک خیالیاں صفحۂ تاریخ سے معدوم نہ ہوں گی۔ اُسی طرح حسن آرا بیگم کی عقلمندیاں اور ذہانت فلک تاریخ پر ستارہ بن کر چمکتی رہیں گی۔

اس بیگم کی سوانح پر نظر کرنے سے صاف ظاہر بلکہ اظہر من الشمس ہے کہ اگر ہماری بہنیں کوشش کو اپنا شعار بنائیں تو اپنی گردنوں سے ناقص العقلی کا ناموزوں اور بھدا طوق نکال سکتی ہیں۔ کتب تاریخ میں عورتوں کی دانشمندیاں، سخاوت، شجاعت، عدالت اور عبادت کا ذخیرہ موجود ہے۔ نسواں کے کارناموں سے اوراق تاریخ مملو ہیں۔ واقعات عالم شاہد ہیں کہ عورتیں کسی بات میں مردوں سے کم نہیں اور نہ ہونا ہی چاہیے۔ ورنہ خداوند کریم کے عدل پر حرف عائد ہوں گے۔ البتہ ہماری پست ہمتیاں ضرورت سے زیادہ ذلیل کرا سکتی ہیں۔ آج اقوام یورپ سے دوسری قومیں لگا نہیں کھا سکتیں کیا باعث؟ مردمان یورپ کو زنان یورپ پر کسی قسم کی فضیلت اور فوقیت نہیں دکھا سکتی۔ آخر کیا وجہ؟ یہی علم ہے جس سے عقل آتی ہے۔ یہی علم ہے جو انسان کو انسان بناتا ہے اور بام ترقی کا زینہ یہی علم ہے۔ اگر ہماری بہنیں کوشش کریں تو ممکن ہے کہ زنان یورپ سے کسی بات میں پیچھے نہیں رہ سکتیں۔ خداوند کریم مردمان ہند کو تعلیم نسواں کی طرف بجلد متوجہ کرلے۔

آمدم بر سر مطلب حسن آرا بیگم اُن عورتوں پر گوی سبقت لے گئی ہے جو سرمایہ ناز تھیں۔ یہ بیگم قبلا خاں جیسے شہنشاہ کی بیگم اور زینت محل تھی۔ قبلا خاں اُن بادشاہوں میں سے تھا جن کا ثانی پیدا نہیں ہوا۔

مصنف تاریخ چین جو ایک مشہور و معروف مورخ گزرا ہی بیان کرتا ہی کہ قبلا خاں کے برابر کوئی بادشاہ روے زمین پر نہیں ہوا ہی۔ چونکہ جولیس سیزر قیصر روم قدیم اور سکندر اور فرانس کا شہنشاہ نپولین بوناپارٹ سب سے نامی گرامی ہوئے ہیں۔ مورخ موصوف نے ہر ایک کے افعال کو قبلا خاں کے ساتھ مطابق دیکر اہل انصاف سے داد چاہی ہی کہ ان چاروں میں بزرگ ترین کون ہی۔

حسن آرا بیگم نہایت حسینہ اور جمیلہ خوش خو اور خوش رو تھی انتظام مملکت میں لاثانی سخاوت میں حاتم ہم اور شجاع تر تھی۔ علاوہ ازیں ایسی نیک بخت اور عاقلہ تھی کہ قبلا خاں کے سے شخص کو اُس سے مشورہ کرنے کی حاجت ہوتی تھی۔ اور جب کوئی مہم درپیش ہوئی۔ یا نیا قانون اجرا کرنے کا قصد کیا تو وزیروں کی صلاح کے علاوہ خاتون کا مشورہ لینا ضرور تھا اور میاں بی بی میں پہلے رد و کد ہو لیتا تھا تب امر سنگین میں حکم ناطق دیا جاتا تھا۔ اس کی عقلمندی کی ایک یہ بڑی دلیل ہی کہ جب سنگ کے گھرانے کا فغفور جو جنگ کر رہا تھا گرفتار ہو کر آیا۔ تو قبلا خاں نے خوشی سے پھول کر بیگم کو آگاہ کیا۔ خاتون نے آہ سرد بھر کر کہا کہ اے خاقان یہ مقام خوشی کا نہیں بلکہ رنج کا ہی کیوں کہ جب تجربے میں یہی آیا ہی کہ انقلاب روزگار تمام سلطنتوں کے لیے لازم ہی تو یہی روز زوال و خرابی کا تمھارے گھر کے لیے بھی آسکتا ہی۔ بس ان بچاروں کے ساتھ ایسا پیش آؤ جیسا کہ چاہتے ہو کہ تمھاری آل کے ساتھ پیش آوے۔ اگر خدانخواستہ ایسا نامبارک دن دیکھنا اُن کے نصیب میں بھی ہووے۔

یہ نصیحت سُن کر خاقان سناٹے میں سر زانو پر رکھے دیر تک خاموش رہا اور اس کے بعد حکم دیا کہ ہر طرح کی عزت و آرام سے فنا کا شہنشاہ نظربند رکھا جائے۔

مسز آغا محمود نمازی

از ٹانگو (لوئر برما)

خاموشی

جہاں اخلاق و عادات کی اور تعلیمیں ہیں۔ وہاں خاموشی کی تعلیم بھی دی گئی ہے اس میں چند باتیں قابل غور اور فائدہ دینے والی ہیں۔ اول کم بولنے والا اکثر گناہوں سے جو زبان کے متعلق ہیں محفوظ رہتا ہے۔ غیبت چغل خوری جو مردوں خصوصاً عورتوں کے لیے سب سے زیادہ لاعلاج مرض ہیں خاموش رہنے والے کے پاس نہیں آتے۔ دوسرے جو شخص کم بولتا ہے۔ اس کی وقعت ہر شخص کی نگاہ میں ہو جاتی ہے۔ سعدی صاحب فرماتے ہیں۔

تا مرد سخن نہ گفتہ باشد عیب و ہنرش نہفتہ باشد

جسکا مطلب یہ ہے کہ جب تک انسان گفتگو نہیں کرتا اُس کے عیب و ہنر لوگوں کی نگاہوں سے چھپے ہوئے رہتے ہیں۔ خواہ وہ عیب زبان کی کم مائگی کے ہوں۔ یا دوسری قسم کے۔

بوستاں جو سعدی کی تصنیف ہے اس میں حاتم اصم کا قصہ لکھا ہے جو قصداً بہرے بنے ہوئے تھے۔ اصم زبان عربی میں بہرے کو کہتے ہیں اُن کا اس سے یہ منشا تھا کہ اگر کوئی مجھے برا بھلا کہے تو مجھے اسکو جواب دینا نہ پڑے۔ جس سے میں گناہگار نہ ہوں اور اسکے حسنات یعنی نیکیاں میرے نامۂ اعمال میں لکھی جائیں۔ اسلیے کہ یہ مسئلہ ہے کہ جو کوئی کسی کی بُرائی کرتا ہے۔ بُرائی کرنے والے کی نیکیاں جس کی وہ بُرائی کرتا ہے اسکے نامۂ اعمال میں لکھی جاتی ہیں۔ بھلا انصاف بھی کوئی چیز ہے۔ اس سے زیادہ بیوقوفی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ناحق اپنی نیکیاں کسی دوسرے کو دیدی جائیں۔ مردوں میں یہ بات اس قدر نہیں ہے جس قدر عورتوں میں ہے عجب نہیں کہ اسی وجہ سے بمقابلہ مردوں کے عورتوں کو خوراک دوزخ زیادتی کے ساتھ کیا گیا ہو۔

جہاں دس بیس عورتیں ایک جگہ اکٹھی ہوئیں اور دنیا کے قصے قضیے چھڑے۔ خواہ وہ کسی کے گھر شادی کی شرکت سے گئی ہوں یا غمی کی۔ لیکن وہ بُری عادت ہر جگہ اُن کے ساتھ رہیگی۔ اس کوچہ میں تعلیم یافتہ جاہل شریف رذیل سب برابر ہیں۔ بڑے گھرانے کی بیگمات ہوں یا چھوٹے گھرانوں کی خاتونیں۔ لیکن یہ رنگ یا وہ کوئی اور دوسروں کی عیب جوئی ہر ایک میں جھلکتا نظر آئے گا۔

زبان کو تلوار سے مشابہت دی گئی ہے۔ پس جس طرح تلوار کو کسی خاص موقع پر نیام سے نکالا جاتا ہے اگر اسی طرح زبان کو کسی مناسب جگہ استعمال کیا جائے تو بہتر ہے ورنہ جس طرح تلوار کی جا و بیجا ضرب سے انسان نقصان اُٹھاتا ہے اسی طرح زبان سے جا و بیجا کام لینے والا خرابی میں پڑجاتا ہے۔ تمام فسادوں کا گھر لڑائی کی جڑ یہ زبان ہے۔ اسی کی وجہ سے انسان نیک نام ہوتا ہے اور اسی کی وجہ سے بدنام۔

یہ بھی خیال رہے کہ جب گفتگو زیادہ کیجائے گی۔ خواہ کتنی ہی احتیاط کیوں نہ کی جائے مگر کوئی نہ کوئی بات ایسی زبان سے نکل جائے گی جس سے فساد پیدا ہوجائیگا۔ جہاں کسی موقعہ پر عورتیں ایک جگہ بیٹھیں کوئی نہ کوئی اس قسم کا واقعہ نکل آئیگا جس سے کائیں کائیں شروع ہوجائے گی۔ بھلا ان سے کوئی پوچھے کہ تمھیں دوسروں کے معاملات سے کیا غرض۔ اگر اتنی دیر کسی دینی مسئلہ کے متعلق تم گفتگو کرو تو کونسی بُرائی ہے۔ اور اگر کوئی بیچاری اس جماعت میں خاموش بیٹھی رہی تو سب کے سب اسکو نکو بنائیں۔ سبحان اللہ۔

جراح الکلام اشد من جراح السہام اسکا مطلب یہ ہے کہ زخم بات کا تیر کے زخم سے زیادہ تکلیف دینے والا ہے۔ لیکن جب ہی تو کہ زبان کی تلوار کو موقعہ بے موقعہ چلایا جائے۔ اور اگر انسان خاموش رہے تو کیوں کسی کے اس بیجا وار کا زخم لگے۔

سفیان بن عبداللہ جو رسول اللہ کے صحابی تھے وہ ارشاد فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ کون شے میرے لیے زیادہ خوفناک

حضور نے اپنی زبان پکڑ کر ارشاد فرمایا "یہ" مطلب یہ کہ اگر خاموشی کو اپنا شعار بنا لو گے تو کبھی کسی بلا میں مبتلا نہ ہو گے۔ بعض لوگ کسی کا عیب بیان کرتے وقت یہ کہدیا کرتے ہیں کہ جب اس میں یہ عیب موجود ہے تو پھر ہم کیوں گنہ گار ہوئے۔

یہ خیال محض غلط ہے۔ غیبت نام ہی اسکا ہے کہ کسی کے عیب کو جو اُس میں موجود ہو اظہار کرنا اور اگر وہ عیب اس میں موجود نہ ہو اور اس کی جانب منسوب کیا جائے تو وہ بہتان ہے جو غیبت سے زیادہ گناہ ہے۔ غرض کہ خاموشی ایسی چیز ہے جس کی وجہ سے انسان تمام آفتوں سے محفوظ رہتا ہے۔

حدیث میں ہے من سکت سلم ومن سلم نجا جس نے خاموشی اختیار کی سلامت رہا اور جو سلامت رہا اُس نے نجات پائی۔ لفظ سلامت کا یہاں یہی منشا ہے کہ تمام آفات زبانی سے محفوظ اور بچا ہوا رہا۔ اور جب ان آفتوں سے جو (ام الآفات ہیں) سلامت رہے گا۔ نجات بھی ضرور پائے گا۔

جھوٹ بھی اسی سے پیدا ہوتا ہے غیبت وچغلخوری بھی اسی کی بدولت ہوتی ہے پس لازم ہے کہ اس گوشت کے لوتھڑے کو جو تمام حصۂ جسم سے زیادہ نقصان دہ ہے جا و بیجا استعمال نہ کیا کریں۔

کرتی ہے فزوں قدر بشر خاموشی
ہر عیب کو کرتی ہے ہنر خاموشی

کیسا ہی کوئی جاہل ہو اور خاموشی اختیار کرے ہرگز اسکا عیب لوگوں پر ظاہر نہ ہو سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں ایسے آسان اور عمدہ طریقہ کو چھوڑ کر ہماری بہنیں ہر وقت دوسروں کی عیب جوئی غیبت وغیرہ میں پھنسکر مفت کے گناہ سمیٹتی ہیں۔

راقم
مقبول احمد نظامی سیوہاروی

آپ بیتی

مفصلہ ذیل مضمون بہت عرصہ ہوا کہ ہمارے پاس آیا تھا ہم نے اسکو بوجوہات نہیں چھاپا تھا لیکن اب پھر مضمون نگار نے ہم سے تقاضا کیا کہ ہم اسکو چھاپیں۔ مصلحت کا لحاظ صرف اسی حد تک ہو سکتا ہے۔ جب تک انصاف اور راستی ہاتھ سے نہ جانے پائیں۔ ہم نے غور کیا اور ان واقعات پر نگاہ دوڑائی جو ہمارے تجربے میں آ چکے ہیں تو ہمیں انصاف کے خلاف معلوم ہوتا ہے کہ ہم مظلوموں کی آواز ناظرین خاتون تک نہ پہنچائیں۔

ہندوستانی مذموم اور خلاف شرع و خلاف عقل رسوم کو قائم رکھنا اب آسان بات نہیں خدا کسی نہ کسی وقت سب برائیوں کے انسداد کرنے کے سامان خود بخود پیدا کر دیتا ہے۔ اب شادیوں میں اصلاح کا وقت آگیا ہے اور اگر لڑکیوں کے والدین خود اس اہم مسئلہ کی طرف متوجہ ہوں گے تو پھر اُن کو اصلاح پسند پارٹی سے شکایت کا کوئی موقع نہ ہوگا۔

اڈیٹر

زندگی گزارنے کو کُتا بلّی بھی گزار دیتے ہیں۔ لیکن کس کام کی۔ اسی طرح ہر شخص کی زندگی کٹ جاتی ہے۔ زمانہ حیات کا ختم ہو جاتا ہے۔ مگر بُری گھڑی کی یاد اُس کے دل سے نہیں جاتی۔ قوم ترقی کے زینے طے کر رہی ہے اور کرے گی خیالات میں سیکڑوں تبدیلیاں ہو گئیں۔ ہوا کا رخ بدل گیا۔ زمانہ کا رنگ کچھ سے کچھ ہو گیا۔ مگر واہ میری پھوٹی قسمت کہ جس بات کے لیے دُہائیاں دی گئیں۔ ہزاروں قسم کے بہانے کیے گئے ہر چند ٹالا مگر وہ ہو کر ہی ٹلی۔

آہ مجھ جیسا بدنصیب کوئی نہ ہوگا۔ اس سے تو مجھے چولھے میں جھونک دیا جاتا بہتر ہوتا۔ یہ تکلیف یہ ہر وقت کی جلن تو نہ ہوتی۔ گھڑی ساعت پل غرضکہ کوئی لمحہ ایسا

نہیں گزرتا جو مجھے اپنے پھوٹے ہوئے نصیب کے نوحہ سے فرصت ملتی ہو۔ یہی غم ہی جو تمام زندگی کے لیے کافی ہو گیا ہی۔ دنیا خوش و خرم ہی۔ زمانہ کی دلہنیں عیش و عشرت میں زندگی کاٹ رہی ہیں۔ لیکن میں ہوں کہ ہر وقت کف افسوس ملنے کے سوا دوسرا کام نہیں۔

لیکن یہ قصور کس کا ہی۔ یا تو میرے ماں باپ کا یا اُس ناشاد رسم کا جس کی وجہ سے لڑکی اپنی زباں سے مرضی نامرضی کا اظہار نہیں کرسکتی۔ خدا اُن کو خوش رکھے جنھوں نے مجھے اس تنگ و تاریک تکلیف دینے والی کوٹھری میں قید کیا۔ ہرچند میں نے اشارات کنایات سے سمجھایا رو رو ہو کر جتلایا کہ یہ شادی میری مرضی کے خلاف ہی لیکن کم بخت لالچ کا برا ہو کہ مال کی ہوس میں اپنے اُس خون جگر کو جسے حوادثات زمانہ سے مثل اُس پھول کے بچایا جسے باغباں کیاری میں محفوظ رکھتا ہی آن کی آن میں دست ظلم گلچیں کی طرح مل دَل کر پھینک دیا۔ بھلا ان سے پوچھو کہ تمام عمر اس نالائق اور کم ظرف خاوند سے میری گزرے گی یا تمھاری۔ لیکن اسکا خیال کسے ہوتا ہی نہ معلوم بیٹی کا کیا بار ہوتا ہے کہ اُس کی زندگی کا شریک خواہ کیسا ہی ہو ہاتھ پکڑ کر حوالہ کر دیا جاتا ہی۔

میں اپنے واقعہ کو اُن سچے لفظوں میں سنانا چاہتی ہوں جو مجھ پر گزرے ہیں میری عمر اب ۱۶ سال کی ہی میری شادی کو ایک برس کا زمانہ ہو گیا۔ لیکن مجھے معلوم نہیں کہ شادی کے کیا معنی ہیں۔

میرے والدین نے بس اور تو کیا کہوں۔ خدا انہیں ہمیشہ خوش و خرم رکھے مجھے ایک ایسے شخص کے حوالہ کرنا چاہا جو علاوہ حسن ظاہری کے سیرت باطنی سے بھی مُعرا تھا لکھا پڑھا بھی کچھ یونہی سا تھا ہاں اسکا خاندان ایک بڑے پایہ کا شریف صحیح النسب اور مالدار تھا۔ اور ہر طرح کے جہیز کی امید تھی لڑکا علیل تھا اور بیماری گو مہلک نہ تھی تاہم خطرناک ایسی تھی کہ شادی کا کرنا نہ کرنا برابر تھا۔ میرے والدین کو باوجودیکہ اسکا علم تھا لیکن جان بوجھ کر مجھے اندھے کنوئیں میں ڈالدیا۔ صرف اس کنوئیں میں ایک سنہرا جال چمکتا ہوا نظر آتا تھا جو اُن کو نہایت بھلا معلوم ہوا۔ غیروں نے سمجھایا اپنوں نے فہمائش کی لیکن اُن کی سمجھ میں خاک نہ آیا اُن کو یہ کہکر تسلی دیدی کہ مرض کا علاج ہونا ممکن ہی۔ مانا۔ لیکن حسن صورت و سیرت بھی تو غور سے دیکھنے کی چیزیں ہیں۔ دولت چلتی پھرتی مایا ہی۔ آج یہاں ہی کل وہاں۔ اس ہرجائی

جہیز کا کیا اعتبار دیکھنا قابلیت کا ہی جو ہمیشہ کام آنے والی شے ہے۔

نکاح کے وقت آنے والی مصیبت کی گھڑی کے خیال سے مجھے غش آگیا اور روتے روتے ہچکیاں لگ گئیں لیکن کسی کم بخت کو یہ خیال نہ ہوا کہ اب بھی انکار ہو سکتا ہی۔ آخر دیدۂ دانستہ مجھے آگ میں ڈال دیا شعلوں نے میرے دامنوں کی طرف توجہ کی اور میں آناً فاناً جل کر راکھ ہو گئی۔

خدا اس ناپاک رسم کا بُرا کرے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ نکاح کس طور سے جائز ہوا جبکہ میری مرضی اس مجوّزہ شادی کے خلاف تھی۔ میں اب زندہ ہوں لیکن مُردوں سے بدتر۔ کھاتی پیتی ہوں لیکن آہ وہ کھانا خود مجھے کھائے جاتا ہی۔ بہنو! کوئی وجہ نہیں کہ اس مسئلہ کے متعلق گفتگو نہ کی جائے۔ مجھ سے کوئی رائے لے تو میں زور سے کہوں گی کہ جبتک فریقین کی مرضی کھلے الفاظ میں نہ لے لی جائے ہرگز نکاح نہ کیا جائے۔ ماں باپ کا کیا ہی وہ تو دو بول پڑھا کر نچنت ہو جاتے ہیں۔ غریب لڑکی کی جس طرح زندگی گذرے خواہ وہ خوش رہے یا غم و غصہ کھا کر زندگی بسر کرے۔ ہزاروں مثالیں موجود ہیں سیبوں خرابیاں پڑ گئیں خاندان کے خاندان تباہ و برباد ہو گئے مگر آنکھیں نہیں کھلتیں ہوش نہیں آتا۔

بہنو! جب کبھی تمھاری مرضی کے خلاف کوئی شادی کی تجویز ہو فوراً انکار کر دو اس کی قطعی پروا نہ کرو کہ ماں باپ ہمارے خوش ہونگے یا ناخوش۔ پڑے ہو جاؤ۔ تمام عمر کنوارے پنے میں گزار دینی اچھی ہی لیکن ہمیشہ آگ میں سلگنا اچھا نہیں۔ نالائق اور نافرمان کہلائی جاؤ گی بُری کہلائی جاؤ۔ اس ہر گھڑی کی مصیبت سے تو بچ جاؤ گی

پاس شرافت ہی جس طرح گزرتی ہی گزارتی ہوں۔ لیکن خدا سے دعا ہی کہ میری کسی بہن کو اُس کی طبیعت کے خلاف شوہر نہ دے۔

رقمہ

زہرہ

اڈیٹوریل

اصلاح کی فتح اور مضر رسوم کی شکست

ذیل میں ہم نہایت خوشی کے ساتھ ایک جلسہ شادی کی مختصر کیفیت درج کرتے ہیں جس میں بجائے غیر مفید رسوم پر روپیہ برباد کرنے کے اس کو نہایت مفید طریقہ سے صرف کیا گیا۔ خدا تمام مسلمانوں کو ایسی انجام بینی کی توفیق عطا فرمائے۔

قصبہ بڑوٹ ضلع میرٹھ میں حافظ محمد خلیل صاحب ٹھیکہ دار نہر نے اپنی لڑکی کی شادی میں جو نمونہ اصلاح مراسم کا دکھایا ہی وہ اس قابل ہی کہ بذریعہ اخبارات اسلامی حلقہ میں پیش کیا جائے تاکہ اس کی تقلید سے مسلمانوں کو دین دنیا کا فائدہ پہونچے

۲۲- اپریل سنہ ۱۹۱۱ء کو رڑکی سے برات آئی دولھا کی جانب سے سامان بری (جس میں رنگا رنگ مٹی کی مٹکیوں میں میوہ کھیلیں شکر مہندی وغیرہ بھری تھی) اور خوانوں میں متعدد جوڑے جو گوٹہ پٹہ سلمہ ستارہ سے جگمگا رہے تھے پیش کیا گیا مگر حافظ صاحب نے صاف انکار کر دیا۔ جس پر ہر طرف سے آواز آئی کہ یہ کیا غضب کرتے ہو کہیں خدائی میں بری واپس ہوا کرتی ہی۔

گھر میں جب یہ خبر پہونچی تو تمام مستورات نے جن کی آنکھیں بری کے اشتیاق میں فرش راہ ہو رہی تھیں شور مچایا کہ شریفوں اور بھلے آدمیوں میں کوئی ایسے بدشگون کرتا ہی کہ بری واپس کی جائے۔

ناظرین خوب سمجھتے ہونگے کہ اس درمیان میں کس قدر لغو مراسم مثلاً پیر گھڑی ہاتھ دھلائی دسترخوان وغیرہ ہوا کرتے ہیں۔ ایک نمونے دیجیے۔ اب صبح ہوئی تو پھر رسوم کا وقت آیا یعنی صبحائی رونمائی جلوہ سلامی گوٹہ اور پٹہ وغیرہ مگر شیر مرد نے

ایک نہ ہونے دی اورکسی کی ایک نہ چلنے دی۔ رخصت کے وقت سامان جہیز (جو نہایت سلیقہ کے ساتھ اعلیٰ پیمانہ پر کارآمد اور آسائش کی چیزوں سے مہیا کیا گیا تھا) باہر نکالا گیا۔ آخر وقت تک ایک حبہ دولہا کی طرف سے خرچ نہیں کرایا گیا بکھیر وغیرہ بھی موقوف رہی۔ البتہ مندرجہ ذیل کارہائے خیر کے لیے ۶۹ رُپیے کی رقم مخصوص کی گئی جس میں سے ۳۵ روپیہ کی رقم دولہا والوں کی طرف سے ہے۔

تعمیر جامع مسجد بڑوٹ تیس روپیہ، عام مسجد بڑوٹ آٹھ روپیہ، مدرسہ اسلامی بڑوٹ پانچ روپیہ، اسلامیہ اسکول اٹاوہ بارہ روپیہ۔ مدرسۃ العلوم علی گڈہ پانچ روپیہ، مدرسہ عربی دیوبند پانچ روپیہ، حجاز ریلوے دو روپیہ، اس کے بعد لڑکی کو بخیر وخوبی رخصت کیا گیا۔ خداوند عالم اس شادی اور کار خیر کو مبارک کرے۔

مدرسہ مصباح الاسلام

بفضلہ تعالیٰ مورخہ ۲۹۔ اپریل ۱۹۱۱ء کو مدرسہ مصباح الاسلام قصبہ اترولی ضلع علی گڈہ میں ایک جلسہ بعد نماز جمعہ منعقد ہوا جس میں تمام قصبہ کے مسلمان اور بہت سے ہندو برادران بھی شامل ہوئے۔ اول وعظ مولانا سعید احمد صاحب نے فرمایا۔ بعد کو میلاد شریف پڑھا گیا۔ بعد ختم ہونے میلاد شریف حاضرین پر پھول برسائے گئے۔ اور افتتاح مدرسہ کی شاخ انگریزی کا اس ساعت سعید میں ہوا۔ ہیڈ ماسٹر مدرسہ کے رشید الملک صاحب سابق طالب علم علی گڈہ کالج مقرر ہوئے ہیں۔ انگریزی کی باقاعدہ تعلیم ۳۔ مئی ۱۹۱۱ء سے شروع ہوگئی ہے۔

ہندوؤں میں تعلیم نسواں کی ترقی

بھاؤنگر میں ۲۰ مئی کو بمقام مہوا لڑکیوں کے مدرسے میں تقسیم انعامات کا جلسہ منعقد ہوا تھا۔ حضور مہاراجہ صاحب معہ رانی صاحبہ رونق افروز جلسہ تھے انعامات مہارانی صاحبہ نے دست مبارک سے تقسیم فرمائے اور اپنی تقریر میں تعلیم نسواں سے جو فوائد ملک کو پہنچتے ہیں ان پر بڑا زور دیا۔

اب سے چار سال پیشتر جب رانی صاحبہ بیاہی آئی تھیں تو شُد بُد گجراتی جانتی تھیں ان کا مجمع عام میں اب تقریر کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ انہوں نے خود اپنی تعلیم میں کس قدر ترقی کی ہے۔ غالباً یہ پہلا ہی موقع تھا کہ انہوں نے عام جلسے میں تقریر کی۔ مہارانی صاحبہ نے انگریزی میں بھی خاصی مہارت پیدا کر لی ہے۔ مہارانی صاحبہ کا اپنی شادی کے بعد تعلیم میں ترقی کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ حضور مہاراجہ صاحب کس قدر بیدار مغز اور ضروریات زمانہ سے واقف ہیں۔

افسوس کہ مسلمانوں میں تعلیم نسواں کی بہت ہی کمی ہے اور اگرچہ قوم اس بات کا بار بار اعتراف کر چکی ہے کہ تعلیم نسواں کو بیحد ترقی دے کر قوم کی ترقی کے لیے راستہ پیدا کر دیا جائے لیکن اس وقت تک جیسی کوشش کہ اس تعلیم کو فروغ دینے کے لیے لازم تھی اس کا عشر عشیر بھی ظہور میں نہیں آیا۔ اس لیے اب تو مسلمانوں کو اس کی طرف توجہ کرنا چاہیے۔

زنانہ نارمل اسکول

ناظرین اس بات کو سن کر بہت خوش ہونگے کہ جو اراضی زنانہ اسکول علی گڈھ کے لیے گورنمنٹ سے چاہی گئی تھی۔ اب دو سال کے بعد گورنمنٹ عالیہ نے

آجکل کی بہت سی روشنخیال بہنیں بھی مبتلا ہیں۔

ہم سب سے پہلے اپنی ناظرات کو اس بات کا یقین دلانا چاہتے ہیں کہ اپنے ہاتھ سے اپنے لیے کام کرنا اس سے بہتر انسان کے لیے کوئی شغل نہیں۔ اپنے لیے کسی کام کے بھی کرنے میں انسان کو عار نہ کرنا چاہیے۔ بزرگان دین کے حالات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ وہ ہمیشہ اپنے کام خود کرتے تھے۔

چنانچہ سرور کائنات اپنے کاموں کو خود کرتے تھے اور کبھی ان کو اس بات کی محتاجی نہ تھی کہ دوسروں سے اپنے کسی کام کی خواہش کریں۔ سیدۃ النسا حضرت فاطمہ اپنے گھر کا تمام کام کاج خود کرتی تھیں۔ نیز امہات المومنین اپنے اپنے کام خود انجام دیتی تھیں۔ بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ اور خلفاء راشدین سب اپنے کام خود ہی کرتے تھے باوجود اسکے کہ آنکے پاس کافی ذریعے موجود تھے اگر وہ دوسروں سے کام لینا چاہتے۔

بزرگان دین کے علاوہ زمانہ حال کے بادشاہوں کی مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں اور ہم کو عمدہ سبق سکھا رہی ہیں۔ ملکہ معظمہ انجہانی نے اپنی سب بیٹیوں کو اپنے ہاتھ سے کھانا پکانا اپنے کمروں اور سامان آرائش وغیرہ کو خوب صاف رکھنا اور سینا پرونا سب پورے طور پر سکھا دیا تھا۔ یہ بچپن کی تربیت مابعد کی زندگی میں انکے لیے ایک بڑا سرمایہ مسرت ثابت ہوا۔ اور انہوں نے بیکاری کی تکلیف دہ بیماری میں کبھی اپنے آپ کو مبتلا نہ پایا۔

ہمارے موجودہ بادشاہ سلامت کو سب سے اول جہاز رانی کی تربیت دی گئی جو ملاحوں کا کام ہی۔ ایک ادنیٰ سے ادنیٰ جہاز کا ملازم بھی وہی کام کرتا تھا جو سلطنت برطانیہ کے تخت وتاج کا وارث کرتا تھا

شاہ جرمنی جسکا مرتبہ یوروپ کے کسی دوسری سلطنت کے تخت نشین سے کم نہیں ہے

اور جو ایک نہایت طاقتور سلطنت کا مالک ہے اُس نے اپنے بیٹے اور بیٹیوں کو معمولی دستکاریوں کے کام سکھائے۔ چنانچہ اپنے بیٹوں سے ہل چلوائے اور اپنی بیٹیوں کو علاوہ ان تمام کاموں کے جو فرائض خانگی کے متعلق ہیں جن میں کمروں میزوں اور فرنیچر وغیرہ کا صاف کرنا بھی ہے۔ اپنے ہاتھ سے ایٹھیں پاتھنی اور پکانی بھی سکھائیں۔ اور وہ سب کے سب اپنی موجودہ زندگی میں اپنے والدین کی فراست اور اچھی تربیت کے مشکور ہیں۔ اور ہر کام کو بڑی مستعدی اور خوشی کے ساتھ انجام دینے کے لیے تیار رہتے ہیں۔

اس آخری زمانے میں سلطان عبدالحمید خاں معزول جو مسلمانوں میں سب سے طاقتور اور بڑے بادشاہ تھے قصر یلدز میں اکثر بڑھئی کا کام کرتے تھے اور اس فن میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔

مسٹر گلیڈاسٹن جنکو لوگ بے تاج کا بادشاہ کہتے تھے وہ اپنے ہاتھ سے لکڑیاں کاٹا کرتے تھے اور اس ورزش کی وجہ سے انہوں نے ہمیشہ اپنی صحت کو قائم رکھا اور نوے سال کی عمر تک ان کے ہوش وحواس بالکل درست رہے اور آخری دم تک اپنے ملک اور قوم کی خدمت انجام دیتے رہے۔

اب دوسری جانب ایک قصہ سُنیے جو غور کرنے کے قابل ہے کہ ایک متمول شخص کی بیوی جسکو ماں باپ نے بڑے ناز و نعم میں پرورش کیا تھا اور جس نے کبھی کوئی دُکھ نہیں سہے تھے۔ اس کی جب شادی ہوئی تو پلنگ پر لیٹے لیٹے اپنی ماما کو بلا کر کہا کہ میرا ہاتھ ادہر کا تھک گیا ہے میرا پہلو ذرا ادہر اُدہر کو بدل دو۔ تم کہاں مر گئی تھیں مجھے دیر سے تکلیف ہو رہی ہے۔

علاوہ اسکے کہ کام کرنے سے انسان کو مستعدی اور ایک خاص مسرت اور تندرستی حاصل ہوتی ہے اس بات کا لحاظ بھی ضروری ہے کہ بوجہ نشیب و فراز کے انسان کو

بعض وقت کام کرنے کے لیے مجبوریاں بھی پیش آجاتی ہیں۔
چنانچہ امیر عبدالرحمٰن خاں مرحوم جب اپنے چچا سے لڑکر ملک سے بھاگ کر روس میں پہونچے جہاں اُن کو کوئی نہیں جانتا پہچانتا تھا۔ ان کے پاس ایک دن کے بھی کھانے پینے کا سامان نہ تھا۔ روس کے گورنر کے پاس جاکر اپنا حال ظاہر کرتا اور اپنے گذارہ کے لیے پنشن مقرر کرانا اسکے لیے کچھ عرصہ درکار تھا۔ ایسی حالت میں شہزادہ عبدالرحمٰن خاں نے اپنے ہاتھ سے محنت کرکے کچھ عرصہ کے لیے اپنا پیٹ پالا۔ اگر وہ ہندوستانی شہزادوں کی طرح نازک اندام اور کام سے متنفر ہوتے اور اپنے ہاتھ سے کام کرنے کو عار سمجھتے تو شاید ان کو کابل کے تخت تک رسائی ممکن نہ تھی۔

نمایش

نمایش کے متعلق ہم اس سے قبل اعلان کرچکے ہیں کہ دسمبر میں ضرور ہوگی ناظرات خاتون کو ابھی سے تیاری کرنی چاہیے۔ ناگپور میں اس کے متعلق ابھی سے ایک کمیٹی قائم کرنے کی تجویز ہے۔ اور چند بڑی بڑی معزز یوروپین لیڈیوں نے اس کام میں مدد دینے کا وعدہ کیا ہے۔ اور جناب چیف کمشنر صاحب بہادر کی میم صاحبہ نے جو صوبہ وسط ہند میں سب سے بڑے حاکم ہیں اس نمایش کی سرپرستی منظور فرمائی ہے۔

نوٹس منجانب سکرٹری تعلیم نسواں سیکشن علی گڈھ

مجکو زنانہ نمایش کی مصنوعات کے متعلق کسی جوشیلے نوجوان کی اشد ضرورت تھی کہ وہ خط و کتابت میں اور نیز اشیا، کی فراہمی میں مجکو مدد دیں۔ مجکو بہت خوشی ہی کہ مسٹر نور محمد صاحب بی اے علی گڈھ کالج نے امسال مجکو پوری مدد دینے کا وعدہ کیا ہی اور میں نے اُن کو نمایش کے لیے اسسٹنٹ سکرٹری مقرر کیا ہی اور اُن کو اختیار دیا ہی کہ وہ میری جانب سے نمایش کی کامیابی کے لیے میری ہدایت اور مشورہ سے کوشش کریں۔ اِس وقت میں اُن کا مشکور ہوں اور مجھے امید ہی کہ وہ اپنے کام سے قوم کو بھی مشکوریت کا موقع دینگے۔

رجسٹرڈ نمبر ۲۷۱

خاتون

جلد ۶ | بابت ماہ جولائی سنہ ۱۹۱۰ء | نمبر ۶

اڈیٹر شیخ محمد عبداللہ بی اے۔ ایل ایل۔ بی سکریٹری تعلیم نسواں سکشن

فہرست مضامین

محمد عبدالسلام پرنٹر کے اہتمام سے

مطبع فیض عام علی گڈھ میں چھپا

۱۲- اگست سنہ ۱۹۱۰ء

شیخ عبداللہ بی اے پبلشر نے علی گڈھ سے شائع کیا

خواب غفلت سے بیدار ہوئے تو آناً فاناً میں ایران و رومہ کی گردن کش بادشاہ
نے ان کے آگے سر تسلیم خم کر دیئے۔ روم اور عجم کی دھاک ایک زمانہ میں تھی
اصل یہ ہے کہ اس وقت کی دنیا انہی دونوں سلطنتوں پر منحصر تھی پھر کیا یہ تعجب کی
بات نہیں کہ عرب کے بادیہ نشین اُٹھ کر انہیں آن کی آن میں حرف غلط کی طرح
صفحہ ہستی سے ناپید کر دیں۔

اس کا جواب ایک جہاں دیدہ رومی نے خوب دیا ہے۔ جب قیصر کو عربوں
نے پے در پے شکستیں دیں تو ان کے قلت سامان و لشکر کو دیکھ کر وہ بہت جھلا کر
جھنجلا کر رومہ کے سرداروں سے اس کا سبب دریافت کیا سب نے سر نیچے
ڈال دیئے۔ اس پر ایک تجربہ کار دانا رومی سے نہ رہا گیا اُس نے کہا "عرب کے
اخلاق ہمارے اخلاق سے اچھے ہیں۔ وہ رات کو عبادت کرتے ہیں اور
دن کو روزے رکھتے ہیں۔ کسی پر ظلم نہیں کرتے۔ آپس میں برابری سے ملتے
جلتے ہیں۔ ہمارا یہ حال ہے کہ شرابیں پیتے ہیں بدکاریاں کرتے ہیں۔ قول و
اقرار سے پھر جاتے ہیں اوروں پر ظلم کرتے ہیں۔ اس کا یہ اثر ہے کہ اُن کے
ہر کام میں جوش اور استقلال پایا جاتا ہے اور ہمارا جو کام ہے ہمت اور استقلال
سے خالی ہے"

یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ عربوں کو اکثر اپنے سے چند بلکہ بعض اوقات
دس گنے دشمن سے لڑنا پڑا مگر میدان جب رہا عربوں ہی کے ہاتھ رہا ان کے
پاس سامان حرب بھی دشمن سے کم درجہ کا تھا۔ ایک دفعہ تو رومیوں نے عرب کے
تیروں کو مسخر اپن میں تکلوں سے تشبیہ دی مگر ان ہی تیروں سے عربوں نے
اُن کے تکلے کی طرح سب بل نکال دیئے۔

یرموک کے معرکہ پر جب رومیوں کا ٹڈی دَل دیکھ کر ابو عبیدہ رض پریشان ہوئے

تو کمک کے واسطے سیدنا فاروق اعظم کو مدینے میں لکھا آپ نے جواب میں لکھا کہ
کمک بھیجنے کو بھیجدی ہی مگر فتح اور شکست فوج کی قلت اور کثرت پر موقوف
نہیں۔ مسلمانوں کی کامیابی کا راز خدا اور اُس کے پیغمبر برحق کے احکام کی اطاعت
تھا۔ جب تک وہ ان پاک تعلیمات پر کاربند رہے نصرۃ اور ظفر ان کے آگے آگے
چلتی رہی۔

الغرض فتوحات عرب کے سیلاب نے ایک طرف دریای سندھ پر جا کر
دم لیا تو دوسری طرف سارا شمالی افریقہ طے کرتا ہوا مراکو کے اُس پار پہنچا اسوقت
بہادران اسلام کی تلواریں نیام سے باہر تھیں۔ فتح مندی اور اشاعت حق کے
شوق سے طبیعتیں بھرپور تھیں۔ مراکو کے اُس پار سمندر موج زن تھا تو ادھر
غازیوں کے سینہ میں شہادت کا دریا اُمنڈا چلا آتا تھا۔ جب اور زمین فتح
کرنے کو نہ رہی تو اللہ کا نام لیکر کشتیاں سمندر میں ڈال دیں۔ افریقہ اور یورپ
کے درمیان ایک ابنای حائل ہی۔ اس مسافت کو طے کرنے کے بعد ملک
سپین آتا ہی جس کو عرب اندلس یا اندلوسیہ کے نام سے پکارتے ہیں۔

اس وقت ولید ابن عبدالملک سریر خلافت پر جلوہ افروز تھا۔ اسکا نائب
موسیٰ افریقہ اور مراکو کا مختار کل تھا۔ موسیٰ کے افسر چند جہاز لے کر اندلس کے
ساحل پر حملہ آور ہوئے تھے مگر باقاعدہ فتوحات کا آغاز ۷۱۲ء مطابق ۸۲ھ
سے ہوا۔ اندلس پر اس وقت عیسائیوں کا قبضہ تھا۔ یہ لوگ نہایت جری اور مضبوط
تھے ان کے بادشاہ نہایت ظالم تھے امیر اور مالدار غریبوں کے ساتھ
جانوروں سے بھی بدتر سلوک کرتے تھے۔ کاشتکاروں کے گلے میں کتوں
کی طرح ایک طوق ہوتا تھا۔ جب کسی امیر کو زمین فروخت کرنے کی ضرورت ہوتی
تو وہ ان غریب زمینداروں کو بھی بیچ ڈالتا تھا۔ ان کے بچے ماں باپ سے

جدا کر کے امرا خدمت کے لیے آپس میں تقسیم کر لیتے تھے۔ یہودیوں کا حال ان سے بھی بدتر تھا ان کو شہروں تک میں رہنے کی اجازت نہ تھی۔

اس زمانہ میں بلکہ صدیوں بعد تک نہ صرف سپین کی بلکہ تمام عیسائی دنیا کی یہی حالت تھی خود انگلستان میں ملکہ انجہانی کے منصفانہ عہد میں رومن کیتھلک اور یہودیوں کے ساتھ برابری کا سلوک ہونے لگا ہے۔ اگرچہ پروٹسٹنٹ یعنی شاہی مذہب رکھنے والی رعایا کے بالکل مساوی اب بھی حقوق حاصل نہیں

غرض سپین کے بادشاہوں اور امیروں کے اس سلوک سے رعایا نہایت خستہ تھی مگر کسی کو فوجوں کے خوف سے حرف شکایت موتھ پر لانے کی مجال نہ تھی۔ سپین کے بادشاہ کو ایک زبردست امیر زارزق ثانی نے تخت سے اتار کر عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ فرنگستان میں پہلے زمانے میں قاعدہ تھا کہ امرا اپنی لڑکیوں کو بادشاہی محل میں آداب محفل سیکھنے کے لیے بیگمات شاہی کی خدمت میں رکھا کرتے تھے۔ سپین کے جنوبی صوبہ کے گورنر جولین کی بیٹی فلوریڈا بھی کہ حسن وجمال میں اپنا ثانی نہ رکھتی تھی۔ زارزق کے محل میں رہتی تھی۔ کہتے ہیں اس بدبخت بادشاہ کو یہ خیال نہ رہا کہ فلوریڈا کا حق بیٹی کے برابر تھا۔ اس لڑکی کو اپنی پاکدامنی کا بڑا پاس تھا۔ ایک وفادار ملازم کو اپنے باپ کے پاس بھیجا اور اُس کو زارزق کی اس حرکت سے جس کی طرف اشارہ کرنا بھی ہم نامناسب جانتے ہیں مطلع کیا۔

جولین غصہ سے بے تاب ہوگیا اور اُس نے بادشاہ سے انتقام لینے کا عہد کر لیا۔ فوراً دربار شاہی میں حاضر ہوا۔ اثنائے قیام میں جولین نے اپنے کسی قول اور فعل سے ناخوشی کا اظہار تک نہ ہونے دیا۔

بادشاہ نے جانا کہ فلوریڈا نے راز رکھا۔ چلتے وقت جولین بیٹی کو ساتھ لیتا آ

بادشاہ نے کہا کہ جنوب کے باز اچھے ہوتے ہیں ہمارے شکار کے لیے بھیجنا جولین نے نہایت سنجیدگی سے کہا کہ حضور کے لیے ایسے باز بھیجوں گا کہ کبھی نہ دیکھے ہوں گے بادشاہ اس پر بھی نہ سمجھا۔

جولین نے اپنے صوبے میں پہونچتے ہی موسیٰ کے پاس پیغام بھیجا کہ آجتک تمہارے حملوں کی میں نے مدافعت کی مگر آج سے خدا گواہ ہے کہ کبھی تمہاری مخالفت نہ کروں گا میری طرف سے اطمینان رکھو میدان خالی ہے۔

موسیٰ نے اندلس کی شادابی اور جولین کی باتوں کو خوب غور سے سُنا اور اپنے ایک سردار کو ۵۰۰ آدمی دیکر اندلس کے ساحل پر جولین کی تصدیق کرنے کو بھیجا اور ولید بن عبدالملک کو اجازت کے لیے لکھا۔ خلیفہ نے حملے کی اجازت دیدی اور وہ سردار کامیاب واپس آیا اور کہا کہ جولین کا وعدہ سچا ہے۔

موسیٰ نے اپنے لشکر کے ایک جری جنرل طارق کو کہ جس کے نام سے آج تک جبل الطارق یورپ میں مشہور ہے ۷۰۰۰ آدمی دیکر ۷۱۲ء مطابق ۹۲ھ میں روانہ کیا۔ یہ سچ ہے کہ جنوبی ساحل پر کوئی مقابلہ کو پیش نہیں آیا کیونکہ حاکم صوبہ حکومت سے منحرف تھا اور رعایا حکمراں قوم کے ظلم سے تنگ آگئی تھی مگر دریائے گاڈلیٹ کے اُس پار بادشاہ رذرق نے ایک لشکر جرار جمع کیا تھا کسٹائل اور گن خاندان شہزادے اور دور دور سے عیسائی اُمرا مسلمانوں سے لڑنے کو جمع ہوئے تھے۔ خود عیسائی مصنفوں کو اس کا اعتراف ہے کہ عیسائیوں کی قوم مسلمانوں سے چڑ گئی تھی۔ موسیٰ نے احتیاطاً طارق کو ۵۰۰۰ کی اور کمک بھیج دی اس لیے لشکر اسلام کی تعداد ۱۲۰۰۰ تھی عیسائی ۷۰۰۰۰ سے متجاوز تھے۔

اس وقت یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ عیسائیوں کو اپنے ملک کے اندر رہکر اپنی حفاظت کرنی تھی وہ ملک کے چپہ چپہ سے واقف تھے۔

غرض گاڈیسٹ کے اُس پار بڑی گھمسان کا رَن پڑا - بہادران اسلام نے اپنے نیزے تان لئے اور دشمن پر شیروں کی طرح اللہ اکبر کے نعرے مارتے ہوئے جا پڑے - عرب کے بہادر میمنہ میسرہ غرض جس طرف جاتے تھے عیسائیوں کی صفوں کی صفیں اُلٹ دیتے تھے -

عیسائیوں کے راہب ہاتھوں میں چاندی سونے کے صلیبیں لیے اپنے ولیوں کی جے پکارتے تھے اور ہزیمت زدہ فوج کو ہمت دلاتے تھے -

(باقی دارد)

شادی

(۱)

ہندوستان کے ایک مشہور شہر کے بہترین حصہ میں ایک خوبصورت خوشنما بنگلہ واقع ہے - مکان کی وضع قطع سے نہ صرف مالک مکان کا اوسط درجہ کا متمول اور خوش حالی ظاہر ہوتی ہے بلکہ اس کی نہایت اعلیٰ درجہ کی نفیس طبعی - پاکیزہ مذاقی اور شائستگی کا بھی صاف صاف پتہ چلتا ہے سلیم جو اس دل فریب مختصر کوٹھی کا خوش قسمت مالک ہے ایک معقول عہدہ پر ممتاز ہے اور شہر کے معززین میں شمار ہوتا ہے اس کی روشن دماغی شائستہ خیالی اور نفاست طبع کی انجمنوں میں دھوم ہے اگرچہ بعض پُرانے خیال کے بزرگ اس بیچارے پر محض اس کی اعلیٰ معاشرت کی بدولت کفر اور نیچریت کے الزام لگانے میں پس و پیش نہیں کرتے لیکن اس کو مطلقاً اس کی کچھ پرواہ نہیں - وہ جانتا ہے کہ:

ہنر بچشم عداوت بزرگ تر عیب است

خدا کی عنایت سے اس کو بیوی بھی ایسی تعلیم یافتہ اور روشن خیال ملی ہے جو اپنی ہمقوم بہنوں میں بے نظیر کہی جا سکتی ہے۔ ان دونوں میاں بیوی کے صرف ایک اولاد ہے اور وہ ان کا اکلوتا فرزند فہیم ہے۔

فہیم کی عمر اس وقت اکیس سال کی ہے۔ گیارہ برس کی عمر میں یہ علی گڈھ کو بھیج دیا گیا تھا۔ اس عالیشان قومی مدرسے میں اتنے دنوں تک تعلیم پانے کے بعد اس نے اسی سال نہایت کامیابی سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا ہے اور اب تکمیل تعلیم کے لیے ولایت جانے کے ارادے سے گھر آیا ہوا ہے۔ ابھی اس کی روانگی میں چار مہینے باقی ہیں۔ اسی لیے فہیم آج کل اپنے عزیزوں اور دوستوں کی ملاقات میں وقت بسر کرتا ہے چنانچہ وہ ابھی صبح کی چاے پی کر اپنے کسی رفیق کے ہاں گیا ہوا ہے۔

فہیم کو گھر سے نکلے ہوئے کوئی آدھ گھنٹہ نہ گزرا ہوگا کہ اس کا نہایت عزیز جانی دوست وحید سلیم کے خوش قطع بنگلہ میں داخل ہوا اور فہیم کی موجودگی یا غیر وجودگی کے متعلق دریافت کرنے کے عوض خود سلیم کو اپنی حاضری کی اطلاع کرائی۔ چند ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ ہم وحید کو ایک خوب صورت اور آراستہ کمرے میں سلیم کے مقابل ایک بہت خوش وضع کرسی پر بیٹھا ہوا دیکھتے ہیں۔ چار پانچ منٹ کے سکوت کے بعد ان دونوں میں حسب ذیل گفتگو ہونے لگی

سلیم۔ میں نے آپ کو اس وقت اس لیے تکلیف دی کہ ایک نہایت ضروری امر میں آپ کی اعانت کی سخت ضرورت ہے بلا آپ کی مدد کے وہ کام انجام نہیں پا سکتا۔

وحید۔ میں تعمیل ارشاد کے لیے بسروچشم حاضر ہوں۔ اگر میری ناچیز شرکت جناب کا کوئی کام انصرام پا سکے تو اس سے بڑھ کر میری خوش قسمتی کیا ہو سکتی ہے۔

سلیم۔ میں آپ کی اس مہربانی کا مشکور ہوں۔ بیشک مجھے آپ سے ایسی ہی امید ہی (چند لمحہ ٹھہر کر) بات اصل یہ ہی کہ آپ کو تو معلوم ہی کہ فہیم سول سروس کے لیے ولایت جاتے ہیں۔ ہماری خواہش ہی کہ اس عرصہ میں ان کے ولایت روانہ ہونے سے پہلے کہیں ان کی نسبت ہو جائے اور بات ٹھہر جائے۔ دو تین لڑکیاں اس غرض سے ہم نے منتخب کی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ مجکو ناصر کی لڑکی مناسب معلوم ہوتی ہی۔ فہیم کی والدہ کو بھی یہی لڑکی سب سے زیادہ پسند ہی لیکن جب تک فہیم کی مرضی نہ معلوم کر لی جائے ہم اس کے متعلق کچھ نہیں کر سکتے۔ فہیم کی پسند او فہیم کی رائے سب سے مقدم ہے ان کی رغبت اور ان کے میلان طبع کو پیش نظر رکھنا ہمارا اولین فرض ہی ہم کو ہرگز اس بات کا حق نہیں ہی کہ بلا ان کا مافی الضمیر معلوم کیے بطور خود ان کی قسمت کا فیصلہ کریں شادی یا ازدواج کا بالکل میاں بی بی کی ذات سے تعلق ہے۔ اس اہم کام کے انصرام میں ہم لوگ محض مددگار و معاون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہمارے ملک کے مروجہ طریقہ کو میں سخت ناپسند کرتا ہوں۔ ہماری قوم میں آجکل جو شادیاں ہوتی ہیں وہ شادیاں نہیں خانہ بربادیاں ہوتی ہیں۔ کیسے غضب کی بات ہی کہ جن کا عمر بھر کا ساتھ ہی انہیں زبان تک کھولنے کی اجازت نہیں۔ بازار سے جب ایک پیسہ کی ہنڈیا خریدی جاتی ہی تو اُسے خوب ٹھوک بجا کر دیکھتے ہیں۔ مگر افسوس جو شخص عمر بھر کے لیے کسی کو اپنا شریک و سہیم بناتا اپنی زندگی اس کے ساتھ وابستہ کرتا اور تمام عمر نباہ کرنیکا

جملہ لڑتا ہے اسے اتنا بھی جہتسیار نہیں کہ وہ اپنی رضامندی یا ناپسندگی کا اظہار کرسکے۔ یہ نہ ہونا کہ ہمارے ہاں کے شادی بیاہ لڑکے اور لڑکی کے لیے نہیں ہوتے بلکہ والدین رنگ رلیاں منا کر چند روز اپنے جی کو خوش کرنے کے لیے بڑے بڑے چاو چوچلے سے اپنی بدقسمت اولاد کی شادیاں رچاتے ہیں۔ ہائے کیسی شرمناک بات ہے۔ افسوس ہم لوگ چند روزہ مسرت کی خاطر اپنی جان سے پیاری اولاد کو تباہ کرتے ہیں۔ اس سے میرا یہ مطلب نہیں کہ میں علانیہ کورٹ شپ کرتے پھرنے کو جائز قرار دیتا ہوں یا والدین کی رضا و مشورہ کو غیر ضروری سمجھتا ہوں۔ نہیں نہیں میرا یہ منشا ہرگز نہیں ہے۔ والدین ہی اس فریضہ کو انجام دیں اور شوق سے انجام دیں مگر اتنی عنایت کریں کہ وہ استمزاج کو مقدم سمجھیں۔ کیا یہ اسی استمزاج کے نہ ہونے کا نتیجہ نہیں ہے کہ ہمارے گھروں اور ہمارے خاندانوں میں نااتفاقی۔ پھوٹ۔ عداوت اور خصومت کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ کیا اس عظیم الشان کام کو ایک بازیچۂ اطفال سمجھ کر اس کی تحقیر کرنے اور اس کی واجبات کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ نہیں کہ ہماری قوم ازدواج کی خوبیوں اور برکتوں سے بالکل بے بہرہ ہے۔ افسوس ہم لوگ خود اپنے ہاتھوں تباہ ہو رہے ہیں اور آپ اپنی بربادی کر رہے ہیں۔

میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ غرض میں چاہتا ہوں کہ فہیم کی رائے اس نسبت کے متعلق معلوم ہو جائے۔ لہٰذا آپ مہربانی کر کے فہیم سے اس کا تذکرہ کیجیے۔ ناصر کی لڑکی ہماری دیکھی بھالی ہے۔ ناصر سے ہمارے قدیمی تعلقات ہونے کے باعث فہیم کی والدہ نے اس لڑکی کو اکثر دفعہ دیکھا ہے۔ لڑکی کی صورت شکل اچھی ہونے کے سوا وہ تعلیم یافتہ بھی ہے اور آج کل کی تعلیم نسواں کے لحاظ سے وہ اعلیٰ درجے کی تعلیم یافتہ کہی جا سکتی ہے۔ انٹرنس پاس ہونے کے علاوہ اس نے بطور خود بڑی

لیاقت و قابلیت پیدا کی ہے۔ صورت و سیرت دونوں پسندیدہ ہیں۔ حیا۔ تحمل نیک مزاجی۔ ملنساری۔ ادب۔ قاعدہ۔ سلیقہ۔ روشن خیالی۔ ہوشیاری دانائی وغیرہ تمام ضروری صفتیں اس میں موجود ہیں۔

ولیم کابٹ نامی ایک انگریز مصنف نے اپنی مشہور و معروف کتاب ایڈوائس ٹو ینگ مین (نوجوانوں کو نصیحت) میں بیوی کے لیے آٹھ صفتیں گنائی ہیں یعنی (۱) عفت و پاک دامنی (۲) پرہیزگاری و خداترسی (۳) تن دہی و محنت و مشقت (۴) کفایت شعاری و سلامت روی (۵) نفاست و پاکیزگی (۶) امور خانہ داری کی واقفیت (۷) نیک مزاجی (۸) حسن و خوبصورتی۔ خداے تعالیٰ نے اس لڑکی کو تو اس سے بہت زیادہ خوبیاں مرحمت فرمائی ہیں۔ میرے خیال میں آج کل جبکہ ہماری قوم میں اس قسم کے اوصاف والی لڑکیوں کا کال ہے ایسی لڑکی کا ملنا مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ آپ یہ باتیں فہیم کے ذہن نشین کر دیجیے اور کہہ دیجیے کہ میں اور اُن کی والدہ دونوں اس لڑکی کو دل سے پسند کرتے ہیں اور ہماری راے میں اس سے زیادہ اچھی بیوی ان کو نہیں مل سکتی۔

دوسری دو لڑکیاں جو ہماری نظر میں ہیں وہ ڈاکٹر اکرام اور مشتاق احمد مجسٹریٹ کی لڑکیاں ہیں۔ یہ دونوں بھی بہت کچھ قابل تعریف ہیں۔ ناصر کی لڑکی کے بعد اُن دونوں سے بہتر اور کوئی جگہ ہمارے خیال میں نہیں ہے۔ یہ تمام باتیں آپ فہیم کو سمجھا دیجیے اور ساتھ ہی یہ بھی ضرور کہہ دینا کہ فوراً جواب دینے کی ضرورت نہیں۔ اطمینان کے ساتھ وہ اس معاملہ میں غور کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ تین مہینے اس کے لیے بہت کافی ہوں گے۔ اس عرصہ میں وہ جو کچھ راے قایم کریں بلا تامل آپ کے ذریعے اس کا اظہار ہو جائے۔ اگر میں خود فہیم سے

اں کے متعلق گفتگو کروں تو وہ مارے شرم و لحاظ کے اپنا عندیہ صاف صاف ظاہر
نہ کرسکیں گے۔ انہیں اس میں ضرور تکلف ہوگا چونکہ آپ فہیم کے بہت گہرے
دوست ہیں اور آپ سے اُن کے نہایت عزیزانہ تعلقات قائم ہیں اس لیے
آپ سے بہتر مجھے کوئی اور ذریعہ نہیں مل سکتا۔ اب آپ کی مدد سے مجھے امید
ہے کہ یہ معاملہ حسب دلخواہ طے ہوجائے گا۔ اسی لیے میں نے آپ کو تکلیف
دینا ضروری سمجھا۔

وحید۔ بہت خوب! میں آپ کے فرمان کو دلی مسرت کے ساتھ بجا لاؤں گا۔
یہ آپ نے کس قدر اچھا طریقہ اختیار فرمایا ہے۔ اگر ہمارے ہم قوم بھائی اس مفید
اور نہایت ضروری طریقے کی پابندی کرنے لگیں تو ہماری اس زبوں حالت کی
کسی قدر کچھ اصلاح ہوسکتی ہے۔ آپ کا ارشاد بالکل درست ہے۔ واقعی جب کھانے
اور پہننے میں والدین کا انتخاب کام نہیں دے سکتا تو شادی جیسے نازک معاملے
میں استمزاج نہ کرنا سخت نادانی اور جہالت ہے۔ اچھا تو میں آج ہی فہیم سے اس کا
تذکرہ کروں گا اور بہت جلد اُن کے ارادے سے اطلاع دوں گا۔

(باقی دارد)

فاطمہ اُمّ جعفر برمکی

مکرم اڈیٹر صاحب!

ابھی تک ہمارے معلومات کا دائرہ بہت تنگ۔ اور ہمارے خیالات کا احاطہ
بالکل محدود ہے۔ اس لیے گزشتہ ترقیوں پر بدگمانیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اور فوراً مبالغہ
آمیز کہانیوں اور بازاری گپوں کا حکم لگا دیتے ہیں۔ حالانکہ اگر ہم بدگمانیوں سے الگ ہوکر

انصاف کی آنکھوں سے دیکھیں تو ہم کو علمی میدان میں مرد تو مرد بعض خاتونیں ایسی نظر آئیں گی جن کی نظیر شاید مشکلوں سے مل سکے۔

چنانچہ معتبر تاریخ سے ثابت ہے کہ ایام سفر میں حضرت امام ابو حنیفہؒ کے جلیل القدر عالم و فاضل شاگرد رشید عبد اللہ بن مبارکؒ ایک ایسی عورت سے ملے جو برموقع اور ان کے ہر سوال پر بے تامل قرآن مجید کی آیتوں سے جواب شافی دیتی تھیں دریافت سے اُن کو معلوم ہوا کہ اس نیک بخت عورت کو کلام مجید پر اس قدر عبور و ملکہ تام حاصل ہے کہ یہ چالیس برس سے روزمرہ کی بات چیت میں بے تکلف و بے تردد کلام الٰہی کی آیتوں کو بولا کرتی ہیں۔ اس خوف سے کہ مبادا زبان سے کوئی ایسا کلمہ نکلے جس کی پرسش خدا کے ہاں ہو۔

مگر اب ہم خود دوسرے عالم ہیں اور ہماری علمی کائنات مفقود ہے۔ اس لیے ہم کو اس قسم کے واقعات خواب و خیال نظر آتے ہیں۔ اور ہم اس وقت جس تاریخی واقعہ پر قلم فرسائی کر رہے ہیں۔ عجب کیا اس پر بھی مبالغہ و بناوٹ کا داغ لگے۔

بہر حال ہمارا ماخذ مستند تاریخ ہے۔ ہمارے احباب جو کچھ اس پر ریمارک کریں ہم اُس کے سُننے اور سراہنے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ ؎

سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

فاطمہؒ[1] ملقب بعتابہ بنت محمد حسین بہت بڑی عالمہ و متکلمہ تھی خصوصاً خوش نویسی و حساب میں بے مثل تھی۔ یہ علمی عزت صرف فاطمہ کے ساتھ مخصوص نہ تھی بلکہ مردوں کی طرح عموماً برامکہ کی عورتیں بھی زیورِ علم سے آراستہ ہوتیں اور اپنا ثانی نہیں رکھتی تھیں۔

چنانچہ روایت ہے کہ ایک دن خلیفہ ہارون الرشید دربار عام میں بیٹھا تھا۔

---

[1] دیکھیے المستطرف جلد اول صفحہ ۱۱۳

ارکان سلطنت وکل اہل دربار حاضر تھے کہ ایک عورت آئی اور ہارون الرشید کو
باخطاب صحیح بناکر یہ دعائیں دیں۔ یا امیر المومنین اقر اللہ عینک۔ وفرحک
بما اٰتاک۔ واتم سعدک۔ لقد حکمت فقسطت۔ یعنی خدا امیر المومنین کی آنکھیں ٹھنڈی
رکھے اور اس نے جو تجھے دیا ہے اس سے فرحت بخشے۔ اور سعادت کو
پوری کرے۔ بیشک تو نے انصاف سے حکومت کی۔

جب وہ عورت یہ کہہ چکی۔ تو خلیفہ نے پوچھا کہ تو کون ہے؟
اس نے کہا میں خاندان برامکہ کی ایک عورت ہوں جنکے مردوں کو تو نے ہلاک کیا
مال وثروت چھین لی۔ اور ان کی فیاضیاں بند کر دی ہیں۔

یہ سن کر خلیفہ نے کہا کہ مردوں کے بارے میں کچھ ہو نہیں سکتا قضائے الٰہی
جاری ہو چکی۔ البتہ مال تجھے واپس ہو سکتا ہے۔ پھر خلیفہ اہل دربار کی طرف مخاطب ہوا
اور پوچھا کہ تم لوگوں نے بھی کچھ سمجھا اس عورت نے مجکو کیا کہا؟
سب یک زباں ہو کر بولے کہ جی ہاں اس نے امیر المومنین کو دعائیں
دی ہیں۔

خلیفہ نے کہا کہ نہیں تم لوگ بالکل غلط سمجھے۔ یہ عورت مجکو دعائیں نہیں دیتی بلکہ
کوستی ہے۔

پہلی بات تو وہ یہ کہتی ہے کہ میں اندھا ہو جاؤں، کیونکہ آنکھوں کا نور حرکتوں سے ہے
اور جب حرکت میں معمولی سکون ہو گا تو آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں گی اور بصارت
زائل ہو جائے گی۔

دوسرا جملہ اس آیت سے لیا گیا ہے اذا فرحوا بما اوتوا اخذناھم بغتۃ ۰
یہاں تک کہ ان کو جو نعمتیں دی گئی تھیں۔ جب ان کو پاکر خوش ہوئے ہم نے ان کو
(عذاب میں) پکڑ لیا۔

تیسرا جملہ اس شعر سے مستنبط ہی ہے

اذا تمّ امرٌ بدا نقصہ   ترقّب زوالاً اذا قیل تمّ

یعنی جب کوئی کام پورا ہو جاتا ہی تو اُس میں کمی شروع ہو جاتی ہی اس لیے ہر چیز کے تمام ہونے پر زوال کا امیدوار رہنا چاہیے۔ کیا معنی کہ اب مجکو اپنے زوال سلطنت کا انتظار کرنا چاہیے۔

اور چوتھا جملہ اس آیت سے ماخوذ ہی واما القاسطون فکانوا لجھنم حطبا یعنی جس نے سرتابی و نافرمانی کی وہ دوزخ کے کندے بنے۔

اہل دربار ہارون کی اس نکتہ سنجی و موشگافی پر متعجب ہوئے۔ اور بہت تعریف کی۔

مگر ہم سے پوچھیے اور ایمان سے پوچھیے تو سراہنے اور ستائش کے قابل وہ خاتون ہے جس نے اس قسم کے کلام کہے جس کے سمجھنے کے لیے عوام قاصر تھے اور ہارون الرشید جیسے عالم و فاضل آدمی کو حل کرنے کی ضرورت پڑی۔

م۔ ح۔ ف دیسنوی
از بختیارپور ضلع پٹنہ

اسلام کی بے تعصبی

اس سے ہم کو انکار نہیں ہی کہ جملہ مذاہب میں بھلائی اور بُرائی کے احکام دیے گئے ہیں بُرائی کی سزا اور بھلائی کی جزا معقول طور پر بتائی گئی ہی۔ جو امور خلاف فطرت انسانی اور خلاف تہذیب ہیں وہ تمام مذاہب میں یکساں ممنوع ہیں یعنی کوئی مذہب ایسا نہیں جس میں چوری اور دغابازی وغیرہ ذمائم اخلاق و

و عادت جائز رکھے گئے ہوں۔ اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ تمام مذاہب کا اصول متحدہ پر مبنی ہیں اور اصول کے اعتبار سے کسی مذہب کو دوسرے مذہب سے مطلق تفرقہ اور امتیاز نہیں ہونا چاہیے

لیکن اب دیکھنا یہ باقی ہے کہ کون سے مذہب میں سیدھے سادے اور سچے قواعد اور اصول پائے جاتے ہیں اور ٹھیک فطرت انسانی کے موافق کون مذہب ہے اور جس میں مطلق پیچیدگی اور مشکلات کا نام نہیں اور حکیمانہ اصول اور قواعد بہتر سے بہتر اور عمدہ سے عمدہ کس مذہب میں پائے جاتے ہیں منزل مقصود پر پہونچنے کے لیے مختلف راستے ہوتے ہیں اور جو راستے دشوار گذار ہوتے ہیں ان کے چلنے والے بھی منزل مقصود پر پہنچ ہی جاتے ہیں لیکن سیدھے راستے میں ہر نہج آسانی ہوتی ہے۔

اس موقع پر مذہب اسلام کی تمام بھلائیوں کا ذکر کرنا ہمارا مقصود نہیں ہے بلکہ ہمارا مقصد اصلی یہ ہے کہ ہم اس امر کو روز روشن کی طرح ظاہر کر دیں کہ منجملہ تمام بھلائیوں کے اعلیٰ درجہ کی خوبی مذہب اسلام میں یہ ہے کہ اس مذہب سے زیادہ (بے تعصب) کوئی مذہب نہیں ہے اور ہم اپنے دعوے کو مدلل اور قوی ثبوت سے ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

قول اول۔ قرآن مجید چونکہ عربی زبان میں نازل ہوا ہے اور اس میں تمام نبیوں کا مذکور ہے تاہم بہت خصوصیات کا لحاظ رکھا گیا ہے اور عام طور پر کہدیا گیا ہے کہ ہر قوم کے لیے ایک ہادی اور رہنما ہوتا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا ہے ہم جس قوم پر کوئی پیغمبر بھیجتے ہیں تو اسکا ہم زبان اور ہم قوم بھیجتے ہیں اس سے بخوبی ظاہر ہے کہ تمام طور پر انبیاے سابقین کو اسلام نے مانا ہے اور ان کی عزت کی ہے اس سے زیادہ اسلام کی مذہبی فیاضی اور مذہبی آزادی اور بے تعصبی کیا ہو سکتی ہے۔

قول دوم - مذہبی بے تعصبی کا یہ ہی کہ اسلام نے بیشک یہ دعویٰ تو کیا کہ تمام دنیا کے سامنے اس کو پیش کرنا چاہیے مگر اس طرح کہ مطلقاً اس میں تعصب کا شائبہ نہ ہو۔ صرف بہ حیثیت ایک سمجھانے والے واعظ کے اپنا فرض پورا کر دے۔

قرآن مجید میں خدا نے یہ حکم دیا ہی کہ اے محمد صلعم بلاؤ تمام دنیا کو اسلام کی طرف معقول طرح سے سمجھا بجھا کر اچھی طرح سے حکمت کے ساتھ اگر مناظرہ کرو کسی سے تو بطرز احسن کٹ حجتی سے نہیں جو آج کل مروج ہی۔ مذہب ایسی چیز نہیں جو اکراہ کا متحمل ہو۔ ایک جگہ فرمایا گیا کہ مذہب میں زبردستی نہیں ہی۔ اس اصول اسلام پر غور کرنے سے معلوم ہو سکتا ہی کہ کیا پاک مذہب ہی جس میں تعصب کا نام تک نہیں ہے۔

مذہب نام ہی عقیدہ کا ممکن ہی کہ کوئی اپنی طاقت کے زور سے زبردستی کسی سے نماز پڑھوائے روزہ رکھوائے زکوٰۃ دلوائے مگر دل کا یقین لانا اور خدا کا حکم سمجھ کر احکام کی تعمیل کرنا زبردستی سے ممکن نہیں جیسا کہ خداوند تعالیٰ نے رسول اللہ کو اس معاملہ میں بہت خواہشمند پاکر فرمایا یا محمد کیا تم لوگوں کو مجبور کر سکتے ہو تاکہ وہ سب ایمان لے آئیں۔ ایک مقام پر یہ ارشاد ہوا ہی اے محمدؐ لوگوں کو سمجھا دو۔ تمھارا کام صرف سمجھانے کا ہی تم کسی کے داروغہ یا گماشتے نہیں ہو۔

اس طرح بہت سے ایسے احکام ہیں جن کی تاکید کی گئی ہی۔ ان سب کا اقتباس نہیں کیا جا سکتا پس جو طریقہ اشاعت اسلام کا بتایا گیا ہی اس میں کسی قسم کی سختی یا جبر کا شائبہ نہیں پایا جاتا ہر شخص کی مرضی اور دلی خواہش پر اُسکو چھوڑ دیا ہی سوائے اسلام کے اور کوئی مذہب ایسا نہیں ہی کہ جس میں کسی قسم کی کوئی سختی یا جبر نہ پایا جائے۔ دنیا میں بہت سی ایسی اقوام ہیں کہ جو اپنی مذہبی کتابوں کے احکام کو ادنیٰ قوموں کے کانوں تک پہونچانا ہی مذہبی گناہ سمجھتے ہیں کسی کو اگر اس میں

شک ہو تو دیکھ لے کہ شاستر کی کیا تعلیم ہے۔

شاستر کا یہ مسئلہ ہے کہ غیر قوموں کے کان میں وید مقدس کی آواز نہیں جانی چاہیے کیونکہ ان کے کان اس قابل نہیں کہ ایسے مقدس کتاب کے احکام سُن سکیں۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ اگر کوئی ہمارے مذہب میں آنے کا ارادہ بھی کرے تو وہ شامل نہیں ہو سکتا۔ بجائے اسکے اسلام یہ تعلیم دیتا ہے کہ مذہب جبراً نہیں قبول کرایا جا سکتا۔ اسلام تعصب سے بری ہے البتہ اس کی خوبیاں بتاؤ اس کی حقیقت سے دنیا کو واقف کر کے اسلام پھیلاؤ۔

تیسری بات یہ ہے کہ اسلام کے جو فرائض واحکام ہیں۔ نماز روزہ۔ زکوٰۃ۔ حج نکاح۔ وراثت وغیرہ جسکو محمڈن لا کہتے ہیں۔ اسلام نے خاصتاً اس امر کو گوارا کیا کہ جو باتیں دوسرے مذہب کی قابل امتحان تھیں اُن کو اپنے میں داخل کیا۔ افسوس ہے کہ بعض مورخوں نے اسلام کے اس نہایت عمدہ اور غیر متعصب اصول کو بری نظر سے دیکھا اور لکھا ہے کہ اسلام میں اصلیت نہیں ہے اُسے ادہر اُدھر سے لے کر ایک مذہب بنا دیا کاش وہ اسلام کی فیاضی اور "خذما صفا ودع ما کدر" کے بیش بہا فوائد پر نظر رکھتے تو کبھی ان کو ایسی بات کے لکھنے اور ظاہر کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔

یہ امر کہ اسلام میں کس قدر صلیت ہے اور کس قدر ایسی چیزیں ہیں کہ صرف اسلام نے پیدا کیں اور اس سے پہلے نہ کسی مذہب میں ان کا وجود تھا نہ اب ہے اس قابل ہے کہ اگر لکھنے کا ارادہ کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب ہو جائے لیکن میرے مضمون میں اسکا موقع نہیں ہے کیونکہ یہ مختصر مضمون ہے اور وقت تھوڑا ہے اگر اسکے متعلق لکھنے کی کوشش کیجائے گی تو زمانہ دراز درکار ہوگا ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ اسلام میں جس قدر صلیت ہے اسکا وجود ازل سے نہ تھا محض اسلام نے

سینٹ المو

دیباچہ

یہ قصہ جسکا خلاصہ ناظرین کے سامنے پیش کیا جاتا ہی امریکہ میں کسی عورت نے انگریزی زبان میں لکھا تھا۔ جسکو اتفاقیہ میں نے بھی دیکھا مجھے بہت ہی پاکیزہ و نصیحت آمیز و قابل پڑھنے اور غور کرنے دختران خواندہ خاندان شرفا کے معلوم ہوا۔ لہذا میں نے خاص کر انہی کے فائدے کے لیے لکھنا شروع کیا ہی۔ ترجمہ نہیں بلکہ خلاصہ ہی۔

اکثر انگریزی خواں حضرات کو یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ مرد و عورت دونوں اپنی اپنی پسند سے ہندوستان میں شادی کیا کریں۔ میری رائے اس کے خلاف ہے۔

اوّل تو ہندوستان کے شرفا خاندان میں رسم پردہ رائج ہے جس کی وجہ سے تعلیم مثل یورپین لیڈیوں کے محالات سے ہی کیونکہ صرف کتابوں کا پڑھ لینا کافی نہیں بلکہ تجربہ بھی درکار ہی اور اسکا کوئی موقع ان بیچاریوں کو علی الخصوص نہیں مل سکتا۔ دوم بلحاظ موسم گرم یہ ضرور ہی کہ لڑکی کی شادی سولہ و بیس برس کی عمر میں کر دی جائے۔ اور اسی طرح لڑکے کی بیس و چوبیس برس کی عمر میں شادی کر دینی لازم ہی۔ برخلاف سرد ملکوں کے جہاں اکیس سال سن بلوغ کے لیے قانوناً قرار دیا گیا ہے اور شادی عموماً تیس و چالیس برس کی عمر میں ہوتی ہے۔ لہذا ظاہر ہے کہ ہندوستانی لڑکے و لڑکی کو اس قدر کمسنی میں کوئی تجربہ یا پختگی مزاج حاصل نہیں ہو سکتی۔ بدیں وجہ میری سمجھ میں اُن حضرات کی رائے صحیح نہیں بلکہ جب تک پردہ کی رسم بالکل اُٹھ نہ جائے والدین و دیگر محافظین کی پسند میں شادی ہونی مناسب ہے۔

جس آدمی نے تمام عمر تاریکی میں بسر کی ہو اسکو دوپہر کی روشنی میں یکایک لے آنے سے

کچھ نہ دکھائی دیگا بلکہ چکا چوند لگ جائے گی۔ یہ بعینہ کیفیت اُس لڑکی کی ہوگی جس نے ہمیشہ پردے میں بسر کی اور جس نے کبھی غیر مرد کی صورت نہیں دیکھی نہ کسی غیر شخص سے بات تک کی پھر ایسی حالت میں یکایک کسی غیر مرد سے ملاقات کے جو بد نتایج مرتب ہوتے ہیں اس کا اندازہ ناظرین خود فرما سکتے ہیں۔ اور حق تو یہ ہے کہ کوئی بڑا تجربہ کار بھی کسی نوجوان کو دیکھ کر اُس کے عادات و خصائل کو نہیں جان سکتا ہے بغیر تجربہ مدت العمر کے۔ چہ جائے کہ ایسی امید کسی نوجوان لڑکے یا لڑکی سے کیجائے۔ ہاں ایک ہی گھر کے لڑکا لڑکی ہوں تو اس کی بات دوسری ہے۔

جن اقوام میں پردے کی رسم جاری نہیں اور جہاں نوجوان لڑکے و لڑکیاں ابتدائے عمر سے آزادی کے ساتھ باہم ملتی جلتی رہتی ہیں اور قبل نکاح کے ایک مدت تک اسی مناکحت کے خیال سے ایک دوسرے کے مزاج اور اتفاق طبیعت کو دیکھتی رہتی ہیں اور تعلیم یافتہ بھی ہوتی ہیں پھر بھی اکثر غلطی ہی کرتی ہیں جہاں اگر کوئی بڑا اختلاف نہیں ہوتا یا کوئی خاص سبب پیدا نہیں ہوجاتا وہاں کا پردہ فاش نہیں ہوتا ورنہ اکثر افسوس ہی کرتے ہیں مگر بدنامی کے خیال سے اظہار نہیں کرتے۔ کمتر میاں بی بی ان میں بھی ہونگے جو فی الواقع خوش کہے جائیں ورنہ اکثر وضع نباہتے ہیں۔

الغرض یہ قصہ اس بات کو ظاہر کرے گا کہ ایک ادنیٰ درجہ کی لڑکی کو کیا کیا مواقع اعلیٰ درجہ کی تعلیم پانے کے حاصل ہوئے اور وہ اپنی پاکیزہ و قابل تحسین خیال و سمجھ باوجود طمع دنیاوی کے قایم رہی۔ اور کسی طرح وہ خود بلا کسی یار و مددگار کے اپنی دلی خواہشات پر قادر ہے اور بالآخر اپنی ہی پسند کے قابل جب اپنے شوہر کو بنالیا تب شادی کی۔ اور پھر تمام عمر خوشی میں بسر کی۔ مگر ہر خوبصورت و نوجوان لڑکی سے ایسی امید رکھنی صریح ظلم ہے۔

یہ خلاصہ محض لڑکیوں کے پڑھنے و سمجھنے کی غرض سے لکھا گیا ہے جو میرے خیال

میں مذہباً و تعلیماً و اخلاق کی درستی کے لیے ان کے واسطے بہت مناسب ہے۔
اور بمقابلہ دیگر قصص بے ہودہ وغیرہ کے جیسے کہ رائج ہیں بہت ہی پاکیزہ اور مصلح ہے۔

میں نے اس قصہ کے حق تالیف کو اس وجہ سے محفوظ کرنا نہیں چاہا کہ فائدۂ عوام کے لیے اگر کسی صاحب کا دل چاہے تو بہ شکل ایک کتاب کے چھپوائیں۔ اور کسی طمع سے یہ نہیں لکھا گیا ہے۔ میں نے اسکو بحق عام لڑکیوں کے وقف کر دیا ہے۔

باب اول

ایک چھوٹا قریہ جسکا نام جھنگا ہے وہاں کا یہ واقعہ ہے۔ یہ قریہ دامن کوہ میں واقع ہے جہاں کی مردم شماری دو سو سے کچھ اوپر تھی صبح کا وقت تھا جب تک آفتاب نہ نکلا تھا۔ اسی وقت ایک لڑکی ۱۲ برس کی عمر کی سر پر گھڑا رکھے پانی بھرنے جا رہی تھی۔ چشمہ گاؤں سے پورب کی سمت کو واقع تھا اور سامنے جنگل اور پہاڑ تھا۔ راستہ کٹنے کے خیال سے لڑکی بزبان حال (سونے کا گگرا گنگا جل پانی) اپنی باریک و شریلی آواز و دھن میں گاتی چلی جاتی تھی۔ چشمہ پر پہنچکر لڑکی نے گھڑا سر سے اتار کر جگت پر رکھدیا اور صبح کے آفتاب کا نکلنا سویرے کی کرنوں کا پہاڑی مختلف بلند چوٹیوں پر پڑنا دیکھ رہی تھی اسیوقت اسطرف سے دو پستولوں کی آواز جنگل میں سے ایک ساتھ لڑکی کے کان میں آئی۔ اس اچانک آواز سے لڑکی جھجک گئی اور معاً دیکھا کہ درختوں کی آڑ میں چند آدمی بھی ہیں اور ایک آدمی چاروں خانے چت زمین پر گرا پڑا ہے۔ لڑکی بے اختیار گھڑا چشمہ پر چھوڑ اُس مقام پر پہنچی جہاں پستول چلے تھے اور جہاں وہ شخص زمین پر پڑا تھا اور جس کے سینے سے تازہ خون نکل رہا تھا۔ جان نکل گئی تھی۔

لڑکی کی زبان سے بیساختہ قتل عمد- نکل گیا- دیگر اشخاص موجودہ کو اس ناآشنا آواز کے سننے سے لڑکی کا موجود ہونا محسوس ہوا- قاتل نے لڑکی سے پوچھا تو کون ہی یہاں تیرا کیا کام ہی-

لڑکی- تو نے اسکو کیوں قتل کر ڈالا- اللہ تعالیٰ تجھے کبھی نہ معاف کرے گا-

قبل اسکے کہ قاتل کوئی جواب دے اس کے اور دوست آگئے اور کہا کہ کلنتن تم اب یہاں سے چل دو- ریل کا وقت بہت قریب ہی ورنہ ڈنٹ کا بھائی فساد برپا کریگا- کلنتن نے لاش کی طرف بھی نہیں دیکھا مگر لڑکی کی طرف بڑے غصہ کی نگاہ سے دیکھتا ہوا دوسری طرف چلا گیا-

لڑکی- کیا تم لوگ اس قاتل کو بلا قصاص کے کورا جانے دوگے؟

ڈاکٹر- اس کی سزا کوئی نہیں ہی- قانوناً یہ جرم نہیں ہی-

لڑکی- کیا آدمی کے قتل کے بدلے آدمی پھانسی نہیں پاتا-

ڈاکٹر- ہاں قاتل پھانسی پاتا ہی- مگر یہ قتل نہیں یہ ڈویل ہی جو قانوناً جائز ہی-

لڑکی نے کبھی ڈویل کا نام بھی نہیں سُنا تھا ڈاکٹر نے بتلایا کہ یہ معزز شریفانہ طریقہ بقائے سلامتی عزت کا ہی کہ دو آدمی برابر کھڑے ہو کر برابر کے ہتیار سے لڑتے ہیں- ایک دوسرے کو زخمی کرتا یا مار ڈالتا ہی اور جو راستی پر ہوتا ہے اسکو خدا فتح دیتا ہے اور اس طرح سب نزاع کا فیصلہ ہو جاتا ہی-

لڑکی- اللہ تعالیٰ نے تو اپنی کتاب میں کسی قتل کو مستثنےٰ نہیں کیا- موت کی سزا موت ہی لکھی ہے-

ڈاکٹر- اے بچی تیرا کیا نام ہی اور کیا تیرا گھر یہاں سے قریب ہی-

لڑکی- میرا نام اڈنا ارل ہی- جی ہاں میرا گھر بہت قریب ہی-

ڈاکٹر- تیرا باپ اس وقت گھر پر ملیگا-

لڑکی۔ میرے باپ نہیں ہیں۔ میرا نانا ہی جو ابھی دوکان پر نہیں گیا ہوگا۔
ڈاکٹر۔ بیٹا تم اپنے گھر کی راہ ہم کو بتا دو۔ ہم کو مدد کی بڑی سخت ضرورت ہی ہم یہاں جنبی جگہ کسی کو نہیں جانتے پہچانتے۔
اڈنا جی بہت اچھا۔ کیا اس لاش کو بھی آپ وہاں ہمارے گھر لیجائیے گا۔

لڑکی کے پیچھے پیچھے ڈاکٹر وغیرہ چلے۔ لڑکی نے گھڑا پانی سے بھرا اور سر پر رکھکر آگے آگے چلی۔ گھر کے پھاٹک پر جب پونچی اور پھاٹک کھولا تب دیکھا کہ اُسکا نانا سیڑھی پر بیٹھا پائپ پی رہا ہی۔ لڑکی نے اپنے نانا کے پاس جاکر کہا کہ آج اسی وقت صبح کو جنگل میں ایک آدمی نے دوسرے آدمی کو مار ڈالا اور مقتول کی لاش گھانس پر بڑے درخت کے نیچے پڑی ہی۔
نانا۔ بیٹا تجھے کیسے معلوم ہوا کہ کسنے مار ڈالا ہی۔
ڈاکٹر۔ گڈ مارننگ۔ آپ کی نواسی نے اتفاقیہ یہ واقعہ دیکھ لیا۔ ایک ڈویل ہوا جس میں مسٹر ڈنٹ زخمی ہوکر مرگیا۔ میں آپ کی اجازت لینے آیا ہوں کہ آپ کے مکان میں ہم لاش کو لاکر رکھیں جب تک تجہیز و تکفین کا بندوبست کیا جائے۔

اڈنا گھڑا پانی کا لیے ہوئے باورچی خانے میں گئی۔ جہاں ایک اڈھیڑ عورت چالیس پچاس برس کی کچھ پکا رہی تھی۔ اڈنا کو آتے دیکھکر عورت نے غصہ میں آنکھیں نیلی پیلی کرکے اُس کی طرف دیکھا اور بولی کہ اتنی دیر تو آج کہاں رہی۔ گھر میں اتنا پانی نہیں کہ میاں کے لیے چاے بنائی جائے۔ میں خود آدھی دور تک تجھے ڈھونڈنے گئی مگر تیرا پتہ نہیں لگا۔ بتا اب تیری کیا سزا ہی۔ میاں نے ابتک حاضری نہیں کھائی اور دوکان جانے میں دیر ہو رہی ہی۔
یہ کہتی ہوئی وہ عورت اڈنا کی طرف لپکی مگر اڈنا کی حالت دیکھکر چیخ اُٹھی۔ اڈنا تیری کیا حالت ہے۔ تیرا تمام جسم کیوں کانپ رہا ہے۔ کیا تجھ کو لرزہ لگیا ہے۔

یا جنگل میں کوئی بھوت یا چڑیل تو نے دیکھی ہے۔

اُڈنا۔ آج صبح کو ایک آدمی نے میرے سامنے جنگل میں ایک آدمی کو مار ڈالا۔ اور مقتول کی لاش دیگر ساتھی اُس کے اسی مکان میں لاکر رکھیں گے اور جو زنانہ کچھ سننا چاہتی ہو تو باہر جاکر سنو۔ ڈاکٹر نانا سے باتیں کر رہا ہے۔

تھوڑی ہی دیر میں مسٹر ڈنٹ کی لاش لوگ مکان پر اُٹھا لائے اور پہلے اُڈنا ہی کے بستر پر اُس لاش کو رکھا سہ پہر کے قریب صندوق بن کر گاؤں سے آگیا اور لاش صندوق میں رکھی گئی۔ پہلے یہ صلاح ہوئی کہ اُسی بڑے درخت کے نیچے جہاں لاش پہلے پڑی تھی دفن کر دیں مگر پھر یہ صلاح ہوئی کہ ریل پر لاش لیجائیں۔ سب لوگ لاش کو مکان میں چھوڑ کر اسٹیشن پر لے جانے کے انتظام کے لیے گئے۔

شام کو اُڈنا نے دروازہ اُس کمرہ کا کھولا جہاں لاش کا صندوق رکھا تھا اور اندر گئی اور گود میں پھول بھی لیتی گئی۔ لاش کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ مقتول کا سن تیس سال کا ہوگا اور اُنگلی میں نکاح کا چھلا طلائی بھی تھا۔ لڑکی کو اُسی وقت خیال ہوا کہ مقتول کی بی بی بچے بھی ہونگے۔ اسی سوچ میں کھڑی تھی کہ اُسی وقت اُس کمرے میں ایک عورت جس کا سن شاید چوبیس سال کا ہوگا چیختی ہوئی ایک ضعیف مرد کے سہارے آگئی اور بے اختیار یہ الفاظ عورت کے مُونہہ سے نکلے "ہائے! میرے شوہر! میرے میاں! اور لاش پر بیساختہ گر پڑی اور بیہوش ہوگئی۔ دیگر اشخاص اُس عورت کو بیہوشی کی حالت میں اُٹھاکر دوسرے کمرے میں لے گئے جہاں ڈاکٹر نے ہوش میں لانے کی پہلے کچھ تدابیر کیں بعد ازاں کہا کہ فالج گرا ہے جس سے یہ جاں بر نہ ہوگی۔ اور بڈھے کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ میں نے اسی واسطے کہا تھا کہ پہلے دفن کر دینا بہتر ہے ناحق اطلاع کر دی۔ آپ اس عورت کو ناحق لائے

بڈہا مقتول کا باپ تھا جسنے ڈاکٹر سے کہا کہ میں نے بہت منع کیا مگر اس نے نہ مانا اس کے دونوں چھوٹے بچوں کو اللہ تعالیٰ صبر دے۔ غرضکہ کچھ رات رہی عورت کی بھی جان نکل گئی۔ صبح کو جب چند آدمی اور جمع ہو گئے۔ عورت کی لاش کو بھی اُسی صندوق میں رکھ دیا اور اُسی درخت کے نیچے جہاں مسٹر ڈنٹ زخمی ہو کر گرا تھا اور مرا تھا قبر کھود کر دونوں میاں بی بی ایک ہی صندوق ایک ہی قبر میں دفن کر دیے گئے سب لوگ آخر چلے گئے۔ مگر ہفتوں اور مہینوں کے بعد بھی اڈنا کے سامنے سے وہ سماں دفع نہ ہوتا تھا۔ اور اوّل اوّل کئی رات تک نیند اچھی طرح نہ آتی تھی اور خواب پریشان دیکھ کر ڈر تی تھی۔ مگر جب پانی بھرنے جاتی تھی روز جنگل کے پھول توڑ کر اُس قبر پر چڑھا آتی تھی۔

اڈنا ارل کے ماں باپ دونوں ایسی کم سنی میں مر گئے تھے جبکہ اُس کو کچھ یاد بھی نہ تھی۔ اڈنا کی ماں ارن ہنٹ گاؤں کے آہنگر کی بیٹی تھی۔ اور اس کا باپ نجار تھا یہ نوجوان ۲۵ - ۲۶ برس کی عمر میں کسی چھت پر کام کرتا تھا وہاں سے اتفاقیہ گر کر مر گیا اُس وقت اڈنا چھ مہینے کی تھی۔ برس کے اندر ہی اندر اڈنا کی ماں بھی چند روز بیمار رہ کر مر گئی۔ یہ برس ڈیڑھ برس کی جان بیچارے آہنگر کے سر پڑی۔ لوہار کی پہلی بی بی عرصہ ہوا مر چکی تھی۔ اسی نواسی کی خاطر اسکو دوسری شادی کرنی لازم ہوئی اسی گاؤں میں ایک چالیس برس کی بیوہ عورت تھی اُس کے ساتھ لوہار نے شادی کر لی تھی۔ یہ عورت اگرچہ رحم دل تھی مگر جاہل مطلق اور غصہ ور بھی تھی۔

اس طرح یتیم اڈنا اپنے نانا و سوتیلی نانی کے ساتھ زندگی بسر کرتی تھی۔ ہم سائے میں کوئی اُسکا ہم سن لڑکا یا لڑکی نہ تھی جس کے ساتھ کھیلتی۔ اُسی اپنے بڈہے نانا سے جی بہلاتی تھی۔ خوش قسمتی سے لوہار بیچارے نے اپنے شروع میں کچھ پڑھ لیا تھا اور وہ بھی اس قدر کہ انجیل پڑھ لیتا تھا اسی قدر اس نے اڈنا کو بھی پڑھایا

اور ہمیشہ علم کی فضیلت لڑکی سے بیان کرتا تھا اور دینداری اور ایمان داری کی باتیں بتلایا کرتا تھا۔ سوائے انجیل کے ایک لغت کی کتاب بھی اس کے پاس تھی اور اسکے علاوہ چند معمولی کتابیں کسی پادری کی اس مکان میں تھیں جو یکایک بیمار ہو کر اسی مکان میں مرگیا تھا اور کتابیں اس کی لاوارثی پڑی رہیں۔ یہ کل کتب خانہ اڈنا کے لیے تھا۔ نانا کی باتوں سے لڑکی کے دل میں شوق پڑھنے کا ضرور تھا مگر بوجہ مفلسی کے کوئی ذریعہ نہ تھا کہ ترقی کرتی۔

گاؤں سے ایک میل کے فاصلہ پر جہاں دو سڑکیں آکر ملی تھیں وہاں پر اس لوہار کی دوکان مختصر سی تھی۔ اور دوکان کی پشت پر ایک بڈھا گھوڑا بندھا گھانس کھایا کرتا تھا جو شام کو وہار کو گھر پہنچاجاتا تھا اور پھر صبح کو دوکان پر لیجاتا تھا۔

ایک دن سات آٹھ مہینے بعد اس واقعہ کے جسکا تذکرہ اوپر لکھا گیا لوہار کو کام زائد تھا جس کی وجہ سے اس کو جلدی تھی وہ اپنا کھانا لیجانا بھول گیا۔ چنانچہ جب اڈنا کو خیال آیا کہ نانا آج اپنا کھانا نہیں لے گیا تب خود نانا کا کھانا لے کر گھر سے چلی اور راستے میں کوئی مناجات گاتی ہوئی چلی جاتی تھی اور کچھ ایسی مصروف اپنے دھن میں تھی کہ پیچھے سے جب تک ایک سخت آواز سوار کی نہیں سنی کہ "تو کیا بالکل بہری ہو بتلا کہ لوہار کی دوکان اس گاؤں میں کہاں ہو" اس وقت تک گھوڑے کے سُم کی آواز بھی اس نے نہیں سُنی تھی۔ پیچھے مڑکر لڑکی نے دیکھا کہ ایک شخص بہت تیز گھوڑے پر سوار اس کے قریب آگیا ہو۔ اسی کی یہ آواز تھی۔ اور سوار نے گھوڑا روک لیا تھا اور جواب کا منتظر تھا۔

اڈنا۔ جی ہاں! نصف میل آگے دوکان ہو جہاں دونوں سڑکیں ملی ہیں۔

سوار نے ٹوپی ہاتھ میں اٹھائی اور گھوڑے کو ایڑ مار چل دیا۔ اڈنا جب دوکان پہونچی تب دیکھا کہ وہی سوار گھوڑے پر سے اتر پڑا ہی اور دوکان کے آگے ٹہل رہا ہو۔

اور اُس کا نانا گھوڑے کا سُم اُٹھا کر دیکھ رہا ہی۔ یہ سوار بہت طاقت ور لانبا آدمی تھا جس کے کندھے پر ایک شال قیمتی پڑی تھی اور سمور کی ٹوپی سر پر تھی۔

لڑکی نے کھانا زمین پر رکھ دیا اور اپنے نانا سے لپٹ گئی اور پوچھا بتاؤ میں کیا لائی ہوں۔ نانا نے ہنس کر جواب دیا میں اپنا کھانا لانا بھول گیا تھا وہی تو لائی ہوگی۔ میری پیاری میرے پاس سے ہٹ جا ایسا نہ ہو کہ یہ شریر گھوڑا لات مارے اور تیرا بھیجا نکل پڑے۔

اُسی وقت سوار نے گالی دیکر کہا میں کب تک منتظر تیرے لیے کھڑا رہوں گا ذرا سے کام میں اتنی دیر لگادی۔

لوہار۔ میں خود جلدی کر رہا ہوں مگر گھوڑا میرے قابو میں نہیں آتا۔

سوار نے شال کندھے سے اُتار کر گھانس پر ڈال دی اور گھوڑے کے پاس آکر گھوڑے سے ایسی زبان میں کچھ کہا جسکو کوئی اور نہ سمجھا مگر گھوڑا بالکل خاموش ہوگیا اور اپنے مالک کے شانے سے اپنا مونہہ رگڑنے لگا۔ ذرا دیر میں لوہار کا کام ختم ہوگیا۔ اڈنا دوکان کے اندر چلی گئی تھی۔ وہ شخص گھوڑے پر سوار ہوگیا اور پوچھا تیری کیا اُجرت ہوئی۔ اور اپنی واسکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک سونے کا ڈالر نکالکر لوہار کی طرف پھینک دیا اور یہ کہا کہ میرے پاس اس سے کم قیمت کا کوئی اور سکہ اس وقت نہیں ہی۔ لوہار نے اسی قدر جواب دیا کہ ایسے ذرا سے کام کی کوئی اجرت میں نہیں چاہتا۔ سوار چل دیا جب چند قدم گیا ہوگا تب اڈنا کی نگاہ شال پر پڑی اور شال اُٹھا کر سوار سے پکار کر کہا کہ آپ اپنی شال بھولے جاتے ہیں۔ سوار نے گھوڑا روک لیا اور لڑکی کے ہاتھ سے شال لے لی اور کہا لڑکی میں تیرا مشکور ہوا۔ اور گھوڑے کو مہمیز لگائی اور نظر سے غائب ہوگیا۔ (باقی دارد)

ملکہ الگزنڈرا کا خط

قوم کے نام

ملک معظم شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم آنجہانی کے انتقال پُرملال کے موقع پر شہنشاہ بیگم کے ساتھ مختلف طریقوں سے جب اظہار ہمدردی کیا گیا تو اسکے جواب میں بیوہ ملکہ نے ایک خط اپنے ہاتھ سے لکھا جس کا اطراف عالم میں آجکل بڑا چرچا ہے۔

شہنشاہ بیگم کے مصائب وآلام کا احساس جیسا کچھ ہماری خواتین فرماسکتی ہیں وہ کسی اور سے ممکن نہیں اُنہیں خصوصیت سے بیوہ ملکہ کے ساتھ ضرور دلی ہمدردی ہوگی۔ اس لیے ملکہ کے جواب کا ان غائبانہ ہمدردوں تک پہنچنا بھی بہت ضروری ہے۔ لہذا اُس خط کا ترجمہ ناظرات خاتون کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔

قصر بکنگ ہام

سہ شنبہ - ۱۰۔مئی سنہ ۱۹۱۰ء

میں اپنے درد رسیدہ۔مصیبت زدہ اور شکستہ دل سے اپنی تمام قوم اور عزیز رعایا کا جس کے ساتھ ہم کو بے انتہا محبت ہی اس سچی اور دلی ہمدردی کے لیے شکریہ ادا کرتی ہوں جو اُس نے میرے بے پایاں غم واندوہ اور ناقابل بیان مصیبت پر ظاہر کی ہی۔

اپنے پیارے شوہر کی وفات سے نہ صرف میں ہی تمام چیزوں سے

محروم ہو گئی ہوں بلکہ قوم کو بھی ایک بہترین دوست۔ مہربان باپ اور شفیق حکمراں کے اس طرح اچانک اُٹھ جانے کا ناقابل تلافی صدمہ برداشت کرنا پڑا ہے۔

خدائے کریم ہم سب کو اس جانکاہ صدمہ اور روح فرسا مصیبت کے کرنے کی توفیق اور قوت عطا فرمائے۔ خدا کی مرضی ہمیشہ پوری ہو کر رہتی ہے دعا کرو کہ میری جان زار کو تسکین اور دل کو قرار حاصل ہو۔ اور جو کچھ مجھے ابھی آیندہ برداشت کرنا ہے اُسے صبر و سکون کے ساتھ برداشت کروں۔

میں تہ دل سے ان تمام اظہارات ہمدردی اور خطوط تعزیت کے لیے شکریہ ادا کرتی ہوں جو میرے پاس ادنیٰ۔ اعلیٰ۔ امیر۔ غریب۔ ہر فرقے اور ہر طبقے کی طرف سے بکثرت وصول ہو رہے ہیں۔ اگر میں فرداً فرداً اُن بیشمار ہمدردوں کی مہربانی کا شکریہ ادا کرنا چاہوں تو میرے لیے بالکل ناممکن ہے اور میں کبھی اس فرض سے سبکدوش نہیں ہو سکتی۔

میں اپنے پیارے لخت جگر کو آپ لوگوں کے سپرد کرتی ہوں۔ مجھے اس بات کا علم اور یقین ہے کہ میرا عزیز فرزند اپنے شفیق محترم باپ کے نقش قدم پر چلے گا۔ آپ لوگوں سے میری یہ استدعا ہے کہ آپ اُس کے ساتھ اسی وفاداری اور عقیدت مندی کا برتاؤ کریں جو اُس کے عزیز باپ کے ساتھ آپ کرتے تھے۔

مجھے اس کا پورا یقین ہے کہ میرا پیارا نور نظر اور میری عزیز بہو دونوں اس بات کی کوشش میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں گے کہ وہ اپنے آپ کو آپ کی عقیدت مندانہ وفاداری کا مستحق ثابت کریں اور اس کی قدر کریں۔ فقط۔

(دستخط) الکزنڈرا

ملکہ نے اجازت دی ہے کہ اس خط کی نقل تیار کرا کے فروخت کی جائے اور اس طرح جو آمدنی ہو وہ کسی قومی کام میں صرف کی جائے۔ اب اس خط کے عکس مسرز ریفائل ٹک کے کارخانے میں تیار ہو رہے ہیں۔

سید خورشید علی
حیدرآباد دکن

زنانہ اسکول علی گڈھ

ہمارے کالج کے معزز و نامور ٹرسٹی جناب حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب کی بیگم صاحبہ نے مہربانی سے گذشتہ مارچ میں زنانہ اسکول علی گڈھ کا معائنہ کیا تھا اور اُن کے ہمراہ حاجی صاحب موصوف کی دختر نیک اختر جنکا نوٹ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں تشریف لائی تھیں۔ اگر ہمارے قوم کے معزز شرفاء کی لڑکیاں زنانہ اسکول میں ابھی سے ایک دلچسپی پیدا کریں تو اسکو ہم اسکول کی آیندہ ترقی کے لیے ایک نیک فال سمجھتے ہیں کیونکہ کسی زمانے میں یہی لڑکیاں جب معزز بیویاں بنیں گی تو مدرسہ کا چلانا اپنے اوپر فرض سمجھ کر اس کے استحکام کی ہر طرح سے کفیل و ضامن بن جائیں گی۔

اس نوٹ میں چند امور بطور آیندہ ہدایت کے لکھے گئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ دوسرے شہروں میں لڑکیاں پیدل آتی جاتی ہیں اس سے کسی کو کہیں یہ خیال نہ گزرے کہ ہمارے مدرسہ کی حالت کے متعلق یہ ریمارک ہے۔ باقی اور جس قدر باتیں دلسوزی اور ہمدردی سے اس معصوم اور نیک دل بچی نے ظاہر کی ہیں اُن پر ہماری معزز بیگمات کو غور کرنا چاہیے۔ اڈیٹر۔

۲- مارچ سنہ حال کو میری والدہ مکرمہ زنانہ مدرسہ علی گڑھ دیکھنے تشریف لے گئیں تھیں اور مہربانی کرکے مجھے بھی اپنے ہمراہ لے گئی تھیں۔ اسکول دیکھ کر دل بہت خوش ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہر چہار جانب تعلیم نسواں کا چرچا ہوتا جاتا ہے۔ خداوند کریم راست لائے اور اس کے حامیوں کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین۔

ہم لوگ بغیر اطلاع کیے گئے تھے اس لیے کہ اصلی حالت دیکھیں۔ لیکن اتنی امید نہیں تھی جیسی ترقی دیکھی۔ لڑکیاں بھی کافی تعداد میں تھیں اور پڑھائی بھی اچھی طرح ہو رہی تھی۔ جائنٹ سکرٹری صاحبہ کی بہن سے بھی ملاقات ہوئی وہ اُس وقت لڑکیوں کی پڑھائی وغیرہ کی نگرانی کر رہی تھیں۔ جو گفتگو والدہ صاحبہ اور بیگم صاحبہ سے مدرسہ کے متعلق ہوئی اُس کو سُن کر اور بیگم صاحبہ کے خیالات دریافت کرکے میں بہت خوش ہوئی۔ کاش کم از کم اسکول کے دیگر متعلقین کی بھی بیگم صاحبہ موصوفہ کی سی رائے ہو اور ایک رائے ہو کر اسکول کے کام کو اپنا سمجھ کر کریں تو یقین ہے کہ اسکول نہایت خوبی سے چل سکے گا۔ لیکن مسلمانوں میں اس قدر ملنساری کہاں ہے۔ اور خاص کر اسکول کے کام سے تو سب اس وجہ سے ڈرتے ہیں کہ خدا نخواستہ کوئی بدنامی ہمارے سر نہ آئے۔

جب سر سید مرحوم نے کالج کھولا تھا تب اسی طرح مرد بھی ڈرتے تھے اور اب اس کے کام کو شرف سمجھتے ہیں۔ یہی نواب محسن الملک بہادر جنھوں نے اس قدر گرمجوشی سے کالج کا کام کیا۔ سید صاحب کے مخالف تھے جتنے پہلے ممبر کالج کے ہیں سب کو سید صاحب نے زبردستی ممبر کیا تھا۔ اُن دنوں کوئی اُن کا ساتھ دینے کی حامی نہیں بھرتا تھا۔ یہی حال آج کل زنانہ اسکول کا ہے کہ کوئی اسکا اور اس کے حامیوں کا ساتھی نہیں۔ لیکن انشاء اللہ کسی روز یہی اسکول کالج کی طرح نام

پیدا کریگا اور اُس کے مخالفین پچھتائیں گے۔

میری ناقص رائے میں معزز بیگمات کو ہرگز کسی کے کہنے کا خیال نہیں کرنا چاہیے اس لیے کہ یہ کار خیر ہی ضرور اللہ تعالیٰ اس میں برکت دے گا اور اس کے حامیوں کو بدنامی سے بچائے گا انشاء اللہ۔

کم از کم علی گڈھ کی سب تعلیم یافتہ بیگمات کو خوب سرگرمی سے کوشش کرنی چاہیے۔ لیکن ایک بات ضرور ہی کہ ابھی کم از کم جب تک بورڈنگ ہاؤس کا انتظام نہ ہو اُس وقت تک بڑی بڑی لڑکیاں اسکول میں داخل نہ ہوں۔ صرف گیارہ بارہ سال تک کی عمر کی لڑکیاں اسکول میں پڑھیں اس لیے کہ گھر سے اسکول کو روز کا آنا جانا ہی۔ جب اسکول بن جائے تب زیادہ عمر کی لڑکیاں بھی پڑھیں تو کوئی بُرائی نہیں۔ لیکن پھر روز کا اُن کا گھر جانا ملتوی ہو۔ اور اُن کے عزیزوں کو ہدایت ہو کہ جس کا باپ یا بھائی تعطیل کے روز خود لڑکیوں کو لینے آیگا تو وہ بھیجی جائیں گی ورنہ پھر سات روز تک نہیں جاسکتیں اور گھر سے اسکول کو بھی کسی اپنے عزیز کو ساتھ لے کر آئیں۔

سُنا ہی کہ اور شہروں میں جہاں لڑکیوں کے اسکول ہیں بعض لڑکیاں جو اُسی شہر کی ہوتی ہیں تعطیل کے روز پیدل رات کے وقت اپنے گھر چلی جاتی ہیں اور پھر دوسرے روز پیدل ہی گھر سے اسکول آتی ہیں اتنی آزادی یہاں کے اسکول کی لڑکیوں کو ہرگز نہیں دینی چاہیے۔

جن لڑکیوں کو وظیفہ ملے دوسری لڑکیوں پر ظاہر نہیں ہونا چاہیے۔ اس کا خیال بھی چاہیے کہ وظیفہ کا تذکرہ علانیہ نہ کیا جائے اس تذکرے سے وظیفہ پانیوالی طالب علم کی قدرتی دلیری میں فرق آجاتا ہی اور وہ دب جاتی ہی پھر اُس کی رفتار مدھم ہو جاتی ہے۔

لباس بھی ایک ہی ہونا چاہیے۔ میری رائے میں عربی لباس مناسب ہوگا
تنگ پائجامہ نیچا کرتہ اور کرتے پر سدری اور ڈوپٹہ اوڑھکر بائیں (یعنی اُلٹے)
کندھے پر دوپٹہ میں سیفٹی پن لگانی چاہیے۔ رنگ بھی ایک ہی ہو اگر پاجامہ
اور سدری سیاہ۔ کرتہ اور ڈوپٹہ سرخ ہو تو مناسب ہوگا ورنہ کوئی اور ہی رنگ
ہو لیکن پاجامہ اور سدری کا ایک ہونا چاہیے اور دوپٹہ اور کرتہ ایک رنگ۔
ایک لباس ہونے میں امیر و غریب کی پہچان نہیں ہوتی۔ جیسا کہ کالج میں ہے
میری دعا ہے اور خدائے تعالیٰ سے امید بھی ہے کہ جیسا ہمارے کالج کا نام نیک نامی
کے ساتھ مشہور ہوا ہے ویسا ہی باری تعالیٰ لڑکیوں کے اسکول کا کرے۔
آمین ثم آمین۔

دختر کلاں حاجی موسیٰ خاں صاحب
از دتاولی

بقیہ شاہ لیر

کینٹ اسٹیج پر آتا ہے

کینٹ۔ یہ کون ہے۔
دیوانہ۔ واللہ یہاں پر ایک حضور عالی ہیں اور ایک خالی چنا۔ یعنی ایک عقلمند
آدمی اور ایک دیوانہ۔
کینٹ۔ ہائے افسوس! کیوں صاحب آپ یہاں کیا کر رہے ہیں۔ جو جانور
کہ رات کی تاریکی کے شائق ہوتے ہیں وہ بھی تو ایسی رات کا وقت پسند نہیں
کرتے جیسی کہ آج کی ہے۔ خشمناک ڈراونے سیاہ بادلوں سے رات کی تاریکی میں

بھرنے والوں کے دل دہل جاتے ہیں اور مارے ڈر کے وہ کھوؤں میں گھس جاتے ہیں۔ جب سے مجکو ہوش ہی میں نے ایسی آنکھوں کو چندھیا دینے والی چمک اور ایسی دل کو ڈرا دینے والی گرج اور ایسی وحشت ناک ہوا اور مینھ کا طوفان نہ کبھی دیکھا اور نہ سُنا۔ انسان کی طبیعت اس مصیبت اور دہشت کی برداشت مشکل سے کرسکتی ہی۔

لیر۔ عالیشان دیوتا جو ہمارے سر پر ان مصیبتوں کا ہجوم لائے ہیں اُن کو اب موقع ہی کہ وہ اپنے دشمنوں کو اس وقت میں سزا دیں۔ اے ذلیل انسانوں جن کے دلوں میں جرم اور گناہوں کے راز پوشیدہ ہیں اور جنھوں سے اپنے جرموں کی سزا اس وقت تک نہیں بھگتی ہے اب تم بھاگ جاؤ اور کہیں چھپ جاؤ۔ تم جنکے ہاتھوں بیگنا ہوں کا خون ٹپک رہا ہی۔ تم جنھوں نے دروغ حلفی کیے ہیں۔ تم جو نیکی کا مونھ چڑاتے ہو اور اصل میں فاسق اور فاجر ہو۔ جاؤ اور اپنی کمینہ زندگی کے بچانے کی فکر کرو۔ اے بدبختو! تم پاش پاش ہوجاؤ جو اپنے ہر کام میں ظاہرداری برتتے ہو اور تمھارے دلوں میں دوسروں کے گلا کاٹنے کے لیے خنجر پوشیدہ ہیں۔ گناہگار دلوں کی تاریکی میں جو بدیاں چھپ رہی ہیں وہ اپنے تاریک کونوں سے باہر نکلیں اور اس خوفناک گرج اور چمک سے اپنی نجات کی دعا مانگیں۔ میں ایک ایسا آدمی ہوں کہ جس نے خود تو اس قدر گناہ نہیں کیے ہیں جس قدر دوسروں نے مجھے اپنے گناہوں کا نشانہ بنایا ہی۔

کینٹ۔ کس قدر سخت افسوس کی بات ہی کہ اس قدر سخت آندھی۔ مینھ گولہ باری۔ برف اور سردی کے وقت آپ ننگے سر جنگل میں پھرتے ہیں حضور آپ مجھ پر مہربانی کیجیے۔ اور یہاں سے قریب ایک جھونپڑی ہے

اس میں تشریف لے چلیے۔ امید ہے کہ اس جھونپڑی کے رہنے والے اس موسم کی سختی سے کچھ تو آپ پر رحم کرینگے۔ اور اس موسم کی سختی سے کچھ تو آپ کو پناہ دینگے۔ اور اتنے میں میں اُن سنگ دلوں کے پاس جاؤں جو اس عالیشان پتھر کے قلعے میں رہتے ہیں جنھوں نے ابھی مجکو تو اندر آنے کی اجازت نہیں دی لیکن حضور کے بارے میں دریافت کرتے تھے اور کہتے تھے کہ آپ کو اندر آنے کی اجازت مل سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ وہ لوگ میری التجا کو قبول کریں اور حضور کو اندر گھسنے کی اجازت دیں۔

لیر۔ اب تو میرے حواس خبط ہوئے جاتے ہیں (دیوانہ سے) چل لڑکے آگے چل۔ کیوں لڑکے تمھاری حالت کیا ہے۔ تم تو سردی میں ٹھٹھرے جاتے ہو۔ مجھے بھی سخت سردی لگ رہی ہے (کینٹ سے) بھائی اُس جھونپڑی ہی کا پتہ دو کہ کہاں ہے۔ ہماری ضرورتیں بھی بعض وقت عجیب و غریب ہوتی ہیں۔ جن کی وجہ سے ذلیل اور ادنیٰ ادنیٰ چیزیں بھی بڑی عالیشان معلوم ہونے لگتی ہیں۔ چلو بھئی چلو جھونپڑی کی طرف چلو (دیوانہ کی طرف دیکھ کے) بیچارے دیوانے ابھی تک میرے دل میں انسانی ہمدردی کا ایک شمہ باقی ہے جس سے مجھے تمھاری مصیبت دیکھ کر تکلیف ہو رہی ہے۔

لیر۔ ہاں لڑکے ٹھیک کہہ رہا ہے۔ (کینٹ سے) چلو بھئی وہ جھونپڑی کہاں ہے؟

(کینٹ اور لیر چلے جا رہے ہیں)

دیوانہ۔ میں اپنے جانے سے قبل ایک پشین گوئی کرنا چاہتا ہوں۔ (پشین گوئی) جبکہ مذہبی پیشوا اصلیت کو چھوڑ کر صرف لفاظی پر اُتریں گے اور جبکہ شراب بنانے والے اپنی شراب میں پانی ملا کر اسکو خراب کرنے لگیں گے۔ جبکہ اعلیٰ طبقے کے لوگ اپنے لباس کی کتر بونت میں دن رات

اپنا صرف کرنے لگیں گے۔ اور جبکہ بدعتی لوگ آگ سے جلائے نہیں جائینگے اور جبکہ اس ملک پر اندھیر نگری چوپٹ راجہ کی مثل صادق آنے لگے گی۔ اور جبکہ کسی سپاہی پر قرض نہیں ہوگا اور کوئی سردار بھوکا نہیں مریگا۔ اور جبکہ لوگوں کی عیب گوئی زبانوں پر باقی نہیں رہے گی۔ اور جبکہ گانٹھ کٹے میلوں ٹھیلوں میں آنا بند کر دینگے۔ اور جبکہ سودخوار کھلے میدانوں میں اپنی اشرفیاں گنا کرینگے۔ اور جبکہ بدکار عورتیں مسجدیں تعمیر کرانا شروع کریں گی۔ اُس وقت انگلستان کے ملک میں حشر برپا ہوگا۔ وہ ایک وقت ایسا ہوگا جو زندہ رہیں گے اُسے دیکھیں گے کہ لوگ اُس وقت اپنے پاؤں پاؤں چلنا شروع کرینگے۔ یہ پیشین گوئی میرے بعد دوسرے ولی خدا جناب مسٹر مرلن صاحب اکثر لوگوں کو سنائیں گے کیونکہ میں تو پہلے ہی مر جاؤں گا۔

سین تیسرا

قلعہ گلاسٹر کا ایک کمرہ

گلاسٹر اور ایڈمنڈ داخل ہوتے ہیں۔

گلاسٹر۔ افسوس صد افسوس! ایڈمنڈ میں اس قسم کا سلوک جوان بیٹیوں نے اپنے باپ سے کیا ہو کسی طرح پسند نہیں کر سکتا ہوں میں نے جب اُن سے اجازت چاہی کہ میں بادشاہ سے کچھ ہمدردی کروں اور اُن کو گھر میں بُلالوں تو اُن کمبختوں نے میرے پاس سے چابیاں چھین لیں۔ اور میرے قلعہ پر خود قبضہ کر لیا۔ اور مجکو حکم دیا کہ اگر تم اُن کی نسبت کبھی بات کروگے یا سفارش کروگے یا کسی طرح سے اُن کو مدد دوگے تو ہم ہمیشہ کے لیے تم سے ناخوش ہونگے۔

ایڈمنڈ۔ یہ حرکت نہایت وحشیانہ اور خلاف فطرت ہے۔

گلاسٹر۔ چپ چپ تم اپنی زبان سے کچھ مت کہو۔ تمھیں معلوم ہو کہ ان دونوں شہزادوں کے درمیان سخت اختلاف واقع ہوا ہے اور اس سے بھی بڑھ کر ایک وحشتناک خبر ہی جس کے بارے میں آج رات میرے پاس ایک خط آیا ہو اُس کے متعلق ذکر کرنا بھی خطرناک ہے۔ میں نے اُس خط کو اپنی الماری میں تالے کے اندر بند کر دیا ہی۔ یہ بدسلوکی اور صدمات جو بادشاہ کو برداشت کرنے پڑے ہیں ان کا انتقام بہت پورے طور سے لیا جائے گا۔ ایک فوج کا دستہ پہلے ہی کنارے پر پہونچ گیا ہی۔ ہم کو بادشاہ کا ساتھ دینا چاہیے۔ میں ابھی جاتا ہوں کہ خفیہ خفیہ بادشاہ سلامت کی کچھ مدد کروں۔ تم جاکر شاہزادہ کو باتوں میں لگالو تاکہ اُن کو یہ معلوم نہو کہ میں بادشاہ کی مدد کر رہا ہوں۔ اگر وہ میری نسبت دریافت کریں تو کہدو کہ میں بیمار ہوں اور سوگیا ہوں۔ گو وہ مجکو موت کی دھمکی دیتے ہیں لیکن میں اپنے آقا کی ضرور مدد کرونگا چاہے اسکا نتیجہ موت ہی کیوں نہو۔ ایڈمنڈ! کچھ عجیب وغریب حالت آنکھوں کے سامنے دکھائی دے رہی ہی تم میرا کہا مانو اور بڑی احتیاط کرو۔ (گلاسٹر چلا جاتا ہی)

ایڈمنڈ اچھا اب موقع ہی۔ باوجود منع کرنے کے میرا بڈھا باپ بادشاہ سے سلوک کرنے گیا ہی میں اس کی اطلاع ابھی شاہزادہ کو جاکر دیتا ہوں۔ اور اُس خط کی بھی اطلاع ان کو دینی ضرور ہے گو اس میں میرے باپ کو بہت نقصان پہونچے گا۔ لیکن اُس کے نقصان میں میرا فائدہ ہے۔ اور شاہزادہ اس سے بڑھ کر اور کسی بات کو خیرخواہی نہ سمجھیں گے۔ اور بڑی بات تو یہ ہے کہ اب بڈھے کے گرنے اور بچے کے اُبھرنے کا وقت آگیا ہے۔

(اسٹیج سے چلا جاتا ہی)

چوتھا سین

جنگل

جھونپڑی کے سامنے لیر کینٹ اور دیوانہ کھڑے ہیں

کینٹ۔ حضور وہ یہی جھونپڑی ہے۔ میرے مہربان آقا۔ اس کے اندر تشریف لے چلیے۔ کھلے میدان میں ہوا اور موسم کی سختی انسان کے لیے بالکل ناقابل برداشت ہے۔

لیر۔ چلو مجھے مت چھیڑو۔ مجھے اپنی حالت پر رہنے دو۔

کینٹ۔ مہربان آقا۔ اسی کے اندر تشریف لے چلیے۔

لیر۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں ایسی ذلیل جھونپڑی میں جاکر اپنی ذلت کے صدمے سے مرجاؤں۔

کینٹ۔ میں چاہتا ہوں کہ قبل اسکے کہ آپ مریں میں ہی مرجاؤں (منھ دوسری طرف کرکے آنسو بہاتا ہے) میرے پیارے آقا موسم نہایت سخت ہے آپ اندر تشریف لے چلیے۔

لیر۔ شاید تم یہ خیال کرتے ہو کہ یہ پانی کی بوچھار اور سرد ہوا جو ہمارے جسم کو تر اور ٹھنڈا کیے دیتے ہیں یہ کوئی بڑی سختی اور مصیبت کی بات ہے۔ ہاں بے شک تمھارے لیے تو اس سے بڑھ کر کوئی مصیبت نہیں ہے لیکن تم کو معلوم ہے کہ انسان کے جسم میں اگر کوئی بہت سخت درد ہوتا ہے تو معمولی تکلیف اسکو کبھی محسوس نہیں ہوتی۔ اس موسم کی سختی میرے لیے معمولی تکلیف ہے۔ جبکہ ناشکرگزار بیٹیوں کی نامہربانی۔ اور ناشکرگزاری کے زہریلے اور تیز تیز تیر میرے دل میں لگ رہے ہیں اور نہایت شدید درد پیدا ہورہا ہے۔ اگر کسی کو راستے

میں ریچھ مِل جائے تو اُس کی دہشت سے انسان ضرور بھاگے گا۔ لیکن اگر سامنے
سمندر کی طوفان خیز موجیں نظر آتی ہوں تو وہ لوٹ کر ریچھ کا مقابلہ کرنا بہتر سمجھے گا
بہ نسبت اسکے کہ وہ سمندر میں یکایک غرق ہوجائے۔ جب انسان کے دل میں
کوئی فکر نہیں ہوتی تو اُسکو جسم کی آسائش کا خیال آتا ہی لیکن تم کو معلوم ہے کہ وہ
طوفان جو میرے دل میں برپا ہی اُسی نے اس طوفان کو جس سے تم ڈرتے
ہو اور مجھے ڈراتے ہو میری نگاہ میں بالکل بے حیثیت کر دیا ہی اور مجکو اُس کی
سختی ہرگز محسوس نہیں ہوتی۔ اولاد کی ناشکرگذاری! تیرا بُرا ہو۔ کیا اولاد
کی ناشکرگزاری ایسی نہیں ہی جیسے ہمارے دانت اُس ہاتھ کو جو مونھ میں لقمہ دے
پھاڑ کھائیں؟ خیر اب میں زیادہ رونے دھونے پر اپنا وقت صرف نہ کرونگا
اِن بدذاتنیوں کو سزا دونگا۔ ہائے غضب ایسی رات میں مجھے گھر سے نکال کر
دروازے بند کر دیئے۔ او آسمان کے سیاہ سیاہ بادل اپنے خزانوں میں سے
ٹھنڈے ٹھنڈے برف گرائے جا۔ میں سب کچھ برداشت کرنے کو تیار ہوں
اور گین! گا نرل! یہاں پر تمھارا بڈھا باپ سردی ہوا اور مینھ میں کھڑا ہے۔
یہ وہی تمھارا باپ ہے جسنے مہربانی سے سب اپنی سلطنت تمھارے حوالے
کر دی۔ ہیں ہیں یہ خیالات مجکو دیوانہ کر دیں گے میں ان خیالات کو اپنے
دل میں جگہ نہیں دوں گا۔ میں ان خیالات سے باز آنا چاہتا ہوں۔

کینٹ۔ حضور انور۔ چلیے اندر تشریف لے چلیے۔

لیر۔ مہربانی سے آپ خود ہی جائیے اور اپنے آرام کے سامان کیجیے۔ یہ
صدمہ جو میرے دل پر ہی مجھے اجازت نہیں دیتا کہ میں کسی ایسی تکلیف کا
خیال دل میں لاؤں جو مجھے اس سے زیادہ رنج پہونچا سکتی ہی۔ مگر خیر میں اندر
چلتا ہوں (دیوانہ سے) چل لڑکے سب سے پہلے تو ہی چل۔ مجھے تیری حالت پر

رحم آتا ہی۔ چل اندر چل۔ میں پہلے دعا مانگوں گا اور پھر سو جاؤں گا۔

(دیوانہ اندر جاتا ہے)

لیر۔ وہ دنیا کے مصیبت زدہ ننگے بھوکے مفلس لوگ جہاں کہیں بھی ہوں جو اس طوفان اور مینھ اور گولہ باری کی مصیبتیں جھیل رہے ہوں گے ایسی حالت میں تمہاری مصیبت کا خیال مجکو سب سے پہلے آنا چاہیے تھا لیکن اپنی مصیبت میں میں تمہاری حالت کو بھول گیا۔ اسے غرور۔ تمول اور شان وشوکت تجھے اگر اپنی اصلاح منظور ہو تو اپنے کو اُسی حالت میں ڈال جس میں کہ مصیبت زدہ لوگ رہتے ہیں تاکہ تجھے حقیقت معلوم ہو جائے اور تو کسی وقت مصیبت زدوں کی کچھ مدد کر سکے۔ اور خدا تم پر بھی رحم کرے۔

ایڈگر (جھونپڑی کے اندر سے چونکتا ہی) سو سو گز گہرا ہے۔ سو سو گز گہرا ہی

(دیوانہ جھونپڑی سے باہر بھاگتا ہی)

دیوانہ۔ چچا صاحب یہاں مت آئیے یہاں مت آئیے۔ یہاں ایک بھوت ہے، میری مدد کیجیے۔ میری مدد کیجیے۔

کینٹ۔ کیا ہی بھئی۔ یہاں کون ہی۔ کیا کہتے ہو۔

دیوانہ۔ ایک بھوت ہے۔ ایک بھوت ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میرا نام ٹوم ہے۔

کینٹ۔ تم کون ہو۔ اندر کیا کر رہے ہو۔ ذرا باہر تو آؤ۔

(باقی دارد)

اڈیٹر

اڈیٹوریل

پردہ۔ بعض لوگوں کے نزدیک پردہ محض ایک سوشیل رسم ہے اور مذہب کا کوئی خاص حکم اسکے متعلق موجود نہیں ہے۔ برخلاف اسکے ایک بڑے گروہ اہل اسلام کا اسپر اتفاق ہے کہ پردے کی ابتدا احکام خدا اور رسول پر مبنی ہے۔ جو لوگ پردہ کو احکام مذہب سے خارج سمجھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں کوئی حکم عام مسلمات کے پردہ کی نسبت نہیں ہے بلکہ پیغمبر خدا کی بیبیوں یا امہات المومنین کے لیے خصوصیت کے ساتھ حکم آیا ہے۔ اگر عام مسلمات کے لیے بھی پردہ کی تاکید مقصود ہوتی تو خصوصیت کی کیا وجہ تھی اور جب ایک حکم خاص کر دیا گیا تو پھر اُس میں کھینچ تان کی کیا ضرورت ہے۔ عام مسلمات کو اس حکم میں شامل کیوں کیا جاتا ہے۔

یہ حضرات دوسری دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ احادیث میں بھی پردہ کی کوئی خاص صراحت نہیں ہے اور برخلاف اس کے فقہ کی کتابوں میں بھی صاف طور پر صراحت کر دی گئی ہے کہ مونھ اور ہاتھ کا پردہ نہیں ہے۔ چنانچہ شرع شریف کی سب سے زیادہ معتبر کتاب ہدایہ میں جو تمام اہل سنت والجماعت کا دستور العمل ہے واضح طور پر موجود ہے کہ مونھ اور ہاتھ کا پردہ نہیں ہے۔ پس اس گروہ کے حضرات کے نزدیک پردہ محض ایک رسمی چیز ہے اور زمانۂ حال میں مہذب دنیا کے سامنے ہم کو اس رسم کی وجہ سے شرمندہ ہونا پڑتا ہے کہ ہم اپنی عورتوں کو ہمیشہ قید میں بند رکھتے ہیں۔ علاوہ بریں پردہ نشین عورتوں کی صحت کبھی ٹھیک نہیں رہ سکتی اور اس سے بچوں کی صحت پر بھی بُرا اثر پڑتا ہے اور ہماری نسل روز بروز کمزور اور بودی ہوتی جاتی ہے۔

دوسری جانب سے یہ کہا جاتا ہے اور اس پر تمام علمار اور قریب جمہور اہل اسلام اور بالخصوص مسلمانان ہند کے بہت بڑے گروہ کا اتفاق ہے کہ پردے کی پابندی عین احکام اسلام کی تعمیل ہے اور جو لوگ اسکے خلاف کہتے ہیں وہ گمراہ ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ آیات قرآنی میں سے کوئی آیت پردے کی نسبت بطور سند کے پیش نہیں کیجا سکتی۔ البتہ متعدد احادیث موجود ہیں جن میں پردے کی تاکید آئی ہے۔ اور نیز جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے گھر کا طرز عمل بطور نظیر کے ہمارے سامنے موجود ہے۔

پیغمبر خدا کے زمانے کی دیگر مستورات اور بالخصوص صحابی عورتوں کے متعلق ٹھیک ٹھیک نہیں کہا جا سکتا کہ آیا وہ بھی پردہ کرتی تھیں یا نہیں یا اُن میں سے بعض پردہ کرتی تھیں اور بعض نہیں کرتی تھیں۔ عورتوں کے متعلق مسلمان مورخین بہت ہی کوتاہ قلم معلوم ہوتے ہیں۔ جہاں پر انہوں نے دیگر پہلوؤں سے فن تاریخ نویسی کو درجہ اوج تک پہونچایا ہے وہاں پر انہوں نے ہم کو عورتوں کے مفصل حالات سے محروم رکھنے میں بھی کمی نہیں کی۔ اس سے ہم یقینی طور پر کبھی نہیں کہہ سکتے کہ آنحضرت کے زمانے میں اور اُن کے بعد حضرات خلفار راشدین کے زمانے میں عام مسلمان عورتوں کی کیا حالت تھی آیا وہ زمانہ حال کی طرح پردے میں رہتی تھیں یا پردہ محض ایک اختیاری چیز تھی جسکا دل چاہا پردے میں بیٹھی اور جسکا دل چاہا نہ بیٹھی۔

انفرادی طور پر عورتوں کے حالات اور واقعات جو وقتاً فوقتاً رسالہ خاتون میں شائع ہوتے رہے ہیں اُن سے یہ نتیجہ اخذ کرنا پڑتا ہے کہ عام طور پر پردے کی پابندی لازمی نہ تھی۔ عورتیں جنگ میں جاتی تھیں۔ گھوڑوں پر سوار

ہوتی تھیں۔ مردوں کی طرح تلوار مردوں پر چلاتی تھیں۔ زخمی سپاہیوں کو پانی پلاتی تھیں اور میدان جنگ سے اُٹھا کر امن کے مقام پر پہونچانے میں مدد دیتی تھیں۔ اکثر احادیث سے ثابت ہی کہ عورتیں آنحضرت کے پاس عام مجمعوں میں آکر سوال کرتی تھیں اور آنحضرت اُسکا جواب ارشاد فرماتے تھے اور اسی طور پر یہ بھی ثابت ہی کہ خلافت راشدہ کے زمانے میں عورتیں دربار میں برملا آکر خلفار کے سامنے اپنی حاجتیں پیش کرتی تھیں اور سرکار دربار کے متعلق جو کام ہوتے تھے اسکو خود انجام دیتی تھیں۔ لیکن اس میں پھر یہ کہا جاسکتا ہی کہ ممکن ہی وہ بُرقعے اوڑھکر آتی ہوں اور مرد اُن کا مُونھ اور ہاتھ نہ دیکھ سکتے ہوں جس سے حامیان پردہ قطعی طور پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ برقعہ کا استعمال ہوتا تھا۔ اسی طرح پر مخالفین پردہ بھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ ایسا نہیں ہوتا تھا۔

اب سوال یہ ہی کہ بالفرض اگر پردے کے احکامات قرآن اور حدیث میں موجود نہ بھی ہوں اور عام طور پر قرون اولی کی مسلمان عورتیں پردہ نہ بھی کرتی ہوں تو پھر کیا رسم پردہ یک قلم موقوف کرنے کے قابل ہی۔ دنیا میں رسمیں اچھی بھی ہوتی ہیں اور بُری بھی اور غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ہماری تمدنی زندگی کی اکثر باتیں رسم و رواج پر مبنی ہیں۔ جو باتیں بزرگوں کے زمانے سے چلی آتی ہیں خواہ وہ مذہبی احکامات پر مبنی ہوں یا نہوں اور نیز بلا کافی غور اور تامل کے حملہ نہیں ہوسکتا۔ کوئی بات تو ہوگی کہ جس کی وجہ سے کسی زمانے میں کل مسلمان اس بات پر متفق ہوگئے تھے کہ مستورات کو غیر مردوں کے سامنے بے حجاب نہیں آنا چاہیئے کوئی بہتری تو پردے میں مخفی ضرور تھی کہ جس کی وجہ سے امہات المومنین کے لیے خصوصیت کے ساتھ پردے کے متعلق وحی آتی تھی۔ کوئی بہتری اور مصلحت تو اب بھی ہماری نگاہ کے سامنے ہی جس کی وجہ سے غیر مردوں سے حجاب کرنا

ہمیں عورتوں کے لیے ضروری معلوم ہوتا ہے۔

ناظرین کو یہ بات معلوم ہے کہ ایشیا کی کل اقوام میں خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان یا بودہ مذہب۔ شروع زمانہ تاریخ سے آجتک عورتوں اور مردوں کے درمیان اُس طریقہ کا اختلاط باہمی روا نہیں رکھا گیا جسکو اقوام یورپ نے روا رکھا ہے۔ اکثر ہندو عورتیں بھی اس قسم کا پردہ نہیں کرتیں جسکو عرف عام میں پردہ کہا جاتا ہے۔

یعنی مکان کی چہار دیواری کے اندر محصور نہیں رہتیں اور صبح کے وقت دریاؤں اور تالابوں پر نہانے کے لیے جاتی ہیں لیکن اُن میں جوان عورتیں جب عام طور پر بازار میں نکلتی ہیں تو گھونگٹ نکال کر نکلتی ہیں یعنی چہرے کا حجاب کرتی ہیں۔ اور گھروں میں مرد اور عورتیں کبھی مل کر ایک جگہ نہیں بیٹھتے بلکہ مردوں کے بیٹھنے اُٹھنے کی جگہ الگ ہوتی ہے اور عورتوں کی الگ۔ چین میں بھی یہی حالت سُنی ہے۔

اسلامی ممالک میں دوسری ہی قسم کا پردہ کیا جاتا ہے جو ہندوستان کے مسلمانوں سے تو ضرور مختلف ہے مگر اکثر ہندوؤں اور چینیوں کی نسبت بہت زیادہ سختی ہے۔ پس ایشیا کی کل اقوام کی طبائع مرد اور عورت کے بے تکلفانہ اختلاط باہمی کے خلاف ہیں۔

پس جو لوگ اس قسم کی بے حجابی کے حامی ہیں جیسی کہ اقوام یورپ میں ہیں اُنہوں نے ملکی اثرات اور قومی رجحان طبائع کا مطلق کچھ لحاظ نہیں کیا۔ اور برخلاف اسکے جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ چہار دیواری کے اندر مقید رہنا ہی پردہ ہے وہ بھی پُرانی لکیر کے فقیر بن گئے ہیں اور اُن کو جاننا چاہیئے کہ اگر ایک فریق تفریط کی حالت کو پہونچا ہے تو وہ خود بھی افراط کے مرتکب ہیں۔ اور افراط

اور تفریط دونوں کے خلاف ہمارے رسالت مآب نبی برحق کا فتویٰ ہی۔
ہمارے معزز و مخدوم دوست اُردو شاعری کے برگزیدہ رکن جناب خان بہادر سید اکبر حسین صاحب پنشنر جج ہم کو پردے کا مخالف خیال فرماتے ہیں۔ اُن کی خدمت میں دست بستہ گذارش ہی کہ وہ ہماری مذکورہ بالا رائے کو بغور ملاحظہ فرمائیں اور اُس سے جو کچھ نتیجہ اخذ ہو اُس کے لحاظ سے ہم کو ملزم قرار دیں۔ اور اگر مذکورہ بالا خیالات کے لحاظ سے ہماری رائے پردے کے خلاف ہی تو ہم اس درجہ تک موجودہ پردے کی مخالفت کا الزام اپنے اوپر لینے کو آمادہ ہیں۔
لیکن ہم کُل حامیان پردہ کی خدمت میں ملتمس ہیں کہ وہ شروع سے آجتک کے تمام خاتون کے فائل اُٹھاکر ملاحظہ فرمائیں کہ ہم نے کبھی اس بات کی تائید نہیں کی کہ عورتیں بے حجاب مردوں کے سامنے آئیں۔ ہم ہمیشہ اس بات کے حامی رہے ہیں اور اب بھی ہیں کہ مثل اور اسلامی ممالک مصر۔ ٹرکی۔ شام۔ عرب۔ ایران اور کابل کے مستورات بُرقعے اوڑھکر اور پورے حجاب کے ساتھ باہر نکلیں اور اپنے ضروری کاروبار کو انجام دینے کے علاوہ اپنی صحت جسمانی کو قائم رکھیں۔

لیڈیز کانفرنس

ہم کو اس بات کے دیکھنے سے انتہا درجہ کی خوشی ہوئی ہی کہ جس قدر اُردو کے رسالے حمایت تعلیم نسواں میں مدد دے رہے ہیں۔ اُن سب میں رسالہ الناظر کی توجہ اور کوشش بہت زیادہ نمایاں ہی۔

لیڈیز کانفرنس کے متعلق جو بحث رسالہ مذکور میں ہو رہی ہے اُس سے جناب اڈیٹر صاحب کی خالص ہمدردی اور بے لاگ کوشش کا پتہ چلتا ہے اڈیٹر صاحب الناظر نے اگست کے نمبر میں اس بات پر بہت زور دیا ہے کہ اب زیادہ غور اور تامل کا موقع نہیں ہے۔ ہمیں فوراً لیڈیز کانفرنس کے متعلق کوئی عملی تجویز پیش کرنی چاہیے۔ اور جہاں تک ممکن ہو یہ کام شروع کرنا چاہیے۔

اڈیٹر صاحب کے جوش اور ہمدردی کے شکریہ کے ساتھ اس بات کی بھی التماس ہے کہ اگر کسی معاملہ میں کُل قوم یا اُس کا ایک معتدبہ حصہ ہمارے ساتھ شرکت کے ساتھ تیار نہ ہو تو پھر وہی فرمائیں کہ ہم کو کیا کرنا چاہیے۔

لیڈیز کانفرنس کا انعقاد ایک ضروری امر ہے اور سال دو سال میں اُسکا عملی نتیجہ ضرور ظہور پذیر ہوگا۔ لیکن سب حامیان تعلیم نسواں سے اس وقت یہ گذارش ہے کہ وہ کسی خاص بات پر اتفاق قائم فرماکر خاکسار اڈیٹر کو اطلاع دیں تاکہ اُسی رائے کے لحاظ سے کام شروع کیا جائے۔

رقومات مندرجۂ ذیل تعلیم نسواں فنڈ میں وصول ہوئیں۔ عطا کنندگان کے اسمائے گرامی نہایت شکریہ کے ساتھ درج کیے جاتے ہیں۔

۱۔ سید خورشید علی صاحب خورشید کا ٹیج حیدر آباد دکن للعہ
۲۔ مسز حشمت اللہ خاں صاحب گوالیار سٹیٹ ۵ر
۳۔ مسز محمد احمد میرزا صاحب ۱ر

۴۔ عطیہ گورنمنٹ گرانٹ بابت ماہ مارچ ۱۹۱۱ء	[illegible]
۵۔ عطیہ گورنمنٹ گرانٹ بابتہ ماہ اپریل ۱۹۱۱ء	[illegible]
۶۔ عطیہ ریاست ٹونک از دسمبر ۱۹۰۹ء لغایتہ اپریل ۱۹۱۱ء	[illegible]
۷۔ سید خورشید علی صاحب خورشید کا بٹنج حیدر آباد دکن	[illegible]
۸۔ مولوی نیاز محمد خاں صاحب پلیڈر جالندھر	[illegible]
۹۔ سید خورشید علی صاحب حیدر آباد دکن	[illegible]
۱۰۔ عطیہ ریاست بہاول پور واسطے ۱۹۱۱ء	[illegible]
۱۱۔ عطیہ ریاست خیر پور میرس ”	[illegible]
۱۲۔ عطیہ گورنمنٹ گرانٹ بابتہ ماہ مئی ”	[illegible]
۱۳۔ عطیہ ریاست ٹونک ” ” ”	[illegible]
۱۴۔ عطیہ گورنمنٹ بابت ماہ جون ”	[illegible]
۱۵۔ عطیہ ریاست ٹونک ” ” ”	[illegible]
۱۶۔ عطیہ ریاست بھوپال بابتہ سال ۱۹۱۱ء	[illegible]
۱۷۔ سید خورشید علی صاحب حیدر آباد دکن	[illegible]

نوٹس منجانب سکرٹری تعلیم نسواں سیکشن علی گڈھ

مجکو زنانہ نمایش کی مصنوعات کے متعلق کسی جوشیلے نوجوان کی اشد ضرورت تھی کہ وہ خط وکتابت میں اور نیز اشیار کی فراہمی میں مجکو مدد دیں۔ مجکو بہت خوشی ہی کہ مسٹر نور محمد صاحب بی اے علی گڈھ کالج نے امسال مجکو پوری مدد دینے کا وعدہ کیا ہی اور میں نے اُن کو نمایش کے لیے اسسٹنٹ سکرٹری مقرر کیا ہی اور اُن کو اختیار دیا ہی کہ وہ میری جانب سے نمایش کی کامیابی کے لیے میری ہدایت اور مشورہ سے کوشش کریں۔ اِس وقت میں اُن کا مشکور ہوں اور مجھے امید ہی کہ وہ اپنے کام سے قوم کو بھی مشکوریت کا موقع دینگے۔

رجسٹرڈ نمبر ایل ۲۶۱

خاتون

نمبر ۸	بابت ماہ اگست سنہ ۱۹۱۰ء	جلد ۶

اڈیٹر شیخ محمد عبداللہ بی اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ سکرٹری تعلیم نسواں سکشن

فہرست مضامین

محمد عبدالسلام پرنٹر کے اہتمام سے

مطبع فیض عام علی گڑھ میں طبع ہوا

۱۰ ستمبر سنہ ۱۹۱۰ء

شیخ عبداللہ بی اے پبلشر نے علی گڑھ سے شائع کیا

خاتون

۱۔ یہ رسالہ ۴۰ صفحے کا علی گڑھ سے ہر ماہ میں شائع ہوتا ہے اور اس کی سالانہ قیمت [illegible] اور ششماہی [illegible] ہے۔

۲۔ اس رسالہ کا صرف ایک مقصد ہے یعنی مستورات میں تعلیم پھیلانا اور پڑھی لکھی مستورات میں علمی مذاق پیدا کرنا

۳۔ مستورات میں تعلیم پھیلانا کوئی آسان بات نہیں ہے اور جب تک مرد اس طرف متوجہ نہ ہونگے مطلق کامیابی کی امید نہیں ہو سکتی، چنانچہ اس خیال اور ضرورت کے لحاظ سے اس رسالہ کے ذریعہ سے مستورات کی تعلیم کی اشد ضرورت اور بے بہا فوائد اور مستورات کی جہالت سے جو نقصانات ہو رہے ہیں اُس کی طرف مردوں کو ہمیشہ متوجہ کرتے رہیں گے۔

۴۔ ہمارا رسالہ اس بات کی بہت کوشش کریگا کہ مستورات کے لیے عمدہ اور اعلیٰ لٹریچر پیدا کیا جائے جس سے ہماری مستورات کے خیالات اور مذاق درست ہوں اور عمدہ تصنیفات کے پڑھنے کی اُن کو ضرورت محسوس ہو تاکہ وہ اپنی اولاد کو اس بڑے لطف سے محروم رکھنا جو علم سے انسان کو حاصل ہوتا ہے معیوب تصور کرنے لگیں۔

۵ ہم بہت کوشش کرینگے کہ علمی مضامین جہانتک ممکن ہو سلیس اور بامحاورہ اُردو زبان میں لکھے جائیں۔

۶۔ اس رسالہ کی مدد کرنے کے لیے اسکو خریدنا گویا اپنی آپ مدد کرنا ہے اگر اس کی آمدنی سے کچھ بچیگا تو اس سے غریب اور یتیم لڑکیوں کو وظائف دیکر استانیوں کی خدمت کے لیے تیار کیا جائے گا۔

۷۔ تمام خط و کتابت و ترسیل زر بنام اڈیٹر خاتون علی گڑھ ہونی چاہیے۔

خاتون

فتح اندلس

(سلسلے کے لیے دیکھو نمبر ماہ جولائی)

چنانچہ ایک دفعہ تو عیسائیوں کے اکھڑتے اکھڑتے پاؤں جم گئے اور اُنھوں نے مسلمانوں پر ایسا جی توڑ کر حملہ کیا کہ اگر اُس وقت طارق جیسا بہادر جنرل نہ ہوتا تو لڑائی کا پاسہ بالکل برعکس پڑتا۔ اُس نے بہادران عرب کو خدا کا وعدہ یاد دلایا اور کہا کہ آگے دشمن پیچھے دریا۔ اس وقت ہمت کی تو میدان تمھارا ہی۔ اس پر شجاعان اسلام نے اللہ اکبر کے نعرے بلند کیے غازیوں کے نعروں سے دشمن کا زہرہ پانی پانی ہوگیا اور ایک ہی حملے میں غروب آفتاب سے پہلے عیسائیوں کو شکست فاش ہوئی زارزق مارا گیا اور گسٹائل خاندان کا جھنڈا سرنگوں ہوگیا۔ یہ نہایت عبرت ناک سماں تھا۔

خاتون

۱۔ یہ رسالہ ۴۸ صفحے کا علی گڑھ سے ہر ماہ میں شائع ہوتا ہے اور اس کی سالانہ قیمت دے
اور ششماہی عہ ہے۔

۲۔ اس رسالہ کا صرف ایک مقصد ہے یعنی مستورات میں تعلیم پھیلانا اور پڑھی لکھی مستورات میں علمی مذاق پیدا کرنا

۳۔ مستورات میں تعلیم پھیلانا کوئی آسان بات نہیں ہے اور جب تک مرد اس طرف متوجہ ہونگے مطلق کامیابی کی امید نہیں ہوسکتی، چنانچہ اس خیال اور ضرورت کے لحاظ سے اس رسالہ کے ذریعہ سے مستورات کی تعلیم کی اشد ضرورت اور بے بہا فوائد اور مستورات کی جہالت جو نقصانات ہو رہے ہیں اُس کی طرف مردوں کو ہمیشہ متوجہ کرتے رہیں گے

۴۔ ہمارا رسالہ اس بات کی بہت کوشش کریگا کہ مستورات کے لیے عمدہ اور اعلیٰ لٹریچر پیدا کیا جائے جس سے ہماری مستورات کے خیالات اور مذاق درست ہوں اور ... پڑھنے کی اُن کو ضرورت محسوس ہو تاکہ وہ اپنی اولاد کو اس ... علم سے انسان کو حاصل ہوتا ہے معیوب تصور کرنے لگیں

۵ ہم بہت کوشش کرینگے کہ علمی مضامین جہاں تک ممکن ہو ... میں لکھے جائیں۔

۶۔ اس رسالہ کی مدد کرنے کے لیے اسکو خریدنا گویا اپنی آپ مدد کرنا ... سے کچھ بچیگا تو اس سے غریب اور یتیم لڑکیوں کو وظائف دیکر استانیوں کے لیے تیار کیا جائے گا۔

۷۔ تمام خط و کتابت و ترسیل زر بنام اڈیٹر خاتون علی گڑھ ہونی چاہیے

خاتون

فتح اندلس

(سلسلے کے لیے دیکھو نمبر ماہ جولائی)

[illegible] یوں کے اُکھڑتے اُکھڑتے پاؤں جم گئے اور انھوں
[illegible] حملہ کیا کہ اگر اس وقت طارق جیسا بہادر جنرل نہ ہوتا تو
[illegible] ملک پڑتا۔ اس نے بہادران عرب کو خدا کا وعدہ یاد دلایا اور
[illegible] پیچھے دریا۔ اس وقت ہمت کی تو میدان تمھارا ہے۔ اس پر شجاعان
اسلام نے اللہ اکبر کے نعرے بلند کیے غازیوں کے نعروں سے دشمن کا زہرہ
پانی پانی ہوگیا اور ایک ہی حملے میں غروب آفتاب سے پہلے عیسائیوں کو شکست
فاش ہوئی ذارزق مارا گیا اور گسٹائل خاندان کا جھنڈا سرنگوں ہوگیا۔ یہ نہایت
عبرت ناک سماں تھا۔

خاتون

۱۔ یہ رسالہ ۴۸ صفحے کا علی گڑھ سے ہر ماہ میں شائع ہوتا ہے اور اس کی سالانہ قیمت ۲؎
اور ششماہی ۱۲؎ ہے۔

۲۔ اس رسالہ کا صرف ایک مقصد ہے یعنی مستورات میں تعلیم پھیلانا اور پڑھی لکھی مستورات
میں علمی مذاق پیدا کرنا

۳۔ مستورات میں تعلیم پھیلانا کوئی آسان بات نہیں ہے اور جب تک مرد اس طرف متوجہ نہ ہونگے
مطلق کامیابی کی امید نہیں ہوسکتی، چنانچہ اس خیال اور ضرورت کے لحاظ سے اس رسالہ کے
ذریعہ سے مستورات کی تعلیم کی اشد ضرورت اور بے بہا فوائد اور مستورات کی جہالت سے
جو نقصانات ہورہے ہیں اُس کی طرف مردوں کو ہمیشہ متوجہ کرتے رہیں گے۔

۴۔ ہمارا رسالہ اس بات کی بہت کوشش کریگا کہ مستورات کے لیے عمدہ اور اعلیٰ لٹریچر پیدا کیا جاوے
جس سے ہماری مستورات کے خیالات اور مذاق درست ہوں اور عمدہ تصنیفات کے
پڑھنے کی اُن کو ضرورت محسوس ہو تا کہ وہ اپنی اولاد کو اس بڑے لطف سے محروم رکھنا جو
علم سے انسان کو حاصل ہوتا ہے معیوب تصور کرنے لگیں۔

۵ ہم بہت کوشش کرینگے کہ علمی مضامین جہانتک ممکن ہو سلیس اور بامحاورہ اُردو زبان
میں لکھے جائیں۔

۶۔ اس رسالہ کی مدد کرنے کے لیے اسکو خریدنا گویا اپنی آپ مدد کرنا ہے اگر اس کی آمدنی
سے کچھ بچیگا تو اس سے غریب اور یتیم لڑکیوں کو وظائف دیکر استانیوں کی خدمت
کے لیے تیار کیا جائے گا۔

۷۔ تمام خط و کتابت و ترسیل زر بنام اڈیٹر خاتون علی گڑھ ہونی چاہیے۔

خاتون

فتح اندلس

(سلسلے کے لیے دیکھو نمبر ماہ جولائی)

چنانچہ ایک دفعہ تو عیسائیوں کے اُکھڑتے اُکھڑتے پاؤں جم گئے اور اُنھوں نے مسلمانوں پر ایسا جی توڑ کر حملہ کیا کہ اگر اُس وقت طارق جیسا بہادر جنرل نہ ہوتا تو لڑائی کا پاسہ بالکل برعکس پڑتا۔ اُس نے بہادران عرب کو خدا کا وعدہ یاد دلایا اور کہا کہ آگے دشمن پیچھے دریا۔ اس وقت ہمت کی تو میدان تمھارا ہے۔ اس پر شجاعان اسلام نے اللہ اکبر کے نعرے بلند کیے غازیوں کے نعروں سے دشمن کا زہرہ پانی پانی ہوگیا اور ایک ہی حملے میں غروب آفتاب سے پہلے عیسائیوں کو شکست فاش ہوئی زارزق مارا گیا اور گسٹائل خاندان کا جھنڈا سرنگوں ہوگیا۔ یہ نہایت عبرت ناک سماں تھا۔

اس لڑائی نے اندلس کی فتح کا دروازہ کھول دیا۔ بہادران اسلام کی تلوار کا دہلکہ سارے ملک میں پڑ گیا۔ طارق نے اپنے جنرل مختلف شہروں کی فتح کے لیے روانہ کیے۔ مغیث کو قرطبہ کی فتح کے لیے بھیجا۔ مغیث کی جمعیت ... آدمی کی تھی قلعہ نہایت مستحکم تھا۔

رات کو فوج قلعہ کا محاصرہ کیے ہوئی تھی کہ ایک غازی انجیر کے درخت پر سے قلعہ کی فصیل پر چڑھ گیا اوپر پہونچکر فصیل پر اپنے عمامہ کو لٹکا دیا اور اپنے چند ساتھیوں کو اوپر چڑھا لیا۔ ان بہادروں نے جاکر دروازے کے محافظوں کو قتل کر دیا۔ اور شہر کا پھاٹک کھول دیا فوج اندر داخل ہوگئی۔ شہر والے بکے بکے دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ فاتحین نے سب کو امن و امان دیا۔

شہر اوہورسیا کی فتح کا واقعہ نہایت دلچسپ ہے۔ جب تھوڈور حاکم مرسیا کو عربوں نے پے در پے شکستیں دیں تو وہ شہر ہورسیا میں پناہ گزین ہوا۔ یہاں آکر اس نے جمعیت پیدا کر لی اور مسلمانوں سے لڑتا رہا آخر کار اس کی ساری قوم کام آئی۔ یہ دیکھکر کہ اب لڑنا بیکار ہے اس نے یہ چال کی کہ شہر کی عورتوں کو سپاہیوں کی وردیاں پہنا کر فصیل پر کھڑا کر دیا اور خود بھیس بدل کر صلح کے شرائط لیکر مسلمان سپہ سالار کے پاس گیا۔ سپہ سالار نے جب شرائط صلح منظور کر لیں تو سفیر کا چغہ اتار کر کہنے لگا کہ میں ہی تھوڈور ہوں اس پر مسلمان سردار کو بڑا تعجب ہوا اور اُسے تھوڈور کی دانشمندی ایسی پسند آئی کہ قلعہ فتح کیا کرایا اس کی سپرد کر دیا۔

اندلس کی فتوحات کا سلسلہ اسی طرح جاری رہا۔ ان کی خوبی اخلاق کے عیسائی گرویدہ ہوگئے۔

طارق کی انتھک ہمت نے جب ساری سپین کو فتح کر لیا تو موسیٰ کے

ل میں رشک پیدا ہوا۔ اس وقت موسیٰ مراکو سے اسپین کی طرف بڑھا طارق
کی خدمت کا اعتراف کرنے کے بجاے موسیٰ نے سرزنش کی کہ میرے بے حکم
گے کیوں بڑھا۔ اس پر ولید موسیٰ سے برہم ہوگیا اور اس کو واپس بلا لیا۔

ایک فرنگی مورخ لکھتا ہی کہ اگر موسیٰ کو واپس نہ بلایا جاتا تو آج تمام یورپ
میں دین اسلام کا ڈنکا بجتا مگر افسوس ہی کہ جس نفاق نے عیسائیوں کو قعر ذلت
میں گرایا تھا وہ اب مسلمانوں میں بھی نمودار ہوا۔

تقریباً ۲۰ برس تک فتوحات اسلامی کا سلسلہ جاری رہا جنوبی اور وسطی
فرانس کا کچھ حصہ مسلمانوں کے قبضے میں آگیا۔ مسلمانوں کی حکومت اندلس میں
۱۴۹۱ء تک رہی۔ اس عرصہ میں اُنھوں نے اندلس کو رشک فردوس بنا دیا
سارے ملک میں علمی چرچے ہونے لگے جا بجا مدارس اور مکاتب قائم ہو گئے
جبکہ مسلمان اندلس میں نہایت ترقی پر تھے یورپ وحشت اور جاہلیت کے پنجے
میں گرفتار تھا۔

چنانچہ یورپ کے فلسفہ حکمت اور مذہبی اصلاح سب کا مبدا اسپین ہی اور
آج تک یورپ میں مسلمان علما کے نام مشہور ہیں۔ اس ملک میں تعلیم کا یہ زور تھا
کہ عورتیں تک فلسفہ کا درس دیا کرتی تھیں۔

رقمہ
م۔ ن

شادی

(سلسلے کے لیے دیکھو نمبر ماہ جولائی)

حسب قرار داده تین ماہ کے بعد وحید نے سلیم سے پھر ملاقات کی اور فہیم

کی رضامندی کا مژدہ سُنایا۔ اس کے بعد بہت جلد ناصر سے بات طے کر لی گئی۔ فہیم چونکہ ناصر کی لڑکی کے لیے نہایت موزوں شوہر تھا اسلیے ناصر نے بڑی خوشی کے ساتھ اس رشتہ کو منظور کیا۔

ناصر ایک تعلیم یافتہ۔ روشن خیال شخص تھا جس کی روشنخیالی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ اُس نے اپنی لڑکی نجمہ کو بہت اعلیٰ تعلیم دلائی تھی۔ خداے تعالیٰ نے اُسے کافی سمجھ دی تھی۔ طبیعت انصاف پسند واقع ہوئی تھی۔ انتخاب زوجین کے بارے میں وہ سلیم کا ہمخیال تھا۔ مخدوم ومحترم شمس العلما مولانا حالی کا یہ شعر ہمیشہ اس کے پیش نظر رہتا۔

بیاہا تمھیں ماں باپ نے اے بے زبانو! اس طرح
جیسے کسی تقصیر پر مجرم کو دیتے ہیں سزا

اسلیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اپنی پیاری بیٹی کو مروجہ رسم ورواج کے جابرانہ اصُول پر قربان کرتا۔ اس نے بھی بالکل وہی تدبیر اختیار کی جس سے سلیم نے کام لیا تھا۔ نجمہ کی ایک خالہ زاد بہن تھی جو اس کی ہم سبق بھی رہی تھی اور ایک سال قبل جس کی شادی بھی ہو چکی تھی۔ اس سے نجمہ کو بہت ہی محبت تھی۔ ناصر نے اس سے مدد لی اور اس کے ذریعہ نہایت مناسب طریقہ سے نجمہ کی رضامندی معلوم کر لی۔

غرض ان تمام مراتب کے طے ہونے کے بعد بہت سادگی کے ساتھ ایک روز فہیم کی والدہ ناصر کے ہاں گئی اور ایک قیمتی انگشتری نجمہ کو پہنا آئی۔ اُسکے دوسرے روز ناصر کی بیوی اُسی سادگی سے سلیم کے پاس گئی اور فہیم کو ایک بیش قیمت انگوٹھی پہنا آئی۔ اس طرح فہیم اور نجمہ ایک دوسرے سے منسوب ہو گئے۔

(۲)

پچھلے واقعات کو گزرے آج چار سال ہو چکے ہیں۔ فہیم اس عرصہ میں ولایت
یا اور بڑی سرخروئی کے ساتھ سول سروس کا امتحان پاس کر کے آبھی گیا۔
کامیاب طلبا کی فہرست میں اسکا نمبر پہلا رہا۔ قاعدہ کے مطابق ایک معقول عہدہ
اسکا تقرر ہو چکا ہے اور گزشتہ تین چار ماہ سے وہ اپنے فرائض منصبی بڑی
خوش اسلوبی سے بجا لا رہا ہے۔

حسب قرار داد اب اس کی شادی کا زمانہ آپہونچا۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل سلیم
کی کوٹھی میں کچھ غیر معمولی چہل پہل معلوم ہوتی ہے۔ غالباً آج ہی عقد خوانی ہو گی۔
جب ہی تو برات کے سامان نظر آرہے ہیں۔ اوہو! بیشک!! یہی بات ہے!!!
وہ دیکھیے اس نفیس خوشنما گاڑی میں فہیم دولہا بنے ہوئے سوار ہو رہے ہیں
اس موقع پر لباس کتنا عمدہ استعمال کیا ہے۔ نہ تو عام دُلہوں کی طرح مقیش اور زرتار
میں ملفوف ہو کر ایک مضحکہ انگیز تماشہ بن گئے ہیں اور نہ بالکل صاحب بہادر
بنے ہوئے ہیں۔

کشمیرے کے ایک بہت خوش وضع اور نہایت مہذبانہ جامہ وار کی حیدرآبادی
شیروانی فہیم کے خوب صورت جسم پر کس قدر بہار دے رہی ہے۔ سفید فلالین
کے پتلون۔ ریشمی پاتابوں۔ سیاہ پمپ شو اور ترکی ٹوپی نے اس نظر افروز
شیروانی کے ساتھ عجب مناسبت پیدا کر لی ہے۔ گلے میں پڑے ہوئے پھولوں کے
ہار فہیم کے دولہا ہونے کا اعلان کر رہے ہیں۔ غرض فہیم اسوقت ایک مہذب اور
شائستہ دولہا بنے ہوئے ہیں۔

فہیم کے بعد سلیم اور وحید بھی اُسی گاڑی میں سوار ہوئے اور عروس کے
مکان کو روانہ ہوئے۔ ان کی گاڑی کے پیچھے چند اور بگھیاں ان کے اعزا و

احباب کی تھیں۔ دو لہا کی سواری کے ساتھ نہ تو کسی فضول تزک و احتشام کے سامان تھے نہ آتشبازی اور نوبت نقارہ کا انتظام۔ جس طرح روشنخیال سلیم نے سانچق مہندی وغیرہ ناحق کے نفرت انگیز ڈھکوسلوں کو اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی میں ترک کیا اسی طرح برات کے فضول لغویات کو بھی بالاے طاق رکھا۔

پندرہ بیس منٹ کے عرصہ میں جب یہ سیدھا سادہا جلوس ناصر کے مکان پہونچا تو خود ناصر معہ چند احباب کے دولہا اور براتیوں کے استقبال کی غرض سے پھاٹک پر موجود تھا۔ ناصر نے بعوض اسکے کہ عام لوگوں کی طرح محض اس خطا پر کہ کیوں ایک لڑکی کا باپ بنا ہی کسی کونے میں موں‌ھ چھپاے پڑا رہتا اور مارے ندامت کے کسی سے آنکھیں چار نہ کرتا بکشادہ پیشانی ہر براتی سے مصافحہ کرنے کے بعد سبھوں کو ایک آراستہ دالان میں لیجا کر بٹھالا۔ پانچ۔ سات منٹ میں اور دعوتی بھی جمع ہوگئے۔

اس کے بعد بلا مزید انتظار و تاخیر کے ناصر کی اجازت سے ایک مقدس بزرگ نے حسب قاعدہ اس مبارک رسم کو ادا فرمایا جو انسان کی زندگی کا ایک اہم ترین۔ عظیم الشان انقلاب انگیز واقعہ ہے۔

عام دستور اور رواج کے موافق عقد خوانی کے وقت نہ تو مہر وغیرہ کا کوئی جھگڑا بکھیڑا نکلا اور نہ کسی قسم کے بحث و تکرار کی نوبت آئی جس سادگی اور سنجیدگی سے تمام ابتدائی مراتب طے ہوئے اسی طرح عقد خوانی بھی نہایت متانت و تہذیب کے ساتھ بلا غل و غش خہتستام کو پہونچی۔

نکاح کے بعد سب لوگ معہ دولہا کے کھانے کے کمرے میں بلائے گئے جہاں انواع و اقسام کے لذیذ اور لطیف کھانے تیار تھے۔ براتیوں کی خاطر خواہ مدارات ہوئی۔ ناصر نے مہمانوں کی خاطر تواضع میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت

نہ کیا۔ کھانے سے فارغ ہو کر گھنٹہ آدھ گھنٹہ سستانے کے بعد فہیم اور سلیم زنان خانے میں بلائے گئے۔ ناصر بھی ان کے ساتھ تھا۔ زنانہ مکان کے صدر دالان میں نجمہ لباس عروسی سے آراستہ ایک شاندار مکلف چوکی پر بیٹھی تھی۔

نجمہ کا لباس بھی فہیم کے لباس کی طرح نہایت مہذب اور شائستہ تھا۔ وہ اس وقت نہ تو عام دلہنوں کی طرح مشجر اور کرکری تاش میں لپٹی ہوئی تھی اور نہ انواع واقسام کے غیر ضروری فضول زیور کے بوجھ میں دبی جا رہی تھی بلکہ نہایت سادہ لیکن مناسب موقع خوشنما لباس اسکے جسم پر تھا۔ لباس کی وضع قطع وہی تھی جو آج کل کی تعلیم یافتہ۔ روشن خیال۔ مہذب خواتین استعمال فرماتی ہیں۔ ریشمی ساڑھی۔ اطلس جاکٹ۔ ولایتی جوتہ وغیرہ یہی چند چیزیں نجمہ کے نورانی جسم کو سر سے پانک چھپائے ہوئے تھیں۔

غرض نجمہ شرم وحیا کی تصویر بنی ہوئی دالان کے وسط میں ایک خوبصورت کوچ پر متمکن تھی۔ ناصر۔ فہیم اور سلیم بھی وہیں آن کر دوسری کرسیوں پر جو وہاں بچھی ہوئی تھیں بیٹھ گئے۔ دو تین منٹ تو سکوت کا عالم طاری رہا اس کے بعد ناصر نے کہا۔

مجھے تو اس کی بے انتہا مسرت ہے کہ میں آج ایک بہت بڑے فرض سے بوجہ احسن سبکدوش ہو رہا ہوں۔ خداوند کریم نے نجمہ کی پرورش اور تربیت کا مجکو ذمہ دار ٹھیرایا تھا۔ اس ذمہ داری کو پیش نظر رکھ کر میں نے اپنی عزیز بیوی کی شرکت سے اپنے فرض کے ادا کرنے کی نہایت مستعدی کے ساتھ کوشش کی۔

خدا کا شکر ہے کہ ہماری محنت ومشقت کا بہت عمدہ اور دل خوش کن

نتیجہ برآمد ہوا۔ ہماری کوئی کوشش بیکار نہ گئی۔ تمام امیدیں پوری ہوئیں اور خدا کے فضل سے ہم سرخ رو ہوئے۔

میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہمیں اپنی پیاری نجمہ پر فخر و ناز ہے یہ خدا کی بہت بڑی مہربانی ہے کہ نجمہ کی تقدیر فہیم جیسے موزوں ترین شوہر سے لڑی۔ مجھے امید بلکہ یقین ہے کہ دونو میاں بیوی نہایت پیار و اخلاص محبت اور سازگاری سے بڑے ہی امن و چین کے ساتھ زندگی بسر کریں گے۔ فہیم اور نجمہ دونوں اپنے اپنے فرائض اور اپنے اپنے حقوق سے بخوبی واقف ہیں۔

میری یہ دلی دعا ہے کہ خداوند تعالیٰ فرائض زوجیت کے ادا کرنے پر ان کی مدد فرمائے۔ اور یہ ہمیشہ خوش و خرم رہیں۔ خوب پھلیں پھولیں اور اپنے خاندان اور اپنی قوم کا نام کریں۔

اس مختصر تقریر کے بعد ناصر نے اپنی بیٹی کا ہاتھ فہیم اور سلیم کے ہاتھ میں دیتے ہوئے دونوں کو مخاطب کرکے کہا۔

اب میں اپنے لخت جگر کو آپ کے حوالے کرتا ہوں۔

سلیم نے جو ناصر کے اس اخیر جملہ سے خصوصاً بہت متاثر معلوم ہوتا تھا اپنی بہو کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر جواب دیا۔

انتہا درجہ کی شادمانی اور مسرت کے جذبات اس وقت میرے دل پر اس شدت سے قبضہ کیے ہوئے ہیں کہ میں اپنی دلی کیفیت کے اظہار سے قاصر ہوں۔ آپ یقین کیجیے کہ میں اپنے عزیز فرزند کو دولہا بنا ہوا دیکھ کر اتنا خوش نہیں ہوں جتنا اس بات سے باغ باغ ہوں کہ مجکو بالکل اپنی آرزو کے مطابق ایک ایسی بہو خدا نے

مرحمت فرمائی ہی جو حقیقت میں اپنی نظیر آپ ہی۔ یہ ہماری بہت بڑی خوش نصیبی ہی جو نجمہ کے مبارک قدم ہمارے گھر کی رونق بڑھا رہے ہیں۔ مجھے یقین ہی کہ نجمہ کی شرکت سے ہمارے خاندان کو بھاگ لگ جائیں گے۔ میں اس کو خدا کی بہت بڑی عنایت سمجھتا ہوں اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر بجا لاتا ہوں جو نجمہ جیسی بہو قابل قدر ہم کو میسر ہوئی۔ فہیم کی خوش قسمتی میں کوئی شک نہیں کہ خداوند عالم نے ان کو ایک ایسی ہمہ صفت موصوف بیوی عنایت کی ہی جس سے بہتر شریک زندگی ملنا ممکن نہ تھا۔

میں آپ کو اطمینان دلاتا ہوں کہ فہیم بیوی کے حقوق اور شوہر کے فرائض سے بخوبی واقف ہیں۔ وہ ان حقوق کی نگہداشت اور فرائض کے ادا کرنے میں سرمو کوتاہی نہ کریں گے اور ہمہ صفت موصوف نجمہ کی قدر کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے۔ مجھے اپنے عزیز سعادتمند فرزند سے اس بات کی قوی امید ہی کہ ہماری ایک ایک آرزو وہ پوری کرکے ہم کو سرخرو کرے گا۔

مجھے یقین کلی ہی کہ ومن ایاتہ ان خلق لکم من انفسکم ازواجاً لتسکنوا الیھا وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ[۱] کا مقدس منشا ہمیشہ ان کے پیش نظر ہوگا

ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف[۲] ،، اور وعاشروھن

[۱] اور اسی کی (قدرت) کی نشانیوں میں سے ایک یہ بھی ہی کہ اسنے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس کی بیبیاں پیدا کیں تاکہ تم کو اُن کی طرف (رغبت کرنے سے) راحت ملے اور تم (میاں بیوی) میں پیار اور اخلاص پیدا کیا (سورہ ۳۰-روم-آیت ۲۰)

[۲] جیسے (مردوں کا حق) عورتوں پر ہی ویسے ہی دستور کے مطابق عورتوں کا حق مردوں پر ہی (سورہ ۲-بقر-آیت ۲۲۸)

بالمعروف[۱]،، اور واخذ نا منکم میثاقاً غلیظاً[۲]،، کے فرمان واجب الاذعان ان کی آیندہ زندگی کے دستور العمل کا کام دینگے۔

استوصوا بالنساء خیراً فانھن عوان عندکم[۳]،، اور خیارکم خیارکم لنسائکم[۴]،، اور اکمل المومنین ایمانا احسنہم خلقا و الطفہم باھلہ[۵]،، کے حکیمانہ ارشادات ان کی رہنمائی کریں گے خدا ان دونوں میاں بوی کو ہمیشہ شادکام رکھے۔

اس کے بعد فہیم، سلیم اور ناصر باہر چلے آئے اور روانگی کا سامان ہونے لگا۔ ناصر کی بوی نے اپنی چاہیتی بیٹی نجمہ کو فہیم کی والدہ کے حوالے کیا۔ ان دونوں سمدھنوں میں تقریباً ویسی ہی باتیں ہوئیں جیسی ناصر اور سلیم میں ہوئی تھیں۔ غرض ناصر کی بوی نے ہنسی خوشی نجمہ کو رخصت کیا۔ فہیم کی والدہ اپنی بہو کو ساتھ لے کر گاڑی میں سوار ہوئیں اور دولھا کی گاڑی کے پیچھے پیچھے گھر کی جانب روانہ ہوئیں۔

ملک کے عام دستور کے موافق نجمہ کے ساتھ اس وقت نہ تو بھاری بھاری مصالح دار۔ کارچوبی جوڑوں کا ڈھیر تھا نہ جڑاؤ زیور کا انبار۔ نہ چھکڑوں جہیز نہ سونے چاندی یا گنگا جمنی کا چھپر کھٹ **ناصر** اگر چاہتا تو عام رواج کے موافق ان سب کا انتظام کر سکتا تھا مگر خدا نے اس کو عقل سلیم عطا فرمائی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس قسم کا فضول نمائشی سامان نجمہ کی آیندہ زندگی کو پُر لطف بنانے میں کسی قسم کی مدد نہیں دے سکتا۔ اسے معلوم تھا کہ ایک تعلیم یافتہ۔ روشن خیال شوہر اور سنجیدہ و مہذب سسرال کی نظروں

---

[۱] اور بیبیوں کے ساتھ حسن سلوک سے رہو سہو (سورۂ ۴۔ نساء۔ آیت ۲۳)
[۲] بیبیاں (نکاح کے وقت) تم سے پکا قول لے چکی ہیں (سورہ ۴۔ نساء۔ آیت ۲۵)
[۳] عورتوں کے ساتھ بھلائی اور نکوئی کرنے میں میری نصیحت قبول کرو اس لیے کہ وہ تمہاری اعوان و مددگار ہیں۔
[۴] تم میں سب سے زیادہ نیک کردار شخص وہ ہیں جو اپنی عورتوں کے ساتھ عمدگی اور نیکی سے پیش آتے ہیں۔
[۵] کامل الایمان وہ شخص ہے جس کا خلق عمدہ ہو اور جو اپنی بی بی کے ساتھ نہایت مہربانی سے پیش آتا ہو۔

میں ان چیزوں سے لڑکی کی اصلی عزت اور وقعت نہیں پیدا ہوسکتی۔ وہ سمجھتا تھا کہ میاں بیوی کی باہمی محبت والفت میں یہ ساز و سامان ہرگز کوئی اضافہ نہیں کرسکتا۔ لہٰذا اس نے اس قسم کے مصنوعی اور بے حقیقت اسباب کے جمع کرنے میں تضیع اوقات کرنے کے عوض اپنی اکلوتی بیٹی کو اس حقیقی اور اصلی زیور سے آراستہ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا جس سے بڑھ کر ایک ہونہار لڑکی کے لیے آیندہ زندگی میں کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ بجمہ کے ساتھ اس وقت لیاقت و دانائی سلیقہ وہنرمندی۔ شائستگی و روشن خیالی۔ ادب و تمیز۔ حیا و لحاظ۔ والدین کی لاکھوں محبت بھری دعاؤں اور کنبہ والوں کی خوشنودی کا وہ بیش بہا جہیز تھا جس کو نہ دنیا کا کوئی خزانہ خرید سکتا ہے نہ کوئی حکومت زبردستی حاصل کرسکتی ہے اور جس کے سامنے دنیا کی ساری نعمتیں ہیچ ہیں۔

سید خورشید علی
حیدرآباد دکن

اسلام کی بے تعصبی

(سلسلے کے لیے دیکھو نمبر ماہ جولائی)

ایک یہی واقعہ نہیں بلکہ اور ایک دو مثالیں بھی اس وقت پیش نظر ہیں بیان کیے ... ہم کی بے تعصبی کا پورا پورا اندازہ ہوسکتا ہے۔

ولید بن عبدالملک کو جو بنی اُمیہ کا بڑا بادشاہ گذرا ہے ایک مسجد بنوانے کا شوق ہوا اور ایک کروڑ روپیے کی لاگت سے دمشق میں مسجد تیار کرائی۔ مسلمانوں کو جب یہ حال معلوم ہوا کہ اس قدر روپیہ مسجد میں صرف ہوا ہے تو اُن میں ایک برہمی پھیلی۔ وہ زمانہ پورا پورا مذہبی آزادی کا تھا۔ ہر شخص کو خلیفہ وقت پر اعتراض کرنے کا حق تھا

اور تاوقتیکہ اُس کے اعتراض کا شافی وکافی جواب نہ ملجائے وہ خلیفہ کی اطاعت کرنے اور اُس کے حکم کی تعمیل کرنے پرمجبور نہیں ہوسکتا تھا۔

مسلمانوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ نماز پڑھنے کے لیے ایک سادہ مسجد کافی تھی۔ ولید گو بادشاہ ہی لیکن اسکو یہ حق نہیں ہی کہ بے ضرورت کروڑوں روپیہ مسلمانوں کے بیت المال کا اپنی خواہش پورا کرنے کے لیے ضائع کرتے۔ روپیہ پبلک کا ہی اور پبلک فنڈ اس وجہ سے نہیں ہی کہ یوں بے دریغ روپیہ بلا کسی کے مشورہ کے صرف کردیا جائے۔

چونکہ عام طور پر یہ برہمی پھیل گئی تھی اور کھلم کھلا لوگ اعتراض کرتے تھے۔ ولید کو اس کی اطلاع ہوئی اور ساری قوم کو بُلایا۔ دربار میں ایک اسپیچ دیکر اس بنا پر معافی چاہی کہ اب بھی پبلک فنڈ میں اس قدر روپیہ ہی کہ اگر ملک میں متواتر دس برس تک قحط پڑے، کافی ہوسکتا ہی اور کسی متنفس کو ذرہ برابر تکلیف نہیں پہونچ سکتی۔

قصہ مختصر اسی مسجد کے پاس جسکو ولید نے اس شوق سے بنایا ایک گرجا یوحنّا کا تھا مسجد میں زمین کی کمی تھی۔ ولید نے عیسائیوں سے گرجے کی زمین مانگی اور کہا جس قدر قیمت چاہو لو اُنھوں نے یہ کہکر انکار کردیا کہ رضامندی سے تو دینا غیر ممکن ہی اور اگر زبردستی لیجائیگی تو ہمارے گرجے کو جو گرائے گا اُسے کوڑھ ہوجائے گا۔ ولید چونکہ اُن بادشاہوں میں سے کہ جنکا کوئی فعل قابل تقلید سمجھا جائے نہ تھا اسکو بادریوں کی یہ بات ناگوار ہوئی اور اس گرجے کو گراکر وہ زمین مسجد میں شامل کرلی۔

اس کے بعد عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہوا۔ یہ شخص فی الحقیقت اس نسل کا تھا کہ مسلمانوں کو جس قدر اس پر ناز ہو وہ بجا ہی۔ اسکے بادشاہ ہونے پر عیسائیوں نے دربار خلافت میں حاضر ہوکر شکایت کی کہ ولید نے ہمارے بغیر مرضی ہمارے گرجے کو گراکر فلاں مسجد میں شامل کرلیا ہی۔ اس شکایت پر فوراً عمر بن عبدالعزیز نے حکم دیا کہ

رجے کی زمین پر جو مسجد کا حصہ تعمیر ہوا ہی اس کو فوراً منہدم کر کے سرکاری خرچ سے دوبارہ
رجا پھر بنوا دیا جائے اور مسجد اسی زمین میں محدود رہے۔
یہ تھی مذہبی بے تعصبی جس کی اسلام نے تعلیم دی تھی۔ اس سے زیادہ بڑھکر
ایک اور واقعہ بیان کیا جاتا ہی۔
مصر کے بشپ لونٹکس نے جسکو عربی میں سعید ابن البطریق کہتے ہیں مصر کی
تاریخ عربی زبان میں لکھی ہی جو یورپ میں چھپی ہی اور لیٹن میں بکا ترجمہ ہوا ہی۔ یہ شخص
سنہ ۹۳۹ء میں موجود تھا اس نے ایک اور واقعہ نقل کیا ہی کہ جس وقت مسلمانوں نے
اسکندریہ فتح کی۔ وہاں حضرت عیسیٰ کی تصویر تھی کسی صحابی یا کسی فوجی سپاہی نے
تیر مارا جس سے اس تصویر کی ایک آنکھ پھوٹ گئی۔ عیسائی جمع ہو کر مسلمانوں کے
گورنر عمرو ابن العاص کے پاس شکایت لائے اور کہا کہ تمھارے آدمیوں نے حضرت
عیسیٰ کی آنکھ کو خراب کر دیا ہی ہم اسکا معاوضہ یہ چاہتے ہیں کہ تم اپنے پیغمبر محمد صلعم کی
تصویر بنا کر دو تو ہم بھی اُس کی آنکھ پھوڑیں۔
اس پر عمرو ابن العاص نے جواب دیا کہ یہ فعل عبث ہی ہم لوگ موجود ہیں تم جسکی
چاہو آنکھ پھوڑ ڈالو۔ ایک عیسائی راضی ہو گیا عمرو ابن العاص نے اپنا خنجر اس کے ہاتھ
میں دیا اور اپنی آنکھ اس کے سامنے کر دی۔ جب اُس نے دیکھا کہ خود گورنر عمرو ابن العاص
اپنی آنکھ پھوڑوانے کو تیار ہے تو تلوار ہاتھ سے گر پڑی اور اپنے اس ارادہ سے باز
آکر کہا کہ ایسی قوم سے جو اس درجہ دلیر فیاض اور بے تعصب ہو انتقام لینا سخت
بے رحمی اور بے قدری ہی۔ یہ اسلام ہی کی بے تعصبی ہی کہ جسکا غیر قومیں بھی لوہا مانے
ہوئے تھیں۔
اسلام نے تو خود اُس کے دشمنوں کے مقابلے میں بھی کہ جو حربی ہیں یہ تعلیم
دی ہی کہ وہ حربی کہ جو تمھارا مقابلہ کریں اور تم پر چڑھ کر آئیں سب سے اول اُن کی مدافعت کرو

اور اپنے آپ کو بچاؤ اور اگر وہ ابتدا کریں تو تم بھی لڑو اور اس پر بھی ایک شرط اور یہ لگا دی اُن سے ایسے لڑو جیسے وہ تم سے لڑتے ہوں۔ حد سے بڑھنے کی کوشش مت کرو کیونکہ حد سے بڑھنے والوں کو اللہ دوست نہیں رکھتا ہی۔

اور دوسری جگہ یہ ارشاد فرمایا ہے۔ خدا تم کو منع نہیں کرتا احسان کرنے سے اُن لوگوں کے ساتھ جو تم سے مذہبی لڑائی نہیں لڑے نہ یہ کہتا ہی کہ تم اُن کے ساتھ انصاف نہ کرو خدا انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ البتہ خدا اُن لوگوں کی نسبت منع کرتا ہی جن میں یہ باتیں پائی جاتی ہیں۔

اول یہ کہ جو مذہبی لڑائی تم سے لڑیں۔ دوسرے وہ جو گھروں سے تم کو نکال دیں تیسرے وہ کہ جو تم کو نکالتے ہوں اُن کی تائید اور مدد کرنے والے ایسے لوگوں سے بیشک محبت مت کرو کیونکہ یہ بے انصافی اور ظلم کی بات ہی بلکہ یہاں تک کہدیا کہ خاص حربیوں میں سے جو لوگ ایسے ہوں کہ جو تم کو تمہارے گھروں سے نہ نکالیں اور تم کو نہ ستائیں۔ انکے ساتھ بھی محبت اور انصاف سے پیش آؤ۔

اسلام کی تاریخ اٹھا کر دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہی کہ اسلام ہی ایسا مذہب ہے جسنے غیر قوموں کو برابری اور مساوات کا درجہ دیا ہی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات کے وقت تین وصیتیں فرمائی ہیں منجملہ ان کے ایک یہ ہی کہ دیگر اقوام مثل ہنود وغیرہ میں اُن کی حفاظت کا بیحد خیال رکھنا کسی کو کسی قسم کی تکلیف نہونے پاوے کیونکہ یہ تمہارے ذمی ہیں اور ہم ان کے ذمہ دار ہیں۔ اسکے متعلق ایک اور چھوٹا سا واقعہ عرض کرنے کے قابل ہی۔

جس زمانہ میں مسلمانوں کا ارمنوں کے ساتھ مقابلہ ہوا ہی۔ اور مختلف مقامات دمشق، حلب وغیرہ فتح ہو چکے تو بادشاہ روم نے مسلمانوں پر حملہ کرنا چاہا حضرت ابو عبیدہ مسلمانوں کے فوج کے حاکم تھے۔ فوج نے اس وقت مشورہ کیا کہ ہم لوگوں کو

کرنا چاہیے یہاں سے نکل جانا بہتر ہی یا ارمنون کا مقابلہ کرنا اچھا ہے۔ بعض کی
ئے ہوئی کہ یہیں سے بیٹھے بیٹھے جواب دیا جائے۔ یہ سُنکر اور لوگ بولے کہ
م رعایا وہی مذہب رکھتی ہی جسکے۔ دم والے پابند ہیں جب باہر سے حملہ ہوگا تو
بھی اُن میں ملجاوینگے۔ پس بہتر یہ ہی کہ رعایا کو شہروں سے نکال دیا جائے اسوقت
ہم اپنی پوری طور سے حفاظت کر سکیں گے اور کوئی کھٹکا باقی نہ رہے گا۔

جس قدر صحابی وہاں موجود تھے یہ سُنتے ہی کھڑے ہو گئے اور ابو عبیدہ سے
کہا کہ اے عبیدہ! کیا حق ہی ہم کو کسی کے نکالنے اور شہر بدر کرنے کا اگر ہم کو دوسر
لوگوں سے اندیشہ ہی تو بجائے اسکے کہ ہم اُن کو نکالیں خود ہم کو شہر چھوڑ دینا چاہیے
یہ کہہ کر یہودیوں اور عیسائیوں کو بُلایا اور اُن سے کہا کہ تم سے ہم نے جزیہ اس خدمت کے
معاوضہ میں لیا تھا کہ چوروں اور اُچکّوں اور دشمنوں سے تمہاری حفاظت کرینگے
اب ہم یہاں سے جاتے ہیں لہذا جو خراج تم سے لیا تھا اسکو ہم واپس کرتے ہیں
یہ کہا اور واپس کر دیا۔ جس وقت کہ ابو عبیدہ جزیہ کی رقم واپس کرنے لگے تو اُن کو
سخت حیرت ہوئی اور کہنے لگے کہ یہ مسلمانوں ہی کا کام تھا کہ اس فیاضی کے ساتھ اسقدر
کثیر رقم کو واپس کر دیا۔

یہ تھی مسلمانوں کی فیاضی اور مذہبی آزادی اور بے تعصبی جنکا نظیر دنیا میں نہیں
مل سکتا۔ اگر کوئی شخص حالات کی تحقیق کرے اور تاریخوں کے ورق اُلٹے تب معلوم ہو
کہ اسلام نے غیر قوموں کے ساتھ کیا کیا رعایتیں کی ہیں کس قدر اُن کی آبروؤں کا
لحاظ رکھا ہے۔

اس موقع پر یہ عرض کرنا بھی خالی از لطف نہیں کہ عمر بن سعد ایک بڑے خدا پرست
صوفی تھے۔ حضرت عمر نے ان کو کسی مقام پر عامل مقرر کرکے بھیجا تو اُنھوں نے یہ
شرط کی کہ میں تنخواہ لیکر قومی کام نہ کرونگا۔ چنانچہ بلا تنخواہ کے مقرر ہوئے اسپر بھی

تھوڑے دنوں کے بعد حضرت عمر کے پاس آئے اور کہا کہ اب میں نوکری کرنا نہیں چاہتا
حضرت عمر نے وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ ایک دن ایک عیسائی سے کسی گفتگو میں
میری زبان سے یہ لفظ نکل گیا کہ خدا تم کو رسوا کرے اس جملہ کے بعد مجھے خیال
پیدا ہوا کہ آخر اس لفظ کے کہنے کا مجکو کس قدر حق حاصل تھا بہت غور کیا لیکن
کوئی بھی حق نہ پایا بجز اسکے کہ ملازمت کی وجہ سے مجکو کہنا پڑا نہ نوکر ہوتا نہ یہ لفظ
موںھ سے نکلتا۔ اور نہ اس کی دلشکنی ہوتی آخر کار نوکری چھوڑ دی۔

اب ہم اپنے مسئلوں کو ختم کرنا چاہتے ہیں اور آخر میں یہ دکھاتے ہیں کہ
مسلمانوں کو مثل دوسری قوموں کے علمی تعصب بھی نہیں ہی اور اس کی بدیہی مثل
ہی کہ جس قدر اسلام کے پاس لٹریچر اس وقت موجود ہی وہ تمام دنیا کے علوم وفنون
کا مجموعہ ہے۔ اور کوئی قوم دنیا میں ایسی نہیں ہی جس کے علم کو مسلمانوں نے کمال
بے تعصبی سے حاصل نہیں کیا۔

ابوریحان بیرونی نے چودہ برس اس ہندوستان سے سنسکرت پڑھی اور
اور ہندوستان کے حالات میں ایک کتاب لکھی۔ اس نے لکھا ہی کہ جس فرش
زمین پر میں بیٹھا کرتا تھا اسکو ہندو دہو دیتے تھے لیکن علمی شوق کے مقابلہ میں
ہر قسم کی ذلتیں گوارا تھیں۔ اس کتاب کو جرمن کے ایک پروفیسر عالم نے چھپوایا ہی
پروفیسر مذکور لکھتا ہی کہ یہ شخص سنسکرت کا ایسا ماہر تھا کہ اس سے پہلے سنسکرت کا اتنا
بڑا عالم نہیں پیدا ہوا۔ ہمارے یہاں جو درسی کتابیں شامل ہیں اُس میں غیر مذہب کے
عالموں اور حکیموں کا نام اس عزت کے ساتھ لیا جاتا ہی جس طرح غزالی اور رازی کا۔
لیکن آج موجودہ حالت یہ ہی کہ چھ سو برس کا زمانہ گزر چکا کہ فارسی شاعری کا
سلسلہ یہاں موجود ہی فارسی زبان میں خسرو دہلوی اور فیضی نے کہ جو ہندی نژاد
تھے ایرانیوں کے چھکے چھڑا دیے مگر ایران والوں نے ہندوستانیوں کو کبھی

ستفادہ نہ مانا لیکن کوئی نہیں دکھا سکتا کہ عربی تاریخوں میں مسلمانوں نے مجوسیوں ر آتش پرستوں کا نام حقارت سے لیا ہو اس سے زیادہ مسلمانوں کی علمی بے تعصبی ر کیا ہو سکتی ہے۔

بغداد میں جس وقت عباسیوں کی سلطنت قائم ہوئی تو انھوں نے مجوسیوں کا باس اختیار کیا ٹوپی وہ پہنی جو مجوسی پہنتے تھے۔ باوجود مقدرت اور سلطنت اور حاکم ہونے کے محکوم رعایا کی تقلید کی ورنہ حاکم کی تقلید تو رعایا کرتی ہی۔ بے تعصبی سکو کہتے ہیں۔

چونکہ ہماری غرض یہی تھی کہ اسلام کا غیر متعصب ہونا ثابت کریں خدا کا شکر ہی کہ ہم کو اپنے مقاصد میں کامیابی ہو چکی اور اسلام کی بے تعصبی ہر پہلو سے ثابت کر چکے اور اب یہ مضمون ختم کیا جاتا ہی۔ سمع خراشی کی معافی چاہتی ہوں۔

خاکسار

رابعہ سلطان بیگم

(از جنوبی سٹیٹ دسرکار نظام)

سینٹ المو

(سلسلے کے لیے دیکھو نمبر ماہ جولائی)

جب اُڈنا شال دیکرا اپنے نانا کے پاس آئی تب لوہار نے کہا کہ یہ سوار بڑا بد آدمی تھا۔

اُڈنا۔ آپ کو کیسے معلوم ہوا۔

نانا۔ کوئی نیک آدمی ایسی گالیاں نہیں بکتا جیسی وہ بکتا تھا۔ یقیناً یہ کوئی مجرم ہے جو قانون کے خوف سے بھاگا جاتا ہی۔ اس کی آنکھوں سے شرارت برستی تھی۔

اڈنا۔ میں نے اسکا چہرا یا آنکھ نہیں دیکھی سوائے اسکے کہ جب شال لیتے وقت میری طرف اُس نے دیکھا تھا۔ خدا ایسے بدآدمی کی مجھے پھر کبھی صورت نہ دکھلائے۔ مجھے تو اس کی صورت سے ڈر لگتا ہی۔ اور ڈالر زمین سے اُٹھا کر اپنے نانا کے پاس لیگئی۔ اور کہا کہ یہ ڈالر میں نانی کو دوں گی تاکہ نیا چاے دان آپ کے لیے منگالیں۔ پُرانا چاے دان اب بالکل خراب ہو گیا ہی۔ مگر گھانس پر وہ کیا پڑا ہی کیا وہ سوار کچھ اور بھول گیا۔ اُڈنا اُدہر گئی اور اُٹھا کر دیکھا تو ایک کتاب تھی جس کی جلد بہت عمدہ چمڑے کی تھی اور ورق سُنہری تھے جو دور سے چمکتے تھے۔ کتاب کے شروع صفحہ پر S. E. 9m لکھے تھے۔ جسکا مطلب اڈنا کچھ نہیں سمجھی۔ جب اپنے نانا کو دکھایا اُس کی سمجھ میں بھی کچھ نہیں آیا۔ مگر یہ کہا کہ خدا جانے یہ کون زبان ہی یونانی ہی یا عبرانی۔ وہ سوار ایسی ہی کسی زبان میں اپنے گھوڑے سے بھی باتیں کرتا تھا۔ اس سوار کا نہ کوئی مذہب تھا اور نہ اُس کے مزاج میں شایستگی تھی۔ وہ اب اس کتاب کو بھی لینے نہ آئیگا۔ قرینہ یہی ہی کہ وہ کوئی جرم کرکے بھاگا جاتا تھا۔

جب بہت دن گزر گئے اور سوار اپنی کتاب لینے نہیں آیا تب اڈنا نے اُس کتاب کو بھی اپنے کتب خانہ میں داخل کرلیا۔ اڈنا اسکا مطلب اچھی طرح نہیں سمجھتی تھی۔ نہ اُس کا نانا اسکو سمجھا سکتا تھا۔ اڈنا اکثر کتابیں دیکھا کرتی تھی اور یہ عادت اُس کی نانی کو پسند نہ تھی بلکہ اس عورت کو پڑہنے کے نام سے نفرت تھی۔ اسکا عقیدہ تھا کہ پڑہنے سے عورتوں کا افلاس بڑہتا ہی۔ کیونکہ پڑہنے سے عورتیں اپنا دھندا چھوڑ کر کتاب میں زائد وقت صرف کرتی ہیں۔ یہی شکایت اڈنا کی نانی نے اسکے نانا سے بھی کی۔ تب لوہار نے کہا کہ بی بی تم اُس سے نہ بولو اور اس میں دخل نہ دو۔ اور لڑکی سے مخاطب ہو کر بولا کہ اللہ چاہے گا تو ایک دن وہ ہوگا جب میری پیاری اُڈنا اسکول کی اُستانی ہوگی اور لڑکیوں کو پڑھاتی ہوگی اور میں اس قدر بڈھا ہو جاؤنگا کہ کام نہ کرسکوں گا

ب میری اڈنا مجھے کھانا کھلاسئے گی۔ کیوں بیٹا تو ایسا کریگی۔

اڈنا۔ ہاں نانا میں ضرور ایسا کروں گی۔ مگر کیا یہ ممکن ہو کہ میں اس قدر پڑھ جاؤں کہ سکول میں پڑھانے کی نوکری کرسکوں۔

لوہار۔ یاد رکھ کہ جس کام کے کرنے کی انسان دل سے کوشش کرتا ہی تو اللہ تعالیٰ اُس کی تدبیر بھی کر دیتا ہو۔ جب میں قرضہ پیٹر کا ادا کر دونگا تب تیرے لیے نئی اور اچھی کتابیں خرید کر دونگا۔ اور ہاں بیٹی کوئی چادر اوڑھ لے اور دیکھ گاے کہاں چلی گئی اُسکے دودھ دُہنے کا وقت قریب آگیا ہے اور گاے کہیں سامنے دکھائی نہیں دیتی۔

اڈنا۔ ہاں آج آپ کا جی کیسا ہو۔ آپ آج دوکان پر بھی نہیں گئے۔

لوہار۔ میں اچھا ہوں۔ آج صبح سے مجھے کئی دست آئے اور دو تین بار استفراغ ہوا ہو۔ جلدی گاے لیکر آجانا اور پھر مجھے انجیل پڑھکر سنانا۔

یہ جنوری کا مہینہ تھا۔ جب اڈنا کو گاے ڈھونڈھنے کے لیے بھیجا تھا تب کسی قدر دن باقی تھا اور لوہار دھوپ میں کرسی بچھاے بیٹھا تھا۔ اور اپنا پائپ پی رہا تھا۔ اڈنا جنگل میں گاے کو ڈھونڈھتی پھری۔ دن بھی ختم ہو گیا تب بہت گھبرائی کیوں کہ گاے کو ڈھونڈھنے میں گھر سے بہت دور چلی گئی تھی۔ آخر کار۔ اڈنا کے پکارنے پر گائے بولی اور اس کے پاس چلی آئی۔ اڈنا خوشی خوشی معہ گاے کے گھر کی طرف لوٹی۔ اس وقت چاندنی بھی نکلی ہوئی تھی۔ اور سردی بھی زائد ہو گئی تھی۔ جب گھر پہونچی اور پھاٹک کھول کر دیکھا تو اسکا نانا اسی طرح کرسی پر بیٹھا تھا۔ گاے کو جلدی بند کرکے اڈنا اپنے نانا کے پاس آئی کہ آج آپ آگ کے پاس کیوں نہیں گئے کیا آپ میرے انتظار میں ابتک سردی میں باہر بیٹھے رہے۔ گاے اگر میری طرح بھوکی دہتکی ہوگی تو اسکو گھر واپس آنے کی ایسی ہی خوشی ہوگی جیسی مجھے ہو۔ اس پر بھی لوہار نے

جواب نہ دیا نہ یہ معلوم ہوا کہ اُس نے سُنا بھی یا نہیں۔ تب لڑکی چلاکر پکارنے لگی کہ نانا جاگو تمھاری اُڈنا تمھارے پاس کھڑی ہے۔ میں گلے ڈھونڈھ لائی ہوں۔
جب مایوسی ہوئی تب رونے لگی اور نانا کے پیروں پر گرپڑی کیونکہ اب اسکو یقین ہوگیا کہ نانا مرگیا۔ اسکے بعد اُڈنا کو ہوش نہیں کہ کیا ہوا کون اسکو اُٹھا لیگیا اور وہ ایک ہفتہ تک کہاں اور کس طرح رہی۔ آخر جب اسکو ہوش ہوا تو دیکھا کہ پیٹر کے گھر میں ہے آخر ایک روز پیٹر کی عورت نے اسکو بتلایا کہ تیرے نانا و نانی دونوں دو ہی دن کے بیچ میں بعارضہ ہیضہ مرگئے۔ مگر اُڈنا کی آنکھ میں ایک آنسو نہ تھا۔ بُت کی طرح بیٹھی سُنا کی۔ ایک ہفتہ اور یہی کیفیت اُڈنا کی رہی۔ آخر جب طاقت کسی قدر آئی تب اپنے نانا کی قبر پر گئی۔ ایک لکڑی کا تختہ ایک درخت میں لٹکا تھا جسپر اسکے نانا کا نام اور ایماندار لوہار لکھا تھا۔ بڑی دیر تک بیٹھی رہی۔ وہیں اُس کا پہلا آنسو نکلا تب سے اسکو کسی قدر ہوا اور نیند بھی آئی۔ روز اپنے نانا کی قبر پر جاکر پھول چڑہاتی تھی اور رویا کرتی تھی۔
ایک دن پیٹر نے اس سے کہا کہ اب تو قبر پر نہ جایا کر۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں۔
اُڈنا۔ بہت اچھا اب میں قبر پر نہ جاؤں گی۔ آج میں خود ہی نانا سے رخصت ہوآئی اب میں یہاں رہوں گی بھی نہیں۔ مکان و گھوڑا و گاے آپ اپنے قرضہ میں لے لیجیے میں آپ کی مہربانی کی تمام عمر مشکور رہوں گی آپ نے میرے حال زار پر بہت مہربانی فرمائی۔ اب میرا یہاں رہنا مناسب نہیں۔ میں کہیں اور چلی جاؤں گی۔
پیٹر۔ تو اکیلی کہاں جائیگی۔ تجھے کھانا کہاں ملیگا۔ رہیگی کہاں؟
اُڈنا۔ میں نے سُنا ہے کہ کلمبیا میں کوئی کارخانہ روئی کا ہے وہاں جو لڑکے کام کرتے ہیں اُن کو کھانا بھی ملتا ہے اور کام کی اُجرت بھی ملتی ہے۔ وہیں میں بھی کام کروں گی۔ اور اپنے کھانے بھر کے لیے کما لوں گی۔
پیٹر اور اُس کی بیوی نے بہت کچھ سمجھایا مگر اُڈنا نے ایک نہ مانا۔ اور آخر یہی کہا کہ

ں کلیسیا ہی چلی جاؤں گی۔ میرے پاس چودہ ڈالر ہیں جو میرے نانا نے مجھے علیحدہ رکھنے کے دیئے تھے۔ اور گائے کا بچہ بھی نانا نے مجھے دیدیا تھا اس کی قیمت اگر آپ بھ دیدیں تو آپ کی مہربانی ہے۔

غرضکہ دوسرے دن سہ پہر کو پیٹر اپنی گاڑی میں اڈنا اور اُسکے مختصر اسباب کو لادکر خود اسٹیشن ریلوے پر لے گیا۔ اڈنا کا کتا بھی گاڑی کے ساتھ چلا گیا۔ اڈنا اور اس کے کتے کا ٹکٹ خرید کرکے دونوں کو گاڑی پر سوار کرکے پیٹر چلا آیا۔ اور ریل روانہ ہوگئی۔ جب تک گاؤں کی کوئی علامت مثل مکانات و پہاڑ دکھائی دیتے رہے اڈنا اُسی طرف بحسرت و یاس دیکھتی رہی۔ بعد ازاں چپ ہوکر بیٹھ رہی۔ آخر شام ہوگئی اور تھک کر بنچ پر لیٹ رہی۔

جس کمرے میں اڈنا تھی اُسی میں ایک میاں بی بی اور اُن کا بچہ بھی دوسری بنچ پر تھے۔ چپ لیٹے لیٹے اڈنا سو گئی۔ چونکہ دن بھر کی تھکی تھی۔ غافل ہوکر سوئی آدھی رات کے بعد کئی بار زور کی سیٹی ریل کی سنائی دی اور اسی کے بعد یہ معلوم ہوا کہ ریل لڑگئی۔ اور بہت سی گاڑیاں و انجن ٹوٹ گیا بہت سے مسافر مر گئے اور اکثر زخمی ہوئے۔

حسن اتفاق سے اڈنا بہت پیچھے کی گاڑی میں تھی جب اڈنا جاگی تب اسکو معلوم ہوا کہ اسکے پیروں میں درد زیادہ ہے اور اُن پر اس قدر بار ہے کہ وہ اپنے پیر نکال نہیں سکتی نہ حرکت دیسکتی ہے۔ بچہ پٹری پر سے گر کر مرگیا اس کے ماں باپ رو رہے تھے۔ بچہ کے ماں باپ البتہ محفوظ رہے۔ اُس وقت اڈنا کے دل میں آیا کہ کاش اس بچے کے بدلے میں مرجاتی۔ اس بچے کے پیار کرنے والے موجود ہیں میرا کوئی چاہنے والا دنیا میں نہیں ہے۔ میرے مرنے کا کسی کو رنج بھی نہوتا اور میں بھی مصیبت سے نجات پاجاتی۔ مگر اے اللہ تیری مصلحت تو ہی جانتا ہے۔ نہیں معلوم میں کس کام کے لیے ابتک

زندہ بچی ہوں۔ اُسی وقت یہ بھی معلوم ہوا کہ اسٹیشن کے بہت قریب یہ واردات ہوئی ہی اور بہت سے لوگ لال ٹین لیے مسافروں کو دیکھتے بھالتے ہیں اور ہر طرف زخمی مسافروں کی آہ وفغاں سُنائی دیتی ہی۔

غرضکہ چند آدمی اڈنا کی گاڑی میں آئے تب اڈنا نے اپنی مصیبت بیان کی اور اُن لوگوں نے بمشکل وہ بوجھ ہٹایا جو اڈنا کے پیروں پر تھا اور جس کی وجہ سے اُسکا پیر ٹوٹ گیا تھا اور پیر دونوں سُن ہو گئے تھے۔ اور دو آدمیوں نے اڈنا کو اُٹھا کر گھاس پر زمین میں لٹا دیا۔

ذرا دیر میں ڈاکٹر راڈلی زخمیوں کو دیکھتا ہوا اڈنا کے پاس بھی آیا۔ اب آفتاب بھی نکل آیا تھا۔ اڈنا کی صورت دیکھ کر ڈاکٹر اڈنا کے پاس گھاس پر بیٹھ گیا اور جہاں جہاں اڈنا نے چوٹ بتلائی وہاں آہستہ آہستہ اڈنا کا بدن ٹٹول کر کہا۔ اے میری لڑکی میرے چھونے سے تیرے درد تو ضرور ہوگا تیرا شانہ اُکھڑ گیا ہی اور تیرے پیر کی کئی ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ مگر جہانتک مجھ سے ممکن ہی ایسی آہستگی سے کام کرونگا کہ تجھے تکلیف کم ہوگی۔ لیکن تاہم شدت درد کی وجہ سے اڈنا بیہوش ہوگئی مگر ایسی بے ہوشی کی حالت میں ڈاکٹر نے جلدی جلدی بندش درست کر دی۔ جب اڈنا کو ہوش ہوا تب دیکھا کہ ڈاکٹر اسکا مونھ دہو رہا تھا۔ اور اڈنا کے بال چہرے پر سے ہٹا کر پوچھا۔ کیا تیرے ماں باپ بھی اسی ٹرین میں تھے۔

اڈنا۔ جی نہیں میرے ماں باپ دونوں اُس وقت مر گئے تھے جب میں شیرخوار بچہ تھی۔

ڈاکٹر۔ تیرے ساتھ پھر کون تھا؟ تیرا کوئی رشتہ دار اسی گاڑی میں تھا؟

اڈنا۔ میرا اس دنیا میں کوئی رشتہ دار نہیں۔ میں ہی تنہا ہوں۔

ڈاکٹر۔ تو کہاں سے آئی ہی اور کہاں جاتی تھی۔

نا۔ میں چنگیگا سے آتی ہوں میرا نانا مرگیا۔ میرا کوئی محافظ نہیں رہا میں کلبیا جاتی تھی
وہاں روئی کے کارخانہ میں مزدوری کروں گی۔
اکٹر۔ تو بہت بڑے کام دنیا میں کریگی اور تو بہت دن زندہ رہے گی۔
ڈنا۔ ہاں صاحب مجھے نہیں معلوم کہ میرا کتا کیا ہوا۔ ورنہ وہ میرے پاس ضرور ہوتا
ڈاکٹر کے دریافت کرنے پر ایک خلاصی نے کہا کہ اُس کتے کے دونوں پیر
ٹوٹ گئے تھے مگر بڑا خونخوار اور زبردست کتا تھا کسی کو گاڑی میں جانے نہ دیتا تھا
تب میں نے ایک ہتوڑا اُسکے سر پر مار دیا تاکہ اسکو تکلیف سے نجات ہوجائے۔
اڈنا نے یہ سُنکر اپنا مونھ گھاس میں چھپا لیا تاکہ آنسو بہتے کوئی نہ دیکھے اور اپنے
دل میں کہا کہ شکر ہی تیرا کہ میرا چاہنے والا ایک کتا تھا وہ بھی دنیا میں نہ رہا۔ یا اللہ
مجھ لنگڑی لولی اور لاوارث کی قسمت میں آیندہ کیا لکھا ہی۔ ڈاکٹر اور زخمیوں کو دیکھنے
چلا گیا تھا۔ جب اڈنا اپنی حالت پر غور کر رہی تھی۔
ڈاکٹر پھر اڈنا کے پاس آیا اب ڈاکٹر کے ساتھ ایک امیرزادی بھی تھی۔ ڈاکٹر نے
پوچھا۔ اے میری بہادر لڑکی تیرا کیا نام ہی۔
اڈنا۔ اڈنا ارل میرا نام ہی۔
امیرزادی۔ تیرے کوئی رشتہ دار نہیں۔
اڈنا۔ جی نہیں میم صاحبہ۔
ڈاکٹر۔ یہ بڑی پیاری لڑکی ہی۔ مسز مرے۔ اگر آپ براہ مہربانی اسکو اپنی حفاظت
میں دو چار ہفتہ کے لیے لے لیں کیونکہ اسی عرصہ میں وہ اچھی ہوجائے گی تو آپ
بڑا ثواب کمائیں۔ میں نے تمام عمر میں ایسے مضبوط دل کا کوئی آدمی اس عمر کا نہیں
دیکھا۔ بخار اسکو چڑھتا آتا ہی لہذا جلدی ہونی لازم ہی اگر آپ اسی وقت اپنے مکان کو
لیجائیں تو بہت بہتر ہے۔

مسز مرے۔ ہاں میں ضرور ایسا کروں گی۔ مہربانی کرکے کوچبان کو حکم دیجیے کہ جلد میری بگھی یہاں قریب ترلے آوے۔ میں ایک گدہ بھی اپنے ہمراہ لیتی آئی ہوں اور بگھی پر اسکو تکلیف بھی کم ہوگی۔ کیسی پیاری اور دل آویز اُس کی آنکھیں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب آپ اگر اس کا نسخہ لکھدیا کریں گے اسکے تیمار کی نگرانی میں خود رکھوں گی۔

گاڑی قریب آگئی اور دونوں سائیسوں نے اڈنا کو بہ آسانی اُٹھاکر گدے پر لٹا دیا۔ مسز مرے اڈنا کو لیکر جلد روانہ ہوگئی۔ رستہ بھر کوئی بات چیت نہیں ہوئی کیونکہ اڈنا نے تکلیف کی وجہ سے اپنی آنکھیں بند کرلی تھیں۔ پھاٹک پر جب گاڑی پہنچی اُس وقت اڈنا نے آنکھ کھولی۔ پھاٹک سے مکان تک فاصلہ زائد معلوم ہوا۔ بہت بڑا احاطہ باغ تھا اور مکان بھی ویسا ہی عالیشان تھا۔ مسز مرے نے اپنے ملازمین کو حکم دیا کہ میرے کمرے کے برابر والے کمرے میں اس لڑکی کو لے آؤ۔ اور خود آگے چلی۔ سنگ مرمر کے فرش کا بہت بڑا وسیع زینہ تھا۔ اُس پر سے نوکر اڈنا کو اُٹھاکر کمرے میں لے گئے اور بہت صاف سُتھری مسہری پر اڈنا کو لٹا دیا۔

رقمہ
شیخ مسعود الزماں

سیر جزیرۂ جلشان

یوں تو نئے شہر کے دیکھنے کا سب کو شوق ہوتا ہی۔ مگر جہاں اپنی عزیز بہنیں ہوں وہاں جانا بہت ہی شوق کے ساتھ ہوتا ہی۔ ہماری عزیز بہن زہرا فیضی صاحبہ اور بہن عطیہ فیضی صاحبہ کے جزیرے سے محبت بھرے بُلاوے آرہے تھے اور

در وہ ایسے نہ تھے کہ یونہی ٹالے جاتے۔ اگرچہ جہاز کے سفر کا موسم اخیر ہوگیا تھا
ورجہاز بند ہونے کو تھا لیکن ہن صاحبہ کے بُلاووں نے بُلا کر چھوڑا۔

میں ۲۱۔ مئی کو بمبئی روانہ ہوئی ۲۲۔ کو بمبئی پہونچکر ہن مسز سید محمد صاحبہ
کے ہاں ٹھہری اور اپنے بمبئی پہونچنے کی اطلاع جزیرے کی۔ وہاں سے سب
انتظام ہو جانے کے بعد ۲۰۔ مئی کی صبح کو مسز سید محمد صاحبہ اور ہمشیرہ سید محمد
صاحبہ۔ ہم تینوں اسٹیشن پر گئے۔ کنارے سے ملا جہاز کھڑا تھا۔ سیڑھی کے ذریعہ
جہاز میں اُترے۔ ہم سٹیمر کے اوپر کے درجے میں بیٹھے تھے۔ جہاز کے ایک حصہ
میں قنات روک کر چاروں طرف پردے گرا دیے گئے تھے۔ بنچوں پر بستر لگا کے
آرام سے بیٹھے ہوئے سمندر کی سیر کرتے رہے۔ ہزہائنس نواب صاحب کے
حکم سے پردے وغیرہ کا انتظام بہت اچھا تھا جس کی وجہ سے ہمیں بہت
آسایش رہی۔

پونے آٹھ بجے سٹیمر نے لنگر اُٹھایا اور چلنا شروع کیا اول جہاز کی چال
ریل جیسی رہی۔ ہم بھی مطمئن رہے کہ جہاز سیدھا چل رہا ہے پانی کی سیر کریں گے۔
لیکن بمبئی کا کنارہ غائب ہوتے ہی سمندر نے آنکھیں دکھائیں۔ گو کہ اس دن کچھ
طوفان نہ تھا تو بھی پانی میں جوش اور بے چینی اور جہاز میں جھوکے پیدا ہوگئے
تھے۔ جو کہ نئے سفر کرنے والوں کے ڈرانیکا خاصہ پہلا ذریعہ تھا۔ جب بیچ سمندر
میں جہاز پہونچا ہے تو سوائے پانی اور آسمان کے خشکی کا پتہ نہ تھا۔

دل ہولا جاتا تھا زیادہ تر چکر اور متلی نے گھبرا دیا تھا۔ جزیرے سے جو ملازم
آئے تھے اُنھوں نے ناشتہ کرنے کو کہا مگر یہاں متلی بات نہیں کرنے دیتی تھی
اخیر ادرک اور سوڈے کی بوتل پر گزارہ کرتے ہوئے سات گھنٹے پورے کرکے
جزیرے کے بندر پر پہونچے خدا کا شکر کیا۔

سٹمبر کے ٹھہرتے ہی کئی ملازم اور کشتی نظر آئی اور جہاز کے برابر آکر لگی۔ اب ہم اور بھی پانی کے قریب کشتی میں جا بیٹھے اور کنارے پر پہونچے۔ وہاں سے اتر کر بیلی میں سوار ہوکر پہاڑی راستہ طے کرنے کے لیے روانہ ہوئے۔ ہماری گاڑی ایک گاؤں میں سے گزری۔ راستے میں ملازموں نے ناریل کا پانی بھیجا ہم سب نے پیا کچھ دل ٹھرا۔ بیلی میں تین میل چل کر سمندر کے دوسرے کنارے پر پہونچے وہاں ایک اور کشتی ہماری منتظر دکھائی دی اور فکر ہوئی کہ پھر پانی سے پالا پڑنے والا ہی۔ لیکن کشتی میں بیٹھ کر پانچ چھ منٹ میں دوسرے کنارے پر اتر گئے۔

سامنے گاڑیاں نظر آئیں۔ ایک گاڑی میں اپنی عزیز بہن زہرا فیضی صاحبہ کو بیٹھا ہوا دیکھکر بہت ہی خوشی ہوئی اور ان کی اس تکلیف اُٹھانے کی مشکور ہوئی بہن صاحبہ کے ساتھ بیٹھکر رستہ بھر سمندر کی شکایت کرتی ہوئی مہمان خانہ پہونچے اتفاق سے بہن مسز علی اصغر فیضی صاحبہ کو بھی وہاں پایا۔ ان سے اور بہن عطیہ فیضی صاحبہ سے مل کر بہت خوش ہوئی۔ معمولی سلام اور مزاج پُرسی کے بعد ناشتہ کیا۔

اتفاق سے وہ جمعہ کا دن تھا اور بزم اتحاد جو بیگم صاحبہ جزیرہ نے بنا رکھی ہی اسکا جلسہ تھا۔ بہن عطیہ فیضی نے ہم سے بھی بزم میں چلنے کو کہا اور ہماری سہولیت کے لیے وہیں بیگم صاحبہ سے ملاقات ٹھری۔ ہم تینوں بھی تیار ہوکر بہن زہرا فیضی صاحبہ کے ساتھ بزم کی طرف چلے۔ تھوڑی دیر میں جلسے کے مکان میں پہنچ گئے۔

یہ عمارت خاص بزم اتحاد کے لیے ہی بنوائی گئی ہی۔ جس میں ہر جمعہ کو بیبیاں جمع ہوتی ہیں۔ بہن عطیہ فیضی ہمیں اندر کمرے میں لے گئیں۔ وہاں کمرے کے دونوں طرف ممبر بیبیوں کی قطار کھڑی تھی۔ اور سامنے کرسی صدارت پر نواب بیگم صاحبہ تشریف فرما تھیں۔ اول ہم بیگم صاحبہ سے ملے۔ پھر ہز ہائنس نواب صاحب کے

عزیزوں سے ملاقات ہوئی۔ اخیر میں ممبر بیبیوں سے علیک سلیک ہونے کے بعد بیٹھ گئے۔

جلسہ کی کارروائی شروع ہوئی۔ بزم اتحاد کے دو سکرٹریوں میں ایک ہندو بیبیوں کی طرف سے دوسری مسلمان بیبیوں کی طرف سے۔ جلسے میں جو تقریریں ہوئیں اور تحریریں پڑھی گئیں وہ سب گجراتی زبان میں ہونے کے سبب ہماری کسی کی سمجھ میں نہ آسکیں۔

بزم اتحاد اچھی حالت میں چل رہی ہے۔ ممبر بھی خاصی تعداد میں ہیں۔ آپس میں ملنے جلنے اور تہذیب و دستکاری سکھانے کا اس سے بہتر اور کیا طریقہ ہوسکتا ہے بہن زہرا فیضی صاحبہ اپنی نئی اور عمدہ سلائی اور سینے کا کام بہنوں کو سکھاتی ہیں ہفتہ بھر میں جو کام بناتیں وہ لاکر دکھاتی ہیں۔ اس ہفتہ میں بھی کئی لڑکیاں اپنی سلائی لائی تھیں ہم نے بھی دیکھی اکثر کام خوب صورت نفیس بنے ہوئے تھے جن کا رواج ابھی تک ہماری طرف نہیں ہے۔

جلسہ کی کارروائی ختم ہونے کے بعد ہر ہائنس بیگم صاحبہ نے مہربانی سے نہایت موزوں الفاظ میں ہمارے جزیرے کا ذکر کیا اور اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ اور ملاقات کا سبب بھی زہرا فیضی صاحبہ کو قرار دیا۔ انکے بعد بہن زہرا فیضی صاحبہ نے ہمارے بلانے پر اور بیگم صاحبہ اور اور قابل بیبیوں سے ملوانے پر ارشاد فرمایا اخیر میں میں نے معزز ہر ہائنس بیگم صاحبہ اور معزز بہن صاحبہ موصوفہ کا مختصر الفاظ میں شکریہ ادا کیا۔ اگرچہ ایسے معزز میزبان بہت زیادہ شکریہ کے قابل تھے۔ اس کے بعد اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ بیگم صاحبہ نے سفر کا حال دریافت کیا موسم کا ذکر ہوا۔ واقعی تعلیم ایسی چیز ہے کہ انسان میں سے بے جا ناز اور نخوت نکال کر سیدھا سادہ انسان بنا دیتی ہے۔ بیگم صاحبہ جزیرہ ایسی خلیق اور ملنسار اور سادہ مزاج ہیں

کہ ایک دفعہ ان سے مل کر ہمیشہ کے لیے ان کا شائق ہو جائے۔ یہ ان کی خوبی اور شائستگی اچھی تعلیم اور تربیت کا سبب ہے۔

سورج غروب ہونے پر سب کمرے سے باہر آئے اور سمندر کے کنارے گئے بہن عطیہ فیضی تو بیبیوں کے ساتھ دوایک کھیل کھیلتی رہیں اور خوب دوڑواتی رہیں بیگم صاحبہ اور اور بیبیاں اور ہم تینوں ریت کے سفید چمکیلے ٹیلوں پر بیٹھ گئے۔ بہن زہرا فیضی صاحبہ نے گگروندہ کے خوب چٹ پٹے کچالو بنوائے اور وہیں ٹیلے پر سمندر کے پاس کھلائے۔ اس وقت وہ کچالو بہت مزے کے معلوم ہوتے تھے۔ اور خیال آتا تھا کہ کہاں ہم اور کہاں یہ سمندر کا کنارہ اور کہاں یہ بیگمات۔ کوئی آدھے یا ایک گھنٹہ تک بیٹھکر قیام کی جگہ پر واپس آئے۔ کھانا کھایا۔ تھوڑی دیر میں بیگم صاحبہ تشریف لائیں۔ باتیں چیتیں ہوتی رہیں۔ دس بجے سب سونے کے لیے رخصت ہوئے۔

۲۸ مئی صبح کو ضروریات سے فارغ ہو کر گول کمرے میں آئے بہن مسز علی صغر فیضی بھی ہمارے پاس ہی مہمان خانہ میں ٹھری ہوئی تھیں۔ یہ مہمان خانہ چار مہمانوں کے ٹھہرنے کا ہے۔ ہر ایک کے لیے دو غسلخانے اور دو کمرے الگ الگ تھے اور ان میں سب ضروری سامان مہیا تھے۔ بیچ میں ایک کھانے کے لیے اور ایک بڑا کمرہ مل کر بیٹھنے کو ساتھ تھا۔ سب کمرے نہایت عمدگی اور خوشنمائی سے آراستہ تھے ساڑھے چھ بجے کے قریب بہن زہرا فیضی صاحبہ اور بہن عطیہ فیضی صاحبہ آئیں اور ہم سب مل کر ناریل پارک پر ناشتہ کرنے گئے وہاں بیگم صاحبہ بھی ناشتہ میں شریک ہوئیں

ناشتہ سے فارغ ہو کر سب سیر کے لیے چلے۔ راستے میں درختوں میں سے پھل کھاتے ہوئے مصنوعی پہاڑ دیکھنے گئے۔ یہ پہاڑ آسٹریا کے معمار نے سنگ کے

ما یا ہی۔ سارا پہاڑ اصلی معلوم ہوتا ہی۔ اس کے اندر دو کنوئیں ہیں جگہ جگہ خودرو
ئی آئے ہیں۔ پہاڑ کے باہر کے رخ سے پانی چھوڑا جاتا ہی تو اونچی نیچی چٹانوں
پر سے ہو کر آتا ہوا بھلا معلوم ہوتا ہی۔ قدرتی آبشار لگتا ہی۔ وہاں سے واپس
ہز ہائنس نواب صاحب کی کچہری اور دفتر جو کہ اس وقت بند تھا کھلوا کر دیکھا۔
یہ عمارت بھی اچھی خوبصورت بنی ہوئی ہی۔ کمرے ائمل ٹائل کی گلکاری سے
تھے۔ ایک کمرہ جو خاص نواب صاحب کے بیٹھنے کا ہی وہ اچھے سامان سے
آراستہ ہی۔ دیکھ بھال کر اپنے مہمان خانے میں آئے اور کھانا کھا کر پھر محل میں
گئے۔ وہاں کچھ دیر بیگم صاحبہ کے پاس بیٹھ کر بہن زہرا فیضی صاحبہ کے ساتھ
محل دیکھنے گئے۔

قصر احمد کو بنے ہوئے ابھی تین سال ہوئے ہیں۔ اس محل کا نقشہ خود
بیگم صاحبہ نے بنایا ہی۔ بعض ایشیائی وضع کی تعمیر جو انگریز انجینیر کے سمجھ میں نہ آسکتی
تھی اُسکے بنوانے اور سمجھانے میں بھی خود ہی شریک رہیں۔ محل میں مشرقی اور
اور قدیم عمارتوں کی خصوصیت تعریف کے قابل ہی۔ سارا محل مغربی طرز کا ہی جو کہ
زمانے کی ضروریات کے لحاظ سے آرام کا نمونہ ہی۔ مگر اپنی ایشیائی وضع کی عمارتوں
میں جو خوبصورتی ہوتی ہی وہ بھی پورے خیال سے بنائی گئی ہی۔ صحن میں ماہتابی جو دلی
کے پرانے مکانوں میں ہوتی ہی اور اُس سے سارا صحن خوبصورت ہو جاتا ہے
وہ بھی محل میں ہی اور کئی جھروکے بھی بنے ہوئے ہیں۔ محل کی دیواریں رنگ
برنگی ائیمل ٹائل کے پھول کاری کی ہیں۔ دیوار کے نیچے کا رخ بھی سارا ائیمل ٹائل کا
بنا ہوا ہی۔ غسل خانے بہت آرام کے ہیں مجھے بہت پسند آئے۔ بمبئی کی طرف جیسے
غسل خانے آرام کے بنائے جاتے ہیں اسکا رواج ابھی ہماری طرف نہیں ہوا۔ ہو جائے
تو بہت اچھا ہو۔

محل چار منزلہ ہی۔ دو منزلیں خوب آراستہ ہیں آرایشی سامان میں بھی بہت کچھ چیزیں مشرقی ساخت کی بنی ہوئی ہیں۔ کرسیوں کا سیٹ مصری بناوٹ کا ہی اور اسپر بنارسی زربفت کے گدے لگائے گئے ہیں۔ زمین میں کہیں فرش نہیں ہی۔ کرسیوں کے پاس جگہ جگہ ایرانی قالین بچھے ہوئے ہیں۔ بمبئی کی طرف بعض اور شہروں کی طرح سب کا لباس اس قسم کا ہی کہ فرش کی ضرورت نہیں ہوتی۔ محل کی زمین میں بھی رنگین اصل ٹائل جڑا ہی جو کہ فرش معلوم ہوتا ہی۔

ایک کمرے کی دیوار میں سیپیوں کا گلدستہ شیشہ کے خانہ میں لگا ہوا تھا۔ یہ گلدستہ استنبول کی ایک صنعت کار بی بی نے سلطان عبدالحمید کے حضور میں پیش کرنے کو بنایا تھا۔ سُنا ہی کہ وہاں اسکو اپنی محنت کا پورا معاوضہ نہ ملنے پر اُس نے واپس لے لیا اور وہ یہاں فروخت ہوا۔ واقعی گلدستہ صنعت کا نمونہ ہی۔ جس جس رنگ کے پھول ہوتے ہیں اُسی رنگ کی باریک سیپیاں جمع کر کے اس گلدستہ میں پھول بنائے ہیں آبی رنگ کی سیپی کا پھول ہی تو اُسی رنگ کی چھوٹی سی کلی ہی۔ اسی طرح گلابی شربتی کاسنی ہر رنگ کی سیپی کا کھلا ہوا پھول اور کھلا پھول چٹخی ہوئی کلی بالکل بند کلی سب موجود ہیں۔ ایک کلی جتنے رنگ بدل کے پھول بنتی ہی وہ سب رنگ اور شکلیں ویسی ہی بنی ہوئی ہیں۔

ایک کمرے میں کئی الماریاں زیور اور کپڑے وغیرہ کے لیے رکھی تھیں۔ ان الماریوں کے کواڑوں کے چاروں طرف پُرانے سکّے لکڑی کے حلقوں میں چڑھے ہوئے ہیں۔ الماری کے سیاہ رنگ میں بڑے بڑے سفید روپیے چمکتے ہوئے اچھے معلوم ہوتے ہیں اور اس طرح پُرانی یادگار بھی محفوظ رکھی ہی۔

محل کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دروازہ کے پاس ایک شیر کھڑا ہے یہ شیر کوئی چھ سات سال ہوئے بیگم صاحبہ نے خود شکار کیا تھا۔ محل میں صفائی اور سب

بزوں کا قرینہ اور قاعدہ کہہ رہا تھا کہ بیگم صاحبہ خود سلیقہ مند ہیں اور ہر ایک کام پر خود نظر
تی ہیں۔ اور محلوں کا سا لاابالی پن جیسا کہ سُننے میں آتا ہی یہاں نہیں ہی کہ سب کچھ
ا اور کچھ نہیں۔ یہاں یہ بھی نہیں ہی کہ سینکڑوں نوکر بھرے پڑے ہیں اور شور و غل
چ رہا ہی اور بے تہذیبی کی واہیات باتیں ہو رہی ہیں۔ جدہر جاؤ نوکروں کے
بستروں کے ڈھیر سامنے پڑے ہیں۔ کھاتے ہیں پہنتے ہیں لڑتے ہیں۔ کام دیکھا جائے
تو ہر جگہ ان کی کاہلی نظر آئے گی۔

یہاں کے نوکر وقت پر کام کر کرا کر ایسے چھپے رہتے ہیں کہ بے ضرورت
سامنے نہیں آتے۔ جب نوکر کام سے فارغ ہو جاتے ہیں تو چھوکرے چھوکریوں کو
الگ الگ کمرے میں بٹھا کر سلائی دی جاتی ہی۔ اس سے کئی فائدے ہیں ایک تو
وہ سب اچھے دستکار بن گئے ہیں دوسرے مفت میں خوبصورت کام بن جاتا ہے
سب سے زیادہ یہ کہ بیکاری میں جو مشغلے سوجھتے ہیں اُن سے نجات ملتی ہی۔ یہ سب بیگم صاحبہ
کے حسن انتظام کا نتیجہ ہی۔

ایک بجے کے قریب اپنے مہمان خانے میں واپس آئے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ آرام
لیکر چار بجے کے قریب بہن زہرا فیضی اور بیگم صاحبہ ایک آبشار دکھانے لے گئیں
دو گاڑیوں میں ہم سب سوار ہو کر چلے۔ پہاڑ پر لینڈو اور موٹر کار نہیں چڑھ سکتی تھیں
اسلیے کئی بہنیں بہلی میں سوار ہو گئیں اور بیگم صاحبہ بہن عطیہ فیضی اور میں پیدل ہی
چڑھتے رہے۔ ان دونوں بہنوں کو تو پہاڑ پر چڑھنے کی عادت تھی مجھے کچھ تکان معلوم
ہوئی مگر خوب چلتی رہی۔ باتوں میں رستہ معلوم نہیں ہوا۔ اگرچہ موسم خشک تھا
تو بھی خاصی سبزی پھیلی ہوئی تھی۔ پہاڑ کے دامن میں کگرونده کا بھی گھرا گھر تھا۔ جزیرہ
کا کگرونده جامن کے مشابہ ہی صورت بُری ہی مزا اچھا ہی بہت میٹھا ہوتا ہی۔ ہماری
طرف کا کگرونده دیکھنے میں اچھا لگتا ہی مگر مزے میں اتنا کھٹا ہوتا ہی کہ کھانے کی چیز

نہیں سمجھا جاتا۔ سوائے مربے اچار کے۔ دور سے ایک آبشار دیکھتے ہوئے دوسری پہاڑی پر گئے وہاں ایک چھوٹا سا کمرہ بنا ہوا تھا اور آگے چبوترا تھا۔ اس پر دری بچھ رہی تھی سب نے وہاں بیٹھ کر آرام لیا۔ اور ناشتہ کرنا شروع کیا۔ بیسن کی پھلکیاں اور کئی تلی ہوئی چیزیں بہت مزے کی معلوم ہوتی تھیں۔ ناریل کا پانی پیا۔ جزیرے کے ناریلوں میں کوئی کوئی بہت میٹھا نکلتا ہے اس کا کچھ خاص نام ہے جو مجھے یاد نہیں۔ اسوقت کا سماں خوب یاد تھا۔ شام کا وقت درختوں سے گھیری ہوئی جگہ کوئی فرش پر بیٹھا ہے تو کوئی پہاڑی کی چٹان پر کھڑے کھڑے کھا رہا ہے خاصی دیر اس لطف میں گزار کر رات کی سیاہی پھیلنے سے پہلے واپس آ گئے۔

۲۹۔ مئی آج بھی زہرا فیضی صاحبہ نے کئی جگہ لے جانے کو کہا مگر اخیر میں یہی بہتر سمجھا کہ گھر ہی رہ کر دن گزاریں کیونکہ کل ۳۰ کو بمبئی آنا تھا ۳۱ کو جہاز بند ہونے کو تھے سمندر میں طوفان کی بھی خبر تھی۔

نازی پارک پر سے بیگم صاحبہ کے ساتھ محل میں چلے گئے وہاں بیگم صاحبہ کا زیور اور لباس دیکھا۔ یوں تو سبھی والیان ریاست کے پاس جواہرات کی کمی نہیں ہوتی اور لباس بھی ایک سے ایک اعلیٰ زرین ہوتے ہیں۔ لیکن ہر ہائینس بیگم صاحبہ جزیرہ کے لباس میں نفاست اور زیور میں موزونیت پائی جاتی ہے۔ نفاست سے میرا مطلب یہ نہیں ہے جو کہ بہنوں نے سمجھ رکھا ہے کہ عمدہ کپڑا ہوتا ہے اور بالکل سادہ۔ انگریزی فیتہ جھالر کے سوا جھوٹ موٹ کو بھی گوٹا لگانا بُرا سمجھا جاتا ہے۔ ایسے ہی زیور سے بھی نفرت ہو چلی ہے۔ گوٹہ کا خوب صورت کام بنایا جائے تو واقعی کپڑے کی خوبی نکل آتی ہے۔ بیگم صاحبہ کے لباس پر ریشم سلمہ ستارے اور کلابتون کا خوبصورت کام بنا ہوا ہے۔ بمبئی کی ٹکیں لگی ہوئی ہیں۔ لہنگوں پر نیچے کے رخ ایک ایک بالشت

ٹکائی ہی۔ دوپٹوں پر بھی خوب صورت طرح سے مصالحہ ٹکا ہوا ہے۔ مگر بھاری جو کام
ملوں پر ہی اس کے جوڑ کے لیے اگر دہلی سے دوپٹے تیار کرائے جائیں تو بہت
زوں ہوں۔

معمولی دوپٹوں پر پٹھہ گوکھرو وغیرہ بھی لگا ہوا ہی۔ ایک سفید اطلس کے لہنگے پر
لاتوں سے بنا ہوا گلدستہ لگا ہی اور اس میں سچے سیپ کے انگور کے خوشے لٹک
رہے ہیں۔ پینچے میں بھاری ٹکائی ہی۔ یہ لہنگا بہت خوب صورت وضع دار ہی۔ مجھے
بہت پسند آیا۔ اپنے سب کپڑے بیگم صاحبہ خود بتا کر سلواتی ہیں۔ صرف درزی کے
حوالے نہیں ہوتے۔ بیگم صاحبہ کو دہلی کا لباس بہت پسند آیا۔ خاصکر فرشی پجامہ اور
ڈوپٹہ اوڑھنے کی وضع بھی۔ ایک فرشی پجامہ بنوایا ہے۔ زیور کا بھی بیگم صاحبہ کو
بھی بہت شوق ہی۔ کسی جوڑ میں اگر موتی کا زیور پہنتی ہیں تو بندے سے لیکر چوڑیوں تک
یکساں سیٹ ہوتا ہی۔ ایسے ہی ہیرے یاقوت زمرد وغیرہ کے جوڑ ہیں۔

نواب بیگم صاحبہ کے اکثر خیالات دہلی کے محلات سے پائے جاتے ہیں جس طرح
شاہزادیوں میں نازک خیالی تھی اور اُنکے سبب سے رعیت کا بھی یہی طریقہ ہو گیا تھا کہ جس رنگ
کا لباس پہنتی تھیں اسی رنگ کا زیور اور پلنگ کا بستر اور فرش ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ شیشہ
کے حقہ کے پانی میں پھول بھی اسی رنگ کے ڈالے جاتے تھے۔

بیگم صاحبہ جس رنگ کا لباس پہنتی ہیں اُسی رنگ کے نگوں کا زیور ہوتا ہی۔ نواب بیگم
کو زیور کا بہت شوق ہی۔ کئی کئی وضع کے زیور ہیں۔ بجلی بند بنوانے کو کہہ رہی ہیں۔
واقعی یہ ہی کہ خوبصورت زیور اور کپڑا انسان کی خوبصورتی کو بڑھاتا ہی۔ میں کبھی اس مصرع
کی قائل نہیں ہوں۔ مصرع "نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا نے دی" یہ کیا ضرور ہے
کہ ازلی خوبی کو تنہا ہی رکھا جائے دنیاوی خوبی ملا کر دوگنی کیوں نہ کی جائے۔

زیور اور کپڑا دیکھتے ہوئے کھانے کا وقت آگیا اور ہم راحت منزل کی طرف چلے

اسوقت کا کھانا بہن عطیہ صاحبہ نے راحت منزل میں جا کر پکایا تھا۔ محل سے دور کھیتوں کے کنارے ایک ہوادار سائبان پڑا ہوا ہے۔ اس میں فرش پر دسترخوان بچھا ہوا اور طرح طرح کا کھانا چنا ہوا تھا اس دن کا کھانا بہت لذیذ تھا اور زیادہ لذت یہ تھی کہ ایک عزیز بہن نے گھر میں محنت کر کے ہمارے لیے پکایا تھا۔ سب نے تعریف کر کے کھایا اور برتن خالی کر دیے۔ کھانے سے فارغ ہو کر مقبول امیر میں گئے۔ یہ جگہ درختوں سے چھائی ہوئی تفریح کے لیے بہت اچھی ہے۔ تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد اپنے اپنے ٹھکانے پر گئے۔

آرام لیکر چار بجے محل سے بلاوا آیا ہم وہاں گئے۔ بیگم صاحبہ کے لیے دہلی کا ذرشی [?] پائجامہ کرتا۔ اور لباس کی تراش خراش پر ذکر رہا۔ نواب بیگم صاحبہ کو جھومر چھلیاں بھی بہت پسند آئیں۔ بیگم صاحبہ کا ارادہ ہے کہ اپنے لیے جھومر چھلیاں پیرس سے بنوا کر منگوائیں۔ واقعی وہ ہلکی اور نازک ہوں گی۔ یہ دن بھی لطف کا گزرا اور رات کو کھانا کھا کر محل سے واپس آئے۔

۳۰ کی صبح آج ہماری واپسی کا دن ہے۔ اگرچہ بیگم صاحبہ نے اور بہن زہرا فیضی صاحبہ نے اور سب نے دو ایک دن اور ہم سے رہنے کو کہا مگر وہ بھی زیادہ روکتے ہوئے ہچکچاتے تھے اور میں تو ٹھہرنے پر راضی نہ ہوتی تھی۔ سمندر نے ایسا پریشان کیا تھا کہ رہنا مشکل ہو گیا۔ مجبوراً سب سے رخصت ہوئی اور بمبئی پہونچی۔ بہن مسز علی اصغر فیضی بھی بمبئی آگئی تھیں۔ بمبئی میں ان کی خالہ صاحبہ اور مسز لقمانی سے ملی بہت خلیق بی بی ہیں۔ شام کو بہن مسز علی اصغر زنانہ جسم خانے لے گئیں۔ یہ عمارت ایک مسلمان بی بی کی فیاضی سے بنی ہے۔ اس میں کئی کمرے ہیں اور سب فرش میز کرسی وغیرہ سے آراستہ ہے۔ بجلی کی روشنی بھی سب میں ہے۔ ایک بیڈ منٹن کوٹ بنا ہوا ہے۔ مینہ اور ہوا میں بھی وہاں کھیل سکتے ہیں۔ صحن میں بھی ٹینس کوٹ۔ بہت بڑے صنعت کی عمارت ہے۔ اسکا داخلہ

روپیے اور ماہواری چندہ پانچ روپیہ ہے۔

اس جسم خانے میں ہفتہ میں دو دن مسلمان بیبیاں نہیں آتیں کیونکہ دو دن پارسی بیبیاں معہ اپنے مردوں کے آتی ہیں۔ جسم خانے میں ہملین مسز روگمے ملین بڑی اچھی بی بی ہیں۔ تھوڑی دیر ان سے باتیں ہوتی رہیں۔ انہوں نے ہمیں چاے کی دعوت دی لیکن جانا ممکن نہ تھا اس لیے عذر کر دیا۔ مسز روگمے صاحبہ کو بھی اور مجھے بھی افسوس رہا کہ ان کی صاحبزادی مسز پرنس نصراللہ خاں اور سلطان جہاں بیگم آف سچین بمبئی میں موجود نہ تھیں ورنہ ملاقات ہوتی۔ اور کئی بیبیاں بمبئی میں موجود نہ تھیں جسکا مجھے بھی اور ان بہنوں کو بھی افسوس رہا۔

قریب ایک گھنٹے کے ٹھہر کر جسم خانے سے واپس آگئے۔ مجھے یہ عمارت اور ایسی اور بیبیوں کا آنا بہت پسند آیا اور یہاں آکر تھوڑی دیر تفریح کا وقت گذارتی رہی۔

اگرچہ بمبئی بڑا اور خوب صورت شہر ہے لیکن سچ پوچھو تو متوسط حال کے لوگوں کے موزوں نہیں۔ یہاں وہ لوگ رہیں جو لاکھ پتی ہوں۔ بمبئی کی آب وہوا سے ہمارا تو دل بیزار ہوگیا۔ مکان اس قسم کے بنے ہوئے ہیں کہ صحن کا نام نہیں کرایہ کی زیادتی غضب کی۔ پچاس روپیے میں دو کمرے اور غسل خانہ یا ایک باورچی خانہ صحن ایک بالشت بھی نہیں۔ شام کے وقت چاہے دل کتنا ہی پریشان ہو گرمی کے مارے مگر آسمان کے نیچے آنے کو جگہ نہیں بہت ہو تو گاڑی منگوا کر ہوا خوری کر آئیں۔ وہاں کی بیبیوں کی عجب زندگی ہے جنکے مکان بے صحن کے ہیں وہ گرمی کا وقت کاٹنے سمندر کے کنارے چلی جاتی ہیں۔ وہاں ہوا میں سانس لیتی ہیں۔ اور رات کی ٹھنڈک ہونے پر واپس آتی ہیں۔ گرمی میں دس بجے تک سمندر کا کنارہ مرد عورتوں سے پٹا پڑا رہتا ہے۔ مسلمان پردہ دار بیبیاں تو اس طرح کب جاسکتی ہیں کبھی کوئی چلی گئی۔ ورنہ پارسی بیبیوں کی رنگ برنگی ساڑیوں کی بہار ہوتی ہے۔ شاید ہی کوئی پارسی بی بی شام کو گھر میں

ہوتی ہوگی۔

بمبئی میں مینے کسی کے موہنہ پر برخلاف پشاور پنجاب کے سرخی کا نام نہیں دیکھا۔ یا تو اتفاق سے مجھے ہی کوئی ایسی بی بی نہیں ملیں جنکے چہرے پر سُرخی ہو۔ پارسنیں بہت گوری مشہور ہیں مگر وہ بھی پھیکی زرد۔ میرا خیال ہی کہ ہندوستان میں پنجاب کی آب و ہوا صحت کے لیے اچھی ہی۔

پشاور کا تو ذکر ہی کیا ہی۔ گویا یہاں سے تو اچھی ہوا چلنی شروع ہوتی ہی۔ جو محنت مزدوری کرنے والے ہیں اُن کے چہروں پر بھی تازگی اور سُرخی ہی۔ بس گدڑیوں کے لعل ادہر ہی ہوتے ہیں۔ فقط

رقمہ

سلطان صاحبہ

بقیہ شاہ لیر

(ایڈگر دیوانہ کا بھیس بدلے ہوئے جھونپڑی سے باہر نکل آیا)

ایڈگر۔ بھاگو بھاگو ناپاک بھوت میرے پیچھے آرہا ہی! تیز کانٹے دار جھاڑیوں میں سخت ہوا چل رہی ہی۔ ہوں ہوں۔ جاؤ جاؤ چلو۔ چلو اپنے گھر بچھونا بچھا کر سو ؤ ورنہ سردی لگ جائے گی۔

لیر۔ کیا تمھارے پاس جو کائنات تھی وہ سب تم نے اپنی لڑکیوں کو دیدی، اور اسی وجہ سے تمھاری یہ حالت ہوگئی۔

ایڈگر۔ غریب دیوانہ کے پاس کیا دھرا ہی۔ مجھے ملعون بھوت نے دہکتی آگ اور آگ کے شعلوں میں گھسیٹا ہی۔ پانی کے گردابوں اور آبشاروں میں غوطے دیئے ہیں اور کیچڑ اور دلدل میں میری مٹی خراب کی ہی۔ اس بھوت کا بُرا ہو کر اُس نے میرے بچھونوں میں

ر تیز چھریاں رکھدیں جس سے میرا جسم کٹ گیا۔ میں گرجے میں بیٹھا تو میرے گلے میں
پھانسی ڈال دی جس سے میرا گلا گھٹ گیا۔ میری فرینی میں زہر ڈالدیا اور مجھے ایسا دلیر
بنایا کہ مونہ زور گھوڑے پر سوار ہو کر چار انچ چوڑے پلوں کے اوپر سے گزرنے کی
ہمت باندھی اور یہ حالت کر دی کہ میں اپنے سایہ کو دیکھ دیکھ کر یہ سمجھا کہ میرے ساتھ میرا
کوئی دشمن لگا ہے۔ اپنے حواس خمسہ کی خیر منائی۔ غریب دیوانہ مارے سردی کے
ٹھٹھرا جاتا ہے۔ ڈی۔ ڈی۔ ڈی۔ ڈی (دانت سے دانت بجا کر ایسی آواز نکالتا ہے کہ گویا
مارے سردی کے اُس کی آواز نہیں نکلتی اور زبان لڑکھڑائی جاتی ہے) خدا سے دعا
مانگو کہ وہ تم کو باد بگولوں سے اور بُرے تاروں کے اثرات سے محفوظ رکھے۔ مجھ غریب
دیوانہ پر مہربانی کیجیے کیونکہ اس ناپاک بھوت نے مجکو بہت ستایا ہے دیکھو دیکھو وہ کھڑا ہے
وہ کھڑا ہے وہ جا رہا ہے میں دیکھ رہا ہوں (جھکڑ اور آندھی بدستور چل رہی ہے)

لیر۔ کیا اس کی بیٹیوں نے اسکو اس حالت میں پہونچایا ہے۔ ارے کمبخت تو نے اپنے لیے
کچھ بھی نہ رکھا سب اُنہیں کو دیدیا۔

دیوانہ۔ نہیں نہیں بیٹا کمبل اُسنے اپنے لیے بچا رکھا ہے۔ ورنہ اسوقت ہمارے سامنے وہ
مادرزاد ننگا کھڑا ہوتا اور ہم شرمندہ ہوتے۔

لیر۔ خدا کرے تمام بیماریاں جو ہوا پر لٹک رہی ہیں اور اس انتظار میں ہیں کہ جو کوئی جرم
کرے اُتر کر اُسکو ہلاک کریں وہ سب آج تیری لڑکیوں پر اُتریں۔

کینٹ۔ حضور اسکے تو کوئی بھی لڑکی نہیں ہے۔

لیر۔ نمک حرام تو غارت ہو جائے اور کوئی دنیا کی مصیبت اس غریب کو ایسی حالت تک
نہیں پہونچا سکتی تھی سوائے اپنی نامہربان بیٹیوں کے اور نہ اسکو ایسی پستی کے گڑھے
میں کوئی چیز ڈال سکتی تھی۔ یہ تو ایک عام بات ہے کہ جن باپوں کو لوگ اپنے گھروں سے
نکال دیتے ہیں وہ سب قسم کی مصیبتیں جھیلتے ہیں اور اپنے اوپر کسی قسم کا رحم نہیں کرتے

اور اس طور پر اپنے جسم کو نہایت انصافانہ سزا دیتے ہیں جس سے کہ ایسی چیلیں پیدا ہوئی تھیں۔

ایڈگر۔ سشتر مرغ شتر پہاڑی پر بیٹھا تھا۔ ہالُو۔ ہالُو۔ لُو۔ لُو۔

دیوانہ۔ آج کی سردی ہم سب کو دیوانہ اور پاگل بنا دے گی۔

ایڈگر۔ ناپاک بھوت سے ڈرتے رہنا۔ اپنے والدین کی فرماں برداری کرنا۔ اپنے وعدے پورا کرنا۔ قسم مت کھانا۔ کسی غیر عورت پر بدنظر مت ڈالنا۔ اور دنیا کی شان و شوکت کی ہوس میں مت پڑنا۔ ہائے کسقدر سردی ہے۔

لیئر۔ تم بتا سکتے ہو کہ تم کون تھے۔

ایڈگر۔ میں ایک بے ڈھب آدمی تھا اور اپنے دل میں بہت مغرور تھا۔ اپنے بالوں کو خوب گھونگر والے بنایا کرتا تھا۔ اور تمام قسم کی بُرائیاں کرتا تھا۔ بات بات میں قسم کھاتا تھا اور دوسرے لمحہ میں اُن کو توڑ دیتا تھا۔ شراب پیتا تھا اور جوا کھیلتا تھا۔ اور اور بُرائیاں کرتا تھا۔ دل کا کھوٹا تھا۔ کانوں کا کچّا تھا۔ اور ایک آدھ کا خون ہر روز کرتا تھا۔ مثل سور کے اپنے کام میں سُست تھا۔ مثل لومڑی کے چور تھا۔ مثل بھیڑیے کے لالچی تھا۔ باولے کُتّے کی طرح دیوانہ پھرتا تھا۔ شیر کی طرح مظلوموں کا شکار کرتا تھا۔ دیکھو اپنے دل کو ظاہری ٹیپ ٹاپ پر شیدا مت کرو۔ جھگڑوں سے بچتے رہو۔ چوری چکاری سے پرہیز کرو۔ سود خور مہاجن کی بہی پر دستخط مت کیا کرو۔ تو ممکن ہے کہ تم ناپاک بھوت سے بچ سکو۔ ابھی تک خاردار جھاڑیوں سے تیز تیز اور سرد ہوا چل رہی ہے۔ ڈی۔ ڈی۔ ڈی۔ ڈی دستی سوام۔ مم۔ ہا۔ نو۔ نونی، پچھوے میرے لڑکے۔ میرے لڑکے (سسے۔ سا) چلو اسے بھاگ جانے دو۔

(آندھی بدستور چل رہی ہے)

لیئر۔ بہ نسبت اسکے کہ تم سرد ہوا اور ایسی سخت بارش میں ننگے باہر پھرتے اور ایسی مصیبت

داشت کرتے ہو بہتر ہوتا کہ مرجاتے اور آرام سے قبر میں جا سوتے۔ کیا آدمی کی اس سے
یادہ کچھ حقیقت نہیں ہے۔ تم انسان کی حقیقت کا اچھی طرح اندازہ کرسکتے ہو کیونکہ تم پر
ی کا احسان نہیں ہے۔ نہ ریشمی کیڑے نے تم کو ریشم عطا کیا نہ کسی جنگل کے جانور نے
ڑا دیا۔ نہ بھیڑ نے تم کو اون دی اور نہ ہرن نے تم کو مشک دیا۔ لیکن تم اپنی طرف
یکھو کر ہم نے اپنی اصلی حالت کیسی بگاڑ لی ہے۔ تم واقعی انسان ہو کیونکہ جیسے پیدا
ہوئے تھے ویسے ہی ہو۔ ہم نے تو لباس پہن کر اپنی شکل بگاڑ لی ہے۔ آدمی کے
ساتھ اگر لباس وغیرہ کا دم چھلا نہ لگا ہوتا تو وہ ایسا ہی ذلیل ننگا ٹیڑھا کبڑا ہوتا ہے
جیسا کہ تم۔ لو یہ مانگے کی چیزیں میں اتار کر پھینکتا ہوں۔ لو یہ بٹن کھول کر کوٹ پتلون
پھینکے دیتا ہوں۔ (کپڑے اتار کر ننگا ہوجاتا ہے)

دیوانہ۔ چچا صاحب خدا کے لیے ذرا صبر کیجیے یہ نہایت ہی سخت رات ہے آپ
ننگے پھریں گے تو مر جائیں گے۔ دیکھیے کسی جانب سے کوئی روشنی لیے ہوئے
ہماری طرف آرہا ہے۔ یہ عجیب تماشہ ہے کہ اندھیری رات میں شعلہ آپ ہی آپ
چل رہا ہے۔

(گلاسٹر ہاتھ میں مشعل لیے ہوئے آتا ہے)

ایڈگر۔ دیکھو یہ کالا بھتنا ہے سر شام باہر نکلتا ہے اور صبح تک پھرتا رہتا ہے۔ بھولی عورتوں
کو رات کو جاکر سوئیاں چبھوتا ہے۔ لوگوں کی آنکھیں بھینگی کر دیتا ہے۔ اور ان کے
ہونٹ کاٹ ڈالتا ہے۔ گیہوں میں پھپوندی لگا دیتا ہے۔ اور کیڑے مکوڑوں کو
کچل ڈالتا ہے۔

کینٹ۔ حضور کی طبیعت کیسی ہے۔

لیر۔ یہ کون شخص آیا ہے۔

کینٹ۔ کون ہے بھئی کس کو ڈھونڈھ رہے ہو۔

گلاسٹر۔ تم کون ہو تمہارا کیا نام ہے۔
ایڈگر۔ ایک پاگل آدمی ہے۔ جو مینڈک اور لڑو۔ اور چھپکلیاں پکڑ پکڑ کر کھاتا ہے اور جبکہ آسیب کا زیادہ اثر ہوتا ہے تو گوبر اٹھا اٹھا کر کھا جاتا ہے جو کچھ الابلا سامنے آتی ہے اسکو بھی ہڑپ کر جاتا ہے۔ گندے تالابوں کی کائی نگل جاتا ہے در در جوتیاں کھاتا پھرتا ہے۔ سزا ملتی ہے بیڑیاں ڈالی جاتی ہیں۔ قید خانے میں ڈالا جاتا ہے۔ میرے ساتھی ہوشیار رہنا۔ آہستہ آہستہ بھتنے شوخی کیوں کرتا ہے۔
گلاسٹر۔ کیا حضور کے پاس ان دیوانوں کے سوائے آدمی نہیں ہیں۔
ایڈگر۔ رات کا بھتنہ بھی تو ایک شریف آدمی ہے کیونکہ لوگ اسکو موڈو۔ اور موہو کہتے ہیں۔
گلاسٹر۔ حضور اعلیٰ ہمارا خون اور گوشت پوست ایسا کمینہ ہو گیا ہے کہ جن سے یہ پیدا ہوتے ہیں انہیں سے یہ نفرت کرنے لگتے ہیں۔
ایڈگر۔ غریب دیوانہ کو سردی لگ رہی ہے۔
گلاسٹر۔ آئیے میرے ساتھ میرے مکان پر چلیے۔ آپ کی بیٹیوں کے سخت احکام کی وجہ سے میں اپنے فرائض کو فراموش نہیں کر سکتا۔ گو انہوں نے مجھکو حکم دیا ہے کہ میں قلعہ کے دروازے بند کر دوں۔ اور آپ کو اندر نہ گھسنے دوں اور اس شدید اور بے رحم آندھی اور تاریکی میں آپ کو پھرنے دوں تاہم میں نے یہ جرأت کی ہے کہ آپ کو ڈھونڈھتا ڈھونڈھتا یہاں تک پہونچا ہوں۔ اب آپ چلیے آپکے لیے کھانا کھانے کو اور آگ تاپنے کو تیار ہے۔
لیر۔ ذرا ٹھہر جاؤ میں ذرا اس فلاسفر سے تو باتیں کر لوں (ایڈگر کی طرف اشارہ کر کے کہیے) جناب فلاسفر صاحب اس قدر گرج اور چمک کے کیا اسباب ہیں۔

نٹ۔ مہربان آقا۔ ان صاحب کی بات مانیے اوران کے مکان پر چلیے۔
ر۔ میں اس داناسے ذرا باتیں کرنا چاہتا ہوں (ایڈگر کی طرف اشارہ کرتا ہے)
ہیے صاحب آپ کن کن باتوں کے عالم ہیں۔
ڈگر۔ میں تو صرف اس بات کا عالم ہوں کہ بد ذات بھتنہ سے کیسے جان بچاؤں
ر کیڑے مکوڑوں کو کیسے مارا کروں۔
یر (ایڈگر سے) آؤ میں تم سے علیحدہ کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔
ینٹ (گلاسٹر سے) جناب آپ ذرا اصرار سے کہئے اور چلنے پر مجبور کیجئے۔ انکے
ہوش وحواس بالکل غائب ہوئے جاتے ہیں۔
گلاسٹر۔ بھئی اس میں بادشاہ کا کیا قصور ہے ان کی بیٹیوں کی بھی خواہش ہے کہ
وہ مرجائے۔ ہائے افسوس غریب کینٹ نے پیشین گوئی کی تھی کہ بادشاہ ان
حالوں کو پہونچیں گے افسوس کہ اسکو بھی جلاوطن کر دیا۔ تمھارا یہ خیال ہے کہ بادشاہ
دیوانہ ہوا جاتا ہے لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میں خود دیوانہ ہوا جاتا ہوں
میرا ایک بیٹا تھا جسکو میں نے اب عاق کر دیا ہے۔ وہ میرے خون کا پیاسا بن گیا
ہے۔ اب میں نے اسکو نکال دیا ہے گو ابھی بہت دن نہیں گزرے کہ مجکو اس سے
انتہا درجہ کی محبت تھی۔ کبھی کسی باپ نے اپنے بیٹے سے اتنی محبت نہ کی ہوگی
جتنی مجکو تھی۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اس صدمہ نے مجکو دیوانہ بنا دیا یہ کیسی تکلیف دہ
رات ہے۔ (لیر کی طرف مخاطب ہوکر) حضور تشریف لے چلیے۔
لیر (ایڈگر کی طرف اشارہ کرکے) جناب میں آپ کی منت سماجت کرتا ہوں کہ آپ
میرے پاس سے نہ جائیے میں آپ ہی کے پاس رہنا چاہتا ہوں۔
ایڈگر۔ ہائے کس قدر سردی ہے۔
گلاسٹر۔ چل رے تو تو جھونپڑی میں گھس جا۔

لیر۔ چلو ہم سب اس جھونپڑی میں چلتے ہیں۔
کینٹ۔ ادہر تشریف لے چلیے۔
لیر۔ میں اس فلاسفر کے ساتھ رہونگا۔ میں کہیں نہیں جاؤنگا۔
گلاسٹر۔ چلو اب چپکے چپکے سب چلو۔

(باقی آیندہ)

اڈیٹوریل

رنج و راحت۔ یہ ایک چھوٹی سی کتاب ہی جسے ہمارے کالج کے ہونہار نوجوان مسٹر آفتاب عمر بی اے نے لڑکیوں کے لیے لکھا ہی۔ معدودے چند افسانے ایسے موجود ہیں جو لغویات اور شرمناک حوالوں سے پاک ہوں اور جنھیں شریف لڑکیاں دیکھ سکیں۔

اگرچہ محبت کے افسانے رنج و راحت میں بھی درج ہیں اور الفت و محبت کے کرشمے ہر طرف نظر آتے ہیں لیکن ایک پاک نفس خاوند اور اُس کی وفادار بی بی کی محبت، ماں بیٹوں کی محبت، بہنوں کا پیار اس خوبصورتی کے ساتھ دکھایا گیا ہی کہ دل پر گہرا نقش کرتا ہی۔ ایام غدر میں ایک شریف گھرانے کی تباہی اور اُس کے بعد طرح طرح کی مصائب اور جدائی کے حالات نہایت دلکش پیرایہ میں دکھائے گئے ہیں۔

اس کتاب میں جمیلہ کی صورت میں شریف لڑکی کی نہایت اعلی پیمانے کی مثال قائم کی گئی ہے۔ ہمیں امید ہی کہ یہ کتاب شوق سے پڑھی جائے گی۔

قیمت صرف آٹھ آنے - منیجر رسالہ خاتون - نیز منیجر دیوٹی بک ڈپو علی گڈھ سے مل سکتی ہے۔

سیاحت ہند

مسلمانوں میں قدیم سے سیر و سیاحت کا مذاق چلا آتا ہے۔ عرب سیاحوں نے اس وقت میں جبکہ یورپ بالکل تاریکی میں تھا دور دراز ملکوں کے حالات پر ایسی روشنی ڈالی تھی کہ جس کی تصدیق آج پورے طور پر ہو رہی ہے۔ ابن بطوطہ وغیرہ سیاحوں کے نام ہر شخص جانتا ہے۔ آجکل کی سیاحت تو ایک مذاق ہے کہ عورتیں بھی ریل اور جہازوں میں بیٹھ کر گھوم آتی ہیں۔ مگر جس زمانہ میں ابن بطوطہ نے سیاحت کی تھی وہ زمانہ ایسا تھا کہ نہ ریلیں تھیں، نہ جہاز تھے، نہ پکی سڑکیں تھیں اور نہ رستوں کے محافظ و چوکیدار تھے۔ چپے چپے پر ڈاکوؤں اور ٹھگوں کا تسلط تھا ایسے زمانہ میں جن لوگوں نے صحرا اور دشت نوردی کر کے سیاحت کی تھی وہ لوگ فی الواقع دنیا کے بڑے اُولو العزم بہادروں میں شمار کیے جانے کے قابل ہیں اور انکی ہمت اور قوت ارادی ہمارے لیے اعلیٰ سے اعلیٰ مثالیں ہیں۔

افسوس ہے کہ آجکل مسلمان کچھ ایسے خانہ نشین ہوئے ہیں کہ گھر سے باہر نکلنا ہی نہیں جانتے۔ بالخصوص ہماری مستورات تو ہمارے مردوں کے اعلیٰ اور دلیرانہ کاموں کی سدِ راہ ہو رہی ہیں۔ اور وہ کبھی گوارا نہیں کرتیں کہ کبھی کوئی مرد خواہ اُنکا خاوند ہو یا اُن کا بیٹا ہو ان کو چھوڑ کر کہیں دوسری جگہ چلا جائے

ہم اس زمانہ میں اپنے معزز دوست شیخ عبدالرحمٰن صاحب امرتسری کا دم بہت غنیمت جانتے ہیں کہ اُنھوں نے اول تو تمام اسلامی ممالک روم شام مصر وغیرہ کا سفر کر کے اپنا ایک سفرنامہ اپنے ہندوستانی بھائیوں کے واسطے طبع کرا دیا۔

اور اب اُنہوں نے ہندوستان کے تمام صوبوں اور شہروں میں اُس وسیع پیمانہ پر سفر کرکے اس ملک کا سفرنامہ شائع کرایا۔

ناظرین کو دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ ہمارے دوست نے اس وسیع ملک کا کوئی حصہ بلا دیکھے نہیں چھوڑا۔ سرحدی صوبے کے شہروں سے لیکر بنگال اور مدراس اور راس کماری اور سوئتہ بندر راملیشر تک گویا کہ کوئی مقام بھی جو ہندوستان کے جغرافیہ میں قابل ذکر ہو سکتا ہے نہیں چھوڑا۔ اور ہر مقام کے حالات مختصر طور پر نہایت دلچسپ لکھے ہیں۔

جو لوگ فضول ناول پڑھنے میں اپنا وقت صرف کرتے ہیں وہ اگر اس کتاب کو پڑھیں تو ناول کے لطف کے علاوہ اُن کو اُن کی معلومات میں بھی انتہا درجہ کی وسعت ہو سکتی ہے۔

کتاب شیخ عبد الرحمٰن صاحب موصوف سے بمقام امرتسر مل سکتی ہے۔

انشاء مفید النساء ۔ مصنفہ مولوی عبد اللہ خاں صاحب۔ مدرس دوم مدرسۂ دریاباد واقع ضلع بارہ بنکی۔

یہ ایک مفید تصنیف لڑکیوں کی تعلیم کی غرض سے معزز مصنف نے شائع کی ہے اس میں روزمرہ کی آپس کی خط و کتابت کے نمونے اور طریقے مصنف نے نہایت خوبی کے ساتھ درج کیے ہیں۔

کُل دنیا کی زبانوں میں خطوط نویسی کی تعلیم کے لیے بالکل جدا گانہ رسالے ہوتے ہیں۔ چنانچہ فارسی میں اس فن میں بہت سی انشاء موجود ہیں۔ مثلاً دستور الصبیان انشاء فیض رساں۔ رقعات عالمگیری وغیرہ وغیرہ۔ انگریزی میں بھی بہت سی کتابیں

یرائٹر کے نام سے مروج ہیں۔ مگر اُردو میں اس فن میں ابتک بہت کم اچھے
م کے رسالے تصنیف ہوئے ہیں اور بالخصوص مستورات کے لیے تو بہت ہی
م رسالے ہیں۔ انشاء مفید النساء اس کمی کو ایک حد تک پورا کرتا ہی اور ہمیں امید ہے
۔ جیسا اسکے نام سے ظاہر ہی یہ انث نسواں کے لیے مفید ثابت ہوگا۔ اس
تاب کے ملنے کا پتہ حسب ذیل ہے۔

حاجی محمد عبد القیوم صاحب تاجر کتب کلکتہ ویلسیلی اسکوئر

پنجاب ریویو

یہ ایک جدید ماہواری رسالہ پنجاب۔ سے جناب ظفر علی خاں صاحب بی اے کی اڈیٹری میں ماہ اگست ۱۹۱۰ء سے شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ در اصل یہ جدید رسالہ نہیں ہی بلکہ اسکو دکن ریویو کا اوتار کہنا چاہیے۔ ہم نہایت خوشی سے اس اعلیٰ اضافہ کا جو ہمارے اُردو لٹریچر میں ہوا ہے خیر مقدم کرتے ہیں۔ اسکے مضامین ترتیب۔ چھپائی۔ کاغذ وغیرہ کے دیکھنے سے ہم بلا تامل یہ کہہ سکتے ہیں کہ پنجاب ریویو ہمارے ماہواری رسالوں کے اول درجہ کے رسالوں میں سے ہی۔ اور ہمارے نہایت قابل دوست ظفر علی خاں صاحب کی لٹریری قابلیت اور اعلیٰ درجہ کی ذہانت جسکا اخباری پبلک کو پورا اعتراف ہوگا اس رسالہ کی کامیابی کے لیے کافی ضمانت تصور کرتے ہیں۔

اس رسالہ کے اول نمبر کے مضامین ایک بڑی سنجیدگی اور متانت کی خوشخبری دے رہے ہیں اور اس لحاظ سے ہم اس رسالہ کی سفارش کر سکتے ہیں کہ ہماری مستورات بھی اسکو پڑھیں۔

اس کی سالانہ قیمت اول درجہ کے کاغذ پر ۱ جہر اور عام قسم کے کاغذ پر ۱ ہے مقام اشاعت کرم آباد وزیر آباد پنجاب۔

امسال بجائے ایک مہینہ کے چالیس روز کے لیے مدرسۂ نسواں بند کردیا گیا ہے۔ وجہ یہ تھی کہ عید کے بعد فوراً ہی استانیوں کا یا لڑکیوں کا باہر سے آکر شامل ہونا دشوار تھا اسلیے آٹھ روز کا اضافہ کردیا گیا ہے لہذا مدرسہ پانچ ستمبر سے لیکر پندرہ اکتوبر تک بند رہے گا۔

ہمیں یہ سنکر بہت افسوس ہوا کہ ایک لڑکی فضلن نا نامی جو ہمارے مدرسہ کی طالب علم تھی اور جسنے لکھنے پڑھنے میں بہت کچھ ترقی حاصل کی تھی اور اُردو کی نوشت خواند میں اچھی مہارت حاصل کر لی تھی۔ اُس کا ہیضہ کے مرض سے انتقال ہوگیا۔ ہمارے مدرسہ کو اس قسم کے اکثر نقصانات پہونچتے رہتے ہیں۔ بعض لڑکیاں تو جب کسی قابل ہوجاتی ہیں تو اُنکے ماں باپ شادیاں کردیتے ہیں اور اُن کا پڑھنا لکھنا وہیں رہجاتا ہی اس لڑکی کا یوں انتقال ہوا چند لڑکیاں علی گڈھ سے چلی گئیں۔ ہمیں اس لڑکی کے اعزا سے دلی ہمدردی ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ آخر کار جب سے بھادوں کا مہینہ شروع ہوا ہے
رش خوب ہونے لگی ہے اور قحط سالی کا اندیشہ بالکل جاتا رہا ہے
دا نے اپنی مخلوق پر رحم کیا جائے شکر ہے۔

جناب انسپکٹرس صاحبہ حلقہ آگرہ نے پھر باقاعدہ مدرسۂ نسواں کا معائنہ کیا اور چند بہت ہی ضروری ہدایتیں کی ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ سامان کافی نہ ہونے کی وجہ سے کچھ عرصہ کے لیے پوری تعمیل سے قاصر رہیں گے۔

خاکسار اڈیٹر سے عندالملاقات انسپکٹرس صاحبہ نے فرمایا کہ اس صوبے میں آپ کا مدرسہ ایک بڑا مدرسہ سمجھا جاتا ہے۔ آپ کو چاہیے کہ ٹرینڈ۔ یعنی نارمل کی پاس کی ہوئی استانیاں اس مدرسہ میں رکھیں کیونکہ آجکل کے زمانے میں بلا نارمل پاس کیے ہوئے کوئی استاد عمدہ طور پر بچوں کو تعلیم نہیں دیسکتا۔

خاکسار نے جواب دیا کہ میں نے اعلیٰ درجے کی استانیوں کے بہم پہونچانے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ اگر آپ مجھے کچھ استانیاں دیں تو میں بڑی خوشی سے اُن کو مدرسہ میں رکھونگا۔

انسپکٹرس صاحبہ نے وعدہ کیا ہے کہ میں دو استانیاں بڑی قابل نارمل پاس کیے ہوئے آپ کو دوں گی۔

انسپکٹرس صاحبہ الہ آباد کی نمایش کے زنانہ حصہ کے لیے مدرسہ سے متعدد اشیا لے گئی ہیں۔

نوٹس منجانب سکرٹری تعلیم نسواں سیکشن علیگڈھ

مجکو زنانہ نمایش کی مصنوعات کے متعلق کسی جوشیلے نوجوان کی اشد ضرورت تھی کہ وہ خط و کتابت میں و نیز اشیار کی فراہمی میں مجکو مدد دیں۔ مجکو بہت خوشی ہی کہ مسٹر نور محمد صاحب بی اے۔ علی گڈھ کالج نے امسال مجکو پوری مدد دینے کا وعدہ کیا ہی اور میں نے اُن کو نمایش کے لیے اسسٹنٹ سکرٹری مقرر کیا ہی اور اُن کو اختیار دیا ہی کہ وہ میری جانب سے نمایش کی کامیابی کے لیے میری ہدایت اور مشورہ سے کوشش کریں۔ اس وقت میں اُنکا مشکور ہوں اور مجھے امید ہی کہ وہ اپنے کام سے قوم کو بھی مشکوریت کا موقع دینگے۔

رجسٹرڈ اے ۲۰۱

خاتون

نمبر ۹	بابت ماہ ستمبر سنہ ۱۹۱۰ء	جلد ۶

اڈیٹر شیخ محمد عبداللہ بی اے ایل ایل بی سکرٹری تعلیم نسواں سکشن

فہرست مضامین

محمد عبدالسلام پرنٹر کے اہتمام سے

مطبع فیض عام علی گڑہ میں چھپا

۱۲ - اکتوبر سنہ ۱۹۱۰ء

شیخ عبداللہ بی اے پبلشر نے علی گڈہ سے شائع کیا

خاتون

۱۔ یہ رسالہ ۴۰ صفحے کا علی گڈھ سے ہر ماہ میں شائع ہوتا ہے اور اس کی سالانہ قیمت ۲ روپے اور ششماہی ۱ روپیہ ہے۔

۲۔ اس رسالہ کا صرف ایک مقصد ہے یعنی مستورات میں تعلیم پھیلانا اور پڑھی لکھی مستورات میں علمی مذاق پیدا کرنا۔

۳۔ مستورات میں تعلیم پھیلانا کوئی آسان بات نہیں ہے اور جب تک مرد اس طرف متوجہ نہ ہونگے مطلق کامیابی کی امید نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ اس خیال اور ضرورت کے لحاظ سے اس رسالے کے ذریعے سے مستورات کی اشد ضرورت اور بے بہا فوائد اور مستورات کی جہالت سے جو نقصانات ہورہے ہیں اس کی طرف مردوں کو ہمیشہ متوجہ کرتے رہیں گے۔

۴۔ ہمارا رسالہ اس بات کی بہت کوشش کریگا کہ مستورات کے لیے عمدہ اور اعلیٰ لٹریچر پیدا کیا جائے جس سے ہماری مستورات کے خیالات اور مذاق درست ہوں اور عمدہ تصنیفات کے پڑھنے کی اُن کو ضرورت محسوس ہو تاکہ وہ اپنی اولاد کو اُس بڑے لطف سے محروم رکھنا جو علم سے انسان کو حاصل ہوتا ہے معیوب تصور کرنے لگیں۔

۵۔ ہم بہت کوشش کرینگے کہ علمی مضامین جہاں تک ممکن ہو سلیس اور بامحاورہ اُردو زبان میں لکھے جائیں۔

۶۔ اس رسالہ کی مدد کرنے کے لیے اسکو خریدنا گویا اپنی آپ مدد کرنا ہے اگر اس کی آمدنی سے کچھ بچیگا تو اُس سے غریب اور یتیم لڑکیوں کو وظائف دیکر اُستانیوں کی خدمت کے لیے تیار کیا جائے گا۔

۷۔ تمام خط وکتابت و ترسیل زر بنام اڈیٹر خاتون علی گڈھ ہونی چاہیے۔

خاتون

ہائیں تم بھی اُنہیں کی بیوی ہو

ریلوے اسٹیشن امرتسر پر سہارنپور سے آنے والی گاڑی کھڑی تھی۔ سکینڈ کلاس کے ایک درجہ میں تو چند یورپین تھے۔ اور دوسرے میں ایک برقعہ پوش ہندوستانی بیگم بیٹھی تھیں۔ ایک دوسری عورت بھی کھڑکی سے مونہہ نکال کر دیکھ رہی تھی جو حیثیت سے ملازمہ معلوم ہوتی تھی۔

گاڑی کو ٹھہرے ہوئے دو منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ ایک اور برقعہ پوش عورت ویٹنگ روم سے نکلکر تیز قدم بڑھاتی سیکنڈ کلاس کمپارٹمنٹ کے آگے پہونچی۔ اور مونہہ سے برقعہ کا رومال اُٹھا نہایت زور سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئی۔ بیچاری وہ عورت جو پہلے کھڑکی کے قریب کھڑی تھی۔ حیران دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

پھر ان نئی مسافر بی بی نے اپنے نوکر سے ٹرنک بستر وغیرہ رکھوا دیا۔ اور گاڑی چل پڑی تو ان دونوں پردہ نشین بیبیوں نے اپنے اپنے برقعے اُتار ڈالے۔ لباس

ان کے بالکل مختلف تھے۔ ایک ہندوستانی اور دوسری پنجابی معلوم ہوتی تھیں
پہلی مسافر بی بی سفید خاصے کا ہندوستانی بڑا غرارہ اور ململ کا پیازی رنگا ہوا کُرتی دوپٹہ پہنے تھیں۔ اور زیور بھی ویسا ہی۔ ہاتھوں میں سونے کے دو دو تانے اور پیچھے ہندوستانی چوڑیاں۔ گلے میں چمپا کلی اور کانوں میں بجلیاں پڑی تھیں۔ ناک میں ایک طرف لکھنؤ کی چھوٹی سی کیل۔ مونھ میں پان اور مسّی بھی۔ پیروں میں دہلی کی سلیم شاہی جوتی تھی۔

اور دوسری امرتسر سے سوار ہونے والی بی بی سبز کناویز کی شلوار اور گلابی ریشمی پھولدار قمیص۔ آسمانی مخمل کی واسکٹ پہنے اور بادامی پھولدار کریب کا دوپٹہ اوڑھے تھیں۔ ہاتھوں میں سونے کے کڑے اور کانوں میں جڑاؤ دُر تھے۔ اور پاؤں میں کابلی جوتی تھی۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ہندوستانی بی بی سے یہ زیادہ خوبصورت تھیں کیونکہ وہ بھی نہایت حسین تھیں۔ ہاں عمر میں اُن سے شاید کچھ کم ہونگی۔ چند منٹ کی خاموشی کے بعد ان مسافر بیبیوں میں سلسلہ گفتگو یوں شروع ہوا۔

ہندوستانی بی بی۔ آپ کہاں تشریف لیے جا رہی ہیں۔

پنجابی بی بی۔ پشاور۔

ہندوستانی بی بی۔ وہاں کیا کام ہے۔

پنجابی بی بی۔ وہاں میرا میکہ ہے۔ امرتسر میں اپنی چھوٹی بہن سے ملنے آئی تھی۔ یہاں میرے بہنوئی بارک ماسٹری میں ٹھیکہ دار ہیں۔ آپ کہاں سے آ رہی ہیں۔

ہندوستانی بی بی۔ میں سہارنپور سے سوار ہوئی ہوں۔

پنجابی بی بی۔ وہاں آپ کا گھر ہے؟

ہندوستانی بی بی (نامعلوم سی سرد آہ بھر کر) میرا گھر نہیں تو۔ ہاں میرا میکہ سہارنپور میں ہے۔

پنجابی بی بی۔ اب آپ کہاں جا رہی ہیں۔
ہندوستانی بی بی۔ میں جہلم جاتی ہوں۔
پنجابی بی بی۔ وہاں آپ کے شوہر ہونگے؟
ہندوستانی بی بی۔ شوہر تو نہیں مگر وہ میری سسرال ہے۔ وہ تو آج کل کسی اور جگہ ہیں۔
پنجابی بی بی۔ جب وہ وہاں نہیں تو آپ سسرال کیوں جا رہی ہیں۔ آپ اُنہیں کے پاس کیوں نہیں جاتیں۔
ہندوستانی بی بی۔ یہ آپ نے کیا کہا کہ جب وہ وہاں نہیں تو کیوں جاتی ہو۔ ہم ہندوستانی لڑکیوں کی سسرال ہی میں گزرتی ہے چاہے وہ وہاں ہوں یا نہ ہوں۔ اب آگے تو اتنا رواج بھی ہو گیا ہے کہ بیبیاں میاں کی جائے ملازمت پر جانے لگی ہیں ورنہ پہلے تو اتنا بھی نہ تھا۔
پنجابی بی بی۔ توبہ بہن ہم سے تو ساس نند کے پاس گزار نہیں ہوتا۔ جہاں اپنا مالک وہاں اپنا گھر۔ میری تو جب سے شادی ہوئی ایک دفعہ بھی سسرال نہیں گئی۔ ساس نندوں کی شکل بھی نہیں دیکھی۔
ہندوستانی بی بی۔ شاید آپ کے پنجاب میں یہ دستور ہو۔ مگر ہماری عمریں تو سسرال ہی میں تیر ہوتی ہیں۔
پنجابی بی بی۔ نہیں پنجاب کا تو یہ دستور نہیں۔ سب پنجابی لڑکیاں سسرالوں میں رہتی ہیں اور ساس نندوں کی تابعداری کرتی ہیں اور میں تو پنجاب کی ہوں بھی نہیں میرا وطن تو پشاور ہے۔ اور پشاور کا بھی ہندوستان جیسا دستور ہے۔ مگر میں تو اپنی کہتی ہوں۔ کہ مجھے سسرال رہنا بالکل نہیں بھاتا۔ یا اپنے گھر یا پھر میکے۔
ہندوستانی بی بی۔ ہاں اپنی اپنی پسند ہے اور سچ تو یہ ہے کہ جیسا جسکو موقع ملے۔ ورنہ

اپنے گھر رہنا کون نہیں چاہتا۔

پنجابی بی بی۔ آپ کو اپنے گھر سے علیحدہ ہوئے کتنا عرصہ ہوا۔

ہندوستانی بی بی۔ اگر آپ میرے اصلی گھر کو پوچھتی ہیں تو وہ میں نے کبھی دیکھا ہی نہیں۔ ہاں سسرال سے گئے ہوئے دو سال ہوئے پہلے میرے خسر ریواڑی میں تھے تو میں بھی اُنکے پاس تھی۔ جب اُن کی تبدیلی ریواڑی سے جہلم کو ہو گئی تو میں وہاں سے سہارنپور کو چلی گئی۔ اس عرصہ میں میرے شوہر کو رخصت بالکل نہیں ملی۔ نہ وہ سہارنپور گئے اور نہ اپنے والد کے پاس جہلم ہی گئے۔ سہارنپور رہتے رہتے میرا دل گھبرا گیا تو سوچا کہ چند روز کے لیے جہلم ہی ہو آؤں۔

پشاوری بی بی۔ اوہو آپ اتنا عرصہ اُن کو اکیلا چھوڑے رکھتی ہیں اس زمانہ میں آپ کو اپنے گھر کا ذرا خطرہ نہیں۔ ہم لوگ بھلا ایسا کہاں کر سکتے ہیں۔ ہمارے پشاور میں تو دو دو چار چار شادیاں کرنے کا عام رواج ہے۔ کوئی خوش قسمت بی بی ہوگی جو اپنے گھر میں اکیلی ہوگی۔ ہمارا تو ویسے بھی سوکنوں سے چھٹکارہ نہیں اگر اتنی بے پروائی ہم کریں تو کہاں ٹھکانا۔ آپ کے ہاں دوسری شادی کا دستور نہیں تب ہی آپ اطمینان سے ہیں۔

ہندوستانی بی بی۔ بہن یہ تو نہ کہو رواج نہیں تب بھی کیا ہے اکثر دوسری شادی کر ہی لیتے ہیں۔ مگر کیا کیا جائے بے حد مجبوری و بے بسی ہے۔ بیکس و بے بس بیچاریاں کیا کر سکتی ہیں۔ ورنہ کوئی بیوی بھی اپنے گھر سے بے پرواہ ہو سکتی ہے۔ مگر جب کوئی بات بھی پرواہ نہ کرے تو کیا کریں۔ ایک سال ہو جائیگا کہ میرے شوہر کا خط میرے پاس نہیں آیا میں جب زیادہ پریشان ہو جاتی تھی تو اُن کے والدین سے اُن کی خیریت دریافت کر لیتی تھی۔ اب کوئی چھ ماہ ہوئے کہ جہلم سے بھی کوئی خیریت معلوم نہیں ہوتی۔ میرے خسر لکھدیتے ہیں کہ "میرے پاس بھی اُنکا خط نہیں آتا"، یہ معلوم کرکے میرا دل بہت گھبرایا

تو سوچا کہ جہلم ہی چل رہوں وہ اُن کے والدین کا گھر ہی۔ کبھی نہ کبھی تو کوئی نہ کوئی خبر ملتی ہی رہے گی۔

یہ ذکر ابھی ختم نہ ہوا تھا کہ گاڑی لاہور پہنچ گئی اور وہاں سے دو کرسچن لیڈیاں سوار ہوئیں جو لالہ موسیٰ تک ساتھ رہیں۔ اس اثنا میں اور ہی اور ذکر ہوتے رہے یہ دونوں بہنیں اپنی باتیں نہ کرنے پائیں۔ لیکن لالہ موسیٰ سے گزر کر پھر وہ پشاوری بیوی ہندوستانی بی بی کے قریب آ بیٹھیں۔

ہندوستانی بی بی۔ ہمارا بہت سا وقت تو میموں کے ساتھ باتیں کرتے گزر گیا۔ اب تو ہمارا سفر بہت ہی تھوڑا رہ گیا ہی۔

پشاوری بی بی۔ ہاں آپ تو شاید دو گھنٹے تک اُتر جائینگی۔ مجھے تو ابھی بہت عرصہ تک یہیں رہنا ہے۔

ہندوستانی بی بی۔ بے شک آپ کو بہت دیر گاڑی میں رہنا ہے۔ مگر میرا یہ مطلب ہے کہ بہت جلدی میں آپ سے جدا ہو جاؤں گی۔ لیکن ہمیں ابھی تک ایک کو دوسری کا نام و پتہ بھی معلوم نہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ ہم آپس میں خط کتابت رکھیں۔ آپ اپنا پتہ مجھے دیں۔

پشاوری بی بی۔ میں اپنا نام آپ کو بتائے دیتی ہوں اور پتہ بھی۔ مگر افسوس کہ میں لکھنا پڑھنا بالکل نہیں جانتی جب تک پشاور رہوں تب تک آپ کو خط نہ لکھ سکوں گی ہاں جب اپنے گھر جاؤں گی تو اُن سے آپ کے خطوں کا جواب لکھواتی رہونگی۔ میرا نام محبوب سلطان ہی۔ آپ بھی اپنا نام بتائیں۔

ہندوستانی بی بی۔ افسوس آپ سے لکھنا نہیں آتا تو میں آپ سے خط و کتابت جاری نہ کر سکوں گی کیونکہ آپ جواب اپنے شوہر سے لکھوائیں گی اور یہ بات ہم لوگوں میں سخت معیوب ہی کہ نامحرم اشخاص کے لکھے ہوئے خط مستورات کے نام آئیں خواہ

کسی عورت کی ہی طرف سے ہوں۔
محبوب سلطان۔ بہن خدا نہ کرے میرے میاں کوئی ایسے ویسے نہیں ہیں۔ وہ تو پشاوری بھی نہیں۔ ہندوستانی ہیں۔ اچھا آپ اپنا نام تو بتائیں۔
ہندوستانی بی بی۔ میرا نام بیگم ہے۔ ہاں آپ کی شادی ہندوستانی خاندان میں کیوں ہوئی؟
محبوب سلطان۔ بہن قسمت کی بات ہے ایک ہندوستانی ڈاکٹر صاحب تبدیل ہو کر پشاور گئے تھے اُن میں اور میرے بھائی میں دوستی ہوگئی۔ اسی بنا پر یہ شادی ہوئی۔ میری والدہ تو شادی پر راضی نہ تھیں کہ اول تو ڈاکٹر صاحب ہندوستانی ہیں۔ دوسرے اُن کی پہلی بی بی موجود ہے۔ لیکن اُنہوں نے بیحد اصرار کیا اور کہا کہ میری پہلی بی بی سے کوئی اولاد نہیں۔ میں دوسری شادی اولاد کے واسطے کرتا ہوں۔ بہن قسمت کا لکھا تھا سو پورا ہوا۔
بیگم۔ کیا ڈاکٹر صاحب کی بی بی آپ کے ساتھ پشاور میں رہتی ہے؟
محبوب۔ نہیں بہن اُس بیچاری کو میں نے دیکھا بھی نہیں۔
بیگم۔ اچھا اب آپ کے ہاں کوئی بچہ ہے اور شادی کو کتنا عرصہ ہوا۔
محبوب۔ توبہ بہن ابھی سے بچہ کیا ہوتا میری شادی کو تو ابھی ایک سال بھی پورا نہیں ہوا۔
بیگم۔ آپ اُردو تو بڑے ہی اچھی بولتی ہیں۔ شاید ساس نند میں سے کوئی آپ کے پاس رہی ہونگی۔
محبوب۔ میں نے تو ابھی تک ساس نند کی شکل بھی نہیں دیکھی۔ اُردو بولنا مجھے یوں آگیا کہ ہمارے پڑوس میں ایک ہندوستانی خانساماں رہتے ہیں اُن کی گھر والیوں سے ہندوستانی سیکھی اور اب ڈاکٹر صاحب بھی مجھ سے اُردو ہی میں باتیں کرتے ہیں۔

بیگم ۔ آپ کی سسرال کہاں ہے ۔
محبوب ۔ میری سُسرال یعنی ڈاکٹر صاحب کا وطن تو دہلی ہی ہے لیکن ڈاکٹر صاحب کے والد آجکل جہلم میں ڈپٹی ہیں ۔
بیگم (گھبراہٹ سے) اچھا تو آپ کی سُسرال بھی جہلم ہی میں ہے ڈپٹی صاحب کا نام کیا ہے ۔
محبوب ۔ اُن کا نام مرزا کلیم اللہ ہے ۔
بیگم ۔ اور ڈاکٹر صاحب کا ۔
محبوب ۔ اُن کا . . . .
بیگم ۔ آپ کو کچھ تامل ہے بتانے میں ۔ بیشک پہلے زمانہ کی عورتیں تو میاں کا نام لینا معیوب جانتی تھیں مگر آجکل تو اس میں کوئی رکاوٹ نہیں رہی ۔ اتنے میں گاڑی جہلم سٹیشن پر جا پہنچی ۔
محبوب ۔ لیجئے جہلم آگیا ۔ بہن نام لینے میں کوئی ہرج نہیں اور ہمارے ہاں تو نام لینے کا عام رواج ہے میرے ڈاکٹر صاحب کا نام مرزا علیم اللہ ہے ۔
بیگم یہ نام سُنتے ہی سخت متحیر ہوگئیں اور اپنی جگہ سے کھڑی ہو کر نہایت تعجب و گھبراہٹ سے کہا ۔
"ہائیں کیا تم بھی انہیں کی بیوی ہو"
بیگم اتنا کہنے پائی تھی کہ اُن کا چھوٹا دیور جو اُن کو لینے سٹیشن پر آیا تھا گاڑی کے قریب آگیا اور دروازہ کھول کر کہا ۔
دیور (ملازمہ سے) نرگس بھابی جان کو ادھر لے آؤ اور اسباب نکالو ۔
نرگس نے پہلے بستر اور ٹرنک دیا پھر دیور نے اندر آکر بھابی کو اُتارا ۔ اور تینوں ویٹنگ روم کی طرف چلے گئے ۔

وہاں پہنچتے ہی بیگم برقعہ سمیت ہی فرش پر گر گئیں۔ لڑکا حیران رہ گیا۔ بمشکل اُس نے اور نرگس نے کاوچ پر ڈالا دیکھا تو بیہوش تھیں۔

دیور۔ نرگس بھابی جان کو کیا ہو گیا۔ کیا پہلے بھی کبھی ایسا ہوا ہے۔

نرگس۔ ہاں میاں کوئی برس دن ہو جائے گا کہ انہیں اختلاج کلب (قلب) کا دورہ پڑنے لگا ہے۔

نسیم اللہ (دیور کا نام)، نرگس اب میں کیا کروں؟ بھابی جان کس طرح ہوش میں آئیں جو گھر چلیں۔

نرگس۔ تم تھوڑا برف کا پانی لے آؤ میں انہیں عطر سونگھاتی ہوں بس اس طرح ہوش آجائے گا۔

نسیم باہر سے پانی لایا۔ نرگس نے فوراً صندوقچی سے لخلخہ نکالکر سونگھایا۔ چند منٹ میں ہوش آگیا۔

نسیم۔ بھابی جان آپ نے بڑی تکلیف اُٹھائی۔ آتے ہی یہ حالت ہو گئی۔ میں تو سلام بھی نہ کر سکا۔

بیگم۔ میاں مجھ بدنصیب کی یہی حالت ہے تم نے ناحق اتنی تکلیف اُٹھائی۔ میرا دم نکلجانے دیا ہوتا۔ آہ! اس دنیا میں اب میری کوئی ضرورت نہیں۔ میں بالکل بیکار اور دوسروں پر فضول بوجھ ہوں۔ کاش خدا اب مجھے اُٹھالے تو خوب ہو۔

نسیم۔ خدا نہ کرے بھابی جان آپ کیسی باتیں کرتی ہیں۔

نرگس۔ میاں جس دن سے تمہارے بھائی جان نے خط بند کر دیا ہے اُس دن سے اُن کا یہی حال ہے۔

نسیم۔ مگر بھابی جان کو کیسے خبر ہوئی؟

نرگس۔ کس بات کی؟

نسیم۔ بھائی جان کی دوسری شادی کی۔
نرگس۔ ہائیں ڈاکٹر صاحب نے ایک اور بیاہ کرلیا۔
نسیم۔ بیاہ کیا یونہی سی ایک عورت سے نکاح کرلیا ہے۔ سُنا ہے کسی میوہ فروش پشاوری کی بیوہ لڑکی ہے۔ مگر ہم نے بھی ابھی سُنا ہے تھوڑا عرصہ ہوا۔ بھائی نے ایسی خفیہ بات رکھی کہ پشاور سے جہلم تک ہمیں معلوم نہ ہوسکا۔ خیر خدا تو سب جانتا ہے ایسے عالم فاضل ہوکر اس قدر جہالت کا کام۔ خدا بھائی کے اس فعل کو سمجھیگا۔ بھابی جان آپ کو اپنا دل بہلانا چاہیے۔ انشاءاللہ بہت جلد اس کام کا نتیجہ پائینگے اور پشیمان ہوکر آپ کے پاس آئینگے۔
بیگم۔ میاں تم لوگوں نے تو مجھے خبر نہ دی مگر خدا کو یہ راز صرف مجھ پر ظاہر کرنا تھا بلکہ اُس عورت کو مجھے دکھانا بھی تھا۔ اچھا اُس کی مہربانی وہ میں نے دیکھ لی اور تمام باتیں اُس کی زبانی سُن لیں۔ نرگس دور بیٹھی تھی اسواسطے ہماری باتیں نہ سُن سکی اسی وجہ سے یہ اس معاملہ سے آگاہ نہ ہوئی۔ وہ امرتسر سے میرے پاس بیٹھی تھی۔ اور یہاں تک رہی۔ اب پشاور جا رہی ہے۔
نسیم (تعجب سے) ہیں بھابی جان وہ عورت جو بُرقعہ اوڑھے اور مونہ کھولے بیٹھی تھی۔
بیگم۔ ہاں ہاں وہی تمہاری بھابی تھی۔
نسیم۔ خدا اُسے سمجھے میری بھابی کیوں ہوتی۔ وہ امرتسر کیوں آئی۔
بیگم۔ وہاں اس کی بہن ہے اُس سے ملنے گئی تھی۔ اب چند روز پشاور ٹھہر کر تمہارے بھائی پاس جائیگی۔ وہ آجکل کہاں ہیں؟
نسیم۔ ہمارے پاس تو عرصہ سے اُن کا کوئی خط نہیں آیا۔ وہ کچھ عرصہ ہوا پشاور سے لوئشہ تبدیل ہوگئے ہیں۔

اس کے بعد یہ سب گھر پہنچے۔ بیچاری بدقسمت بیگم کو بخار آنے لگا۔ ڈپٹی صاحب نے
اپنی عزیز بہو کا بہتیرا علاج کیا مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ ڈاکٹروں نے تپ دق بتایا۔
آہ افسوس بدنصیب ہندوستانی مستورات کی حالت پر یہ واقعہ کوئی نیا نہیں ہی
ایسے ایسے صدہا واقعات ہر روز سُننے اور دیکھنے میں آتے ہیں۔ سیکڑوں نہیں
ہزاروں بے کس و بے بس مستورات اسی طرح گھُل گھُل کر جل جل کر جان دیتی
ہیں۔

خاکسار

بنت نذر الباقر۔ از کوہاٹ

کُتب بینی

قبل اسکے کہ میں اپنی راے آپ لوگوں کے سامنے پیش کروں آپ کے سامنے
اُن بڑے بڑے لوگوں کے قول بیان کرتا ہوں کہ جنکا نام زمانہ ابتک عزت کے ساتھ
لیتا ہی اور لیتا رہیگا۔

سر جان ہرشل کا قول ہی کہ

اگر خدا سے میری خواہشوں کے مانگنے کی نوبت آئے تو میں خدا سے
اپنی کتابوں کے مطالعہ کی شوق کی دعا مانگونگا۔"

ڈیجر ڈبڑی نے ۱۳۴۴ء میں ایک کتاب لکھی ہی اُس میں کتابوں کے مطالعہ کی
نسبت بہت کچھ لکھا ہی۔ وہ لکھتا ہی کہ

کتاب ہماری خود معلم ہے اور ہم کو بغیر مار پیٹ کے سبق دیتی ہے اگر ہم
کچھ بھول جاتے ہیں تو ہم پر کبھی خفا نہیں ہوتی۔ جب کبھی ہم اسکے
پاس جاتے ہیں کبھی نیند میں یا سوتی ہوئی نہیں ملتی ہے۔ اگر ہم کسی بات

کو سو مرتبہ پوچھیں گے تو سو ہی مرتبہ جواب دے گی۔ اگر کوئی بات تمہاری سمجھ میں سو مرتبہ نہ آئے گی تو تمہاری عقل پر کبھی مضحکہ نہ اڑائے گی جبتک تم چاہو پوچھے جاؤ خفا نہ ہو گی"

سقراط - کا قول ہے کہ

کوئی تو گھوڑا اور ہاتھی لیکر خوش ہوتا ہے اور کوئی عزت حاصل کر کے اور کوئی مال و دولت حاصل کر کے۔ لیکن وہ خود اپنی نسبت لکھتا ہے کہ اگر مجھے تمام دنیا کی دولت ملجائے تو شاید میں اتنا خوش نہ ہوں جتنا کتابوں کے دیکھنے اور پڑھنے سے خوش ہوتا ہوں۔

جن لوگوں کو کتابوں سے محبت صرف دیکھنے کی نہیں بلکہ اُن کو پڑھکر اُن سے فائدہ اُٹھانے کی محبت ہوتی ہے اون لوگوں کو کچھ عجب لطف آتا ہے جو لکھنے سے حاصل نہیں ہو سکتا ہے۔

جن کو کتاب کے مطالعہ کا شوق ہوتا ہے اُن کے دلوں پر مختلف کتابوں کے پڑھنے سے عجیب اور مختلف حالات معلوم ہوتے ہیں۔ جب کبھی وہ کسی ملک یا شہر کے حالات پڑھتا ہے تو اُس ملک کی گلی گلی میں سیر کرتا ہے۔ اگر کسی جنگل کا بیان آتا ہے تو جنگل در جنگل کا لطف اُٹھاتا ہے۔ کبھی بڑے بڑے لائق لوگوں کے ساتھ ہمکلام ہوتا ہے۔ کبھی بڑے بڑے سیاحوں کے ساتھ ہم سفر ہو کر سفر کی باتیں کرتا ہے۔

لارڈ میکالے نے اپنی قلم کی طاقت سے بہت سی کتابیں لکھی ہیں اور بہت سی دولت اور عزت حاصل کی لیکن جس قدر وہ دوسری کتابوں کے مطالعہ سے اور اُنکے دیکھنے سے خوش ہوتا تھا اتنا وہ اپنی تصنیف سے نہیں خوش ہوتا تھا۔

گبن۔ یہ ایک نامور مصنف ہے اس کا قول ہے کہ اگر مجھے ساری دنیا کی دولت ملے تو میں اُس کے عوض مطالعہ کا ذوق و شوق دینا ہرگز پسند نہ کرونگا۔

جو لوگ اکثر کتابوں کا مطالعہ رکھتے ہیں ان کو کبھی خوش طبع اور ناصح لوگوں کی کمی نہیں ہوتی۔

کتاب کے دیکھنے اور اس کے غور کرنے سے جو باتیں حاصل ہوتی ہیں وہ اگر کوئی عالم شخص ہم کو سمجھائے تو کچھ کار آمد نہیں ہوتی ہیں۔

رنج و فکر کی حالت میں اگر کتاب کا مطالعہ کیا جائے تو کتاب غم غلط کر دیتی ہے اور دماغ سے رنج و فکر بالکل جاتا رہتا ہے۔

ایک نامل ڈاکٹر بلکہ فلاسفر اپنے ایک رسالہ میں لکھتا ہے کہ

اگر ہم گزرے ہوئے لایق لوگوں کو مثلاً حافظ۔ جامی۔ سعدی شیرازی ملٹن۔ نیوٹن۔ ڈارون۔ ہومر وغیرہ وغیرہ کو کسی مسئلے پر بحث کرنیکے لئے بلا سکتے ہیں تو یہ اقتدار ہم کو اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے کہ ہم نے بہت سی کتابوں کا مطالعہ کیا ہو۔ یا ہمارے پاس ایک عمدہ ذخیرہ کتابوں کا جمع ہو۔

فی زمانہ ہم کو ہر ایک فیشن اور ہر مذہب کی کتاب بآسانی مل سکتی ہے خدا کا شکر کرنا چاہیے کہ ہم انیسویں صدی میں پیدا ہوئے اور ہر ایک قسم کی کتابیں مطالعہ کے لیے موجود ہیں۔

ایک وہ زمانہ تھا کہ ایک انار اور صد بیمار کا مضمون تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ اب لاکھوں پریس اور کارخانے ہو گئے ہیں اور بہت سی نسخہ اطے سے کتابیں ملتی ہیں۔

(باقی دارد)

ثمود الحق

سہارنپور

منقولات

مجذوب کی بڑ

(۱)

انسانیت و درندگی

لومڑی۔ آہا۔ خالہ بلی! یہ کیا جاتی دنیا دیکھی کہ ادھر قدم رنجہ فرمایا۔ تم تو انسانوں میں ایسی گھل مل گئیں کہ ہم غریب جانوروں کی طرف بھول کر بھی رُخ نہیں کرتیں۔

بلی۔ بُوا! یہ تم کیا کہتی ہو۔ ان انسانوں سے تو ہم غریب جانور ہی کچھ اچھے ہیں۔ مجھے تو ان کی صحبت سے نفرت سی ہوتی جاتی ہے۔

لومڑی۔ کیوں خیر تو ہے۔ آج تو تم عجب اُکھڑی اُکھڑی باتیں کر رہی ہو۔ کیا کسی سے لڑکے آئی ہو۔

بلی (مسکرا کے) بھلا اس بڑھاپے میں کسی سے کیا لڑوں گی۔ تم جانتی ہو کہ میری تین پشتیں انہیں انسانوں کے ساتھ رہتے سہتے گزری ہیں۔ لیکن جوں جوں مجھے انکے حالات سے زیادہ واقفیت ہوتی جاتی ہے میری بدگمانی اور بڑھتی جاتی ہے۔ بعض اوقات جب میں تنہائی میں بیٹھ کے سوچتی ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ان انسانوں کو ہم پر کیوں ترجیح دی جاتی ہے۔ نیز انسان اپنے تئیں ہم سے افضل سمجھیں تو سمجھیں۔ یہ بدنصیب جانور بھی تو ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ مگر جہاں تک میں نے اس پر غور کیا ہے حقیقت اسکے خلاف ہے۔

لومڑی۔ تم تو اس بڑھاپے میں روز بروز فلسفی ہوتی جاتی ہو۔ اور کیوں نہ ہو آخر تم اُس خاندان سے ہو جس کی کسی زمانے میں پوجا ہوتی تھی اور سونے میں سہاگہ یہ کہ صحبت

ہی تو حضرت اشرف المخلوقات کی۔
بلی۔ (قہقہہ لگاکے) ہا ہا! اشرف المخلوقات! انسان اور اشرف المخلوقات!! ارذل مخلوقات کہو ارذل مخلوقات۔
لومڑی۔ آج تو بے ڈھب تمہارا مزاج بگڑا ہوا ہے۔ میں تو بے شک اب تک یہی سمجھتی ہوں کہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اور ہم بے عقل۔ ناکارہ ذلیل ادنی جانور ہیں۔
بلی۔ بیشک اس سے زیادہ بے عقلی کیا ہو گی کہ تم انسان کو اشرف المخلوقات سمجھتی ہو۔ انسان اپنے مونہ سے میاں مٹھو بنا کرے مگر تمہاری عقلوں پر کیا پتھر پڑ گئے کہ تم بھی اُسے اشرف و افضل سمجھنے لگے۔ بڑا رونا تو یہی ہے۔
لومڑی۔ سمجھنے لگے کی بھی ایک ہی کہی۔ کیا وہ درحقیقت اشرف المخلوقات نہیں ہے؟
بلی۔ کیسے؛
لومڑی۔ کیسے۔ تم ان کی مصاحب اور انیس و جلیس ہو۔ یہ باتیں مجھ سے کہیں بہتر جانتی ہو لیکن آنکھیں میری بھی ہیں اتنا میں بھی دیکھتی ہوں کہ آج وہ اس عالم کا بادشاہ اور حاکم مطلق العنان ہے وہ روے زمین پر اس طرح چھایا ہوا ہے جیسے درخت پر اکاس بیل۔ اس کے سامنے شیر کی شیری، ہاتھی کی مستی، تیندوے کی خونخواری، لومڑی کی عیاری گرد ہے۔ وہ دور ہی سے کھڑے کھڑے ایسی ٹھائیں سے آواز کرتا ہے کہ حضرت جنگل کے بادشاہ بھیں کرکے زمین پر دراز ہو جاتے ہیں مجھے تو کبھی اس کے گھروں میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ لیکن سنا ہے کہ وہ بڑے بڑے عالیشان محلوں میں رہتا ہے۔ ایسے ایسے نفیس کھانے کھاتا ہے کہ ہمارے خواب و خیال میں بھی نہیں آتے۔ جو رستہ ہم مہینوں برسوں میں طے کرتے ہیں وہ گھنٹوں میں طے کر لیتا ہے۔ وہ زمین کو کھود پتال تک پہنچا اور آسمان پر تھیگلی لگاتا ہے۔ وہ لق و دق صحراؤں اور خوفناک جنگلوں اور طوفان خیز سمندروں کو اس طرح طے کرتا ہے جیسے کوئی چمن میں سیر کر رہا ہو۔ اس کی صنعت و حرفت اور حکمت اور کارستانیاں

دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اس کے سامنے جنگل کے شیر اور بیابان کے غول اس طرح بھاگتے ہیں جیسے چیتے کے سامنے ہرن یا دھوئیں سے مچھر۔ غرض اس کی حکومت مسلم اور اس کی عقل و حکمت حیرت انگیز ہے۔ بھلا ہمیں اس سے کیا نسبت۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔

بلّی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ تم اتنی فصیح البیان ہو۔ تم نے تو انسان کی چرب زبانی کو بھی مات کر دیا۔ لیکن میری پیاری لومڑی! یہ سب خول ہی خول ہے۔ ہاتھی کے دانت کھانے کے اور ہوتے ہیں اور دکھانے کے اور۔ تم اس مظلوم صورت۔ سنگ دل خونخوار درندے یعنی انسان کو کیا جانو اس میں وہ وہ گُن بھرے ہیں کہ خدا پناہ میں رکھے۔

لومڑی۔ تو میں کسی کے باطن کا حال کیا جانوں۔ تم اُس کی چہیتی اور پیاری ہو تمہیں کو معلوم ہوگا۔

بلّی۔ خاک پڑے اس پیار پر۔ میں تو اس کی صورت سے بیزار ہوں۔

لومڑی۔ آخر کیوں! میں بھی تو جانوں کہ اس نے کیا قصور کیا ہے۔ یہ معمہ تو میری سمجھ میں نہیں آتا۔

بلّی۔ یہ تو میرا دل ہی جانتا ہے کہ وہ کیسا ہے خیر تم سے کیا چھپاؤں۔ لو اب کان دھر کے سنو۔ یہ اسرار ہیں اور سب کی سمجھ میں نہیں آسکتے۔

بی لومڑی! تم آبادی سے دُور۔ جنگل کے بھٹوں میں رہتی ہو۔ تم اس انسان کو کیا جانو۔ میری تو ساری عمر انہیں میں گزری ہے۔ میں نے اسکے تمام کرتوت اپنے آنکھوں سے دیکھے۔ اس کی باتیں سُنیں اور اسے کتابیں پڑھتے سُنا ہے۔ جانوروں کا تو کیا ذکر اس نے اپنے بھائی بند انسانوں پر وہ ظلم توڑے ہیں۔ وہ خونریزیاں کی ہیں کہ خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ اس نے بلا وجہ ہزار ہا اپنے بھائی انسانوں کو تہ تیغ کر ڈالا۔

اُن کی کھوپڑیوں کے مینار بنا دیئے. اُن کی لاشوں سے دریا پاٹ دیئے. اُن کے خون سے ندی نالے بہا دیے. اچھا تم ہی اپنے ایمان سے کہو کہ تم نے کبھی کسی شیر کو شیر کھاتے کسی تیندوے کو تیندوے کا خون پیتے. کسی لومڑی کو لومڑی زہر مار کرتے دیکھا یا سنا ہی؟

لومڑی۔ ہرگز نہیں۔ خدا نہ کرے کہ ایسا ہو۔

بلّی۔ اب تم ہی انصاف کرو کہ یہ کہاں کی تہذیب و شرافت ہی۔ اچھا اسے جانے دو۔ یہ سب جانتے ہیں کہ یہ شیر کس پُھرتی سے جھپٹ کر ہرن کو دبا لیتا ہی اور پھر اُس کا خون پیکر اور سیر ہوکر دھوپ میں آرام کرنے کے لیے جا بیٹھتا ہی۔ اس وقت اُسکے سامنے ہرنوں کی ڈاریں کی ڈاریں گزر جائیں تو وہ آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتا۔ یا جب کوئی جانور دوسرے جانور پر کھانے کے لیے حملہ کرتا ہی تو وہ اپنی حفاظت کے لیے اُسے مارتا ہی۔ لیکن یہ حضرت اشرف المخلوقات صرف دوزخ شکم کے بھرنے یا اپنی حفاظت ہی کے لیے دوسروں کو نہیں مارتا۔ بلکہ تفریح کے لیے ہزارہا بے گناہوں کا خون کر ڈالتا ہی۔ اور اس شریف فن کا نام اُس نے سیر و شکار رکھا ہی۔ قربان جائیے اس تفریح کے۔ بات یہ ہی کہ اسکی فطرت میں خونخواری ہی۔ ایک چھوٹا سا ٹلوا جس کی عمر چار پانچ برس سے زیادہ نہیں ہوتی۔ ایک خوبصورت پھول کو توڑتا اور بلا وجہ اس کی نازک پتیوں کو نوچ نوچ کر ہوا میں اُڑا دیتا ہی۔ جب اس سے بڑا ہوتا ہی تو معصوم پرندوں کے انڈے توڑتا ہے کے غریب و بے کس بچوں کو گھونسلوں میں سے نکال نکال کر تڑپا تڑپا کر مار ڈالتا ہی اور خوش ہوتا ہی اور جب جوان ہوتا ہی تو جنگل کے بے گناہ جانوروں کا شکار کرتا اور اُن کو مار کر اس قدر خوش ہوتا ہی جیسے کوئی اقلیم فتح کر لی۔ پھر طرہ یہ کہ جان لیکر ہی بس نہیں کرتا بلکہ اُن کی کھالیں کھچوا کر اپنے مکان میں بچھواتا اور دیواروں پر لگاتا ہی۔ خوبصورت اور نازک پرندوں کو مار کر اُن کی کھالوں میں بُھس بھرواتا ہی اور گھروں کی محرابوں اور طاقچوں میں

خوشنمائی کے لیے رکھتا ہی اور اُسے اپنے مکان کی آرایش و زینت کرتا ہے ۔ یہ ہے انسان کی انسانیت ۔

لومڑی ۔ خالہ ! آج تم نے تو بڑے بڑے اسرار بتلائے توبہ ۔ توبہ کسی کو مار کر خوش ہونا کیسی بُری سنگدلی ہی ۔ اور یہ کیسی عجیب بات ہی کہ انسان انسان ہی کو قتل کرتا ، ور اُس کے قتل پر فخر و مسرت کرتا ہی ۔ ہم میں بھی ہزار ہا قسم کے جانور ہیں مگر کوئی بلا وجہ کسی کو مار ، خوش نہیں ہوتا چہ جائے کہ اپنے ہم جنس کو ۔ خدا اپنی پناہ میں رکھے ۔

بلی ۔ اجی اور سنو ! تمہیں ایک نئی بات سُناتی ہوں ۔ تم نے کبھی دیکھا یا سُنا ہی کہ شیر کا غلام شیر ہو ۔ تیندوے کا نوکر تیندوا ۔ یا ہاتھی کا نوکر ہاتھی یا بلّی کی باندی بلّی ہو ؟ یا کوئی جانور کسی جانور کا غلام ہو ؟

لومڑی ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہی ۔ یہ تو بالکل ان نیچرل یا خلاف فطرت ہی ۔

بلی ۔ مگر تمہیں یہ سُنکر حیرت ہوگی کہ انسان دوسرے انسانوں کو اپنا غلام بناتا اور اُنہیں بیچتا اور خریدتا ہی ۔ یا دوسرے انسانوں کو اپنا نوکر اور خدمتگار بنا کر رکھتا ہی اور اُن پر طرح طرح سے حکومت کرتا ہے ۔

لومڑی ۔ تم سچ کہتی ہو ۔ یہ موا اشرف المخلوقات کیسا ارذل مخلوقات ہی ۔

بلی ۔ بس ایک دو ہی باتیں سُنکر تمہارے ہوش و حواس جاتے رہے ۔ اس کے کرتوت دیکھو تو جان سے بیزار ہو جاؤ ۔ یہ میرا ہی دل و جگر ہی کہ ان کے ساتھ رہتی ہوں اور زندہ ہوں ۔ اچھا ایک آدھ بات اور سُنائے دیتی ہوں ۔

لومڑی ۔ انسان کی خونخواری کا حال سُنکر بیشک میرے ہوش و حواس ٹھکانے نہیں رہے اگر کوئی اور کہتا تو میں کبھی یقین نہ کرتی ۔ اچھا اور فرمایئے ۔

بلی ۔ لیجیے ایک اور عجیب بات سُناتی ہوں ۔ ہم میں سے جب کوئی درندہ کسی وجہ سے کسی دوسرے کا دشمن ہو جاتا ہی تو وہ انتقام کے لیے اُس پر حملہ کرتا اور مار ڈالتا ہی اسکے بعد وہ ٹھنڈا پڑ جاتا ہی

اور پھر اسکا خیال بھی نہیں کرتا۔ لیکن انسان کی ہر آن انوکھی ہے وہ جوں جوں کسی دوسرے انسان کو دباتا ہی اُس کا غصہ اور بڑھتا ہے۔ اور جوں جوں وہ انتقام لیتا ہے اُس کے انتقام کی پیاس اور بڑھتی ہے وہ اپنا انتقام وہیں تک نہیں رکھتا جس سے اُسے عداوت ہے بلکہ اُس کے عزیز و اقارب یار و آشنا۔ نوکر چاکر۔ اس کے ملنے جُلنے والوں سب سے انتقام لیتا اور اُن کی دل آزاری اور اُنہیں تکلیف پہنچانے کی فکر میں رہتا ہی۔ بلکہ بعض اقوام اُن میں ایسی ہیں کہ انتقام موروثی طور پر باپ سے بیٹے اور بیٹے سے اس کے بیٹے تک سالہا سال تک برابر پہنچتا ہے۔ اور وہ اسی طرح ایک دوسرے کے خون کے پیاسے رہتے ہیں اور جنگ وجدل قتل و غارت کا بازار قرنہا قرن تک برابر گرم رہتا ہے۔ تم نے کبھی درندوں میں بھی ایسی موروثی عداوت اور انتقام سُنا ہی۔

لومڑی۔ ہرگز نہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص سے لڑے۔ اور لڑکر فیصلہ کرے تو پھر بھی وہ عداوت خاندانوں اور قبیلوں میں صدہا سال تک جاری رہے۔ اور برابر ایک دوسرے سے انتقام لیتے رہیں واہ۔ واہ۔ وا!

بلّی۔ میں نے اپنے آقا کے لڑکوں کو ایک کتاب میں پڑھتے سُنا ہی کہ ایک ملک میں مجھے اُس کا نام یاد نہیں رہا مگر اتنا یاد ہے کہ وہ دنیا کی ایک بڑی عظیم الشان سلطنت ہوئی ہی جس کی تہذیب و شایستگی آج تک زبان زد عالم ہے۔ خیر اس ملک میں یہ دستور تھا کہ دنگل میں پہلوان چھوڑے جاتے۔ اور تمام شرفا و امراے ملک اور خاص کر نازک بدن خاتونیں وہاں جمع ہوتی تھیں۔ وہ پہلوان ایک دوسرے سے نہایت بے رحمی سے لڑتے اور ایک دوسرے کو بُری طرح سے مار ڈالتے تھے۔ تو یہ شریف انسان اور اُن کی خاتونیں بہت خوش ہوتی اور اسے بہت بڑی تفریح خیال کرتی تھیں۔ کیا تم نے بھی کسی شیرنی کو دیکھا ہی کہ کسی کے دم توڑنے پر اس طرح خوش ہوتی ہو۔

وہاں ایک یہ بھی دستور تھا کہ شیروں کو کئی کئی روز تک بھوکا رکھتے تھے۔ اور پھر

اُن کے سامنے مجرموں کو چھوڑتے تھے۔ خیال کرو ان غریبوں اور بیکسوں کی مظلومی اور بے کسی کو وہ اپنی جان بچانے کے لیے لڑتے تھے۔ مگر کیا لڑ سکتے ہیں۔ آخر شیر اُنہیں بھنبھوڑ ڈالتا اور شڑاپ شڑاپ اُن کا خون پی جاتا۔ مہذب اور نازک بدن خاتونیں تماشا دیکھ کر خوش ہوتیں اور مارے خوشی کے اُچھلتی کودتی تھیں۔ اور اگر کوئی شخص ان پہلوانوں میں بیچ بچاؤ کرانے کی کوشش کرتا یا اس خونخوارانہ تفریح کو بند کرنا چاہتا تو یہ مجسم رحم خاتونیں بہت بگڑتیں اور خفا ہوتی تھیں۔ یہ ہے انسان کی رحم دلی۔ یہ ہے ان کی نازک بدن رحمدل خاتونوں کی خدا ترسی۔

لومڑی۔ ان انسانوں پر خدا کی مار۔ بے شک یہ ارذل مخلوقات ہیں۔ بس خالہ صاحب مجھے معاف رکھو۔ میں ایسے افسانے سُننا نہیں چاہتی۔ ان رحم دل انسانوں سے تو ہم غیر ذی عقل ناپاک درندے اچھے۔ ان کی انسانیت انہیں کو مبارک رہے۔

بلی۔ اجی تم نے ان کی مکاری۔ عیاری کے حالات تو سُنے ہی نہیں۔ انسانوں میں لومڑی بہت مکار مشہور ہے مگر انسان کی مکاری کے سامنے اُس بے چاری کی کیا حقیقت ہے۔

لومڑی۔ آہا۔ وہاں میرا بھی ذکر خیر ہوتا ہے۔

بلی۔ ہاں آپ کی عیاری تو ان میں ضرب المثل ہے۔

لومڑی۔ خدا ان موؤں کو غارت کرے۔ مکار۔ دغاباز۔ خونخوار۔

بلی۔ ان کی ستم ظریفی تو دیکھو۔ بیچارے گوشہ نشین عافیت پسند الّو کو کہتے ہیں کہ یہ بڑا منحوس جانور ہے اور ہمیشہ ویرانوں میں رہتا ہے۔ اور جہاں یہ بیٹھ جاتا ہے وہ ویرانہ ہو جاتا ہے کیا خوب! کوئی ان سے یہ تو پوچھے کہ وہ ویرانے کس کے تھے اور اُنہیں ویران کس نے کیا۔ میں اُن کی غارتگری۔ خونریزی۔ قتل و بربادی کے حالات کہاں تک بیان کروں۔ اس سے زیادہ منحوس کون ہوگا۔ کل ہی میں نے ایک فلسفی کو اپنے آقا سے باتیں کرتے

سُننا۔ وہ کہتا تھا کہ مہذب اقوام جہاں جہاں پہنچی ہیں وہاں کے اصلی اور وحشی باشندے روز بروز غارت ہوتے چلے جارہے ہیں اور کوئی دن جاتا ہے کہ دنیا میں ان کا نام و نشان باقی نہ رہے گا۔ کیا تہذیب و شائستگی اسی کا نام ہے کہ اپنی ہم جنس اقوام کا ملک تو چھینا ہی تھا۔ اب اس پر اکتفا نہ کرکے اُن کے نام و نشان کو بھی صفحۂ ہستی سے مٹانا چاہتا ہے۔ منحوس کون ہوا انسان یا اُلو؟ درندہ کون ہوا شیر۔ اور تیندوا یا انسان اور پھر ان کرتوتوں پر دعوائے حریت و مساوات و اخوت ہے۔ انصاف و عدل کی بگا ہے۔ قانون بناتا اور عدالتیں قائم کرتا ہے۔ لیکن نہ کہیں انصاف ہے نہ عدل۔ نہ اخوت ہے نہ مساوات۔

لومڑی۔ خدا کے لیے خالہ بلی بس کرو۔ میں اس ظالم ناپاک مخلوق کا حال سُننا نہیں چاہتی۔ تعجب ہے کہ تم ان میں کیسے رہتی ہو۔ شاباش ہے تمہارے دل و جگر کو۔

بلی۔ بُوا لومڑی۔ اگرچہ وہ مجھ سے پیار و محبت کرتے ہیں مگر مجھ سے بدگمان بھی ہیں۔ البتہ کُتے کو وہ بہت وفادار اور اطاعت گزار سمجھتے ہیں۔ اس حرامزادے نے ایک ٹکڑے روٹی کے لیے اپنی آزادی اور شرافت انسان کے ہاتھ بیچ رکھی ہے۔

لومڑی۔ مجھے تو اس موئے کُتے سے نفرت ہے۔ خدا سب کو اس خونخوار ناپاک انسان کے پنجے سے نجات دے۔

بلی۔ آمین۔ اب بہت دیر ہوگئی ہے۔ لو بُوا لومڑی میں اب جاتی ہوں۔ اگر زندگی ہے تو پھر ملوں گی۔

لومڑی۔ آج تو خالہ بلی۔ تم نے وہ وحشتناک باتیں سنائی ہیں کہ میرے اوسان جاتے رہے خدا ہم سب پر رحم کرے۔ خدا حافظ

بلی۔ ابھی تم نے سُنا ہی کیا ہے۔ یہ تو سمندر میں سے ایک قطرہ ہے۔ خدا حافظ۔

از
پنجاب ریویو

خانۂ کعبہ

سہروردیہ صاحبہ کے نام نامی سے ناظرین خاتون بخوبی واقف ہیں۔ ان کا عالمانہ تاریخی مضمون جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے مسلمان بیبیوں کے لیے بہت دلچسپ ہوگا۔ ہمیں مضمون نگار صاحبہ سے اب زیادہ سفارش کرانے کی ضرورت نہیں ہے انکے مضمون کی خوبی خود انکے مضمون سے عیاں ہے۔ مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید کے مقولہ پر عمل کر کے مضمون ہدیہ ناظرین کرتے ہیں

اڈیٹر

این سعادت بزور بازو نیست　　تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

خدا کی قدرت ملک شام میں سام بن نوح کے نسل سے ایک بت تراش کے گھر میں ایک بت شکن پیدا ہوا۔ ؎

برآری خلیلے ز بتخانۂ　　کنی آشنائی ز بیگانۂ

اس سرشار بادۂ الست وجویائے معرفت کے دیدہ بصیرت و نظر حق بین میں کل موجودات و مخلوقات و کائنات میں جلوۂ وحدت و کرشمۂ معرفت نظر آیا ہے

آنکس از اہل بشارت کہ اشارت داند　　نکتہ ہاست بسے محرم اسرار کجاست

نظر اٹھائی تو شجر حجر۔ بحر و بر کو دیکھا کہ زبان حال سے ذات واحد و صفات مطلق کی شہادت دے رہے ہیں ؎

ہر گیاہے کہ از زمیں روید　　وحدہٗ لاشریک لہ گوید

جمادات و نباتات۔ وحش و طیور اجرام فلکی۔ اجسام خاکی سب کے سب صانع صورت نگار کی صنعت کا اقرار کر رہے ہیں ؎

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار　　ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

نصف اللیل کی دہشت انگیز تاریکی، وہ لق ودق میدان وکف دست صحرا جہاں آسمان سرنگوں ہوکر چاروں طرف سے زمین بوس نظر آتا تھا۔ وہ عالم تنہائی سراب کے سوا دور دور تک کسی چیز کا نشان نہ ملتا تھا۔ وہاں وہ صاحب قلب سلیم حق کی جستجو میں ڈانواڈول ہورہا تھا۔

فلما جن علیہ اللیل را کوکباً قال ھذا ربی فلما افل قال لا احب الافلین ٭ فلما را القمر بازغاً قال ھذا ربی فلما افل قال لئن لم یھدنی ربی لاکونن من القوم الضالین ٭ فلما را الشمس بازغۃً قال ھذا ربی ھذا اکبر فلما افلت قال یا قوم انی بری مما تشرکون ٭

ترجمہ۔ سو جب اُس پر رات نے اندھیرا کیا تو اُس نے ایک تارا دیکھا۔ کہا یہ میرا رب ہے۔ پھر جب وہ چھپ گیا تو کہا کہ چھپنے والے مجھے پسند نہیں آتے پھر جب چاند چمکتا دیکھا تو کہا کہ یہ میرا رب ہے۔ پھر جب وہ بھی چھپ گیا تو کہا اگر میرا رب مجھے ہدایت نہ کرے گا تو میں بے شک گمراہوں میں ہونگا۔ پھر جب سورج چمکتا دیکھا تو کہا کہ یہ میرا رب ہے یہ سب سے بڑا ہے پھر جب وہ بھی چھپ گیا تو کہا اے قوم میں اس سے بنیں تم شریک ٹھہراتے ہو بیزار ہوں۔

پھر انی وجھت وجھی للذی فطر السموٰت والارض وما انا من المشرکین ٭

ترجمہ میں نے آسمان وزمین کے خالق کی طرف یکطرفہ ہوکے اپنا مونھ پھیرا ہے اور میں مشرکوں میں نہیں۔

کہہ کے کل ماسوا سے مونھ موڑ لیا۔

بُتان مصنوعی سے ابا کرکے معبود برحق کی پرستش کی اشاعت کا خیال آیا اور حضرت

سلیمان علیہ السلام سے نو سو پچانوے سال پیشتر جزیرہ نمائے عرب کے خطۂ حجاز کے شہر مکہ میں اُس بیت عتیق کی بنیاد ڈالی ؎

ازل میں مشیت نے تھا جس کو تاکا   کہ اس گھر سے اُبلے گا چشمہ ہدا کا

زہے نصیب ہمارے اگر اُس سرزمین پاک کی خاک کو سرمہ بنائیں کہ یہ دیدۂ کوتاہ مشاہدۂ مظہر جلال الٰہی سے روشن ہو کر محو جمال نور نامتناہی ہو ؎

بر زمینے کہ نشان کف پائے تو بود   سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود

گو اس وقت مکہ یا مکۂ مبارکہ جسکو بطحیٰ بھی کہتے ہیں حجاز کے کُل ملکوں میں متمدن و مہذب ہے۔ مگر بنائے کعبہ کے وقت وہ مقام اس قدر ویران وخشک وبنجر تھا کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل دونوں باپ بیٹوں نے اُس سرزمین کی آبادی کے لیے خشوع وخضوع سے دعا کی اور اپنی ذریت کی ہدایت کے لیے اُن میں سے ایک رسول مبعوث کرنے کی استدعا کی تاکہ ذات وحدانیت کی پرستش کا سلسلہ جاری رکھے

ربنا وابعث فیھم رسولاً منھم یتلو علیھم آیٰتك ویعلمھم الکتاب والحکمۃ ویزکیھم انك انت العزیز الحکیم ہ

اے ہمارے رب اور انکے بیچ انہیں میں سے ایک رسول اُٹھا جو تیری آیتیں ان پر پڑھے اور انہیں کتاب اور حکمت سکھائے اور انہیں سنوارے توہی زبردست حکمت والا پختہ کار ہے۔

ان کی دعا مقبول ہوئی اور عرب کے قدیم قبیلۂ بنی جرہم میں حضرت اسمٰعیل نے نکاح کیا۔ اور اُن کی اولاد نہ صرف مکہ میں بلکہ سارے عربستان میں پھیل گئی۔ انہیں کی اولاد میں سعد بن عدنان۔ کنانہ۔ قصی۔ قریشی وغیرہ پیدا ہو ہو کر بڑے بڑے نام آور دہ قبیلوں کے سرگروہ و مورث ہوئے۔

مکہ کو بطحیٰ اسلیے کہتے ہیں کہ یہاں کی زمین سنگلاخ ہے۔ پانی بھی یہاں کا کھاری ہے

اسلیے یہاں سبزی و نباتات نام کو نہیں جمتی۔
چراگاہ شہر سے فاصلہ پر تھے جہاں مویشی چرا کرتے تھے۔ جدّہ اور طایف سے اجناس ضروری اور میوہ وغیرہ بکنے کو آتے تھے۔ یہاں کے باشندے اس زمین سے متمتع ہونے کی اور اس میں سے اپنی وجہ معاش حاصل کرنے کی کچھ بھی امید نہ رکھکر ناچار ان لوگوں نے فن سپاہ گری اور تجارت کو اپنا شغل ٹھہرایا تھا۔ اور تجارت سے ان کو بہت فائدہ ہوتا تھا۔
عدن اور عمان کے بندرگاہوں اور یمن کے بازاروں سے بیش قیمت خوشبودار مصالحے شام اور بصرہ میں لیجاکر فروخت کرتے اور وہاں سے ہر قسم کا غلہ اور ہر قسم کی تجارت کی چیزیں خرید کر لیجاتے تھے۔ اور اس تجارت سے مکہ ہر قسم کے اجناس واطعمہ واقمشہ سے پُر رہتا تھا۔
اور مکہ کی آبادی کا بڑا سبب کعبہ تھا کیونکہ گو حضرت ابراہیم کے عہد سے بعثت رسول مقبول تک ایک زمانہ دراز گذرا تھا۔ اور کل بنو اسمٰعیل نے خدائے واحد کی پرستش کو بھول کر مصنوعات کو معبود قرار دے لیا تھا۔ مگر کعبہ کی عظمت و بزرگی انکے دلوں میں بدستور قائم تھی۔ سال بسال عرب کے ہر دیار وامصار سے لوگ جوق جوق اسکی پرستش کو آتے تھے۔ اور قربانیاں چڑھاتے اور طواف کرتے تھے۔
اسلام سے تین سو سال پیشتر ہبل نام سنگ سرخ کا ایک بت شام سے لاکر کعبہ میں رکھا گیا تھا اور اُس کے ذمہ سب کی قسمتوں کا فیصلہ تھا۔ یعنی کعبہ میں نہ معلوم کن وقتوں سے سات تیر کسی نے رکھے تھے جنکو وہ بہت مقدس جانتے تھے اور ان کو ازلام کہتے تھے۔ اور انہیں تیروں سے کل تنازعات کا فیصلہ کرلیا کرتے۔ اور اُس فیصلہ کا مالک ہبل کو قرار دے رکھا تھا۔
علاوہ ہبل کے چھوٹے چھوٹے تین سو ساٹھ بت سال کے دنوں کے شمار سے

اُس میں جمع کر رکھے تھے۔ بغرض تعظیم حضرت ابراہیم اور حضرت اسمعیل کی مورتیں بھی بنا کر رکھی تھیں اور اُس زمانہ جاہلیت میں ان کو بھی پوجنے لگ گئے تھے۔ طلائی و نقرئی دو ہرن تھے۔ اور شیر و ہما کی صورت کے بھی معبود تھے۔ کچھ چھوٹے چھوٹے طلائی بُت حضرت اسمعیل کی سسرال قبیلہ بنی جراہم کے بھی کعبہ کے طاقوں کو زینت دے رہے تھے۔ غرض ؎

وہ تیرتھ تھا اک بُت پرستوں کا گویا ۔۔۔ جہاں نام حق کا نہ تھا کوئی جویا

اصل خانۂ کعبہ بارہ گز مکعب و مربع بغیر کسی کنگرہ و طاق کے ایک پاسہ نما عہد قدیم کے بھدے فن تعمیر کا نمونہ ہے۔ گو کئی مرتبہ اُس کی ترمیم و تعمیر ہوئی مگر کسی نے اُس کی عظمت کے لحاظ سے اُس کی شکل و ہیئت اصلی کو بدلنے کی کوشش نہ کی۔

اسلام کے قبل کا حال تو ٹھیک معلوم نہیں مگر تحقیق ہے کہ آنحضرت کے زمانہ میں بھی ایک مرتبہ اس کی تعمیر و ترمیم ہوئی ہے۔ غالباً سیل عرم یا کسی اور حادثہ سے اس کے گر جانے کا خوف دیکھکر لوگوں نے اس کی جانب توجہ کی ہوگی کہتے ہیں کہ بنو اسمعیل کی چار سر برآوردہ قوموں نے مل کر اسکو بنایا تھا۔ تاکہ فضیلت میں سب کی شرکت برابر رہے۔ جب حجر اسود کو اُس کی جگہ میں رکھنے کے لیے اُٹھانے کا وقت آیا تو (جیسی جاہلیت کے عربوں کی عادت تھی کہ ذرا ذرا سی بات پر شعلہ جنگ اُن میں بھڑک اُٹھتا تھا) جدال و قتال کی نوبت آئی۔ آخر قرار پایا کہ صبح کو دارالندوی میں جو پہلے آ نکلے اُسکو فیصلہ کے لیے ثالث مقرر کیا جائے۔ خدا کی مرضی آنحضرت صلعم علی الصباح نظر آئے۔ سب نے کہا کہ اے محمد امین تم اسکا فیصلہ کرو اس عالم علم لدنی نے ایک چادر بچھادی اور چاروں فرقے کے سرداروں سے کہا کہ تم چاروں ملکر پتھر اُٹھا کر اسکے بیچ میں رکھکر چادر کے چاروں کونے پکڑ کر لیچلو۔

سب نے راضی اور خوشی ہوکر ایسا ہی کیا۔

جب کعبہ میں نصب کرنے کا وقت آیا تو اُس وقت ایک ہی شخص کا کام تھا آنحضرت نے کہا کہ تم سب مل کر ایک معتبر آدمی کو اپنا وکیل مقرر کرو جو تمھاری طرف سے یہ کام انجام دے سب نے یک زباں ہوکر کہا یا محمدؐ تجھ سا امین ہم کو کہاں ملے گا تو ہی ہماری طرف سے اسکو انجام دے۔

اُس وقت بھی خانۂ کعبہ اندر سے بیت المقدس کے نمونے پر پُرانے وضع کا بنا تھا اور لکڑی اور پتھر کے ستونوں پر چھت قائم تھی۔ اندر نقرئی فانوس لٹک رہی تھیں کسی نے کہا ہی کہ اس میں کوئی روشندان یا دریچہ نہ تھا۔ مگر بعض کہتے ہیں کہ دریچے تھے جس میں رنگ برنگ کے شیشے جڑے ہوئے تھے۔ اور دروازہ اسکا بلندی پر واقع ہی جس پر چڑھنے کے لیے کئی ایک سیڑھی بنی ہوئی تھیں۔

ہجرت کے ساٹھ ستر سال بعد خانۂ کعبہ آتش زدگی میں تباہ ہوگیا تھا تو عبداللہ ابن زبیر نے اپنے زمانۂ حکومت مکہ میں پھر اُس کی تعمیر کرائی۔ پھر حجاج ابن ثقیف نے خلیفہ بنی مروان کے درمیانی عہد میں کسی قدر دنیوی شان و شوکت کے ساتھ اُس کی ترمیم و تعمیر کی۔ جب سے ابتک خانۂ کعبہ اسی حالت پر ہی۔ البتہ خلیفہ مہدی نے بہت مہتم بالشان طریقے سے اُسکے دروازوں اور دیواروں کو طلائی نقرئی پچیکاریوں اور صنعت سے سجانے کا ارادہ کیا تھا اور کسی قدر کام بھی جاری ہوا تھا کہ موت نے اسکو مہلت نہ دی اور کام ادھورا رہ گیا۔

جب سے برابر خلفاؤں اور حامیان حرمین شریفین کی طرف سے ضرورت پر مناسب ترمیم ہوا کرتی ہی۔ جب سے تعمیر کی کسی نے ہمت نہ کی۔

جاہلیت کے زمانے میں خانۂ کعبہ پر کوئی غلاف و پردہ وغیرہ چڑھانے کا رواج نہ تھا۔ آنحضرت کے عہد میں اُسپر بردیمنی کا غلاف جسکو قصوہ کہتے ہیں چڑھا۔ جب سے

برابر سال بسال خلفای وقت ایک سے ایک نفیس و زرنگار بردے اور غلاف اپنی سعادت کے لیے بھیجا کرتے ہیں۔ ہر سال ذی قعدہ کی چھبیسویں تاریخ کو پُرانا غلاف اُتار لیا جاتا ہی اور ایام حج کے دس دنوں تک وہ بغیر غلاف کے رہتا ہی۔ پُرانے غلاف کے ٹکڑے زائرین بطور تبرک کے لایا کرتے ہیں اور آنکھوں سے لگاتے ہیں۔ عمارت کے جنوب مشرق کونے پر کوہ صفا کی طرف حجر اسود نصب ہی۔ یہ ایک بالشت کا مستطیل سیاہ رنگ کا پتھر ہی۔ اور جنوب۔ مغرب۔ شمال مغرب۔ اور شمال مشرق۔ اطراف کو یمنی، شامی، عراقی کہتے ہیں کیونکہ اُن ملکوں کے باشندوں کا قبلہ اُنہی اطراف سے گرتا ہے۔

طرف عراقی کے کچھ دور پر خانۂ کعبہ سے الگ ایک نصف دائرہ پتھر کے نیچے دیواروں کا بنا ہوا ہی جس کے اندر سنگ موسیٰ کا فرش ہی اُسکو حجر کہتے ہیں۔ اسکے اندر میزاب یعنی ایک سُنہری ملمع کا فوارہ بنا ہوا ہے۔ اور کہتے ہیں کہ حضرت اسمٰعیلؑ اور اُن کی والدہ بی بی ہاجرہ کی تربت بھی وہیں ہی۔

ایک طرف مقام ابراہیم ہی۔ یہ ایک پتھر ہی جسپر کہتے ہیں کہ خلیل اللہ کا نقش قدم ہی۔ وہ ایک جالی کے اندر رقبہ میں رکھا ہوا ہے۔ دیکھنے سے اندر کی طرف سے ذرا دبا ہوا معلوم ہوتا ہے جسکو دیکھنے والے نقش قدم سے تعبیر کرتے ہیں۔ کچھ دور پر وہ مقدس زمین بھی ایک گڑھے کی صورت پر ہی جہاں کی مٹی خمیر کر کے خانۂ کعبہ بنایا گیا تھا۔

وہاں سے کچھ فاصلہ پر چاہ زمزم واقع ہی اسکا پانی گو ذائقہ میں کھاری ہے مگر اہل اسلام اسکو تبرکاً نہایت تعظیم و رغبت سے پیتے ہیں۔ وسط شعبان میں مشہور ہی کہ اس میں ایک تموج پیدا ہوتا ہی اور وہاں کے باشندے اُس دن جوق جوق آتے ہیں اور چاہ زمزم کے خادم کچھ اُجرت پر ڈول سے پانی اُٹھا اُٹھا کر دیداروں کو

سرابور کر دتے ہیں۔

خانہ کعبہ کے ایک طرف چاروں مذہب کے پیروں کے لیے الگ الگ حنبلی شافعی حنفی، مالکی نمازگاہیں سائبان نما بنی ہوئی ہیں اور حنفی کی عبادت گاہ دومنزلہ ہے۔ اور یہ کل عمارات ڈھائی سو گز طول اور دو سو گز عرض زمین میں ہیں۔ جنکے چاروں طرف دو قطار ستونوں کے مثل احاطہ کے ہیں۔ ان ستونوں کی تعداد پانچسو سے زیادہ ہے۔ اور چالیس دروازے اسکے درمیان ہیں۔ واللہ اعلم۔

اصل حال وہی خوش نصیب جانے جسنے وہاں کی زیارت کی ہو۔ اگر کوئی بات خلاف واقعہ اس مختصر سے مضمون میں درج ہے تو ناظرین ازراہ کرم چشم پوشی کریں کیونکہ میں نے جناب اڈیٹر صاحب کی فرمایش سے اس مضمون کو قلم برداشتہ لکھدیا ہے عجلت وعدم فرصت کی وجہ سے تحقیق کا وقت نہیں رہا۔

راقمہ
سہروردیہ

ایران میں تعلیم نسواں

اندنوں یہ جاننا مشکل ہی کہ ترقی نسواں کی تحریک ایران میں کس حد تک پہنچ گئی ہی مگر یہاں ہندوستان میں جہاں عورتوں کی مجلسی اور معاشرتی اصلاح کی ترقی کے غیر مشتبہ آثار ہم دیکھ چکے ہیں۔ یہ سُن کر چنداں تعجب نہیں ہوتا کہ ایران کے دارالسلطنت میں بھی اس تحریک نے اپنے وجود کا ثبوت دینے کی آہستہ مگر مستقل سعی وکوشش شروع کر دی ہی۔ البتہ ایک ایسے ملک میں جہاں پُرانے خیالات کے مقابلے میں مجلسی اور سیاسی خیالات کا نبرد آزما ہوکر فتح پانا ابھی باقی ہے۔ عورتوں کی

اس ناتواں جد و جہد کا کوئی معتد بہ نتیجہ مرتب ہونے کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ تاہم یہ ایک قابل یادگار واقعہ ہے کہ ایران میں بھی اس سال تعلیمی مسائل پر بحث کرنے کی غرض سے ایرانی خاتونوں کا ایک جلسہ بمقام طہران منعقد ہوا۔

یہ واقعہ اس امر کی ایک بیّن دلیل ہے کہ تعلیم نسواں بطور ایک مفید تحریک کے تسلیم کی جانے لگی ہے۔ اور اس واقعہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ملک فارس کے مجلسی انقلاب میں تعلیم نسواں کا حصہ معقول ہوگا۔

اس تحریک کی آغاز کی وضاحت کے لیے ہم اخبار ٹائمس (لندن) کے طہرانی نامہ نگار کے ممنون ہیں۔ نامہ نگار مذکور کا بیان ہے کہ کوئی تیس سال کا عرصہ ہوا کہ امریکہ کی پریسبیٹیرین مشنری سوسائٹی نے طہرانی لڑکیوں کی تعلیم میں عملی حصہ لینا شروع کیا۔

ایک مدرسہ کھولا گیا جس میں ابتداءً دس بارہ ارمنی (عیسائی) لڑکیاں داخل ہوئیں اور چند سال تک اس ملک میں اپنی طرز کا یہ ایک مدرسہ تھا۔ باوجودیکہ لڑکیوں کے لیے مکان اور کھانا مفت تھا۔ تعلیم مفت تھی۔ اور کتابیں بھی مفت ملتی تھیں۔ تاہم سالانہ داخلہ کی تعداد پچاس سے متجاوز نہ ہونے پائی۔ ۱۸۹۶ء میں پہلی مسلمان لڑکی اس مدرسے میں داخل ہوئی۔ مگر مسلمان لڑکیاں کچھ بے جھجک ہوکر اگر داخل ہونے لگی ہیں تو وہ ۱۹۰۵ء کے بعد ہی سے ہوئی ہیں۔

ابتدا میں تعصب اور مخالفت کا غلبہ رہا اور جب تک مسلمان والدین نے بغیر اطلاع کیے آکر مدرسے کا ناگہاں معائنہ نہ کرلیا تب تک اُن کے دلوں سے شک و شبہ دور نہ ہوسکا۔

بہرحال سال گزشتہ اس مدرسے میں کل ۲۳۵ لڑکیاں داخل ہوئیں جنمیں ۱۲۰ مسلمان تھیں۔ حالانکہ اب بعوض ہر چیز مفت دیے جانے کے مدرسے کے

سرپرستوں کو تعلیم اور سامان نوشت وخواند کے لیے تین ہزار روپیہ سے زائد رقم ادا کرنی پڑی۔

لڑکیاں سات سال کی عمر میں داخل کی جاتی ہیں مگر پورا نصاب بارہ سال کا ہی اور اس عرصہ تک ان کی تعلیم کا جاری رکھنا تجربے سے دقت طلب پایا گیا۔ باہمہ تیرہ تیرہ لڑکیوں کی پانچ جماعتوں نے پوری نصابی تعلیم پائی اور افتتاح مدرسے سے آجتک قریباً آٹھ سو لڑکیاں اس مدرسے کی تعلیم سے بہرہ یاب ہو کر نکلیں۔

بانیان مدرسہ کی یہ غرض نہیں ہی کہ اپنے شاگردوں کی قومیت منقلب کردیں یا اُنھیں مرتد بنائیں۔ ان کا مقصد صرف یہی ہی کہ لڑکیوں کو معمولی ہائی اسکول کی قسم کی تعلیم دیجائے اور عورت کے متعلق اہل یورپ کے جو تخیلات نصب العین ہیں وہ اُن کے ذہن نشین کیے جائیں۔

پچھلے سال ڈیڑھ سال سے اسی قسم کی تعلیم کے اسباب خود مہیا کرنے کے لیے اہل فارس خود آمادہ پائے جاتے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس وقت صرف طہران میں پچاس سے زیادہ لڑکیوں کے مدرسے جاری ہوگئے ہیں۔ امریکن مدرسے میں کئی بڑی عمر کی لڑکیاں اُستانیاں بننے کے لیے تیار کی جارہی ہیں۔ اور بعض تو اسوقت بھی ایرانی مدرسوں میں چند گھنٹے روزانہ تعلیم دے آتی ہیں۔

تہذیب نسواں کے دارو گیر میں مجلسی ترقی کی بنیاد ہمیشہ تعلیم ہی پر رکھی جانی چاہیے۔ اور یہ تو ظاہر ہی ہے کہ ایران کی عورتیں امریکن مشنریوں کی مرہون منت تو ہو ہی چکی ہیں اور جیسے جیسے زمانہ گزرتا جائیگا ان کا امتنان بڑھتا جائیگا۔ مشنری بھی یہ دیکھ کر کہ اہل فارس تعلیمی کام وسعت کے ساتھ اپنے ہاتھ میں لے رہے ہیں یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کی سعی مشکور ہوئی۔ اس اثنا میں ہر ایک مدرسہ جو کھلتا جاتا ہی عورتوں کے مسئلے کو ترقی دیتا جاتا ہے۔ اور زیادہ عرصہ گزرنے

نہیں پائے گا کہ عورتوں کے یہ جلسے خالص تعلیمی حد سے گزر کر مجلسی اور معاشرتی صورت اختیار کرینگے۔

خاتونانِ فارس کی ہندوستانی بہنیں جو اُن سے ایک منزل آگے بڑھ گئی ہیں۔ اپنی ایرانی بہنوں کی یہ ابتدائی سعی و کوشش بے حد ہمدردی اور شغف سے دیکھتی رہیں گی۔

(ترجمہ از بمبئی گزٹ مورخہ ۱۴۔ ستمبر ۱۹۱۰ء)

عبد الحافظہ باحکاظہ

سچی رفاقت

ایک بہت ہی شاندار حویلی جھاڑوں فانوسوں اور بڑی بڑی تصویروں سے آراستہ ہے۔ اندر باہر عجب پُر لطف سماں ہے در و دیوار سے عجب خوشی برس رہی ہے۔ سارا مکان مہمانوں سے پُر ہے۔ رنگا رنگ کے لوگ چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ ایک سرسری نظر سے دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اس جگہ کی ہر ایک چیز ایک باشوکت تقریب کی منتظر ہے۔ مہمانوں کی کثرت نوکروں کے شور و غل بچوں کی چیخ پکار سے کان پھٹے پڑتے ہیں۔ طبیعت گھبرا رہی ہے۔

اُفوہ کیسا شور و غل ہو رہا ہے مراسیوں کی صدائے دولت زیادہ سے دماغ پراگندہ ہے۔ زر دادن و درد سر خریدن والا مقولہ حسب حال ہے۔ چلیے ہم صحن میں چلکر ٹھنڈی ہوا کھائیں۔ طبیعت کو فرحت دیں۔

بہار کا موسم ہے غروب آفتاب کا وقت ہے آہا کیا ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ ایک بہت بڑا وسیع کمپونڈ ہے جسکے چاروں طرف شاہ بلوط کے بڑے بڑے

درختوں نے احاطہ کر رکھا ہے۔ پھولوں سے لدے ہوئے خوشنما درخت اس طرح جھوم رہے ہیں گویا اس خوش منظر سماں کی دید سے وجد میں آکر بارگاہ الٰہی میں سربسجدہ ہونا چاہتے ہیں۔ درختوں کی شاخوں میں چھوٹی چھوٹی قندیلیں جگنوؤں کی طرح چمک رہی ہیں۔ پھولوں کی مہک سے سارا صحن معطر ہے جہاں تک نظر اٹھاؤ سبزہ زار نظر آتا ہے۔ آفتاب غروب ہو رہا ہے جسکا عکس سامنے والے حوض پر پڑ رہا ہے فوارہ چھوٹ رہا ہے جس پر سورج کی کرنیں پڑکر پانی کو رنگین بنا رہی ہیں گویا سنہرا پانی حوض میں بھرا ہوا ہے۔ سُرخ سبز مچھلیاں پانی سے سانس کے لیے مونھ نکالتی کیسی بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ حوض کے چاروں طرف گملوں کی عجب بہار ہے۔ سبز گھاس پر چھڑکاؤ جو ہوا ہے پانی کی بوندیں مخمل کے فرش پر موتی کا کام دیتی ہیں۔ سفید کنکر سے جابجا انگریزی اور اُردو اشعار خوبی کے ساتھ لکھے ہوئے ہیں۔

خوش گلو خوش آواز پرندوں نے اپنی راگنی چھیڑ دی ہے ایک شاخ گل سے دوسری شاخ پر اُڑ اُڑ کر اس طرح بیٹھتے ہیں گویا شب بھر کی جدائی کے لیے گلوں سے گلوگیر ہوتے ہیں اور اپنی زبان میں رخصتی ترانہ گاتے ہیں۔ نوبت کی رخصتی گیت کی آواز دل پر عجیب کیفیت پیدا کرتی ہے۔ فولو کی آواز غمگین سے غمگین دلوں کو اپنی جانب مسخر کر لیتی ہے۔ تنٹد کی آواز سے کیسا لطف حاصل ہوتا ہے اس وقت اس بہار میں خلل انداز ہونے والی صرف کوئل کی کوکو پپیہا کی پی پی ہے باقی ہر طرف جدہر دیکھو ہر ایک شے سے شادمانی اور تازگی برس رہی ہے۔

چلیے ہم روش پر چل کر دل بہلائیں۔ ادہو دیکھیے روش پر ایک قیمتی کوچ پر ایک نازنیں خوبصورت حور وش لڑکی بیٹھی ہے جسکے چہرہ سے نزاکت شرافت ٹپک رہی ہے۔ ظاہرا تو سب خوشی کے سامان مہیا ہیں۔ شباب کے دن اور بہار کا

موسم ہی حویلی میں بھی عجب خوشی برس رہی ہے۔ تعجب ہے کہ ایسے خوشی کے وقت میں یہ کیوں اس قدر اُداس غمگیں سب سے جدا تنہا بیٹھی ہے۔ ہو نہ ہو کوئی سبب ہوگا غور سے سنیے وہ کچھ آہستہ آہستہ کہہ رہی ہے چلیے ہم بھی چھپ کر سنیں (الٰہی کیا بات ہے جو آج میری طبیعت اس قدر اُداس ہے۔ دل نہایت پریشان ہے مطلق دل نہیں بہلتا۔ طبیعت سخت بے چین ہے۔ صبح سے دل پژمردہ ہے دو دن سے خلافِ معمول خط بھی نہ آیا خدا خیر کرے۔ کہیں دشمنوں کا مزاج تو ناساز نہ ہوگا۔ یا اللہ اب میں کس سے خیریت دریافت کروں۔ تین دن کی راہ پر میں بیٹھی ہوں۔ اے ننھے ننھے پودھو! اے شاخ گل پر بسیرا لینے والے خوشنما پرندو! اے بے فکر آزاد خوش گلو رنگین چڑیو! تم ہی مجھ دور اُفتادہ مغموم کی مدد کرو خیریت سے اطلاع دو۔ اے سنہرے آسمان! تو ہی مجھ بیقرار کو تسکین بخش۔ اے ڈوبنے والے خورشید! تو ہی مجھ پر رحم کر۔ باعث تو معلوم نہیں لیکن دل کی پریشانی لحظہ بہ لحظہ ترقی پر ہے) لیجیے اب تو صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ اپنی پریشانی کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس طرح غمگین بیٹھی ہے۔ لیکن یہ نہیں معلوم کہ دراصل یہ کیوں اس قدر اُداس ہے۔ آنکھوں پر رومال پڑا ہوا ہے۔

سب اپنی اپنی خوشی میں لگے ہوئے ہیں لیکن کوئی بیچاری غمگین کی خبر نہیں لیتے نہیں نہیں ہمارا خیال غلط ہے دیکھیے کوئی ایک سفید پوش سن رسیدہ صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ چہرہ سے شرافت ٹپک رہی ہے۔ ایلو بہت قریب آگئے ہیں دیکھنا تو سہی بہت گھبرائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں سخت بے چین ہیں۔

نووارد صاحب۔ رشیدہ رشیدہ پیاری رشیدہ اٹھو بی بی تم کیوں اس قدر اُداس ہو۔ ہائیں بچی کیا رو رہی ہو۔ رشیدہ کچھ کہو تو سہی طبیعت کیسی ہے۔ دیکھو میں دیر سے کھڑا آوازیں دے رہا ہوں۔ رشیدہ پیاری یہ کیا وحشت ہے

کیوں روتی ہو باعث تو کہو دیکھو تمہاری پریشانی سے ہم بے چین ہیں۔ وہاں رسم شادی ادا ہو رہے ہیں۔ عنقریب رخشندہ رخصت ہو جائینگی۔ کیا تم اپنی پیاری بہن سے نہ ملوگی۔

رومال سے آنکھ صاف کر رہے ہیں۔ رشیدہ ہیں کہ بے اختیار آنسو جاری ہیں ہچکی بندہ گئی ہے۔ صاحب موصوف نے چھاتی سے لگایا پیار کیا۔ گھنٹوں بعد اپنے آپے میں آکر کہتی ہیں۔

ماموں جان آپ کیوں تکلیف کر رہے ہیں آپ کتنی دیر سے کھڑے ہیں مجکو مطلق خبر نہیں معاف کیجیے۔ آج طبیعت اُداس ہی کیا خبر ہی کس لیے آپ یہاں تشریف لائے ہیں۔ فرمائیے۔

ناظرین سمجھا آپ نے، رشیدہ کون ہیں غالباً آپ حیرت میں ہونگے۔ لیجیے عرض خدمت کرتی ہوں۔

رشیدہ بانو۔ حسین ذکی الطبع سلیم الفطرت سلیقہ شعار، خوش مزاج عقیل شیریں زباں لڑکی تھی۔ علاوہ ان قدرتی خوبیوں کے زیور علم سے بھی مزین تھی جس کے باعث قریب قریب وہ اپنے کنبے بھر میں مشہور ہو چلی تھی۔ چودہ سال کی عمر سے بڑے بڑے اونچے گھرانوں سے نہایت التجا کے ساتھ پیام سلام آنے لگے۔ دوچار جگہ روپیہ پیسے کے لالچ میں رضیہ بانو کا دل بھی چاہا لیکن یہ خیر تھی کہ ہندوستان کی رسم کے مطابق اپنی لڑکی کو بے پوچھے گچھے کنوئیں میں گرانا پسند نہ کرتی تھیں۔ بلکہ جب کہیں کی بات آتی رشیدہ بانو کی سہیلیاں مرضیہ بانو۔ صوفیہ بانو کے ذریعے جن سے رشیدہ کا بہت ملاپ تھا اُسکا منشار دریافت کرواتیں۔ اور یہ بھی انہیں کے وسیلہ سے جواب دیتی۔

ایک مرتبہ حیدرآباد کے ایک معزز عہدہ دار کی نسبت آئی جو نہایت شریف

نیک بخت، مہذب، خوش چلن، با وضع، باشرع تھے۔ رشیدہ کے کل خاندان نے انہیں پسند کیا اور رشیدہ نے بھی ان کی ذاتی خوبیوں کو دولت پر ترجیح دے کر منظور کیا۔ اور شرع شریف کے مطابق یعنی طرفین کی رضامندی کے ساتھ بیاہ ہوا۔ رشیدہ اپنی سسرال سدھاریں۔ میاں بی بی باہم بہت الفت محبت سے رہا کرتے۔ گل وبلبل۔ شمع و پروانہ اگر انہیں کہیں تو بجا ہے۔

بہن کی تقریب میں رشیدہ ایک ماہ کے لیے اپنے میکے آئیں۔ جہاں کہ آپ صاحبوں نے ابھی انہیں ماموں سے بات کرتے ہوئے چھوڑا ہے۔ وہ جو اس طرح پریشان ہیں اسکا خاص سبب یہ ہے کہ

(باقی آیندہ)

راقمہ
ر۔ بیگم

سوالات دلچسپ

مس رابعہ بیگم صاحبہ نے چند سوالات دلچسپ تحریر فرمائے ہیں جو ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔ ناظرات خاتون مہربانی سے انکے جوابات تحریر فرمادیں۔

اڈیٹر

(۱) مرد وزن کو کونسی چیز نے خوشی دی۔

(۲) غریب۔ بے کس۔ بے چارہ کو کہاں تسلی ملے گی۔

(۳) کونسے سوال کو سوائے قبول کے جواب بن نہیں سکتا۔

(۴) ارنی سے ارکاٹ کو کونسی چیز بغیر حرکت کے چلی جاتی ہے۔

(۵) وہ کیا چیز ہی جسکو نہ دیکھ سکتے ہیں نہ سنتے ہیں نہ چھوتے ہیں نہ پاتے ہیں لیکن اسکا نام ہے

(۶) وہ کیا چیز ہے جسکے آنے کی نہایت آرزو ہی۔ جب آئیگی ہم واقف نہیں ہو سکتے۔

(۷) وہ کیا چیز ہی جسکو ہر شخص لگانا چاہتا ہی جب لگی فوراً دور کر دیتے ہیں۔

(۸) وہ کیا چیز ہی جو سب کو ملی لیکن ملنے کا باعث معلوم نہیں لیکن جب وہ چلی گئی اُسکا جانا ہم کو معلوم نہیں ہوتا۔

(۹) چیونٹی کے مونھ سے کونسی چیز چھوٹی ہے۔

(۱۰) وہ کونسی تمھاری چیز ہی جو تم سے زیادہ دوسرے استعمال کرتے ہیں۔

(۱۱) وہ کیا چیز ہی جو سب ڈھونڈھتے ہیں لیکن اسکو کوئی پانا نہیں چاہتا۔

(۱۲) ایک جگہ ہی کہ وہاں کوئی رغبت سے جانا نہیں چاہتا۔ اور اگر گیا شرمندہ ہو کر آنا نہیں چاہتا۔

(۱۳) وہ کونسی چیز ہی جو شیر و حیوان کو نہایت عزیز ہی لیکن جب وہ آوے تو سب آشوب کا ہوتا ہے۔

(۱۴) وہ کونسا ملک ہی جسکے قلب کرنے سے خرزر ہوتا ہے۔

(۱۵) انسان کی ہستی میں بجز روح کے غیر فانی ذخیرہ کونسا ہی۔

(۱۶) دنیا میں سب سے زیادہ کشش کس چیز میں ہے۔

(۱۷) وہ کونسا چو حرفی لفظ ہی جس میں سے ایک حرف نکال لو تو بھی چار باقی رہیں اگر دو نکال تو بھی چار باقی رہیں اگر تین چار حرف نکال لو تب بھی چار باقی رہیں گے۔

(۱۸) وہ کونسا دس حرفی لفظ ہی جسکے ۱۔ ۲۔ ۳۔ سے مصنع سلطنت ۳۔ ۷ سے مصنع دوت ۷۔ ۸۔ ۵ سے ایک ملک کا نام ۷۔ ۱۰۔ ۱ سے مصنع سانپ۔ ۵۔ ۳ سے ہنڈونکے ایک پاک ندی کا نام۔ ۸۔ ۹ سے مصنع قطار ۱۰۔ ۷ سے ایک پھل کا نام ۱۰۔ ۵۔ ۶۔ ۷ سے مصنع چین ۲۔ ۷۔ ۱۰ سے مصنع کام ۳۔ ۴۔ ۷ سے مصنع پیالہ۔ اور بحیثیت مجموعی ایک

شخص کا نام معہ تخلص ۔

معما

اے حکیم از تو پُرسم پُر ہنر اندرون صحرا بدیدم یک عجائب جانور

پائے ناقہ سُم آہو مار دُم کژدم شکم سینۂ شیر و پشت فیل و خوک گردن اسپ سر

دیگر

زمرد کی ڈبیا جواہر کا ڈھکنا سمجھ بوجھ کے کہنا بیہودہ نہ بکنا

راقمہ خاکسار
مس رابعہ بیگم بنت محمد علی صاحب

صدمہ

بہن سلمہ ۔ تمھارا خط آیا۔ تم لکھتی ہو کہ صدمہ کا کیا مفہوم ہی اور کتنی قسم کا صدمہ ہوتا ہے مجھے صدمے کی تھیوری بیان کرنا اسوقت مدنظر نہیں۔ لیکن مختصر طور پر اتنا سمجھ لو کہ صدمہ اُس تکلیف کا نام ہی جو کبھی بُری خبر کے سُننے یا دیکھنے سے پیدا ہو۔ صدمے کی قسمین بیان کرنا بھی ویسا ہی دُشوار ہی جیسے صدمے کی فلاسفی ۔ لیکن ذرا غور سے سُنو۔

عام خیال یہ ہی کہ اولاد کے مرنیکا غم سب سے زیادہ دلخراش ہوتا ہی ذرا خیال رکھنا اور اس صدمے سے جسکا نمبر میں سب سے اول رکھوں گی

۔ انسان مقدمہ ہارتا ہی اُس سے بھی صدمہ ہوتا ہی۔ اول تو اس امر کا صدمہ کہ فریق ثانی مجھپر حاوی ہوگیا۔ دوسرے اپنے نقصان کا صدمہ تیسرے اس امر کا صدمہ کہ جن لوگوں کے سامنے میں نے ہمہ دانی کے دعوے کیے تھے۔ اور باوجود انکے منع کرنے کے اس مقدمہ کو اپنے ذمہ لیا تھا وہ مجھے حقیر سمجھیں گے۔ اسی کو کہتے ہیں

یکے نقصان مایہ و دیگر شماتت ہمسایہ

ملازمت سے معزول ہونے کا بھی صدمہ ہوتا ہے۔ اس میں بھی چند باتیں پیش نظر ہوتی ہیں۔ اپنے وابستگان کا خیال۔ آیندہ آمدنی سے مایوسی۔ دوسری ملازمت نہ ہونے کا اندیشہ۔ لیکن یہ بھی ایسا صدمہ ہے کہ جسکا ازالہ جلد ہوجاتا ہے۔

بہن۔ تم نے سُنا ہوگا وفی السماء رزقکم وماتوعدون اسکا یہ مطلب ہے کہ جتنا تمھارے حصہ کا رزق ہے وہ آسمان میں ہے۔ یعنی وہ کسی دوسرے کے قبضے میں نہیں ہے۔ ملازمت کی معزولی سے یہ خیال کرلینا کہ دیکھیے آیندہ کیا ہوتا ہے۔ فضول خیال ہے۔

ماں باپ کا مرنا بھی ایک سخت صدمہ ہے۔ یہ صدمہ مذکورہ صدمات سے اسلیے سخت ہوتا ہے کہ یہ دونوں افراد ضائع ہوکر پھر نہیں مل سکتے۔ لیکن یہ صدمہ بھی رفتہ رفتہ کم ہوتا جاتا ہے۔ خدا کا ارشاد ہے کل نفسٍ اجل ہر ذی حیات کو ایک مرتبہ موت آنی ہے کسی نہ کسی وقت خیال آتا ہے لیکن وہ ایسا خیال نہیں کہ جس سے زندگی تلخ ہوجائے۔ تم خود دیکھتی ہوگی کہ ہزاروں افراد بے ماں باپ والے خوش گزران کررہے ہیں۔

چوری ہوجانا بھی کم صدمہ نہیں۔ زندگی میں اگر انسان کسی شے سے عمدہ زندگی بسر کرسکتا ہے تو وہ روپیہ ہے۔

اے زر تو خدا نئی ولیکن بخدا   ستار عیوب قاضی الحاجاتی

شعر کے دوسرے مصرعہ کا یہ منشا ہے کہ روپیہ تمام عیوب کو چھپانے والا اور تمام ضروریات کو پورا کرنے والا ہے۔ کیوں سچ ہے یا نہیں۔ لیکن اگر کسی وجہ سے روپیہ جاتا رہے تو کیا ہوگا۔ کچھ دنوں تک خیال رہے گا۔ لیکن رفتہ رفتہ صبر آجائے گا۔ کیونکہ عقل ہدایت کرے گی کہ جس خدا نے ہمیں دیا تھا۔ یا جس زور عقل سے ہم نے اس روپیہ کو پیدا کیا تھا وہ اب بھی ہمارے پاس موجود ہے۔ پھر فراہم ہوجائے گا۔ یا یہ کہ خدا کا منشا کچھ دنوں ہم کو غربت میں رکھنے کا ہے جس کی تعمیل ضروری ہے۔

بہن سلمہ۔ یہ مجمل سابیان صدموں کا ہے اسپر دوسرے صدمات کو قیاس کرلو یا ہر صدمہ کی تقسیم کردو اور پھر ایک بڑا ذخیرہ صدموں کا بنالو۔

میری عزیز بہن! اب ذرا اُس صدمہ کو سنو۔ جسکو میں نے اول نمبر میں بتایا ہے وہ خلاف شادی ہونے کا صدمہ ہی جس سے دونوں فریق کو یکساں صدمہ ہوتا ہے۔ سلمہ! وہ زندگی جو بیاہی لڑکی کی ہوتی ہے اُس زندگی سے بالکل مختلف ہی جو کنوارپن میں اُسے پیش آتی ہی۔ اُسے ایک ایک قدم سنبھال سنبھال کر رکھنا پڑتا ہی وہ ایک جاندار چڑیا کی مثل ہوتی ہے جسکے ہر فعل، حرکت، لفظ کو دیکھنے پرکھنے کے لیے ہزاروں آنکھیں ہوتی ہیں۔

وہ ایک بے تکلفانہ گھر سے دوسرے تکلف کے گھر میں جاتی ہی اسے اس گھر کو اپنا بنانا ہی۔ سوچو غیر آدمی کے ساتھ جبتک خوش خلقی کا برتاؤ نہ ہوگا وہ دوسرے گھر پر کسطرح قبضہ کریگا۔ حاکم محکوم کی مثال ناقص مثال خادمہ اور آقا کی مثال ایک بیہودہ مثال ہے الرجال قوامون علی النساء کا یہ منشا نہیں ہی کہ تم عورت پر اس طرح حکمرانی کرو جس طرح ایک حاکم اپنے محکوم پر کرتا ہی۔

اچھا مانا حاکم محکوم کا تعلق سہی لیکن سوچو تو یہ کونسا قانون ہی کہ محکوم کو محکوم سمجھا جائے اور اسپر عتاب کے ساتھ حکومت کی جائے۔ اصل میں عورت مرد کی رفیقہ یا شریک زندگی ہی۔ گویا زندگی اُسی وقت خوبی سے بسر ہوسکتی ہی جب اپنی عورت کو اپنی جیسی راحت دی جائے۔

جس طور سے بعض وقت تم اپنے اوپر حکومت کرتے ہو۔ عورت پر بھی حکومت کرو لیکن اگر اپنے کو دانتوں سے کاٹتے ہو لکڑیوں سے مارتے ہو گالیاں دیتے ہو تو تم سے بچنا چاہیے کیونکہ تم پاگل ہو۔

الغرض تمام صدموں سے زیادہ نارضامندی کی شادی ہی۔ اب تم اس صدمہ سے

اس صدمہ کو تطبیق دو۔ جسکا ذکر میں نے سب سے پہلے کیا ہو۔ اولاد مرتی ہو دوسری اولاد کے مرنے پر اسکا مرنا انسان بھول جاتا ہو۔ اور ایک ہی صدمہ کیسا تمام صدمے زندگی سے منفک ہو جاتے ہیں۔ لیکن خلاف مرضی شادی کا صدمہ علیحدہ تو علیحدہ کم بھی نہیں ہوتا جتنے دن زیادہ اس حالت میں گزرتے ہیں اُسیقدر تکلیف اور صدمات کی زیادتی ہوتی ہے۔ سمجھیں۔ امید ہو کہ میرا یہ مختصر سا خط تمہارے سوال کے جواب کے لیے کافی ہو گا۔

رقیمہ تمہاری
عذرا

بقلم مقبول احمد نظامی

کالی گھٹا

کیا کالی گھٹا جھوم کے ہے آج تو آئی
گھر گھر میں چڑھی تیری خوشی میں ہو کڑھائی
دل دل میں پڑی جھولوں کی گیتوں کی سمائی
ملہار کا وقت آیا جو منہی کی وہ من آئی
گھنگھور گھٹا صدقہ ترے۔ تیرے میں واری
گرمی کی ہو تو نے ہی مری پیاس بجھائی
یہ دل میں اُمنگ اُٹھی کہ سُدھ رکھی نہ گھر کی
جھولوں پہ کی سکھیوں نے ہو دل پل کے چڑھائی
ہو بینگ بڑھاتی کوئی ہو کر نڈر ایسی
کہتی ہو کوئی دل میں ہو کیا تیرے سمائی
جو خون کی ہلکی ہیں دھڑکتا ہو دل اُن کا
سُن سُن کے کڑک کہتی ہیں کیا بجلی گرائی
چھم چھم تو برس چاہے برس بر تو نت نت
ایسا نہ برسیو کہیں پڑ جائے دُہائی
میں تیرے گرجنے سے لرزتی ہوں یہاں تک
لے لیتی ہوں جھٹ مونہہ پہ دُلائی کہ رضائی
ٹپکے کا ہو ڈر ایسا جیسے شیروں نے مارا
ہم جیسوں کی گنتی بھی وہاں تک تو نہ آئی
دیواروں کے گرنے سے لرزتا ہو مرا جی
بنیادوں کے ڈھہنے نے مری جان سُکھائی
اس سے ہی تو ہوتا ہے مکانوں کا صفایا
ہو جاتی ہو دم میں نگھری ساری خدائی

سب کچھ ہی مگر فائدے ہیں تجھ سے ہی اَت گت — تو گرمی کی ہو جاتی ہے دم بھر میں ٹھنڈائی
تیری ہی بدولت ہے یہ دریاؤں کا جگرا — جس طرح یہ کرتے ہیں سمندر پہ چڑھائی
رکھ سکتے ہیں ہم آس تجھی سے تو سمے کی — تو کال کی کر سکتی ہے دم بھر میں صفائی
کھیتوں میں جو رونق ہے تو ہے تیرے ہی دم کی — ہے ذات سے سب تیری عیاں شانِ خدائی
راتوں کو چمکنا یہ پپیہے کا ہے تجھ سے — اور دن کو تو موروں نے بھی اُودھم ہے مچائی
سید نے جو دیکھی ہے گھٹاؤں کی یہ حالت — تو جھولے پہ سب لڑکیوں نے ملکے ہے گائی

سید احمد دہلوی
مولف فرہنگ آصفیہ

کیفیت جلسہ

۲۴۔ جون ۱۹۱۱ء بروز جمعہ مجھے سکندرہ راؤ ایک جلسہ میں شریک ہونیکا اتفاق ہوا یہ جلسہ بتقریب آمین ختم قرآن شریف میری شاگرد رشید محمودہ بیگم دختر نیک اختر سید امجد علی شاہ صاحب تحصیلدار سکندرہ منعقد ہوا۔ مجھے اور دیگر استانیوں کو پہلے سے اطلاع دی گئی تھی اسلیے ہم سب جمعہ کے روز چھ بجے سے تیار ہو رہے تھے۔

سکندرہ علی گڈھ سے بارہ کوس ہے۔ اور عزیزی محمودہ بیگم کی والدہ ماجدہ نے ہمارے لیے گاڑی وغیرہ کا انتظام کر دیا تھا۔ علیگڈھ میں آکر میرے لیے یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے اتنا فاصلہ گھوڑا گاڑی میں طے کیا۔ گاڑی ساڑھے چھ بجے ہمارے مکان پر آئی اور میں معہ ہر دو استانیاں اور دو ماما ایک چپراسی اور ایک اسکول کی لڑکی کے سوار ہوئی۔ راستہ بڑے آرام سے گزرا۔ دن بھی ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ اسلیے گرمی وغیرہ کی کوئی تکلیف نہیں ہوئی اور ہم سب گیارہ بجے عزیزہ محمودہ بیگم کے مکان پر پہنچے۔

چونکہ ڈیوڑھی اور زنانخانے کے درمیان ایک کھلا مردانہ صحن تھا اسلیے پردہ کا

دورویہ انتظام کیا گیا تھا اور اس طرح ہم بہ آسانی زنانے مکان تک پہنچ گئے۔ دروازہ پر عزیزہ محمودہ بیگم اور اس کی والدہ صاحبہ کھڑی تھیں وہ ہم سے بڑی گرمجوشی سے ملیں۔ اور اسکے بعد ہم کو اندر لے گئیں۔

پہلے ہم ایک دالان سے گزرے جس میں دری کا فرش بچھا تھا۔ پھر اور دالان آیا جو بہت عمدہ طور سے سجایا گیا تھا۔ پُر تکلف فرش بچھا تھا۔ گاؤ تکیے لگے تھے وہاں محمودہ بیگم کی دو خالہ صاحبان معہ اپنی دو صاحبزادیوں کے تشریف رکھتی تھیں وہ بھی نہایت خوش اخلاقی سے پیش آئیں۔ اور ہم کو وہیں بیٹھنے کو جگہ دی گئی۔ جب ایک دوسری کی خیر و عافیت کا استفسار ہو چکا تو تھوڑی دیر کے بعد ہم سب کو ٹھنڈا شربت پلایا گیا اور بعدہ پان الائچی کی رسم ادا ہوئی۔

گھنٹہ بھر کے بعد کھانا ایک بڑے دستر خوان پر چُنا گیا۔ اور مہمان عورتیں جو تشریف رکھتی تھیں سب نے مل کر کھایا۔ پھر کچھ دیر کے لیے سب نے آرام کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد شہر کی اور بیبیاں آنی شروع ہوئیں۔ محمودہ بیگم اور اُس کی والدہ صاحبہ ہر ایک کا نہایت تپاک سے خیر مقدم ادا کر کے بٹھاتی تھیں۔

جب سب بیبیاں آچکیں تو اتنے میں نماز کا وقت ہو گیا۔ ہم سب نے نماز پڑھی۔ اور پھر محمودہ بیگم سے قرآن شریف سنانے کو کہا گیا۔ اس نے نہایت خوش الحانی سے آخر کی چند سورتیں پڑہیں۔ اسکے بعد آمین کی مبارک رسم ادا کی گئی۔ جسکے ختم ہوتے ہی سب نے محمودہ بیگم کی والدہ کو مبارک باد دی۔ اور ہم سب نے مل کر بآواز خدا کی شان میں حمد پڑہی۔

بعدہ محمودہ بیگم کی والدہ سب بہنوں کو بالاخانہ پر لے گئیں۔ وہاں ایک کمرہ کرسیوں اور موڑہوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ بیچ میں ایک میز لگی ہوئی تھی۔ محمودہ بیگم کی والدہ نے مجھے وہیں بٹھایا اور اُنھوں نے اور اُن کی ہمشیرہ صاحبہ نے مجھے صدر انجمن بننے کی

عزت بخشی۔ اسکے بعد محمودہ بیگم نے علم کے فوائد اور جہالت کے نقصانات پر ایک تقریر معہ اپنی تعلیم کی سرگزشت کے بیان کی۔ بعدہ اس کی خالہ صاحبہ نے علم و جہل پر ایک مضمون پڑھا جس سے حاضرات جلسہ بہت متاثر ہوئیں۔ پھر خاکسار نے بھی ہندوستان میں اسلامی مستورات کی تعلیمی حالت بیان کی۔

اسکے بعد جلسہ برخاست ہوا۔ محمودہ بیگم کی والدہ صاحبہ نے مٹھائی اور ایک جوڑا اور کچھ روپیہ ایک کشتی میں لگا کر میرے سامنے رکھے۔ جو شکریہ ادا کرنے کے بعد میں نے لیے۔ اسکے بعد محمودہ بیگم کی والدہ ہم سب کو پھر نیچے لائیں۔ یہاں ایک میز پر گلدستوں وغیرہ سے خوب سجا کر ناشتہ لگایا گیا تھا جو ہم سب نے مل کر کھایا۔ تھوڑی دیر کے بعد شہر کی مہمان بیبیاں اپنے گھروں کو رخصت ہونی شروع ہوئیں اور یکے بعد دیگرے روانہ ہوگئیں۔

محمودہ بیگم پھر ہم کو بالاخانے پر لے گئیں جہاں اُس وقت کی ہوا خوب فرحت بخش تھی۔ چونکہ عصر کی نماز کا وقت آگیا تھا اسلیے وہیں پر ہم سب نے نماز عصر ادا کی۔

محمودہ بیگم کی والدہ اور خالہ صاحبہ نے ہم کو رات رہنے پر مجبور کیا اور چونکہ شام بھی ہوگئی تھی۔ اسلیے ہم رات کو وہیں ٹھہرے۔ شب بڑے آرام سے گزاری۔ اور نماز صبح سے فارغ ہوکر ہم پانچ بجے پھر اُسی گاڑی میں سوار ہوکر قریب نو بجے علیگڈھ پہنچے اور مدرسہ کا کام شروع کر دیا۔

خاکسار۔ ہیڈ معلمہ
مدرسۂ نسواں علیگڈھ

اڈیٹوریل

جناب ڈاکٹر ماشاءاللہ خاں صاحب ایم بی اسسٹنٹ سرجن علی گڈھ جن کی

صاحبزادی ہمارے مدرسہ میں تعلیم پاتی ہیں۔ کسی ایسی لڑکی کو جسنے مڈل پاس کیا ہو۔ دو سال کے لیے بحساب دس روپیہ ماہوار وظیفہ دینے کا وعدہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی مڈل پاس لڑکی کسی لڑکیوں کے ٹریننگ اسکول میں تعلیم پائے تو وہ اسکو دو سال کیلیے وظیفہ دینگے۔

مدرسۂ نسواں علی گڈہ سے تو مڈل پاس کرنیکے لیے ابھی بہت عرصہ درکار ہی مگر اگر کسی اور مدرسے کی لڑکی مڈل پاس ہو اور وہ ٹرینگ اسکول میں جاکر تعلیم پانا چاہے اور یہ وعدہ کرے کہ بعد حاصل کرنے ٹریننگ سرٹیفکٹ وہ مدرسۂ نسواں علی گڈہ میں کم از کم تین سال تک ملازمت کرے گی تو ہم یہ وظیفہ اسکے لیے بڑی خوشی سے تجویز کرینگے۔

ٹریننگ اسکول ایک تو لاہور میں ہی اور ایک لکھنؤ میں ہم اُن دونوں مقامات کے لیے وظیفہ دلا دینگے۔ درخواستیں بنام سکرٹری مدرسۂ نسواں علی گڈہ آنی چاہییں اور درخواستوں کے ساتھ سرٹیفکٹ بھی ہونے چاہییں۔

ہم جب کسی ہندوستانی بیمار کو دیکھتے ہیں تو بیساختہ دل سے یہ دعا نکلتی ہی کہ خدا اس غریب کو تیمار داروں کی حماقتوں سے بچائے رکھے ورنہ اس کی خیر نہیں۔ پُرانے ویدک کا طریقۂ علاج تو اس درجہ سخت ہی کہ بیمار زیادہ تر پرہیز اور کمی ہوا اور شدت گرمی سے دنیا سے رخصت کیے جاتے ہیں۔

چند واقعات میرے تجربے میں خود آئے ہیں جنکو دیکھکر تعجب معلوم ہوا کہ ہزارہا برس کے تجربہ کے بعد بھی ویدک والے ہنوز لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں۔ اور بیماروں کو اکثر اپنے ایسے طریقوں سے جو کہ خلاف فطرت وطبیعت انسانی کے ہیں مار ڈالتے ہیں۔

ایک بہت بڑے ساہوکار کو میعادی بخار آیا گرمیوں کا موسم تھا ایک نہایت تنگ و

تاریک مکان میں اس مظلوم کو بند کر دیا گیا اور کمرے میں خوب آگ دہکا دی گئی ہوا کے چاروں
طرف کے سوراخ بند کر دیے گئے۔ پانی بھی پینے کو اسکو نیم گرم دیا جاتا تھا۔ اسکے کمرہ میں
اگر کوئی دوسرا آدمی جاتا تھا۔ اُس سے پانچ منٹ بھی وہاں نہ ٹھہرا جاتا تھا۔ جیسے مچھلی گرم
ریت پر تڑپتی ہو ایسے ہی وہ تڑپتا تھا۔ وید صاحب دروازہ پر بیٹھے ہوئے یہ کہتے تھے
کہ پسینہ بہت آرہے ہیں اب بخار اُترا اب اُترا۔ اور اُسپر طرہ یہ کہ دو ہفتہ کے قریب
وہ زندہ رہا اسکو فاقے پر فاقے دیے گئے جسکو وہ لوگ اپنے محاورہ میں لنگن کہتے
ہیں۔ دو ہفتہ کے بعد وہ غریب تو مرا مگر کس مصیبت میں اور وید صاحب نے کہا کہ فلاں وقت
فلاں کھڑکی کے سوراخ سے ہوا آگئی اسلیے وہ مرگیا۔ علاج کا کیا قصور ہے۔ اسی طور
پر ایک اور نہایت خوبصورت نوجوان مارواڑی کو انہیں وید صاحب نے مار ڈالا۔

ویدوں کا تو کچھ کہنا ہی نہیں مگر عام طور پر ہندوستانی طریقۂ علاج و تیمارداری میں
ایسی ایسی غلطیاں کی جاتی ہیں کہ جس سے مریض کی کل قوتیں سلب کر دیجاتی ہیں۔ اور
اس کی طبیعت بیماری کا مقابلہ نہیں کر سکتی اور اگر مرض سے نہ بھی مرنے والا ہو تو طریقہ علاج
و تیمارداری سے ضرور مرجاتا ہے۔ اکثر بیماروں کو نہایت تنگ مکان میں رکھتے ہیں جہاں کی
زہریلی ہوا وہ ہر وقت کھاتا ہے۔ مریض کو اپنے عزیز اور دوست کبھی چین نہیں لینے دیتے
ہر وقت اُن کو گھیرے رہتے ہیں جس سے اسکو علاوہ بیماری کے پریشانی ہوتی ہے اور
اُسکے قویٰ بالکل تھک جاتے ہیں۔

ان سب باتوں کا لحاظ کر کے ہمارا ایک عرصہ سے یہ خیال تھا کہ تیمارداری کے
اوپر کوئی رسالہ لکھوائیں یا کسی انگریزی کتاب سے ترجمہ کرا کے اُردو میں کوئی رسالہ
شائع کریں۔

استنے میں ہمارے مخدوم دوست محمد سعید صاحب صوفی نے جو آجکل بمقام سمالی
لینڈ افریقہ میں ہیں۔ انگریزی کی ایک بہت اعلیٰ درجہ کی کتاب سے نہایت سلیس اُردو

میں ترجمہ کرکے ہمارے پاس بھیجا ہی اور ہم کو اجازت دی ہو کہ ہم اسکو شائع کریں اور جو کچھ اسکا منافع ہو اُسکو خاتون کی ترقی میں صرف کریں۔ ہم اپنے دوست کے تہ دل سے ممنون ہیں اور ہم ان کی قابلیت کی داد دیتے ہیں کہ اُنھوں نے نہایت قابلیت سے ترجمہ کیا ہے۔ جسکو ہر شخص آسانی سے پڑھ اور سمجھ سکتا ہی

یہ کتاب ان دنوں چھپ رہی ہی اسپر ہم خود ایک مقدمہ لکھیں گے جس میں یورپین طریقہ تیمارداری اور ہندوستانی میں جو جو ترمیمیں ضروری ہیں وہ بتائیں گے۔ اور اور ضروری امور جو خصوصیت کے ساتھ ہندوستانی تیمارداروں کو جاننا ضروری ہے اُن کو بھی صاف طور پر لکھیں گے۔

یہ کتاب کم وبیش دوسو سوا دوسو صفحے کی ہوگی۔ عمدہ کاغذ کے اوپر نہایت عمدہ لکھائی چھپائی ہوگی تاکہ ہر شخص جلد بندھوا کر بہت عرصہ تک اپنے پاس رکھ سکے۔ اس کی قیمت ایک روپیہ چار آنہ علاوہ محصولڈاک کے ہوگی۔ اخیر سال تک شائع ہو جائیگی اسوقت اس کی صرف ایک ہزار کاپیاں چھپوائی گئی ہیں۔ جن صاحبوں کو اس کے پڑھنے کی خواہش ہو وہ فوراً درخواستیں بنام اڈیٹر رسالہ خاتون بھیجیں۔

کتاب مذکورہ بالا کے متعلق ایک بات ذکر کرنے سے رہ گئی کہ اس کتاب میں بچوں اور مستورات کی تیمارداری کے متعلق بھی بیان ہے اور مستورات کو ایسی کتاب کا ہر وقت پڑھنا اور اپنے پاس رکھنا نہایت ضروری ہے۔

ناول اور ڈراما

ہندوستان میں عام لوگوں کے نزدیک ناول اور ڈراما مخرب اخلاق ہیں۔ مگر ہمکو افسوس سے کہنا پڑتا ہی کہ جن لوگوں کے اس قسم کے خیالات ہیں ان کو اُسی قسم کے

ناول اور ڈراما پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے جس سے اخلاق پر واقعی بُرا اثر پڑتا ہے۔ اُردو لٹریچر ابھی تک شیر خوارگی کی ابتدائی حالت میں ہے اور بالخصوص ناول اور ڈرامے کا صیغہ تو ایک طرف سے خالی نظر آتا ہے۔ کچھ چند چھوٹے چھوٹے ناول لوگوں نے لکھے بھی ہیں اور بعض پورے قسم کے ناول دوسری زبانوں سے اُردو میں ترجمہ بھی ہوئے ہیں۔ مگر جن لوگوں نے اعلیٰ درجہ کے ناول ڈرامے پڑھے ہیں وہ غالباً اُن ناولوں یا ڈراموں کو پڑھنا کبھی پسند نہ کرینگے۔ جو آج کل اُردو لٹریچر میں آ گئے ہیں۔

ان ناولوں اور ڈراموں کی وجہ سے ہماری اُردو داں پبلک پر ایک بہت خراب اثر پڑ رہا ہے کہ وہ لوگ جو ثقہ اور متین ہیں وہ لٹریچر کی ایک بہت بڑی اور اہم شاخ سے متنفر ہوئے جاتے ہیں۔ اور دوسری طرف پبلک کا جو غیر سنجیدہ حصہ ہے وہ نہایت ادنیٰ قسم کے لٹریچر پر شیدا ہو رہے ہیں۔

اس ضرورت کو ہم نے ایک عرصہ سے محسوس کیا ہے کہ اُردو لٹریچر میں سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ہر صنف کی اعلیٰ درجہ کی کتابیں تصنیف کیجائیں یا ترجمہ کی جائیں۔ لیکن ایک دوسری وقت یہ ہے کہ ابھی تک اُردو داں پبلک کا لٹریری مذاق بہت اعلیٰ پیمانہ پر نہیں پہنچا۔ اور اسی لیے اعلیٰ درجہ کے ناولوں اور ڈراموں کی شروع شروع میں کبھی قدر نہ ہوگی۔

مثال کے طور پر ہم بتانا چاہتے ہیں کہ کنگ لیر جسکا ترجمہ خاتون میں ہو رہا ہے وہ شیکسپیر کے اعلیٰ ڈراموں میں سے ہے۔ اور اہل مذاق ایک مرتبہ شیکسپیر کا ڈراما پڑھنے کے بعد پھر اُس شاخ کی کسی لٹریری کتاب کو وہ قدر و منزلت کا درجہ نہیں دیتے جو شیکسپیر کو دیتے ہیں۔

شیکسپیر دنیا میں اس قدر مقبول عام ہے کہ کُل دنیا کی مہذب زبانوں میں اُسکے

ایک ایک ڈرامے کے متعدد ترجمے ہو چکے ہیں اور اُس کی ایک ایک سطر پر کئی کئی قسم کی شرحیں موجود ہیں۔ گویا کہ اس وقت لٹریچر کی اس خاص شاخ میں شیکسپیر سب کا سرتاج سمجھا جاتا ہی۔

مگر ناظرین خاتون میں سے ایک صاحب نے ہم کو لکھا ہی کہ کنگ لیر کے ترجمہ کی وجہ سے خاتون پھیکا ہو گیا ہے اور پڑھنے والوں کو کچھ لطف نہیں آتا۔ ہمیں ان اپنے دوست کے مذاق پر تعجب ہوا کہ انھوں نے شیکسپیر کے ڈرامے کے متعلق ایسا عجیب و غریب فتویٰ صادر فرمایا۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی خوشی ہوئی کہ بعض دوستوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ شیکسپیر میں سے خاتون میں کنگ لیر کے علاوہ اور ڈرامے بھی ترجمہ کر کے چھاپے جاویں اور اُن کو الگ کتابوں کی شکل میں بھی چھاپا جاوے۔

ان خیالات کا مقابلہ کرنے سے ہمیں یہ نتیجہ نکالنا پڑتا ہی کہ جن ہمارے دوست کو کنگ لیر لطف سے خالی معلوم ہوتا ہی اُن کو چاہیے کہ اگر وہ انگریزی داں ہیں تو کسی کی مدد سے شیکسپیر کے کچھ ڈرامے پڑھ لیں اور اگر اُردو داں ہیں تو انتظار کریں جبتک کنگ لیر ختم ہو۔ اور پھر شروع سے لیکر اخیر تک ایک مرتبہ کل ڈرامے کو پڑھ جاویں اور ہم بتاویں کہ یہ کیا چیز ہے۔

اب کم و بیش چھ سال کا عرصہ ہوا ہی جب سے ہم نے علی گڈھ میں تعلیم نسواں کے متعلق کوشش شروع کی تھی۔ اس کوشش میں جو کچھ کامیابی ہوئی اُس سے ناظرین واقف ہیں اور ہمیں امید ہی کہ جو کام شروع ہو گیا ہی قوم اُسکے ترقی دینے میں ہماری مدد کرے گی۔ مگر غور کرنے سے اور عام خیالات کو دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہی کہ گو ملک میں تعلیم نسواں کا چرچا کچھ پھیل رہا ہی اور لڑکیوں کو تعلیم دلانے کی طرف بھی لوگ متوجہ ہو رہے ہیں مگر تعلیم نسواں کی اس قسم کی ضرورت ابتک لوگوں نے بہت کم محسوس کی ہے جیسی کہ

[illegible] عورت کی تعلیم [illegible] ہو رہی ہے [illegible] اسوقت [illegible]

[illegible] مرد و عورت کی تعلیم [illegible] یکساں کی جاوے [illegible] ہم چاہتے ہیں کہ اس بارے میں [illegible] خواتین کی رائے حاصل کریں کہ آیا مرد اور عورت کی تعلیم کی ضرورت یکساں ہے یا اس میں کچھ تفاوت ہے۔ ہمارا ارادہ یہ ہے کہ ناظرین و ناظرات خاتون اسکے متعلق مضامین لکھیں اور ان مضامین میں سے جو مضمون سب سے بہتر ہوگا اسکے لکھنے والے کو ہم ایک تمغہ دینے کا [illegible]۔ ایک تمغہ ناظرین خاتون میں سے سب سے بہتر مضمون لکھنے والے کے لیے ہوگا دوسرا ناظرات خاتون میں سے سب سے بہتر مضمون لکھنے والی کے لیے ہوگا۔

۲۔ نومبر تک یہ مضامین ہمارے پاس آنا چاہییں۔ علیگڈھ میں جو ججنگ کمیٹی مقرر [illegible] کی ہے وہ ان مضامین کو پڑھنے کے بعد یہ تجویز کریگی کہ مردوں میں سے سب سے بہتر کس کا مضمون ہے اور بیگمات میں سے سب سے بہتر کس کا مضمون ہے۔ پھر کانفرنس کے موقع پر اس تجویز کا اعلان کیا جاویگا اور وہیں پر انعام دیا جائیگا۔ مضمون میں مفصلہ ذیل باتوں کا لحاظ رکھنا ہوگا۔

مضمون

۱۔ عورت و مرد کے لیے تعلیم کی ایک ہی ضرورت ہے یا اُس میں کچھ تفاوت؟

۲۔ مضمون فل اسکیپ کے ۱۰ صفحوں سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔

۳۔ مضمون میں محض خیالات نہیں ہونے چاہییں بلکہ دلائل ہونے چاہییں۔ اور اگر کسی مصنفین کے اقوال سے ہر چیز کی یا کسی چیز کی تائید ہو تو وہ اقوال بھی دینے چاہییں

۴۔ تاریخی واقعات سے جہانتک اس مسئلہ پر روشنی پڑ سکے۔ روشنی ڈالنی چاہیے

۵۔ اگر مرد اور عورت کی تعلیم میں کچھ فرق تجویز کیا جائے تو اسکی وجہ بتانی چاہیے۔

لیکن یہ کل مضامین خواہ اُن پر انعام تجویز ہو یا نہو خاتون میں وقتاً فوقتاً شائع ہونگے تاکہ پبلک کو سب مضامین لکھنے والوں کے خیالات دیکھنے کے بعد صحیح راے قائم کرنے کا موقع ملے۔ ایک بات خصوصیت کے ساتھ مضامین میں آنی چاہیے کہ آیا عورتوں کی دماغی حالت مرد کی دماغی حالت سے کمزور ہی یا اُسکے مساوی۔ اب اسکے لیے ہم محض الفاظ کو نہیں دیکھیں گے بلکہ ڈاکٹری اور طبی اسناد اور اقوال پر زیادہ اعتبار کرینگے۔

نظم الصلوٰۃ

یہ ایک چھوٹا سا رسالہ نظم میں حاجی محمد سمٰعیل خاں صاحب رئیس دتاولی نے تصنیف فرمایا ہی۔ اس میں نماز کے متعلق جملہ مسائل وارکان آپنے نظم میں لکھدیے ہیں تاکہ بچے آسانی سے اُن کو یاد کرسکیں۔گو تمام مسائل شرعی متعلق صلوٰۃ نظم کرنے کچھ آسان نہ تھے۔ لیکن حاجی صاحب موصوف نے حتی الوسع اُنکو نظم کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی ہی۔ ہم امید کرتے ہیں کہ یہ نظم بچوں کے لیے بہت مفید ثابت ہوگی۔ تین پیسے اسکی قیمت ہی۔ اور مطبع البشیر اٹاوہ سے یا مصنف موصوف سے گھٹیا اعظم خاں آگرے سے مل سکتی ہے۔

رجسٹرڈ نمبر ایل ۲۷۱

خاتون

جلد ۶	بابت ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۱۰ء	نمبر ۱۰

اڈیٹر شیخ محمد عبداللہ بی اے۔ ایل ایل بی۔ سکرٹری تعلیم نسواں سکشن

فہرست مضامین

محمد عبدالسلام پرنٹر کے اہتمام سے
مطبع فیض عام علی گڑھ میں طبع ہوا
۶۔ نومبر سنہ ۱۹۱۰ء

شیخ عبداللہ بی اے پبلیشر نے علیگڈہ سے شائع کیا

خاتون

۱ - یہ رسالہ ۴۸ صفحے کا علیگڈھ سے ہر ماہ میں شائع ہوتا ہی اور اس کی سالانہ قیمت (ے ۱ر) اور ششماہی ۱۲ ؍ ہے -

۲ - اس رسالہ کا صرف ایک مقصد ہی یعنی مستورات میں تعلیم پھیلانا اور پڑھی لکھی مستورات میں علمی مذاق پیدا کرنا -

۳ - مستورات میں تعلیم پھیلانا کوئی آسان بات نہیں ہی اور جبتک مرد اس طرف متوجہ نہونگے مطلق کامیابی کی امید نہیں ہوسکتی چنانچہ اس خیال اور ضرورت کے لحاظ سے اس رسالہ کے ذریعہ سے مستورات کی تعلیم کی اشد ضرورت اور بے بہا فوائد اور مستورات کی جہالت سے جو نقصانات ہورہے ہیں اسکی طرف ہمیشہ مردوں کو متوجہ کرتے رہینگے -

۴ - ہمارا رسالہ اس بات کی بہت کوشش کریگا کہ مستورات کے لیے عمدہ اور اعلی لٹریچر پیدا کیا جائے جس سے ہماری مستورات کے خیالات اور مذاق درست ہوں اور عمدہ تصنیفات کے پڑھنے کی انکو ضرورت محسوس ہو تاکہ وہ اپنی اولاد کو اُس بڑے لطف سے محروم رکھنا جو علم سے انسان کو حاصل ہوتا ہی معیوب تصور کرنے لگیں -

۵ - ہم بہت کوشش کرینگے کہ علمی مضامین جہانتک ممکن ہو سلیس اور بامحاورہ اُردو زبان میں لکھے جائیں -

۶ - اس رسالہ کی مدد کرنیکے لیے اسکو خریدنا گویا اپنی آپ مدد کرنا ہی - اگر اسکی آمدنی سے کچھ بچیگا تو اُس سے غریب اور یتیم لڑکیوں کو وظائف دیکر اُستانیوں کی خدمت کے لیے تیار کیا جائیگا -

۷ - تمام خط و کتابت و ترسیل زر بنام اڈیٹر خاتون علی گڈھ ہونی چاہیے -

خاتون

جاپان

ہمارے خاص کرم فرما اور ہمدرد قوم مولوی سید خورشید علی صاحب نے جاپان نامی ایک کتاب کا انگریزی سے اُردو ترجمہ کیا ہی. سید صاحب موصوف کا ترجمہ نہایت صاف اور دلنشیں ہوتا ہی اور اُن کی خواہش ہی کہ یہ ترجمہ سلسلہ بسلسلہ خاتون میں شائع کیا جائے تاکہ ناظرات خاتون کو معلوم ہو کہ ایک بالکل جاہل اور ادنی درجہ کی قوم کس طرح پستی سے نکل کر ترقی کی بلندی پر پہنچتی ہے۔

ہم نہایت خوشی سے اس کتاب کا پہلا باب اس نمبر میں شائع کرتے ہیں۔

امید ہے کہ سید صاحب موصوف کی توجہ سے خاتون میں آیندہ سلسلہ بسلسلہ اسکے ابواب مندرج ہوتے رہیں گے۔

اڈیٹر

پہلا باب

طلوع آفتاب کی سرزمین

ہمارے ملک سے بہت دور دنیا کی دوسری جانب بہت سے جزیروں کا ایک جھنڈ ہی جسپر سلطنت جاپان واقع ہی۔ لفظ "جاپان" کے معنی "طلوع آفتاب کی سرزمین" کے ہیں اور یہ حقیقت میں مشرق اقصیٰ کے ملک کا نہایت اچھا نام ہی۔

جاپان کے جھنڈے پر اس قسم کی تصویر منقوش ہی کہ آفتاب طلوع ہو رہا ہی اور اُس کی شعاعیں ہر سمت پہنچی ہوئی ہیں۔ روسی افواج کے مقابلہ میں جو حیرت انگیز و عظیم الشان فتوحات اس نشان نے حاصل کیے۔ ان کی بدولت اس کی شہرت و ناموری کی کوئی انتہا نہیں رہی۔

جاپانی اکثر باتوں میں انگریزوں کے ساتھ جو انکے دوست اور رفیق جنگ ہیں اپنا مقابلہ کرنے کے بڑے شائق ہیں۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ جس طرح برطانیہ ساحل یورپ سے دور جزائر کے مجموعہ پر واقع ہی اسی طرح جاپان بھی ساحل ایشیا سے دور جزائر کے مجموعہ پر واقع ہی۔ ان لوگوں نے ایک طرف تو اپنے تئیں انگریزوں کی طرح بحری جنگوں میں بہادر اور چست و چالاک ثابت کیا ہی۔ اور دوسری طرف ان کی فوجوں نے خشکی پر بالکل انگریزوں کی مانند نہایت جرأت و دلاوری سے داد جوانمردی دی ہی۔ یہ لوگ اپنے آپ کو "مشرقی انگریز" کہنا بہت پسند کرتے ہیں اور اپنے ملک کو "برطانیہ بحرالکاہل" کہتے ہیں۔

دنیا کی ایک زبردست عظیم الشان قوت بننے میں جاپان کی رفتار ترقی بے حد تیز اور حیرت انگیز ثابت ہوئی ہی۔ پچاس سال قبل جاپان دنیا کی نگاہوں سے بالکل پوشیدہ تھا جاپان میں سیر و سیاحت کی غرض سے بالکل اور خیال سے اجنبیوں کی داخل ہونے کی

سخت ممانعت تھی اور جاپانیوں کے عادات و خصائل۔ رسم و رواج وغیرہ کے متعلق کچھ بھی معلوم نہ تھا۔

اس کے جنگی جہازوں کا بیڑا اس زمانہ میں صرف چند مختصر سے چوبی جہازوں پر محدود تھا۔ مگر آج اس کے پاس بڑے بڑے زبردست آہن پوش موجود ہیں جن کا انتظام اُن کاملان فن کے سپرد ہے جو انگریزی بحری فوج کی طرح اپنے فرائض ادا کرنے میں یدطولیٰ رکھتے ہیں۔ اس زمانہ میں جاپان کی فوج کے پاس صرف دو تلواریں اور تیر و کمان بطور ہتیار کے ہوتے تھے لیکن آج اس کی سپاہ دنیا کی حیرت و استعجاب کا باعث ہے۔ تازہ ترین ہتیاروں سے یہ آراستہ ہوتے ہیں اور چار دانگ عالم میں انکی دہاک بیٹھی ہوئی ہے۔ بڑی بڑی قوی اور زبردست قومیں ان سے دشمنی کرتے ڈرتی ہیں۔

پچاس سال قبل جاپان بالکل طوائف الملوک کی حالت میں تھا اسکے بڑے بڑے امراء اور نواب ڈیمیوپاے کہلاتے تھے۔ ہر امیر اور ہر نواب کے پاس ایک مضبوط قلعہ اور ایک اپنی ذاتی فوج ہوتی تھی۔ ان نوابوں اور رئیسوں میں باہم ہمیشہ لڑائیاں ٹھنی رہتی تھیں اور ان کی فوجوں میں جو سامورائے کہلاتی تھیں۔ لگاتار کشت و خون ہوا کرتا تھا۔ جاپان کی اس وقت بالکل وہی حالت تھی جو انگلستان کی **وار آف دی روزز**[1] کے زمانہ میں تھی۔ خاندانی معمولی جھگڑوں سے طول طویل سالہا سال کی جنگوں تک نوبت پہنچ جاتی تھی۔

---

[1] پندرہویں صدی عیسوی کے اخیر نصف حصہ میں انگلستان میں عجیب خانہ جنگی برپا تھی۔ سلطنت کے دو سربرآوردہ فریق اپنا اپنا اقتدار قائم کرنے کے جوش میں باہم رقیب بن گئے تھے۔ سنہ ۱۴۵۵ء سے سنہ ۱۴۸۵ء تک دونوں جماعتوں میں بڑی بڑی معرکہ آرائیاں ہوئیں۔ ایک فریق نے اپنا نشان سرخ گلاب قرار دیا تھا اور دوسرے نے سفید گلاب اسی بنا پر ان محاربات کا نام "وار آف دی روزز" یعنے جنگ گلاب رکھا گیا۔ مترجم

لیکن اب یہ سب باتیں جاتی رہیں۔ ڈیمیو یاسے اب معمولی درجہ کے شرفا بن گئے ہیں۔ ساموراے کی فوجیں توڑ ڈالی گئیں۔ اس وقت جاپان میں بالکل مغربی ممالک کے نمونہ پر حکومت کی جاتی ہی اور یورپ کے ملکوں کے مطابق اس میں ججوں۔ عدالتوں کوتوالی وغیرہ کا انتظام ہے۔

جاپانیوں نے جس وقت اپنی قدیم دقیانوسی حالت کے بدلنے اور دنیا کی ترقی یافتہ قوموں میں شمار ہونے کا درجہ حاصل کرنے کا تہیہ کیا تو ان لوگوں نے ادہوری کوششوں سے کام نہیں لیا بلکہ ہر بات میں انتہائی کوششیں کیں اور درجہ کمال کو پہنچ کر رہے۔ ان لوگوں نے بڑی خوشی سے اپنے آپ کو آجکل کی ایجادوں۔ اختراعوں اور ترقی کی مختلف تحریکوں کے حوالہ کر دیا اور بڑے استقلال سے ثابت قدم رہے۔ انھوں نے ریلیں بنائیں۔ تار برقی (ٹیلیگراف و ٹیلیفون) کے سلسلے قایم کیے ہیں۔ پُلوں اور سڑکوں کی تعمیر سے ملک کو بڑی رونق بخشی ہی۔ متعدد بنکیں تجارتی کوٹھیاں۔ گرنیاں اور کارخانے تیار کیے ہیں۔

عدالتوں وغیرہ کے قیام کے ساتھ ایک پارلیمنٹ بھی بنائی ہے جس میں رعایا کی جانب سے ممبر منتخب اور نامزد ہوتے ہیں۔ ملک کے ہر گوشے اور ہر حصے میں اخبارات کی کثرت ہی۔

جاپان ایک نہایت خوبصورت اور سیر حاصل ملک ہی۔ اس میں خوشنما پہاڑوں کی کمی نہیں۔ کثرت سے ندیاں ہیں اور دلکش پہاڑوں کی آغوش میں بہتی ہیں۔ ندیوں کی بڑی بڑی چٹانوں سے ٹکرانے یا بہت عمیق ڈہالوں میں گرنے سے بر فیلے آبشاروں کی بھی قلت نہیں۔ پہاڑیوں کے دامن میں سرسبز و شاداب میدان اور زرخیز وادی واقع ہیں بہت سی نہریں جو پہاڑیوں میں سے نکلتی ہیں ان میدانوں کو ہمیشہ تر و تازہ رکھتی ہیں۔ لیکن پہاڑوں کی اتنی کثرت اور میدانوں کی اتنی قلت ہے کہ صرف تھوڑے ہی حصہ میں زراعت

کی جاسکتی ہے۔ اس میں جاپان کا ایک بہت بڑا نقصان ہے۔ یہاں کی آب و ہوا اور یہاں کا موسم برطانیہ سے کچھ زیادہ فرق نہیں رکھتا۔ البتہ گرمی کا موسم یہاں برطانیہ کے موسم گرما سے کسی قدر سخت ہوتا ہے اور سرما میں بعض حصے زیادہ سرد ہو جاتے ہیں۔ اکثر پہاڑ آتش فشاں ہیں۔ بعض ان میں سے ابتک متحرک ہیں اور اس وجہ سے عموماً زلزلے ہوا کرتے ہیں۔ بعض اوقات ان زلزلوں سے بے انتہا نقصان پہنچتا ہے۔

۱۸۹۱ء میں جو خوفناک زلزلہ آیا تھا اس میں دس ہزار آدمی تلف ہوئے۔ بیس ہزار زخمی ہوئے اور ایک لاکھ تیس ہزار مکان تباہ و برباد ہوئے۔

جاپان کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ اونچا پہاڑ سب سے زیادہ خوبصورت بھی ہے جاپانی اسکو بے انتہا عزیز رکھتے ہیں اور اس کی بلندی کو بہت مقدس خیال کرتے ہیں اسکا نام **فوجی سان** یا **فوسی یامہ** ہے۔ یہ سمندر کے قریب جاپان کے دارالسلطنت ٹوکیو کے پاس واقع ہے۔

یہ پہاڑ بہت ہی خوش وضع اور نہایت خوبصورت ہے۔ اس کی شکل بالکل مخروطی ہے اور یہ تیرہ ہزار فٹ مرتفع ہے۔ سمندر سے اسکا نظارہ بے حد عالی شان اور نظر فریب ہوتا ہے ساحل یا شہر کی کوئی جھلک نظر آنے سے بہت پہلے سیاح کو اس کی بلند چوٹی ایک عجیب شان کے ساتھ دکھائی دیتی ہے۔ جسپر کی برف کی روشن کلغی سے اسکا جاہ و جلال اور بھی بڑھ جاتا ہے اس خشکی کا تو اس وقت پتہ بھی نہیں معلوم ہوتا جہاں یہ پہاڑ واقع ہے۔ اہل جاپان قدرتی حسن اور فطرتی صناعیوں کی بہت قدر کرتے ہیں اور اسلیے یہ لوگ **فوجی سان** کی ایک حد تک پرستش کرتے ہیں۔ انکے ہاں کے نقاش اور مصور تو اس خوبصورت پہاڑ کی تصویریں بنانے سے کبھی نہیں تھکتے۔ اسکی تصویریں دنیا کے ہر حصے میں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔

سید خورشید علی
حیدرآباد دکن

نماز

روز محشر کہ جاں گداز بود　　اولیں پرسش نماز بود

دین اسلام کی اصل اقرار توحید اور عقیدہ رسالت ہی اسکے بعد نماز۔

نماز (صلوۃ) کے معنی اصل میں دعا کے ہیں جو ہر مذہب میں مختلف طور سے رائج ہی ہر مذہب میں اسکا وجود موجود ہی۔ عبادت کے طریقے جس طور سے بزرگان مہنود نے بنائے وہ ایک حد تک ضرور قابل تحسین تھے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ کسی دیوتا کے متعدد ہاتھ ہیں جن میں مختلف اشیا وہ لیے ہوئے ہیں۔ مثالاً ایک ہاتھ میں پھول ہی جس سے مراد علامت رحمت ہی۔ ایک ہاتھ میں تلوار ہی جسکا یہ منشا ہی کہ خدا جس طرح اپنی رحمت بندوں پر مبذول کرسکتا ہی اُسیطرح قہر و غضب بھی نازل کرسکتا ہی۔ ایک ہاتھ میں خوشہ ہی جسکے یہ معنی ہیں کہ وہ رزاق مطلق رزق بھی دیسکتا ہی۔

خدا کے مختلف ہاتھ ہیں' یہ روزمرہ کی گفتگو ہی۔ اسکو ظاہری صورت سے بچانے کے لیے تمثال قائم کردیتے تھے۔ لیکن بعد میں آنے والی نسلوں نے اس سے دوسرا نتیجہ اخذ کیا جسکو دنیا جانتی ہی۔

نماز جس شان سے شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے وضع کی اُس کی طرف جہانتک غور کیا جائے مفید نتیجہ مترتب ہونے کی امید ہی۔ بدن کی صفائی۔ دل کی روشنی۔ نزول رحمت۔ خوشنودی پروردگار۔

شرائط و آداب نماز مختصر طور سے جو صاف سمجھ میں آجائیں یہ ہیں کہ ہاتھ اُٹھاتے وقت یہ خیال کریں کہ ہم دنیا سے ہاتھ اُٹھاتے ہیں اور اس حاکم اعلیٰ کے حضور میں ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں جس سے بڑا کوئی حاکم نہیں۔ اور ایسا نہ ہو کہ کوئی کلمہ تہذیب کے خلاف یا قانون سے علیحدہ یا غلط نکل جائے۔ الفاظ بحث اور روئداد مقدمہ کو نہایت متانت

اور عمدگی کے ساتھ سنانا چاہیے۔ نہ گھبراہٹ اور غلط سلط الفاظ میں۔ جو کچھ کہو صحیح اور قانون کے موافق۔ ایسا نہ ہو کہ تم گھبراہٹ یا بیدلی کا اظہار کرکے توہین عدالت کے مرتکب ہو جاؤ۔ حی علی الصلاح حی علی الفلاح اُس عدالت العالیہ کے چپراسی کی آواز ہی جو مدعی مدعا علیہ کو بلایا کرتا ہے بہتر ہی کہ کچہری میں پہلے سے حاضر ہو جاؤ۔ کیونکہ اندیشہ ہی کہ کہیں عدم حاضری میں مقدمہ خارج ہو جائے اور ڈگری تمہارے سر پڑے۔

آہ دوستو! یہ حاکم مجازی کے چپراسی کی آواز کس قدر تمہیں اپنی طرف متوجہ کرتی کیسے دوڑتے ہو۔ ہوش و حواس بھی درست نہیں رہتے محکمہ والوں کی الگ خوشامد۔ رشوت کا بازار علیحدہ گرم۔ لیکن اُن کا موتھ سیدھا نہیں۔ حاکم کے روبرو گئے۔ بیان لیے گئے۔ دل دہڑک رہا ہی۔ ہاتھ پیر کانپ رہے ہیں۔ لیکن کیا کریں۔ قہر درویش برجان درویش۔ کیا مجال جو وقت پر حاضر نہ ہوں۔ حاکم حقیقی کا چپراسی آواز لگا رہا ہے آؤ تمہارے لیے ہر قسم کی فلاح موجود ہے۔ آؤ تمہیں اُس کی حضوری سے فیضیاب کیا جاتا ہی۔ حاضر حاضری کی جگہ قہقہہ لگاتے چلے جاتے ہیں کوئی سنتا بھی نہیں کیا کہا اور کس نے کہا۔ کیسی توہین کھلی ہوئی۔ جسکا کوئی جواب نہیں کوئی عذر نہیں۔ کیا ہوگا۔ وہ جس سے تمہارے دل اور جگر کے جوارح کانپ اُٹھیں گے۔ ایسی عدالت میں تم کو مدعو کیا جاتا ہی جہاں نہ رشوت کا زور ہی نہ خوشامد کا دخل۔ یہ خبر ہی نہیں کہ من اقام الصلوۃ فاقام الدین ومن ترکھا فقد ھدم الدین۔ آخر یہ کیسی مسلمانی ہی۔ بقول شخصے ذراسی مسلمانی اور اُس میں بھی آنا کانی۔ زمانہ بھر کی اصلاحیں ہوتی ہیں۔ لیکن اس اسلامی اصول کی طرف کوئی بھی توجہ نہیں کرتا۔

دُلہن آئیں ڈولے سے اُتریں اللہ آمین سے سلامتی کے ساتھ اُن کو قبل اسکے کہ کوئی صورت دیکھے یا نہ دیکھے صندل کے ٹیکے سے ماتھا زیب کر دیا گیا۔ ایک دھڑے

آئیں دوسری نے ادہر سے گھیرا۔ خاصا بازار لگ گیا۔ یہ کوئی نہیں پوچھتا کہ دلہن نے مسلمان کے گھر میں جنم لیا ہی یا کسی دوسرے مذہب والے کے۔ نماز اسکو پڑہنی چاہیے یا نہیں۔ کہے کون۔ او خویشتن گم ست کرا رہبری کند۔

سو میں ایک بی بی ایسی ہونگی جو ایسے شادی بیاہ کی مجلس میں نماز پڑہنے کا خیال رکھتی ہوں۔ توبہ کیجیے۔ اتنی فرصت کہاں کہ دو ٹکریں خدا کے نام کی ماریں۔ پھر بھلا وہ ایسی بات کیوں بتانے لگیں۔ دولہا چار بجے صبح کے گھر میں بلائے گئے دن کے آٹھ بجے تک رسمیں ہوتی رہیں۔ یہ کسی نے نکہا کہ دین اسلام کا پیرو ہی اسکو نماز پڑہوا دینی چاہیے۔

یہ تو بھلا شادی بیاہ کے موقعوں کی کیفیت ہی۔ اُن مجمعوں کی کیفیت دیکھنی چاہیے جہاں قومی خیرخواہی کے گیت گائے جاتے ہیں۔ اسپیکر صاحب میز پر ہاتھ رکھے تقریر فرمارہے ہیں۔ لوگوں کا عقیدہ جم گیا کہ ان جیسا دیندار کوئی نہیں۔ لیکن نماز کا وقت آیا اور اُنھوں نے بھی گھر میں جاکر لمبی تانی۔ بقول حافظ۔

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند چوں بخلوت می روند آں کار دیگری می کنند

مورد الزام ہیں تو بیچاری نئی نویلی دلہنیں ہیں۔ جو لوگ ان تجاویز کے محرک ہیں وہ خود بھی عمل نہیں کرتے۔

ایک صاحب سرے سے پردے کو اُڑائے دیتے ہیں۔ دوسرے صاحب یہ کہتے ہیں کہ ماں باپ کی مرضی کے مقابلہ پر دولہا دلہن کی منشا کوئی شے نہیں۔ غرضکہ ہر جانور اپنی اپنی بولی اس باغ عالم میں بول رہا ہی۔ لیکن اصل چیز کا نام بھی کوئی نہیں لیتا۔ صحابہ رضوان اللہ علیہم کے حالات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ اُنھوں نے اس موقع پر جب کہ جدال و قتال کا بازار گرم تھا۔ نماز نہیں چھوڑی۔ اور اگر متواتر لڑائی ہوتی بھی ہی تو بعد ختم تمام نمازوں کا اعادہ کر لیا ہی۔ انکے خیال میں نماز ویسی ہی ضروری شے تھی

جیسا اس کے واضع نے اس کی اہمیت کو بیان کیا تھا۔

ہرقل اور شرجیل ابن حسنہ کاتب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو جو کاتب واقدی نے لکھی ہے نماز کی اہمیت ظاہر کر رہی ہے۔ جو لوگ سجدے میں خاک پر سر جھکائے ہوئے کس طرح ارض روم و شام پر قابض ہو گئے اللہ اللہ اس سادہ جماعت کا کیسا اثر تھا جس سے ہرقل جیسا سلطان کانپتا تھا۔

آج سینکڑوں مسلمان یہ بھی نہیں جانتے کہ نماز میں کتنے فرض اور کتنی سنتیں اور مستحبات ہیں۔ اور یہ حالت عام لوگوں کی ہی نہیں بلکہ خواص بھی اس میں شامل ہیں۔ ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا۔

عورتیں تو فیصدی دس بھی نہ ملیں گی جو مسائل صلوٰۃ سے واقفیت رکھتی ہوں اور نماز صحیح طور سے ادا کر لیتی ہوں۔ اُن کو نماز تو نماز قرآن بھی صحیح یاد نہیں اس کلیہ میں کیا تعلیم یافتہ اور کیا غیر تعلیم یافتہ سب شامل ہیں لیکن کوئی اس کے اصلاح کی جانب مائل نہیں ہوتا۔

اگر اڈیٹر صاحب نے اجازت دی اور مناسب سمجھا تو ہم مختصر طور پر آئندہ مضمون میں نماز کے متعلق بعض ایسے مسائل جو عورتوں کے لیے بیحد ضروری ہیں۔ اور جو اکثر کو معلوم نہیں بتائینگے اور نماز کا وہ طریقہ جو اصل حدیث میں ہے لکھیں گے۔ والسلام

راقم

مقبول احمد نظامی سیوہاروی

مجلس حیراں

تحریر کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ تقریر کی طرح آسان ہو اور جلد سمجھ میں آ جائے۔ خاص کر خاتون جیسے رسالے

کے لیے جو کم مایہ بیویوں کے پڑھنے کے لیے شائع کیا جاتا ہے سلیس اور آسان عبارت کی زیادہ ضرورت ہے۔ مگر ہم قصداً کبھی کبھی اس قسم کے مضامین بھی درج کر دیتے ہیں جو مشکل ہوں۔ تاکہ بیویاں اسکو غور سے پڑھیں اور مشکل عبارت سمجھنے کی ان کو مشق ہو جائے۔ اسی قسم کا یہ مضمون ہے

ادھیڑ

خلوت کی انجمن میں انسانی شکل و شمائل کی دو مورتیں رکھی ہیں اب ان کی حرکت د نے تو ضرور ثابت کر رہا ہے کہ یہ زندہ جان انسان ہیں۔ ورنہ تھوڑی دیر کے عالم سکوت میں تو یہ تصویر خموش تھی۔ ان کی ہیئت کذائی کا ہیولانی اختلاف جنسی امتیاز بھی قائم کر رہا ہے۔ جس سے ایک میں شان رجولیت۔ اور دوسری میں انداز اناثیت پیدا ہیں۔ ایک کی نرم آواز۔ زنانہ لب و لہجہ۔ اور دوسرے کی آواز میں باوجود متانت نسبتاً کرختگی کا پایا جانا اس خیال کی تصدیق کر رہا ہے۔

یہ بھی آپ کو مان لینا چاہیے کہ یہ دونوں باہم رشتہ زن و شوی رکھتے ہیں اور ماشاء اللہ دونوں کی جوانی کا زمانہ ہے۔

بہرحال یہاں جس بات نے ہمیں کچھ دیر کے لیے نقش حیرت بنایا تھا۔ ہمارے ناظرین بھی اسے حیرت ہی سے سنیں گے۔ وہ یہ کہ بجائے محبت اور خوشی دکھلانے کے انقباض، ترکا دش۔ اور بات ہی بے لطفی سے صحبت لطف مجلس غم ٹھہر گئی ہے۔

اس کے سلسلہ اسباب و علل پر ہمیں غور کرنا ضرور ہے۔ لیکن اگر مزید واقفیت کے بعد ہم کوئی رائے قائم کریں گے تو وہ زیادہ صائب و قابل وقعت ہوگی۔ لہذا ہمیں چاہیے کہ اس معزز نوجوان کو جس کی شبستان عشرت میں ہم ہو آئے ہیں بیدار ہونے دیں۔ اسکے بعد ہمیں بعض تحقیقات کا تعاقب کرنا ہوگا۔

ناظرین! شکر کیجیے آپ کو انتظار کی کٹھن گھڑیاں گننی نہ پڑیں۔ اور وہ لیجیے ہمارا

تاہم مقصود آگیا۔ مگر ابھی اسے چھیڑنا مناسب نہیں۔

فطری ضروریات سے فارغ ہو کر فلاں وقت "ریسٹنگ روم" کی ڈیوٹی انجام دے رہے ہونگے اُسکا ملازم گھنٹی کی آواز سُن کر بڑے ہال کے باہر والے کمرے میں گیا ہے

خیر! اب ہم باغیچہ سے کوٹھی کے بڑے ہال میں آجاتے ہیں۔ جس میں زنانہ مکان سے نکلکر ایک مُدوّر وسیع چمن کو صراطِ مستقیم سے طے کرکے بذریعہ ایک کرسی اربر آمدے سے داخلہ ہوتا ہے۔

یہ ہال قیمتی فرنیچر و سامانِ آرائش سے فوق البھڑک نہیں بنایا گیا ہے۔ بلکہ سادہ علمی مذاق رکھنے والی طبیعت نے اسے ایک پرائیویٹ لائبریری کی زیب و زینت دے رکھی ہے۔ سمتوں میں الماریاں، بیچوں بیچ ایک بڑا میز ہے جسکے گرد دس پندرہ کی تعداد میں کُرسیاں، میز پر مختلف علوم و فنون کی کتابیں دنیا کی مشہور علمی زبانوں کی عظمت قائم کر رہی تھیں۔

ہم پہنچے ہی تھے کہ ہمارا نوجوان دوست بھی آکر ایک کرسی پر ڈٹ گیا، اور میز پر سے دائرۃ المعارف کی ایک جلد اُٹھا کر مطالعہ کرنے لگا۔

اتنے میں ایک بڑے میاں آکر بیٹھ گئے۔ جنھوں نے آتے ہی زبانِ متانت میں فرمایا کہ صاحبزادے کیا دیکھ رہے ہو؟

ہمارے نوجوان نے سادے مگر اُدب جانے والے چشم و ابرو دکھلا کر کہا کہ "رسمی اور عقلی احکامات کا مقابلہ" اور اپنے بزرگان قوم و خاندان کی عقل کوتاہ اندیشہ، پر تاسف کر رہا ہوں۔ جنہوں نے رسم و رواج کو آج فرائض مذہبی کا درجہ دے رکھا ہے۔

بزرگ۔ صاحبزادے تمہارا روئے سخن اس سے کن امور کی جانب ہے۔

نوجوان۔ بالفعل میرا روئے تحقیق ایک خاص مسئلہ کی جانب ہے۔ یعنی عورتیں اس

جلوہ گاہ ہستی میں کیوں لائی گئیں - منشا تخلیق کیا ہی، اور ہمارے یہاں کہانتک اس حکیم مطلق کے منشار کی تکمیل ہو رہی ہے -

بزرگ - اس پر اگر تم نے نئی کتابوں سے استدلال کیا، اُسکا تو میں قائل نہیں. کیونکہ سُنتا ہوں کہ علماے مصر جنکے دماغوں میں ولایت والوں کے خیالات بھرے ہوتے ہیں، وہ ایسی تصانیف کرکے کم علم مسلمانوں کو قرآن وحدیث کے دہوکے میں لاکر اپنا ہمخیال کرلیتے ہیں -

نوجوان - نہیں. نہیں، اگر آپ اُن سے حسن ظن نہیں رکھتے تو میں آپ پر کتاب اللہ کتاب الرسول، معتبر کتب تفاسیر، اجلہ، علمای سلف کا استدلال پیش کرونگا -

آجکل اس کی دہوم مچی ہی کہ لڑکیاں بھی لڑکیوں کی طرح تعلیم یافتہ ہوں - ورنہ امید نہیں کہ نئی پودھ اُن کی ہمنشینی کو بطیب خاطر گوارا کرے گی - اس میں ہیچ اگر یہ پڑا ہی کہ شور مچانے والوں میں سے اکثر بے سوچے سمجھے شور مچاتے ہیں اور اسی طرح سننے والے اُسے مجذوب کی بڑ سمجھکر رد کر دیتے ہیں - کہنے والوں اور سُننے والوں میں زیادہ شمار اُن حضرات کا ہی جو نہ بات کو خود سمجھ کر کہتے ہیں، اور نہ سُنکر سمجھتے ہیں. مخالف و موافق گروہ ایک دوسرے کے بیانات کا صحیح صحیح منشا، معلوم کرکے اُسپر راے زنی کرے تو یہ عقدہ آسانی سے حل ہوجائے -

اس ضرورت کے محسوس کرنے والوں کا زور مذہبانہ حیثیت سے اُن آیات قرآنی پر ہی جو اس کی ناطق ہیں -

هُنَّ لِبَاسٌ لَكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَهُنَّ - عورتیں تمہارے لیے باعث زینت ہیں اور تم عورتوں کے لیے -

یہ آیت کریمہ صاف بتلاتی ہی کہ عورت ومرد میں جسم وجامہ کا تعلق ہی جن دونوں کا تناسب بدیہی ہی، اگر جامہ جسم پر ٹھیک نہ اُترے. یا جسم کے کسی عضو کی کجی سے اسکی تبدیل وضع ہوجائے، تو وہ جامہ جسم پر یا جسم جامہ کے لیے موزون ہوگا - نہ باعث زینت

آسئے گی۔

اسی طرح مرد کے اخلاقی و معاشرتی جسم کے لیے عورت جو بمنزلہ لباس کے ہے اگر اُس کی قطع و برید کا جسم اخلاق و معاشرت سے تطابق نہ ہو تو بھی خانگی معاشرت میں شان دلاویزی نہ پیدا ہوگی۔ جو معاشرت بالمعروف کے لیے ضروری ہے جسکا حکم دوسری آیت کریمہ میں موجود ہے۔

وعاشروهن بالمعروف۔ حسن معاشرت سے اُن کے ساتھ زندگی بسر کرو۔

پس جبکہ مذہب اس بارہ میں اصرار بلیغ کر رہا ہے تو کونسی عقل سلیم ایسی ضرورت سے انحراف کرے گی جو حسن معاشرت کے مبادی ہے۔ کیونکہ اصل منشا یہ ہے کہ عورتوں میں مذاق صحیح پیدا ہو۔ جس سے اُن کا استصواب امور خانگی میں نازیبا، اور درجۂ عقل سے گرا ہوا نہ ہو۔ جو بسا اوقات مردوں کے حق میں سم قاتل کی تاثیر رکھتا ہے۔

اس سلسلۂ گفتگو میں اُس حدیث نبوی کی یاددہانی بیجا نہیں۔ جسے اکثر سطحی معلومات رکھنے والے اس بحث کے دنگل میں زوربازو قرار دیتے ہیں، یعنی

طلب العلم فریضة علی کل مسلم ومسلمة۔ تحصیل علم مسلمان مرد و عورت دونوں پر لازمی ہے۔

لیکن ہم اسپر مذکورالصدر آیات کے اجمال کی تفسیر قرار دینے سے زیادہ اعتماد نہیں کرنا چاہتے۔

اسکے علاوہ ایک روشنخیال بند تقلید سے آزاد ہو کر یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ الحاجة ام الاختراعات۔ زمانہ کی نئی ضرورتیں جس طرح جدید اشیا کے اختراع کی سفارش کرتی ہیں اسی طرح ہمارا طبعی میلان (اور جو خرابیاں آئے دن ظہور پذیر ہوتی ہیں اُنکا لحاظ) اس بات کی بھی جائز خواہش رکھتا ہے کہ ہمیں بجائے اَلّھڑ و بے شعور عورات کے خواندہ و شایستہ بیویاں ملنی چاہییں۔ جو ہمارے لیے باعث دلبستگی، موجب مسرت اور افکار و مصائب کی ظلمت کے لیے صبح درخشاں بنیں۔

کارخانۂ قدرت کے کارساز نے اس نوع انسانی کے، داعی ایجاد کے بارہ میں جنس اعلیٰ کو خطاب کر کے فرمایا ہی۔

لتسکنوا الیھن ۔ تو تم اسلیے ہیں کہ سکون خاطر و قلب تمہیں ان سے حاصل ہو۔

اس فرمان میں جناب باری عزاسمہ کا منشاء ہمارے منشار سے کہیں اعلیٰ وارفع ہی۔ جس کی توضیح یوں ہو سکتی ہی کہ کلام عرب میں اس خاص محاورہ کا استعمال دیکھا جائے سکن الیہ اُس خاص موقع کے لیے ہی جب کسی کو غیر معمولی گھبراہٹ کو لی تشفی بخش صورت اطمینان نظر آجاتی ہی۔ تسکین دینے والی شے کو سکن بولتے ہیں۔

پس جب عورت کو مرد کے لیے سکنٌ خداوند تعالیٰ نے بتلایا ہی۔ اُسے مرد کی "ایسوسی ایشن" کا ایک ضروری جزو قرار دیا ہی۔ اور خانگی معاشرت کا ٹھاٹھ اسی کی ایک ذات خاص کا ہی اور ہم بجاے دلچسپی لینے اور شریک لطف معاشرت بنانے کے اُس کی حیثیت مٹادیں۔ وقعت زائل کریں تو کیوں نہ ہم بفحواے وضع الشی فی غیر محلہ ظالم ٹھہرینگے۔

بظاہر یہ بات نہایت چھوٹی معلوم ہوتی ہی لیکن جو نقائص اس سے ظہور پذیر ہوتے ہیں، وہ بہت وزنی ہیں۔ یہ بات بھی کالنّور والسُّرور ہی کہ نوجوانوں کو زنانہ سوسائٹی کے اس نقص کی وجہ سے یورپ کی طرف متوجہ ہونے کا موقع ملتا ہی۔ اور بعض اوقات وہ وہیں کے ہو رہتے ہیں۔ اور دونوں طرف کا نقشہ یہ ہوتا ہی۔ ؎

دلم چو مصر زلیخا شکستہ در خلوت غمم چو تہمت یوسف دویدہ در بازار

غرضکہ اس جہالت اور بے علمی کا اثر حکم خدا و رسول سے محض منحرف ہونا ہی نہیں بلکہ نظام معاشرت و تمدن کے شیرازہ کو پراگندہ کرنا ہی جس کی نظیر آپ ایسے جہاندیدہ بزرگ غور کرکے بہت نکال سکتے ہیں۔ دیکھیے عورتوں کو خطاب کرکے ہمارے مخدوم قوم مولانا حالی نے خوب کہا ہی۔

مونس ہو خاوندوں کی تم، غمخوار فرزندوں کی تم تم بن ہی گھر ویران سب گھر بھر کی برکت تم سے ہے

تم آس ہوشیار کی۔ ڈہارس ہو تم بے کار کی دولت ہو تم نادار کی عسرت میں عشرت تم سے ہے

تعلیم وتہذیب کے متعلق جو مجھے بالفعل عرض کرنا تھا وہی تھا جو میں نے عرض کیا انشاء اللہ اور مسائل کے متعلق بھی جو آجکل زمانہ کے معرض بحث میں مثلاً پردے وغیرہ پر بھی اظہار خیال کرونگا۔ آپ کی سمع خراشی تو ہو لی معاف فرمائیگا۔

بزرگ۔ ماشاء اللہ۔ صاحبزادے ماشاء اللہ۔ تم نے جو کچھ اس وقت کہا وہ میرے دل میں نقش کالحجر ہوگیا۔ سبحان اللہ کیا پاکیزہ خیالات تھے۔ درحقیقت خدا اور رسول کا یہی حکم ہے۔ انشاء اللہ آیندہ سے میں ضرور اسی کی خالصتہ للہ کوشش میں مصروف ہونگا کہ شریف خاندانوں میں علم پھیلے۔ میں پھر بھی اس کی کوشش کرونگا کہ تمہارے اور خیالات بھی سنوں۔

ناظرین! اس گفتگو سے آپنے کیا اخذ کیا۔ کیا یہ مستنبط نہیں ہوتا کہ یہ نوجوان بھی اسی تیغ ستم کا کشتہ ہے یعنی اسکا سابقہ بھی بے پڑھی لکھی بیوی سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے ان دونوں بیوی میاں کو بجائے عیش و خوشی کے ناگوار زندگی بسر کرتے ہوئے پایا۔

لیکن ہم اسکے اس خیال سے متفق نہیں جو اُس نے قطعاً بیوی سے کج رخی اختیار کرلی ہے۔ درحقیقت بیوی کا اس میں قصور کیا۔ اُسے تعلیم و اصلاح کی طرف مائل کرنا ہمارے نوجوان کا فرض تھا۔ مگر شاید وہ بزرگوں کی پابندی و سختی کی وجہ سے تعلیم نہ دلاسکتا ہو۔ اگر ایسا ہے تو اسکا بھی قصور نہیں

الغرض نوجوانوں کی زندگی بے جوڑ ساتھ سے قدیم الخیال خاندانوں میں طوفانِ غم بن گئی ہے۔ بقول شخصیکہ

زندگی ہے یا کوئی طوفانِ غم ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مرچلے

جواد علیخاں۔ عالی
محمد پوری

بےغرض محسن

(۱)

ساون کا مہینہ تھا۔ ریوتی رانی نے پیروں میں مہندی رچائی مانگ چوٹی سنواری اور تب اپنی بوڑھی ساس سے جاکر بولی" اماں جی آج میں بھی میلہ دیکھنے جاؤں گی"

ریوتی پنڈت چنتامن کی بیوی تھی۔ پنڈت جی نے سرسوتی کی پوجا میں زیادہ نفع نہ دیکھکر لکشمی دیوی کی مجاوری کرنی شروع کی تھی۔ لین دین کا کاروبار کرتے تھے مگر مہاجنوں کے برخلاف بجز خاص خاص حالتوں کے ۲۵ فیصدی سے زیادہ سود لینا مناسب نہ سمجھتے تھے۔

ریوتی کی ساس ایک بچے کو گود میں لیے کھٹولے پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ بہو کی بات سن کر بولیں" بھیگ جاؤ گی تو بچے کو زکام ہو جائیگا"

ریوتی۔ نہیں اماں مجھے دیر نہ لگے گی۔ ابھی چلی آؤں گی"

ریوتی کے دو بچے تھے۔ ایک لڑکا۔ دوسری لڑکی۔ لڑکی ابھی گود میں تھی اور لڑکا ہیرامن ساتویں سال میں تھا۔ ریوتی نے اُسے اچھے اچھے کپڑے پہنائے۔ نظر بد سے بچنے کے لیے ماتھے اور گالوں پر کاجل کے ٹیکے لگادیے۔ گڑیاں پیٹنے کے لیے ایک خوشرنگ چھڑی دیدی اور اپنی کئی ہجولیوں کے ساتھ میلہ دیکھنے چلی۔

کیرت ساگر کے کنارے عورتوں کا بڑا جمگٹ تھا۔ نیلگوں گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ عورتیں سولھوں سنگار کیے۔ ساگر کے پُرفضا میدان میں ساون کے رم جھم برکھا کی بہار لوٹ رہی تھیں۔ شاخوں میں جھولے پڑے ہوئے تھے۔ کوئی جھولا جھولتی۔ کوئی ملار گاتی۔ کوئی ساگر کے کنارے بیٹھی لہروں سے کھیلتی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی خوشگوار ہوا

پانی کی ہلکی ہلکی پھوہار۔ پہاڑیوں کی نکھری ہوئی ہریالی۔ لہروں کے دلفریب جھکولے موسم کو دلچسپ بنائے ہوئے تھے۔

آج گڑیوں کی بدائی ہے۔ گڑیاں اپنے سسرال جائیں گی۔ کنواری لڑکیاں ہاتھ پاؤں میں مہندی رچائے۔ گڑیوں کو گہنے کپڑے سے سجائے انہیں بدا کرنے آئی ہیں۔ انہیں پانی میں بہاتی ہیں۔ اور جھک جھک کر ساون کے گیت گاتی ہیں۔ مگر دامن عافیت سے نکلتے ہی ان ناز و نعمت میں پلی ہوئی گڑیوں پر چاروں طرف سے چھڑیوں اور لکڑیوں کی بوچھار ہونے لگی۔

ریوتی یہ سیر دیکھ رہی تھی اور ہیرامن ساگر کے زینوں پر اور لڑکوں کے ساتھ گڑیاں پیٹنے میں مصروف تھا۔ زینوں پر کائی لگی ہوئی تھی۔ دفعتاً اُسکا پیر پھسلا تو پانی میں جا پڑا۔ ریوتی چیخ مار کر دوڑی اور سر پیٹنے لگی۔ دم کی دم میں وہاں مردوں اور عورتوں کا ایک ہجوم ہوگیا۔ مگر یہ کسی کی انسانیت تقاضا نہ کرتی تھی کہ پانی میں جا کر ممکن ہو تو بچے کی جان بچائے سنوارے ہوئے گیسو نہ بکھر جائیں گے! دُھلی ہوئی دھوتی نہ بھیگ جائے گی! کتنے ہی مردوں کے دلوں میں یہ مردانہ خیالات آرہے تھے۔ دس منٹ گزر گئے۔ مگر کوئی شخص کمرہمت باندھتا نظر نہ آیا۔ غریب ریوتی پچھاڑیں کھا رہی تھی۔ ناگاہ ایک آدمی اپنے گھوڑے پر سوار چلا جاتا تھا۔ یہ اژدحام دیکھ کر اُتر پڑا اور ایک تماشائی سے پوچھا "یہ کیسی بھیڑ ہے" تماشائی نے جواب دیا "ایک لڑکا ڈوب گیا ہے"

مسافر۔ کہاں؟

تماشائی۔ جہاں وہ عورت کھڑی رو رہی ہے۔

مسافر نے فوراً اپنی گاڑھے کی مرزئی اُتاری اور دھوتی کس کر پانی میں کود پڑا چاروں طرف سناٹا چھا گیا لوگ متحیر تھے کہ کون شخص ہے۔ اُسنے پہلا غوطہ لگایا۔ لڑکے کی رف کی جان سے لگایا تو اُس کی چھڑی ہاتھ لگی اور تیسرے غوطے کے بعد جب اوپر آیا بن سے ایک مہاتما نے

تماشائیوں نے واہ واہ کا نعرۂ پُرشور بلند کیا۔ ماں نے دوڑ کر بچے کو لٹا دیا۔ اس اثنا میں پنڈت چنتامن اور کئی عزیز آپہنچے اور لڑکے کو ہوش میں لانے کی فکر کرنے لگے۔ آدھ گھنٹہ میں لڑکے نے آنکھیں کھول دیں۔ لوگوں کی جان میں جان آئی۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا اگر لڑکا دو منٹ بھی پانی میں اور رہتا تو بچنا غیر ممکن تھا۔ مگر جب لوگ اپنے گمنام محسن کو ڈھونڈھنے لگے تو اُسکا کہیں پتہ نہ تھا۔ چاروں طرف آدمی دوڑائے۔ سارا میلہ چھان مارا۔ مگر وہ نظر نہ آیا۔

(۲)

بیس سال گزر گئے۔ پنڈت چنتامن کا کاروبار روز بروز بڑھتا گیا۔ اس دوران میں اُس کی ماں نے ساتوں جاترائیں کیں۔ اور مریں تو اُنکے نام پر ٹھاکردوارا تیار ہوا۔ ریوتی بہو سے ساس بنی۔ لین دین بہی کھاتہ ہیرامن کے ہاتھ میں آیا۔ ہیرامن اب ایک وجیہ نحیم و شحیم نوجوان تھا۔ نہایت خلیق۔ نیک مزاج۔ کبھی کبھی باپ سے چھپا کر غریب آسامیوں کو بلاسودی قرض دیا کرتا تھا۔ چنتامن نے کئی بار اس گناہ کے لیے بیٹے کو آنکھیں دکھائی تھیں اور الگ کردینے کی دھمکی دی تھی۔

ہیرامن نے ایک بار ایک سنسکرت پاٹھ شالا کے لیے پچاس روپیہ چندہ دیا۔ پنڈت جی اسپر ایسے برہم ہوئے کہ دو دن تک کھانا نہیں کھایا۔ ایسے ناگوار واقعات آئے دن ہوتے رہتے تھے۔ انہیں وجوہ سے ہیرامن کی طبیعت باپ سے کچھ کھچی رہتی تھی۔ مگر اُس کی یہ ساری شرارتیں ہمیشہ ریوتی کی سازش سے ہوا کرتی تھیں۔

جب قصبہ کی غریب بدھوائیں یا زمینداروں کے ستائے ہوئے آسامیوں کی عورتیں ریوتی کے پاس آکر ہیرامن کو آنچل پھیلا پھیلا کر دعائیں دینے لگتیں تو اُسے ایسا معلوم ہوتا کہ ؛ اور میرے بیٹے سے زیادہ فرشتہ صفت آدمی دنیا میں کوئی نہ ہوگا دن یاد آجاتا جب ہیرامن کیرت ساگر میں ڈوب گیا تھا اور اُس آدمی

کی تصویر اس کی نگاہوں کے سامنے کھڑی ہوجاتی جسنے اُسکے لال کو ڈوبنے سے بچایا تھا اُسکے تہ دل سے دعا نکلتی اور ایسا جی چاہتا کہ اُسے دیکھ پاتی تو اُسکے پیروں پر گر پڑتی۔ اُسے اب کامل یقین ہوگیا تھا کہ وہ انسان نہ تھا۔ بلکہ کوئی دیوتا تھا۔ وہ اب اُسی کھٹولے پر بیٹھی ہوئی جسپر اس کی ساس بیٹھتی تھی اپنے دونوں پوتوں کو کھلایا کرتی تھی۔

آج ہیرامن کی ستائیسویں سالگرہ تھی۔ ریوتی کے لیے یہ دن سال بھر کے دنوں میں سب سے زیادہ مبارک تھا۔ آج اسکا دست کرم خوب فیاضی دکھاتا تھا اور یہی ایک بیجا صرف تھا جس میں پنڈت چنتامن بھی اسکے شریک ہوجاتے تھے۔ آج کے دن ریوتی بہت خوش ہوتی اور بہت روتی اور آج اپنے گمنام محسن کے لیے اُس کے دل سے جو دعائیں نکلتیں وہ دل و دماغ کے اعلیٰ ترین جذبات میں رنگی ہوتی تھیں۔ اُسی کی بدولت تو آج مجھے یہ دن اور دیکھ دیکھنا میسر ہوا ہے!

(۳)

ایک دن ہیرامن نے آکر ریوتی سے کہا "اماں سری پور نیلام پر چڑھا ہوا ہے۔ کہو تو میں بھی دام لگا دوں"

ریوتی سولھوں آنہ ہے۔

ہیرامن۔ سولھوں آنہ۔ اچھا گانوں ہے۔ نہ بڑا نہ چھوٹا۔ یہاں سے دس کوس ہے۔ چار ہزار تک بولی چڑھ چکی ہے۔ سو دو سو میں ختم ہو جائیگا۔

ریوتی۔ اپنے دادا سے تو پوچھو؟

ہیرامن۔ اُنکے ساتھ دو گھنٹے تک سر مغزن کرنے کی کسے فرصت ہے۔

ہیرامن اب گھر کا مختار کل ہوگیا تھا اور چنتامن کی ایک نہ چلنے پاتی۔ وہ بوڑھے لالہ اب عینک لگائے ایک گدّے پر بیٹھے اپنا وقت کھانسنے میں صرف کی جان کے دوسرے دن ہیرامن کے نام پر سری پور ختم ہوگیا۔ مہاجن سے ایک مہاتما نے

اپنے منیب اور دو چپراسیوں کو لیکر گانوں کی سیر کرنے چلے۔ سری پور والوں کو خبر ہوئی۔ نئے زمیندار کی پہلی آمد تھی۔ گھر گھر نذرانہ دینے کی تیاریاں ہونے لگیں پانچویں دن شام کے وقت ہیرامن گانوں میں داخل ہوئے۔ دہی اور چاول کا تیلک لگایا گیا اور تین سو آسامی پہر رات تک ہاتھ باندھے ہوئے اُن کی خدمت میں کھڑے رہے۔ سویرے مختار عام نے آسامیوں کا تعارف کرانا شروع کیا جو آسامی زمیندار صاحب کے سامنے آتا وہ اپنی بساط کے موافق ایک یا دو روپیہ اُنکے پیروں پر رکھ دیتا۔ دوپہر ہوتے ہوتے وہاں پانچسو روپیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔

ہیرامن کو پہلی بار زمینداری کا مزہ ملا۔ پہلی بار ثروت اور طاقت کا نشہ محسوس ہوا۔ سب نشوں سے زیادہ تیز زیادہ قاتل ثروت کا نشہ ہے۔ جب آسامیوں کی فہرست ختم ہوگئی تو مختار سے بولے "اور کوئی آسامی تو باقی نہیں ہے"

مختار۔ ہاں مہراج۔ ابھی ایک آسامی اور ہے۔ تخت سنگھ۔

ہیرامن۔ وہ کیوں نہیں آیا۔

مختار۔ ذرا مست ہے۔

ہیرامن۔ میں اُس کی مستی اُتار دونگا۔ ذرا کوئی اُسے بُلا لائے۔

تھوڑی دیر میں ایک بوڑھا آدمی لاٹھی ٹیکتا ہوا آیا اور ڈنڈوت کرکے زمین پر بیٹھ گیا نہ نذر نہ نیاز۔ اُس کی یہ گستاخی دیکھ کر ہیرامن کو بخار چڑھ آیا۔ کڑک کر بولے "ابھی کسی زمیندار سے پالا نہیں پڑا۔ ایک ایک کی ہیکڑی بھلا دونگا"

تخت سنگھ نے ہیرامن کی طرف غور سے دیکھ کر جواب دیا "میرے سامنے بیس زمیندار آئے چلے گئے مگر کسی نے اس طرح گھُرکی نہیں دی۔

نے لاٹھی اُٹھائی اور اپنے گھر چلا آیا۔ بوڑھی ٹھکرائن نے پوچھا "دیکھا زمیندار کو؟

تخت سنگھ۔ اچھے آدمی ہیں۔ میں انہیں پہچان گیا

ٹھکرائن۔ کیا تم سے پہلے کی ملاقات ہے۔

تخت سنگھ۔ میری ان کی تیس برس کی جان پہچان ہے۔ گڑیوں کے میلے والی بات یاد ہے نا۔

اُس دن سے تخت سنگھ پھر ہیرامن کے پاس نہ آیا۔

(۴)

چھ مہینے کے بعد ریوتی کو بھی سری پور دیکھنے کا شوق ہوا۔ وہ اور اُس کی بہو اور بچے سب سری پور آئے۔ گانوں کی سب عورتیں اُن سے ملنے آئیں۔ ان میں بوڑھی ٹھکرائن بھی تھی۔ اُس کی بات چیت۔ سلیقہ اور تمیز دیکھکر ریوتی دنگ ہو گئی۔ جب وہ چلنے لگی تو ریوتی نے کہا ٹھکرائن! کبھی کبھی آیا کرنا۔ تم سے ملکر طبیعت بہت خوش ہوئی۔ اس طرح دونوں عورتوں میں رفتہ رفتہ میل ہو گیا۔ یہاں تو یہ کیفیت تھی۔ اور ہیرامن اپنے مختار عام کے مغالطے میں آکر تخت سنگھ کو بیدخل کرنے کی بندشیں سوچ رہا تھا۔

جیٹھ کی پورنماشی آئی۔ ہیرامن کی سالگرہ کی تیاریاں ہونے لگیں۔ ریوتی چھلنی میں میدہ چھان رہی تھی کہ بوڑھی ٹھکرائن آئی۔ ریوتی نے مسکرا کر کہا" ٹھکرائن۔ ہمارے یہاں کل تمہارا نیوتہ ہے۔

ٹھکرائن۔ تمہارا نیوتہ سر اور آنکھوں پر۔ کونسی برس گانٹھ ہے۔

ریوتی۔ تیسویں۔

ٹھکرائن۔ نارائن کرے ابھی ایسے ایسے سو دن ہیں اور دیکھنے نصیب ہوں۔

ریوتی۔ ٹھکرائن۔ تمہاری زبان مبارک ہو۔ بڑے بڑے جنتر منتر کیے ہیں تب تم لوگوں کی دعا سے یہ دن دیکھنا نصیب ہوا ہے۔ یہ تو ساتویں ہی سال میں تھے کہ ان کی جان کے لالے پڑ گئے۔ گڑیوں کا میلہ دیکھنے گئی تھی۔ یہ پانی میں گر پڑے۔ بارے ایک مہاتما نے

ٹھاکر نے آہستہ سے کہا "سب ایشور کی دیا ہے۔ آپ کیسے بھول پڑے"؟
ہیرامن کو دوسری بار زک ملی۔ اُس کی یہ آرزو کہ تخت سنگھ میرے پیروں کو آنکھوں سے چومے اب بھی پوری نہ ہوئی۔ اُسی رات کو غریب۔ آزاد منش۔ ایماندار۔ بیغرض ٹھاکر اس دنیا سے اُٹھ گیا۔

(۷)

بوڑھی ٹھکراین اب دنیا میں اکیلی تھی۔ کوئی اُسکے غم کا شریک اور اُسکے مرنے پر آنسو بہانے والا نہ تھا۔ بینوائی اور بے مائگی نے غم کی آنچ اور تیز کر دی تھی۔ سامان فراغت موت کے زخم کو گو بھر نہ سکیں۔ مگر مرہم کا کام ضرور دیتے ہیں۔
فکر معاش بُری بلا ہے۔ ٹھکرائن اب کھیت اور چراگاہ سے گوبر چُن لاتی اور اُپلے بنا کر بیچتی۔ اُسے لاٹھی ٹیکتے ہوئے کھیتوں کو جاتے اور گوبر کا ٹوکرا سر پہ رکھ کر بوجھ سے ہانپتے ہوئے آتے دیکھنا سخت دردناک تھا۔ یہانتک کہ ہیرامن کو بھی اُس پر ترس آگیا ایک دن انھوں نے آٹا دال چاول تھالیوں میں رکھ کر اُسکے پاس بھیجا۔ ریوتی خود لیکر گئی۔ مگر بوڑھی ٹھکرائن آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی" ریوتی جبتک آنکھوں سے سوجھتا ہے اور ہاتھ پیر چلتے ہیں مجھے اور مرنے والے کو گنہگار نہ کرو"
اُس دن سے ہیرامن کو پھر اسکے ساتھ عملی ہمدردی کرنے کی جرأت نہوئی۔
ایک دن ریوتی نے ٹھکرائن سے اُپلے مول لیے۔ گانوں میں پیسے کے تیس اُپلے بکتے تھے۔ اُسنے چاہا کہ اس سے بیس ہی اُپلے لوں۔ اُس دن سے ٹھکرائن نے اسکے یہاں اُپلے لانا بند کر دیا۔

ایسی دیویاں دنیا میں کتنی ہیں! کیا وہ اتنا نہ جانتی تھی کہ ایک راز سربستہ زبان پر لاکر میں اپنی جانکاہیوں کا خاتمہ کر سکتی ہوں۔ مگر پھر وہ احسان کا بدلہ نہو جائیگا۔ مثل مشہور ہے نیکی کر اور دریا میں ڈال۔ شاید اسکے دل میں کبھی یہ خیال ہی نہیں آیا کہ مینے ریوتی پر کوئی احسان کیا۔

یہ وضعدار۔ آن پر مرنے والی عورت شوہر کے مرنے کے بعد تین سال تک زندہ رہی یہ زمانہ اُسنے جس تکلیف سے کاٹا اُسے یاد کرکے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کئی کئی دن فاقے سے گذر جاتے۔ کبھی گوبر نہ ملتا۔ کبھی کوئی اُپلے چُرا لیجاتا۔ ایشور کی مرضی! کسی کا گھر بھرا ہوا ہے۔ کھانے والے نہیں۔ کوئی یوں رو رو کر زندگی کے دن کاٹتا ہی۔

بڑھیا نے یہ سب دُکھ جھیلا۔ گر کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔

(۸)

ہیرامن کی بیسویں سالگرہ آئی۔ ڈھول کی سہانی آواز سنائی دینے لگی۔ ایک طرف گھی کی پوریاں پک رہی تھیں۔ دوسری طرف تیل کی۔ گھی کی معزز برہمنوں کے لیے۔ تیل کی غریب۔ فاقہ کش۔ نیچوں کے لیے۔

یکایک ایک عورت نے ریوتی سے آکر کہا "ٹھکرائن جانے کیسی ہوئی جاتی ہیں۔ تمھیں بُلا رہی ہیں"

ریوتی نے دل میں کہا ایشور آج تو خیریت سے کاٹنا۔ کہیں بُڑھیا مر نہ رہی ہو۔ یہ سوچ کر وہ بُڑھیا کے پاس نہ گئی۔ ہیرامن نے جب دیکھا اماں نہیں جانا چاہتیں تو خود چلا۔ ٹھکرائن پر اُسے کچھ دنوں سے رحم آنے لگا تھا۔ مگر ریوتی مکان کے دروازہ تک اُسے منع کرنے آئی۔ یہ رحمدل۔ نیک مزاج۔ شریف ریوتی تھی۔

ہیرامن ٹھکرائن کے مکان پر پہنچا تو وہاں بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ بوڑھی عورت کا چہرہ زرد تھا اور جاں کندنی کی حالت طاری تھی۔ ہیرامن نے زور سے کہا "ٹھکرائن! میں ہوں ہیرامن"

ٹھکرائن نے آنکھیں کھولیں اور اشارہ سے اُسے اپنا سر نزدیک لانے کو کہا۔ پھر رُک رُک کر بولی "میرے سرہانے پٹاری میں ٹھاکر کی ہڈیاں رکھی ہوئی ہیں۔ میرے سہاگ کا سیندور بھی وہیں ہی۔ یہ دونوں پراگ راج بھیج دینا۔

یہ کہکر اُسنے آنکھیں بند کرلیں۔ ہیرامن نے پٹاری کھولی تو دونوں چیزیں بحفاظت رکھی ہوئی تھیں۔ ایک پوٹلی میں دس روپیے بھی رکھے ہوئے ملے۔ یہ شاید جلنے والے کا زادراہ تھا۔ رات کو ٹھکرائن کی تکلیفوں کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہوگیا۔

اُسی رات کو ریوتی نے خواب دیکھا۔ ساون کا میلہ ہی۔ گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں۔ میں کیرت ساگر کے کنارے کھڑی ہوں۔ اتنے میں ہیرامن پانی میں پھسل پڑا میں چھاتی پیٹ پیٹ کر رونے لگی دفعتہً ایک بوڑھا آدمی پانی میں کود پڑا اور ہیرامن کو نکال لایا۔ ریوتی اسکے قدموں پر گر پڑی اور بولی "آپ کون ہیں"۔

اُسنے جواب دیا "میں سری پور میں رہتا ہوں میرا نام ہی تخت سنگھ"۔

سری پور اب بھی ہیرامن کے قبضے میں ہی۔ مگر اب اُس کی رونق دوچند ہوگئی ہے وہاں جاؤ تو دور سے شوالے کا سُنہرا کلس دکھائی دینے لگتا ہی۔ جس جگہ تخت سنگھ کا مکان تھا وہیں اب یہ شوالہ بنا ہوا ہے۔ اسکے سامنے ایک پختہ کُنواں اور پختہ دھرم سالہ ہے۔ مسافر یہاں ٹھہرتے ہیں اور تخت سنگھ کا جس گاتے ہیں۔ یہ شوالہ اور دھرم سالہ دونوں اسی کے نام سے مشہور ہیں۔

(از دادیب)

عورتوں کا اصلی زیور

آجکل اس ہندوستان میں جہاں حق پرستی اور روحانیت کا دور دورہ تھا۔ اور دہریت و مادہ پرستی قابل نفرت سمجھی جاتی تھی۔ ایسی خراب حالت ہوگئی ہے کہ ہر شخص مادیت کا دلدادہ و شیدا نظر آتا ہی اور حق پرستی کوسوں نہیں بلکہ منزلوں دور ہے۔

مردوں کی بابت تو میں کیا لکھوں لیکن عورتوں میں یہ عام طور پر دیکھکر رنج ہوتا ہے کہ اُن کو رات دن سوائے لڑائی جھگڑے اور تو تو میں میں کے کوئی کام نہیں اور نہ سوائے ظاہری یا نقلی زیورات کی فکر کے دوسری فکر۔ اور سچ بھی ہے مگر برعکس بقدر ہمت دست حسب مردوں کی سمجھ کا حال ناگفتہ بہ ہو تو عورتوں کی عقل کا کیا کہنا؟ بیچاریوں کی پہنچ اب یہیں تک محدود ہوگئی ہے کہ خوبصورتی ہے تو زیور سے۔ امارت ہے تو زیور سے۔ عزت ہے تو زیور سے۔ حرمت ہے تو زیور سے۔ غرض کہ جو کچھ ہے زیور سے ہے اور جسقدر صفتیں عورتوں میں ہونی چاہییں وہ سب زیور سے وابستہ ہیں۔ اگر زیور ہے تو سب کچھ ہے ورنہ کچھ نہیں اور یہ خیال دن بدن پختہ ہوتا جاتا ہے۔

اس میں کلام نہیں کہ زیور قابل قدر چیز ہے۔ مثل مشہور ہے کہ

اے زر تو خدا نہ ولیکن بخدا   ستار عیوب و قاضی الحاجاتی

لیکن زر پرستی کی رَو جس تیزی سے آجکل عوام الناس کو بہائے لیے جا رہی ہے اور جس میں سارا ہندوستان اور خاصکر میری بھولی بہنیں بے سمجھی اور لاعلمی کی وجہ سے ڈوبی جا رہی ہیں۔ قابل افسوس ہے۔ ہر گھر میں زیور اور کپڑے پر تکرار ہے۔ میاں بیوی سے اور بیوی میاں سے بیزار ہیں۔ زیور کے لیے غریب خاوند کا ناک میں دم کر رکھا ہے چوری۔ فریب۔ دغا وغیرہ وغیرہ ایسے افعال جنکا خیال تک آنا محال تھا۔ محض زیور کے لالچ سے اعمال بنتے جاتے ہیں۔ اُن کے دل میں پورا پورا یقین ہوگیا ہے کہ جب تک انکے پاس زیور نہ ہوگا لوگ عزت نکرینگے۔ بے عزت سمجھیں گے خوبصورتی بدصورتی ہو جائے گی اور سب ہنسی اُڑائیں گی۔ کیونکہ غریب سمجھیں گے۔

پر کتنا اچھا ہوتا اگر کسی طرح انکے ذہن نشین ہو جاتا کہ ان کی اصلی خوبصورتی اور سچی عزت علم اور عمل کے اصلی اور سچے زیوروں سے ہے نہ کہ ان نقلی سونے چاندی کے فرضی زیوروں سے جن میں بجز رنج کے راحت اور بجز نقصان کے فائدہ نہیں۔ ہاتھ۔ پاؤں۔ کان۔

ناک ۔سر۔ گلا۔ غرضکہ بدن کا بند بند بندھ جاتا ہی۔ بوجھ کے مارے کان۔ ناک پھٹ جاتے ہیں۔ پاؤں ہڈیوں کے بوجھ سے اُٹھانے مشکل ہو جاتے ہیں۔ دن رات سوتے جاگتے ان کی حفاظت میں حیران وپریشان رہنا پڑتا ہی۔ خدانخواستہ چوری ہو جائے یا کھو جائے تو سخت سے سخت رنج سہنا پڑتا ہی۔ ٹوٹ پھوٹ کا خوف ہردم سر پر سوار رہتا ہی۔ ساروں کی نازبرداریوں اور چالاکیوں سے جی گھبرا جاتا ہی۔

لیکن زیور ہی دین۔ اور زیور ہی ایمان ہی۔ ہر وقت زیوروں ہی کا دھیان۔ دیکھتی ہیں زیوروں کی بدولت آئے دن پچاسوں قتل ہوتے ہیں۔ سینکڑوں معصوم بچے بیدردی سے زیور کی بھینٹ چڑھائے جاتے ہیں۔ اور ایسے بے انتہا خوف کی وجہ سے زیور آزادی سے پہنے بھی نہیں جاتے۔ صرف دھرے رہتے ہیں۔ فقط زیور ہی کی وجہ سے عورتیں راہ چلتے ڈرتی ہیں۔ قدم قدم پر خطرہ کا خیال ہی۔ گویا زیور سے زندگی محال ہی پر زیور نہیں چھوڑا جاتا۔

زر از بہر آسایش تن ہست   نہ کہ تن از بہر جمع کردن زر

مثل مشہور ہی۔ لیکن آسایش تن سے یہ مطلب نہیں ہی کہ روپیہ کو زیور کے سانچے میں ڈھالکر جسم ڈھانک لو۔ اور اسکو دین وایمان سمجھو۔

پیاری بہنو! بھلا بتاؤ تو گارگی کے پاس کتنا سونا تھا اور میتری کے پاس کتنا روپیہ سیوری کے پاس کتنا دھن تھا اور میراں کے پاس (گو وہ ایک راجہ کی بیٹی اور راجہ کی بہو تھی) کتنی دولت؟ کیا مہارانی تارامتی کی وقعت۔ سری مہارانی سیتا جی کی عزت۔ مہارانی دمینتی۔ سلوچنا۔ مندودری۔ لیلاوتی۔ پکھاوتی۔ پدماوتی سنجوگتا۔ بھلا۔ یا زمانہ حال کی شری متی شرلا دیوی۔ ہردیوی۔ گنگا بائی وغیرہ وغیرہ صدہا عورتوں کی شہرت زیور کی بدولت ہی؟

تم ضرور کہو گی کہ نہیں ہرگز نہیں، پھر جان بوجھکر غلطی کرنا کونسی عقلمندی ہے۔

تم سمجھتی ہو کہ سر کی شوبھا[1] سیس۔ پھول۔ جھومر۔ بینہ۔ بندے۔ سہارے۔ کانٹے نگر اور چاند سے ہے۔ تم نے سوچ رکھا ہے کہ کان کی خوبصورتی بالی، پتے۔ یا کرن پھول جھمکے سے ہے۔ ناک کی لطافت نتھ یا بلاق سے ہے۔ اور گلے کی موزونیت گلوبند۔ یا چمپاکلی سے۔

تمہیں یقین ہے کہ سینہ کی صفائی دھکدھکی۔ پچلڑی۔ یا بدھی اور پان ہار پر منحصر ہے بازوؤں کی خوب صورتی۔ کلائی کی نازکی ہاتھ کی شوبھا۔ انگلیوں کی سندرتا[2] تمہارے خیال سے محض بازوبند۔ جوشن۔ پچھیلی پہن۔ پونچی۔ کڑے۔ جہانگیری۔ ہتھ پھول۔ چھلے اور انگوٹھیوں سے ہے۔

تم نے سمجھ رکھا ہے کہ تمہارے پاؤں کی نزاکت چوڑی۔ کڑے۔ بچھے۔ بلے۔ پازیب۔ جھانجھ بغیر نہیں معلوم ہو سکتی۔ اور اسی غلط یقین کی وجہ سے تم ہر طرح کے جائز و ناجائز طریقہ سے زیور بنوانے میں کوشاں ہو۔ لیکن افسوس یہ نہیں سمجھتی ہو کہ یہ نمائشی زیور اور لباس تمہاری ظاہری نمائش کو ضرور بڑھا دے گا۔ لیکن اصلی خوبصورتی اور سچی عزت اس سے کوسوں دور ہے۔

تم نے اپنی آنکھوں سے پچاسوں عورتیں دیکھی ہونگی جو سونے میں پیلی اور چاندی میں سفید ہونگی۔ مگر کیا اُن کی ویسی ہی عزت تھی جیسی رامائن والی شبری کی۔ یا اہلیا کی۔ بہنو! یاد رکھو تمہاری اصلی خوبصورتی اور سچی عزت اینٹ پتھر یا چاندی سونے میں نہیں ہے یہ زیور نقلی یا فرضی ہیں تمہارے اصلی زیور تمہارے گن اور کرم ہیں۔

گارگی کے پاس زیور نہ تھا گن تھا۔ میراں کے پاس دولت نہ تھی وسواس[3] تھا۔ لیلاوتی کا نام اسکے اعلیٰ دماغ کی بدولت مشہور ہے جسنے علم حساب میں سکہ بٹھا رکھا ہے ریکھاوتی ریکھا گنت کی عالمہ مشہور ہے۔ شری مہارانی سیتاجی بن میں دولت کی بدولت

---

۱ زینت ۲ خوبصورتی ۳ اعتبار۔

عزت نہیں پاتی نہیں بلکہ پت برت دھرم کی وجہ سے منددرری۔ سولوچنا۔ عقلمندی اور شوہر پرستی کے لیے مشہور رہیں نہ کہ زیور کے لیے۔ دمینتی تاراوتی بے مثل جفاکشی کے لیے۔ عزت کی مستحق ہیں۔ پدماوت سنجوگتا ستی ہوجانے سے مشہور رہیں نہ کہ زیور کے لیے۔

اور اسی طرح زمانۂ حال کی قابل پرستش خاتونیں۔ علم واخلاق پاکیزگی اور سچائی وغیرہ اچھے گنوں کے لیے مشہور رہیں نہ کہ صورت اور زیور کے پہننے سے۔

میری پیاری بہنو! تمھارے سر کی شوبھا تمھاری بلند خیالی سے ہوگی۔ تمھارے چہرے کی ضیا تمھاری خوش اخلاقی سے چمکے گی۔ ناک کی عزت ناک قائم رکھنے سے ہوگی۔ کان کی شوبھا اس میں ہے کہ بری بات سنی اَن سنی کرجاؤ۔ زبان کی شوبھا پان سے نہیں بلکہ میٹھی بولی سے ہے۔ آنکھوں کی خوبصورتی سرمہ سے نہیں بلکہ شرم سے ہے۔ گلے کی خوبصورتی بیکسوں کو گلے لگانے سے ہے۔ بازوؤں کی قدر کمزوروں اور بیکسوں کو سہارا دینے سے ہے۔ ہاتھ کی خوبصورتی دان پن کرنے اور ڈوبتے ہوؤں کے ہاتھ پکڑنے سے۔ انگلیوں کی شوبھا تسبیح پھیرنے یا عمدہ کتاب لکھنے میں ہے۔

غرضیکہ اسی طرح تمام جسم کے لیے بلکہ ظاہر و باطن اندریوں تک کے لیے پرماتما نے اصلی زیور عطا فرمائے ہیں۔ جنکو پہنکر عورتیں ایسی خوب صورت اور باعزت بن سکتی ہیں کہ جن کی خوبصورتی میں ضعیفی تو ضعیفی مرنے کے ہزارہا سال بعد تک فرق نہیں آتا۔ یہ زیور ایسے ہیں کہ پہننے اور دیکھنے والا دونوں خوش ہوتے ہیں۔ ان زیوروں سے ہاتھ پاؤں سیاہ نہیں ہوتے۔ نہ یہ زیور استعمال سے گھستے ہیں بلکہ دونے چمکدار ہوتے جاتے ہیں۔

پیاری بہنو! ان زیوروں کو تم خود پہنو اور دل بھر کر بانٹ دو۔ یہ کم نہونگے بلکہ زیادہ بڑھیں گے۔ ان زیوروں کے لیے نہ چور کا ڈر۔ نہ قتل ہونے کا خطر۔ نہ کسی سے مانگنے کی ضرورت نہ کسی کے دست نگر۔ نہ سنار کی حاجت۔ نہ بنوانے کی قباحت بلکہ حسب خواہش

حسب مرضی ہر وقت ہر جگہ تمہارے اختیار میں ہیں۔ جیسا چاہو پہنو۔ دینا چاہو دو۔ بانٹنا چاہو بانٹو۔ بہنو ان سچے زیوروں بغیر وہ نقلی زیور بھی دو کوڑی کے ہو جاتے ہیں۔ ان زیوروں کی بھی جبھی خوبصورتی ہے جب عورت ان اعلیٰ اخلاقی اور روحانی زیوروں سے مرصع ہو۔

میری بہنو! اب تم بتاؤ کہ تم کون سے زیور کی قدر کرتی ہو۔ کیا اب بھی تمہارے دل میں انہیں جھوٹے زیوروں کی محبت ہے۔ اگر ہے تو کم کردو اور اپنی طبیعت ان سچے اور اچھے زیورات کے حاصل کرنے میں لگاؤ۔

ایک روایت مشہور ہے کہ ایک بادشاہ نے ایک دوسرے بادشاہ کے پاس امتحان کی غرض سے مٹی کی دو پُتلیاں نہایت نفیس لباس اور کئی ہزار روپیہ کے مرصع زیورات سے مزین روانہ کیں اور دریافت کیا کہ ان کی قیمت بتاؤ۔ کونسی دو لاکھ کی ہے اور کونسی دو کوڑی کی؟

بادشاہ پتلیوں کو دیکھکر حیران ہوگیا۔ دونوں ہر بات میں برابر نظر آتی تھیں سوچنے لگا قیمت کا کیونکر اندازہ کروں۔ عقلمند وزیر نے بھی پتلیوں کو لیکر ہاتھ میں دیکھا اور ایک سینک لیکر امتحان کیا۔ پھر ایک کا موںھ کالا کرکے بالکل برہنہ کردیا اور دوسری کے گلے میں ایک بیش قیمت مالا ڈالکر دونوں پتلیاں واپس کردیں۔

جب بادشاہ نے وجہ پوچھی تو بیان کیا کہ جہاں پناہ! میری سینک ایک پُتلی کے کان میں ڈالنے سے پیٹ میں چلی گئی اور دوسری کے موںھ سے نکل پڑی۔ بس جسکے موںھ سے کان کی سُنی بات نکل پڑے وہ ذلیل اور جو پیٹ میں رکھے وہ عقیل ہے۔ یہی نتیجہ ہے۔

اب خیال کرو کہ عورت کی ایک صفت جب عورت کی عزت میں اسقدر فرق کرسکتی ہے تو اُس خاتون کی عزت کا کیا اندازہ ہو جو ہمہ صفت موصوف ہو۔

چاند رانی

از (زمانہ)

شادی

جناب شمس العلما مولانا سید علی صاحب بلگرامی کے فرزند ارجمند سید مجتبیٰ علی بلگرامی کی شادی کتخدائی مورخہ ۲۶ مئی بروز جمعہ بوقت بعد نماز ظہر انجام کو پہنچی۔

شادی بالکل سیدھی سادھی مطابق شرع کے ہوگئی۔ نہ باجا نہ گا جا نہ ریت نہ رسم دولہا والوں کے جو لوگ تھے انہیں مدراس کے مشہور ہوٹل سپنسر ہوٹل میں اتار اگیا وہاں ہر طرح کا آرام آسایش کا پورا پورا بندوبست کیا گیا۔ موٹر کار۔ لینڈو وغیرہ ہروقت تیار جہاں چاہے چلے جاؤ جب تک چاہے سواری لو۔ برقی پنکھے۔ برقی روشنی سمندر کے کنارے کی خوشگوار ہوا۔ حالانکہ گرمی کا زمانہ تھا مگر معلوم نہ ہوتا تھا کہ دن کیسے کٹا۔

ہر صبح ہر شام دولہن والے خود آتے تھے۔ اور یہ لوگ بھی جاتے تھے دولہن کے والد ماجد آہا ماشاء اللہ سبحان اللہ ایسا باحوصلہ ایسا بامروت ایسا خلیق ایسا ملنسار ایسا غریب مزاج شاید ہی کوئی ہوگا۔ ہم نے تو ایسے لوگ بہت کم بلکہ دوبارا دیکھنے میں نہیں آئے۔

دولہن کے والد اور نانا صاحب یہ لوگ ہمہ صفت موصوف ہیں۔ اخلاق، آداب مہماں نوازی وغیرہ خدا نے کچھ انہیں لوگوں کو عطا فرمائی ہے حالانکہ دولہن کے نانا صاحب ڈپٹی کلکٹر اور والد ماجد پولیس سپرنٹنڈنٹ ہیں مگر ان لوگوں میں غرور تکبر نام کو نہیں۔ مہماں نوازی میں انکو عجیب وغریب ملکہ خدا نے عطا فرمایا ہے۔ خاندانی ایسے کہ خاندان نواب کرناٹک سے ہیں۔ مگر نام کو غرور نہیں۔

ہوٹل جسمیں اتارا تھا یہ کوئی معمولی ہوٹل نہ تھا بلکہ سارے مدراس میں ممتاز سب عمدہ کھانا ملتا تھا۔ نہایت عمدہ۔ نہایت لطیف۔ نہایت پاکیزہ۔ ہوٹل میں انہوں نے

اسلیئے اتار اکہ شاید خاطر تواضع میں کوئی کسر باقی نہ رہ جائے اور کسی طرح کی تکلیف نہو۔ میں ہزار مرتبہ ان صاحبوں کی تعریف کیے بغیر نہ رہوں گی۔ ان صاحبوں کے عجیب ہی عجیب اخلاق و آداب ہیں ایسے ہر دلعزیز ہیں کہ میں آپسے کیا بیان کروں۔ میری تو دعا ہے کہ خدای بزرگ ہماری ساری قوم میں ایسے ہی لوگ پیدا کر دے۔ میں نے تو آپ سے کہدیا ہی کہ بہمہ صفت موصوف۔ شرع کے اس قدر پابند کہ اگر میں کچھ لکھوں تو آپ مبالغہ تصور کریں۔

سب تو سب انہوں نے ساری عمر میں ابتک پان حقہ یا کسی قسم کی اور ایسی ہی چیز چھوئی نہیں۔ غرض کہانتک لکھوں وہ فرشتہ صفات صاحب ایسے ہی ہیں کہ میں اُنکے اوصاف لکھ بھی نہیں سکتی ہوں۔ اور اسپر لڑکی بھی ملی تو ایسی جیسے نایاب جواہر۔ درحقیقت چشم بد دور لڑکے نے بہت اچھی قسمت پائی ہی۔

لڑکی تعلیم یافتہ انگریزی ایسی اچھی بولتی ہی جیسی اپنی مادری زبان اور لکھتی بھی ایسا ہی ہی ملنسار۔ کم گو۔ خوش گفتار نہایت شیریں بیاں۔ بہت حسین نہایت خوش اخلاق۔ کفایت شعار۔ جس سے ملے ایک ہی مرتبہ کی ملاقات میں اسکو اپنا رام کرلیتی ہی۔ غرضکہ ہر طرح قابل تعریف۔

لڑکی کے والد ماجد نے لڑکی کو جہیز وغیرہ کچھ نہیں دیا بلکہ باغات وغیرہ اور جو کچھ لڑکی کے نام نقد روپیہ جمع تھا سب کچھ داماد کے حوالے لڑکی کے نام سے کر دیا۔

میاں بی بی نہایت محبت و یکدلی سے اپنی نئی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اللہ سے دعا ہی کہ وہ ان دونوں کو خوش و خرم رکھے اور اسکے بزرگوں کو ان کی خوشیاں دیکھنی نصیب ہوں۔

مبارک باد

یہ عیش کے دن خوشی کا عالم ہمیشہ الماس کو مبارک — کہینگے خوش ہو کے بس یہی ہم ہمیشہ الماس کو مبارک

خلوص دل سے یہ بلبلیں سب چمن میں کہتی ہیں چہچہا کر
ہزاروں یارب بہارِ موسم ہمیشہ الماس کو مبارک

یہ شان و شوکت یہ نام و شہرت رہے جہاں میں یہ جاہ عزت
یہ کرّ و فریہ عروج پیہم ہمیشہ الماس کو مبارک

چمن میں مل ملکے گارہی ہیں یہ راگ جتنی بھی بلبلیں ہیں
رہے یہ باغ و بہار جم جم ہمیشہ الماس کو مبارک

بہارِ گلشن یہ جشن گلشن لٹاتی ہے اوس جیسے موتی
یہ ابر رحمت یہ عیش ہر دم ہمیشہ الماس کو مبارک

الٰہی آپس میں دونوں ملکر رہا کریں بس ہنسی خوشی سے
عزیز اُن کے کہیں یہ باہم ہمیشہ الماس کو مبارک

مراد کے پھولوں سے الٰہی تو بھر دے دامن کو اُنکے جلدی
ہزاروں امیدیں پانا ہر دم ہمیشہ الماس کو مبارک

خدا دے عمروں میں انکی برکت خلوص دل سے رہیں دونو
یہی تمنا ہے اپنی ہر دم ہمیشہ الماس کو مبارک

علی مراہی جو دُرّ مکنوں ترقی ہو اس کی روز افزوں
یعنی مجتبےٰ علی
جہاں میں لہرائے اسکا پرچم ہمیشہ الماس کو مبارک

یہ حسن سیرت وہ حسن صورت میں روز افزوں کریں ترقی
دعا یہ کرتی عباسی بیگم ہمیشہ الماس کو مبارک

راقمہ آپکے خاتون کی پُرانی خریدار
عباسی بیگم - اہلیہ سید محمد اسمٰعیل
از حیدرآباد دکن

علم سے خطاب

اے علم تیرے نور سے روشن جہان ہے — تو وہ قمر ہے جس سے زمین آسمان ہے
کرنیں تری زمانے میں پھیلی ہیں ہر طرف — جن سے کہ بقعہ نور کا یہ خاکدان ہے

اندھیر تھا جہاں اُسے روشن بنا دیا
تاریک جو مکاں تھا اُسے جگمگا دیا

اے علم تیرا باغ عجب پُر بہار ہے — دل میرا اس بہار پہ ہر دم نثار ہے
تیرے چمن سے آتی ہے خوشبو بھری ہوا — جو صورتِ نسیم سحر خوشگوار ہے

ہاں! تو نے میرے دل کی کلی کو کھلا دیا
اور اپنے صاف چشمے کا پانی پلا دیا

اے ماہتاب روشنی تیری ہے بے زوال — روشن وہ ملک ہے۔ کہ جہاں پائے تو کمال
جس ملک پر شعاعیں تیری ہوں نہ جلوہ گر — تاریک ہے۔ تباہ ہے۔ وہ اور شکستہ حال

ہاں! اسکے رہنے والوں پہ ہوتا عتاب ہے
جاہل کو نیم وحشی کا ملتا خطاب ہے

جس دن سے تیرا ہو گیا یورپ میں راج ہے — اُس دن سے وہ تو بن گیا ملکوں کا تاج ہے
سارا جہان سیکھتا اُس سے تمیز ہے — علم و ہُنر کا عقل کا معدن وہ آج ہے

ہاں! تو نے اسکو دہر میں مشہور کر دیا
ڈالی وہ روشنی اُسے پُر نور کر دیا

یونان کی بہار تھی دم سے ترے بڑھی — اور دھاک اُسکی سارے زمانے میں تھی بندھی
جسدن سے اپنے سائے کو تو نے اُٹھا لیا — وہ دن بدل گئے وہ ہوا بھی پلٹ گئی

یونان بسکا سارا جہاں خوشہ چین ہے

تیرے بغیر ہو گیا عزلت نشین ہے

ٹیکن ابھی ہے وہ بھی سماں اپنے دھیان میں رہتا تھا جن دنوں تو ہمارے مکان میں

سارا جہان پاتا تھا جب ہم سے روشنی ہم فرد روزگار تھے ہندوستان میں

اے علم اب کدھر گئیں تیری عنایتیں

ہیں خواب اور خیال وہ پہلی حکایتیں

وہ دن خدا دکھائے کہ ہندوستان میں تیری چمک دمک ہو یہاں ہر مکان میں

اے ماہتاب آئے تری چاندنی نظر اس ملک کا بھی نام ہو روشن جہان میں

ظلمت کدہ میں دیکھوں گی جب تیرا نور میں

گھی کے دیے جلاؤں گی اُس دن ضرور میں

رقیمہ
بنت حفیظ اللہ امرتسر

بقیہ شاہ لیر

گلاسٹر کے قلعہ میں ایک کمرہ

کارنوال اور اڈمنڈ داخل ہوتے ہیں

کارنوال۔ قبل اسکے کہ میں تمہارے باپ کے گھر سے رخصت ہوں اُس کی شرارت کا اس سے پورا بدلہ لوں گی۔

اڈمنڈ۔ حضور اس بات کا خیال کرکے میرا کلیجہ دہل جاتا ہے کہ میں نے حضور کی وفاداری کے مقابل میں اپنے باپ کی شکرگزاری اور فرمانبرداری کا کچھ لحاظ نہیں کیا۔

کارنوال۔ ہاں مجھے اب معلوم ہوا کہ اس میں تمہارے بھائی کا قصور نہ تھا کہ وہ اپنے باپ کو

قتل کرنا چاہتا تھا۔ تمہارا باپ اس بات کا مستحق تھا کہ اسکو قتل کیا جاتا۔

ایڈمنڈ۔ میں کس قدر بدقسمت آدمی ہوں کہ صاف گوئی پر مجبور ہوں۔ لیکن پھر مجھے اسی صاف گوئی پر افسوس بھی آتا ہے۔ یہ ہے یہی خط ہے جو میرے باپ کے پاس فرانس کے بادشاہ نے بھیجا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اُسکا جانب دار ہے۔ اے خدا میرا باپ اس سازش میں شریک نہوتا اور اگر وہ شریک ہوا تھا تو اس سازش کا پردہ فاش کرنے والا میں بدقسمت نہ ہوتا۔

کارنوال۔ چلو میرے ساتھ بیگم صاحبہ کے پاس۔

ایڈمنڈ۔ اگر جو کچھ اس خط میں لکھا ہے وہ حقیقت میں ایک واقعہ ہے یعنی فرانس کی فوج انگلستان میں پہنچگئی ہے تو آپ کو بڑا زبردست مقابلہ کرنا پڑیگا۔

کارنوال۔ خواہ یہ واقعہ غلط ہو یا صحیح لیکن اس کی وجہ ہے آپ گلاسٹر کی گدی کے مالک ہوگئے اپنے باپ کو ڈھونڈھکر لاؤ کہ ہم اسے گرفتار کریں۔

ایڈمنڈ۔ دل ہی دل میں" اگر ایسا ہو کہ میرا باپ اور بادشاہ دونوں ایک جگہ ملیں تو کارنوال کا شبہ اور بھی پختہ ہو جائے۔ میں تو اپنی وفاداری میں بہت ثابت قدم رہونگا۔ گو اس میں بہت سی باتیں مجھے اپنے باپ کے خلاف کیوں نکرنی پڑیں۔

کارنوال۔ میں تم پر پورا بھروسہ کرتا ہوں اور تم دیکھو گے کہ تمہارے باپ سے بڑھ کر تم سے محبت کرونگا۔

سین نمبر ۶

قلعہ کے قرب میں ایک کسان کا مکان

گلاسٹر۔ لیر۔ کینٹ۔ دیوانہ اور ایڈگر داخل ہوتے ہیں

گلاسٹر۔ دیکھیے یہ جگہ کھلی۔ سرد ہوا سے کسقدر بہتر ہے۔ خدا کا شکر کیجیے اور یہاں پر آرام کیجیے اور جو کچھ سامان آسایش کا مجھ سے ہوسکیگا وہ میں ہم پہنچاؤنگا۔ اب میں جاتا ہوں اور بہت جلد

واپس آؤنگا۔

کینٹ۔ خدا آپ کو اس مہربانی کا اجر دیوے۔ لیکن بادشاہ سلامت تو اس صدمہ کی وجہ سے بالکل ہی دیوانہ ہوگئے ہیں۔

ایڈگر۔ دیوانہ کی طرح بڑ ہانکتا ہی۔

دیوانہ۔ جناب چچا صاحب مہربانی سے مجھے بتائیے کہ ایک دیوانہ آدمی کو آپ جنٹلمین کہینگے یا گنوار؟

لیر۔ میں دیوانہ آدمی کو بادشاہ کہونگا بادشاہ۔

دیوانہ۔ نہیں گنوار تو وہ شخص ہی جسکا بیٹا ایک جنٹلمین ہو۔ کیونکہ وہ گنوار دیوانہ ہی جو اپنے بیٹے کو جنٹلمین بناتا ہی۔

لیر۔ ہزار جلتی ہوئی بھٹیوں میں سے آگ کے شعلے نکل نکلکر انکو ہڑپ کرجائیں (ریگن اور کارنوال)

ایڈگر۔ ظالم بھوت میری پیٹھ کاٹے کھاتا ہی۔

دیوانہ۔ وہ شخص بالکل ہی پاگل ہی جو ایک بھیڑیے کو اپنے گھر میں کھلکر مطمئن ہوجاے کہ وہ ہل گیا ہے اور ایک بچہ کی محبت پر بھروسہ کرے۔ یا بدچلن آدمیوں کی قسموں پر اعتبار کرے۔

لیر۔ اب تو یہ ہوکر رہیگا۔ میں ابھی اُن کو گرفتار کرتا ہوں (اپنی بیٹیوں کے متعلق کہتا ہی) ایڈگر۔ آپ یہاں تشریف لائیے۔ آپ سب سے بڑے قابل اور انصاف والے جج ہیں۔ دیوانہ صاحب آپ بھی یہاں تشریف لائیے۔ آپ بھی بڑی لائق ہیں۔ اور یہاں کچہری بناکر بیٹھ جائیے۔ اب آپ کے سامنے ان بھیڑنیوں کو پیش کرتا ہوں۔

ایڈگر۔ بڑ ہانکتا ہی۔

دیوانہ۔ بڑ ہانکتا ہی۔

ایڈگر۔ بڑ ہانکتا ہی۔

کینٹ۔ حضور کی طبیعت کیسی ہی۔ حضور ایسے پریشان کیوں معلوم ہوتے ہیں ذرا آرام سے

لیٹیے۔ یہ بچھونا اور تکیے ہیں۔
لیر۔ نہیں میں سب سے پہلے اس عدالت سے اپنا انصاف کراؤنگا (ایڈگر سے) جناب جج صاحب آپ بیٹھ جائیے (دیوانہ سے) جناب آپ بھی تو بڑے انصاف کرنیوالے جج ہیں آپ بھی تشریف رکھیے (کینٹ کی طرف) جناب آپ کو بھی اس انصاف کی عدالت میں پنچ قرار دیتا ہوں آپ بھی بیٹھ جائیے۔
ایڈگر۔ لیجیے ہم انصاف کرتے ہیں (سُریلی آواز میں گاتا ہے) گڈریے صاحب کیا آپ جاگ رہے ہیں یا سو رہے ہیں۔ آپ کی بھیڑیں تو کھیت کھا رہی ہیں۔ آپکے ذرا سے اشارہ پر وہ آپ کی پرواہ نہ کرینگی۔ اور پھر ہانکتا ہے
لیر۔ لاؤ سب سے پہلے گانرل کو گرفتار کر لاؤ۔ میں اس صدر عدالت کے سامنے حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ اسی نے غریب بادشاہ اپنے باپ کو جوتی سے ٹھکرا کر اپنے گھر سے نکالدیا۔
دیوانہ۔ آئیے بیگم صاحبہ کیا آپ کا نام گانرل ہے (یہ سب باتیں فرضی ہو رہی ہیں۔ گانرل ورگین کوئی موجود نہیں ہے)
لیر۔ وہ انکار نہیں کر سکتی۔ اسکا نام ضرور گانرل ہے۔
دیوانہ۔ خدا کی پناہ۔ میں یہ سمجھا کہ آدمی نہیں ہے بلکہ لکڑی کا بُت ہے۔
لیر۔ یہ دیکھو یہ دوسری آئی جسکے تیوروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اسکے دل میں کسقدر زہر بھرا ہوا ہے دیکھو دیکھو جانے مت دو۔ بھاگنے مت دو۔ تلوار لاؤ۔ بندوق لاؤ۔ روکو معلوم ہوتا ہے کہ سب کے سب یہاں راشی ہیں۔ کیوں بے ایمان جج اسے جانے کیوں دیا۔
ایڈگر۔ کیا حواس خمسہ بالکل جاتے رہے۔
کینٹ۔ حضور کس قدر افسوس کی بات ہے کہ حضور ہمیشہ فخر سے بیان کرتے تھے کہ مجھ میں بڑا تحمل ہے اب وہ تحمل کیا ہوا۔
ایڈگر۔ (اپنے دل میں) اب میری آنکھوں سے آنسو نکلا ہی چاہتے ہیں اور یہ تمام بھیس ویس

میرا خاک میں ملجائیگا۔ تمام میرا راز فاش ہو جائیگا۔

لیر۔ دیکھو سب قسم کے کتے۔ ناڑی۔ ل ڈاک۔ لینڈی میری طرف دیکھ دیکھکر بھونکتے ہیں۔

ایڈگر۔ میں ان سب کو یہاں سے بھگا دونگا۔ چلو بھاگو یہاں سے۔

لیر۔ آؤ سب سے اول ریگن کا سینہ چاک کر کے دیکھیں کہ اس میں کیا بلا بھری ہوئی ہے کیا اس کی سرشت میں کوئی ایسی چیز ہے جسنے اسکے دل کو ایسا سخت کر دیا (ایڈگر کی طرف اشارہ کرکے) لیجیے صاحب میں آپ کو اپنے ہاں ملازم رکھتا ہوں اور آپ میرے سو سواروں میں سے ایک سوار ہونگے۔ لیکن مجھے آپ کا یہ لباس کچھ پسند نہیں گو آپ کہیں گے کہ آپ ایک بڑا لباس فاخرہ پہنے ہوئے ہیں مگر مہربانی سے اسکو بدل دیجیے۔

کینٹ۔ حضور تھوڑی دیر تک لیٹ جائیے۔

لیر۔ اب غل مت مچاؤ۔ خاموش ہو جاؤ۔ پردہ ڈالدو۔ اب ہم رات کا کھانا صبح کو کھا دینگے۔

دیوانہ۔ میں تو دوپہر کو بچھونا بچھا کر سوؤنگا۔

گلاسٹر پھر لوٹ کر آتا ہے۔

گلاسٹر۔ بادشاہ سلامت میرے آقا کہاں ہیں۔

کینٹ۔ وہ یہاں پڑے ہیں۔ لیکن انکے حواس بالکل جاتے رہے۔ اس وقت ان کو مت چھیڑنا۔

گلاسٹر۔ بھائی خدا کے واسطے ابھی بادشاہ کو اپنی پیٹھ پر اُٹھا کر یہاں سے لیچلو۔ میں ابھی اپنے کانوں سے سُن آیا ہوں کہ اسکی بیٹیاں اُسکے قتل کی سازش کر رہی ہیں۔ باہر ایک پالکی رکھی ہے اُس میں جاکر بادشاہ کو لٹا دو اور جس قدر جلد ممکن ہو بادشاہ کو ڈوور کی طرف لیچلو (ڈوور ایک بندرگاہ تھی جہاں فرانسیسیوں کی فوج اُتری ہوئی تھی) ڈوور پہنچکر آپ کو بہت سے لوگ ملینگے جو آپ کی حفاظت کرینگے۔ اور کھانے کو دینگے۔ جلدی سے بادشاہ کو اُٹھالو۔ اگر آدھ گھنٹہ بھی سستی کروگے تو بادشاہ اور اُنکے ساتھ تم اور اور جسقدر ہونگے سب تہ تیغ ہو جائینگے

اُٹھاؤ اُٹھاؤ جلدی کرو۔ میرے ساتھ آؤ کہ میں زادراہ کا کچھ جلدی سے انتظام کردوں۔

کینٹ۔ مصیبت زدہ دل کو ذرا چین ملا تھا اور خاموشی سے سو گیا تھا۔ ممکن تھا اس آرام کی وجہ سے اُنکے دماغ کو کچھ سکون ملتا مگر اب مجبوری ہے اور مرض لا علاج ہو جانیکا اندیشہ ہے (دیوانہ سے) تم بھی اپنے آقا کو اُٹھانے میں مدد دو تم بیٹھے کیا کر رہے ہو۔

گلاسٹر۔ آؤ چلو جلدی چلو۔

(کینٹ۔ گلاسٹر اور دیوانہ بادشاہ کو اُٹھا کر لے گئے)

ایڈگر۔ جب ہم اپنے سے بڑے اور اچھے لوگوں کو اسی قسم کی مصیبتوں میں مبتلا دیکھتے ہیں جس میں کہ ہم خود مبتلا ہیں تو ہماری تکالیف بہت ہلکی ہو جاتی ہیں۔ جب کوئی مصیبت تنہا ہم پر نازل ہوتی ہے اور دوسروں کو ہم ظاہری شان و شوکت کے ساتھ چین اور اطمینان کی حالت میں دیکھتے ہیں تو ہمارے دل پر ایک بڑا سخت صدمہ پہنچتا ہے۔ لیکن جب دوسروں کو بھی ہم اُسی قسم کی تکلیفوں میں دیکھتے ہیں تو ہمارا دل اپنے کو بہت کچھ تسلی دیکر اپنی تکلیف کم کر دیتا ہے۔ اب اسوقت مجکو اپنی تکلیف کس درجہ ہلکی معلوم ہوتی ہے جبکہ میں بادشاہ کو اس سے بدرجہا زیادہ تکلیف میں مبتلا دیکھتا ہوں اُس کی مصیبت اسکی اولاد کی وجہ سے ہے۔ اور مجھپر میرے باپ کی وجہ سے آئی۔ لیکن سنو۔ کیا شور ہو رہا ہے شاید لوگ بادشاہ کا تعاقب کرنے کو آئے ہیں۔ چلو ہم تو کہیں چھپ جائیں اور جب تک میرے والد غلط فہمی میں پڑ کر میری جان کے دشمن ہو رہے ہیں۔ میں اپنی جان بچائے رکھوں۔ آج نہ معلوم اور کیا کیا دیکھنے میں آئیگا۔ خدا کی پناہ چلو چھپو۔

ساتواں سین

قلعہ گلاسٹر میں ایک کمرہ

کارنوال۔ ریگن۔ ایڈمنڈ اور ملازم داخل ہوتے ہیں۔

کارنوال (گانرل سے) آپ ایجلدی سے سوار ہو جائیے اور یہ خط جاکر اپنے شوہر کو دکھائیے۔ فرانس کی فوج تو سر پر آپہنچی (نوکروں سے) چلو جاؤ جلدی جاؤ۔ بد ذات گلاسٹر کو کہیں سے ڈھونڈھ لاؤ۔

ریگن۔ اُسے فوراً سولی پر لٹکا دو۔

گانرل نہیں نہیں اسکے آنکھوں کے ڈھیلے نکال کر پھینک دو۔

کارنوال۔ اب اس بات کو رہنے دیجیے کہ میں اسکو کیا سزا دیتا ہوں۔ ایڈمنڈ تم ہماری ہمشیرہ صاحب کے ہمراہ جاؤ۔ جس قسم کا انتقام ہم تمہارے باغی باپ سے لینا چاہتے ہیں ہم نہیں چاہتے کہ تم اُسکو اپنی آنکھ سے دیکھو۔ اور ہمارے ساڑھو سے جاکر کہو کہ اپنی طرف سے جسقدر جلد ممکن ہو لڑائی کی بہت اچھی تیاری کر کے نکلیں اور ہم بھی پوری تیاری کر رہے ہیں وقتاً فوقتاً ہمارے اور انکے درمیان سوار دوڑتے رہیں گے اور خبریں پہنچاتے رہینگے۔ میری پیاری ہمشیرہ الوداع آپ سوار ہو جائیے۔ شہزادہ گلاسٹر آپ بھی سوار ہو جائیے۔

(ایڈمنڈ کو شہزادہ گلاسٹر کے نام سے خطاب کیا کیونکہ گلاسٹر کی جائداد چھین کر ایڈمنڈ کو دیدی گئی)

(اوسورڈ اسٹیج پر آتا ہے)

کارنوال۔ کہو بھئی بادشاہ کہاں ہے۔

اوسورڈ۔ لارڈ گلاسٹر بادشاہ کو تیس چالیس سواروں کے ہمراہ اور نیز بعض ملازمین و مزارعان گلاسٹر کے ساتھ ڈوور کی طرف لیگئے ہیں اور فخر سے کہتے گئے ہیں کہ وہاں ہمکو مسلح فوج اپنی حفاظت کے لیے ملیگی۔

کارنوال۔ اچھا بیگم صاحبہ کیلیے گھوڑے لاؤ۔ اب میری عزیز ایڈمنڈ اور پیاری بہن میں آپ سے رخصت ہوتا ہوں

گانرل۔ خدا حافظ۔

(گانرل۔ ایڈمنڈ۔ اوسورڈ چلے جاتے ہیں)

کارنوال (ملازموں سے) جاؤ اس بدذات گلاسٹر کو کہیں سے گرفتار کر کے مشکیں باندھکر میرے سامنے لے آؤ گو اسوقت اسکا قتل کرنا بلا کسی باقاعدہ قانونی تجویز کے نامناسب ہوگا۔ مگر ہم اپنا غصہ فرو کرنے کے لیے اُس سے وہ سلوک کر سکتے ہیں جسکے لیے گو لوگ ہمیں الزام دینگے مگر ہمیں کوئی روک نہیں سکیگا۔

یہ سامنے کون ہے؟ ہاں وہی بدذات ہے۔

(ملازم گلاسٹر کو سامنے گرفتار کر کے لاتے ہیں)

رنگین۔ یہ وہی ناشکرا بدذات بندر ہے۔

کارنوال۔ اسکے سوکھے ہاتھوں کو خوب کسکر اس کی پیٹھ کے پیچھے باندھ دو۔

گلاسٹر۔ آپ کا کیا مطلب ہے صاحب۔ آپ ذرا غور کیجیے کہ آپ میرے مہمان ہیں کوئی اس قسم کی بدسلوکی آپ مجھ سے نہیں کر سکتے۔

کارنوال (نوکروں سے) تم اسے باندھتے کیوں نہیں ہو۔ سنتے بھی ہو۔

رنگین۔ خوب ہی کسکر باندھو۔ کیوں بدذات باغی۔

گلاسٹر۔ سخت دل اور بیرحم بیگم میں باغی نہیں ہوں۔

کارنوال۔ اس کرسی کے ساتھ اسے باندھ دو۔ بدذات تجھے ابھی معلوم ہو جائیگا۔

(رنگین گلاسٹر کی ڈاڑھی نوچتی ہے)

گلاسٹر۔ مجھے خدای لایزال کی قسم ہے کہ اس سے بڑھکر اور کوئی نالایق حرکت نہیں ہوسکتی کہ اس طرح سے میری ڈاڑہی اس طریقہ سے نوچی جائے۔

رنگین۔ یہ بڑھاپا اور اس قدر بغاوت۔

گلاسٹر۔ بدطینت بیگم۔ یہ بال جنکو تو اسقدر بیحرمتی سے نوچ نوچ کر پھینک رہی ہے یہ زندہ ہوکر بولیں گے اور تم کو ملزم قرار دینگے۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں تمہارا میزبان ہوں۔ میری مہمان نوازی کا یہ صلہ نہیں ہے کہ تم مثل ڈاکوؤں کے میری ایسی دُرگت کرو۔ اب بتاؤ تم کیا چاہتے ہو۔

کارنوال۔ اب بتاؤ کہ فرانس سے تمہارے پاس کیا خطوط پہونچے ہیں۔

رنگین۔ صاف جواب دو۔ واقعات تو ہم کو معلوم ہی ہو چکے ہیں۔

کارنوال۔ اور اُن باغیوں کے ساتھ تم نے کیا کیا سازشیں کی ہیں جو آمادہ فساد ہو رہے ہیں۔

رنگین۔ اور بادشاہ کو کسکے ساتھ اور کہاں بھیجا ہے۔ بولو۔

گلاسٹر۔ میرے پاس ایک خط آیا تھا جو ایسے شخص کی طرف سے تھا جو کسی فریق کا جانبدار نہیں ہے اور وہ بھی اسکے قیاسات پر مبنی تھا۔ کسی مخالف کا کبھی کوئی خط میرے پاس نہیں آیا۔

کارنوال۔ یہ تمہاری دہوکہ بازی ہی۔

رگین۔ بلکہ سراسر جھوٹھ ہی۔

کارنوال۔ بتاؤ بادشاہ کو کہاں بھیجا۔

گلاسٹر۔ ڈوور کو بھیجا ہی۔

رگین۔ کیوں ڈوور کو بھیجا۔ کیا تم کو حکم نہیں دیا گیا تھا۔

کارنوال۔ خیر حکم کو تو جانے دو۔ یہ بتاؤ کہ ڈوور کو کیوں بھیجا۔ اسی کا جواب دو۔

گلاسٹر۔ میں تمہارے سامنے پڑا ہوں۔ ہاتھ پاؤں بندھے ہیں۔ اب میں کیا جواب دوں۔

رگین۔ بس یہی جواب دیدو کہ ڈوور کیوں بھیجا۔

گلاسٹر۔ مینے اسلیے بھیجا کہ مجھے یہ دیکھنا منظور نہیں تھا کہ تم اپنے خوں ریز ناخنوں سے بادشاہ کی آنکھیں نکالو۔ نہیں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تمہاری خونخوار بہن اپنی سوئر یلے سے دانت اُسکے پاک جسم میں گھونپ دیتی۔ آندھی اور طوفان کا یہ عالم تھا کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ سمندر اُبل پڑیگا اور آسمان تک پہنچکر ستاروں کی مشعلیں بجھا دیگا۔ مگر باوجود اسکے بادشاہ برہنہ سر ظالم سر رات کی تاریکی میں کھڑا بارش کی زیادتی کے لیے دعائیں مانگ رہا تھا۔ اگر ایسے وقت میں ایک بھیڑیا بھی آکر آپکے دروازہ پر چلاتا تو آپ رحم سے پسیج کر اپنے دربان کو حکم دیتیں کہ اسکے لیے دروازہ کھولدو اور اُسکے سب ظلموں اور شرارتوں کو بھول جاتیں۔ خیر میں ایسی ولاد پر کوئی آفت نازل ہوتی ضرور دیکھونگا۔

کارنوال۔ نہیں آپ کو کبھی ایسا دیکھنا نصیب نہ ہوگا۔

ارے اس کرسی کو مضبوط پکڑو۔ اور لو تمہاری اس آنکھ کو میں اپنے بونٹ سے سلکر کچلے دیتا ہوں۔

گلاسٹر۔ ارے خدا کیلیے اپنی جوانی کے صدقہ سے مجھے کوئی مدد دو۔ او ظالم کیا غضب کیا۔

رگین۔ ابھی تو ایک ہی پھوٹی ہی۔ دوسری اگر قائم رہیگی تو وہ اس بیچاری کا مذاق اڑائیگی۔ اسے بھی پھوڑ دو۔

کارنوال۔ لو انتقام ایسا ہوتا ہی۔

ایک ملازم۔ حضور بس۔ اب رک جائیے۔ مینے بچپن سے لیکر اسوقت تک آپ کی خدمت کی ہی مگر اس سے بہتر

آجتک میں نے کبھی کوئی کام نہیں کیا کہ میں آپسے کہوں کہ رک جائیے اور حد سے نہ گذریے۔

رگین۔ کیوں رستے گئے اسکے کیا معنی ہیں۔

ملازم۔ بیگم صاحب تم اگر مرد ہوتیں اور تمہارے ڈاڑھی ہوتی تو میں اس جھگڑے میں آپ کو مزا چکھاتا آپ لوگ کیا ظلم کر رہے ہیں۔

کارنوال۔ یہ میرا بد ذات ملازم اور یہ گستاخی (دونوں تلوار کھینچکر لڑنے لگے)

ملازم۔ آئیے۔ پھر میں بھی اسوقت غصہ میں بھرا ہوں۔ آپ کو ان حرکات کا مزا چکھا دوں۔

رگین۔ لاؤ ایک تلوار تو مجھے دو۔ ایک گنوار اس طور پر تلوار کھینچکر کھڑا ہو جائے (ایک تلوار لیکر پیچھے سے جاکر ملازم کو مارتی ہی)

ملازم۔ ہائے افسوس میں تو اب مرتا ہوں (گلاسٹر کی طرف مخاطب ہو کر) جناب من آپ کی ایک آنکھ تو ابھی بفضل خدا ہی۔ دیکھ لیجیے آپ کا بدلہ لیا یا نہیں (مر گیا)

کارنوال۔ اب میں دوسری آنکھ سے تجھے زیادہ نہیں دیکھنے دونگا۔ لو یہ نکلی گئی۔ بتاؤ اب کہاں ہی تمہاری آنکھ کی روشنی۔

گلاسٹر۔ اب روشنی کہاں۔ دنیا تاریک اور تکلیف کا سامنا ہی۔ میرا بیٹا ایڈمنڈ کیا ہوا۔ بیٹے ایڈمنڈ کیوں تیرا خون جوش نہیں مارتا۔ اور کیوں تو اس سخت بیرحمی کا انتقام نہیں لیتا۔

رگین۔ بد ذات باغی تجھے شرم نہیں آتی جو شخص تم سے اس قدر نفرت کرتا ہی اُسی سے مدد مانگ رہے ہو یہ وہی تو ہی جسنے تمہاری بغاوت کا پردہ ہمارے سامنے فاش کیا وہ ایسے نالایق پر رحم نہیں کر سکتا۔

گلاسٹر۔ آہ میں اپنی حماقت کو اب سمجھا کہ میرا بیٹا ایڈگر بالکل بے گناہ تھا۔ اے خدا تو اسکو خوش رکھ اور سرسبز کر۔

رگین۔ جاؤ اسکو دروازہ سے باہر پھینک آؤ کہ اپنا راستہ ٹٹول ٹٹول کر ڈوور پہنچے۔ (کارنوال کی طرف مخاطب ہوکر) آپ کا چہرہ متغیر کیوں ہو گیا۔

کارنوال۔ بیگم مجکو ایک کاری زخم لگا ہی اور بہت خون بہ رہا ہی۔ بہت بے وقت یہ زخم لگا۔ مجھے ذرا

سہارا دیکر دوسرے کمرہ میں لیجلو۔ اور اس بدذات اندھے کو باہر جاکر گھورے پر پھینک آؤ۔

(کارنوال کو ریگن دوسرے کمرے میں لیجاتی ہی)

دوسرا ملازم۔ اگر شاہزادہ کارنوال اس زخم سے نہ مرا تو میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھے کیا کچھ نہ کرنا پڑیگا (وہ اس طرف اشارہ کرتا ہی کہ اگر اس زخم سے نہ مرا تو میں اُسے مار ڈالونگا)

تیسرا ملازم۔ اگر ریگن بڑھاپے تک زندہ رہکر معمولی موت سے مرے گی تو شاید سب عورتیں چڑیلیں بن جائینگی۔

دوسرا ملازم۔ آؤ ہم چلکر اُس پاگل کو جو برہنہ پھرتا ہی شاہزادہ گلاسٹر کے ساتھ کردیں کہ وہ اُسے کہیں لیجائے

تیسرا ملازم۔ تم آگے چلو۔ میں تھوڑی سی سینگ اور انڈے کی سفیدی لاتا ہوں کہ اُس کی زخمی آنکھوں پر لگادوں کہ اسکو کچھ آرام ملے۔ اے خدا تو اس کی مدد کر۔

(باقی آیندہ)

اڈیٹوریل

ریویو

نمبر۱۔ مارکوئس اٹیو کے دلچسپ حالات۔ نمبر۲۔ مارکوئس یاماگاٹا کے دلچسپ حالات

یہ دونوں سالے منشی شرف الدین احمد خاں صاحب ہیڈ کلرک جیل ریاست رامپور کی تالیف سے ہیں اور سلسلۂ مشاہیر جاپان انہوں نے تالیف کر کے شائع کرائے ہیں۔ مارکوئس اٹیو اور مارکوئس یاماگاٹا موجودہ جاپان کے اُن چند ارکان میں سے ہی جن کی وجہ سے وہ گذشتہ چالیس سال کے عرصہ میں تحت الثریٰ سے فلک البروج پر پہنچا ہی۔ ۱۸۶۸ء سے پہلے جاپان کو کون جانتا تھا مگر آج مغرب کے کسی بڑے سے بڑے سلطنت کے ہم پلہ ہونیکا دعویٰ کرتا ہی۔ یہ سب کچھ انہیں چند نفوس کے قدموں کی برکت سے ہی جن میں مارکوئس اٹیو اور یاماگاٹا بھی ہیں۔ یہ لوگ حب الوطنی۔ اور ایثار نفسی کی زندہ تصویریں ہیں مسلمانوں کو انکے حالات ضرور پڑھنے چاہییں۔ منشی شرف الدین احمد خاں صاحب

سے ہم معافی مانگنے کے بعد یہ کہیں گے کہ یا تو اُنکے پاس کافی مصالحہ نہیں ہے اور یا اُنھوں نے کافی توجہ نہیں کی ہے۔ ورنہ ایسے بڑے بڑے لوگوں کے ایسے قابل حالات سے پڑھنے والوں کے دل پر کچھ بہت اچھا اثر نہیں ہوتا۔ اگر ایسے لوگوں کی زندگی کے پورے حالات میں سے ایک سواں حصہ بھی منتخب کر کے دیا جائے تو ایک معقول رسالہ بنیگا۔ پندرہ پندرہ صفحے کے نہایت چھوٹی تقطیع کے رسالے دنیا کے اتنے بڑے مشاہیر کی سوانح عمریاں محض ایک مذاق معلوم ہوتا ہے بہرحال جو کچھ منشی صاحب موصوف نے کیا ہے وہ بھی غنیمت ہے۔ ان کی قیمت ار فی رسالہ ہے اور منشی شرف الدین احمد خاں صاحب ہیڈ کلرک جیل ریاست رامپور کے پتہ سے ملتے ہیں۔

جناب مہاراجہ صاحب پٹیالہ نے فیروزپور کے مدرسہ نسواں کو جو ایک سکھوں کا مدرسہ ہے دس ہزار روپیہ نقد اور چھ سو ماہواری کا عطیہ دیا۔ ہم اپنے ہموطن سکھ صاحبان کو مبارکباد دیتے ہیں کہ اُن کی قوم میں ایسے بڑے روشنخیال شہزادے موجود ہیں جن کی فیاضی اور امداد سے وہ خاطرخواہ ترقی کر سکتے ہیں۔ ہم کو یہ بھی سُنکر بڑی مسرت ہوئی کہ سکھوں کی قوم میں تعلیم کا بہت چرچا پھیلتا جاتا ہے۔ اور ہمارے ایک بزرگ دوست جنکو اکثر پنجاب کے دیہاتوں اور قصبات میں دورہ کرنیکا اتفاق ہوا ہے انھوں نے اپنے چشم دید واقعات بیان کیے کہ سکھوں میں تعلیم کا زبردست خیال اور خاص جوش پیدا ہو گیا ہے اور جسکا یہ نتیجہ ہے کہ جملہ دیہات و قصبات میں اپنے الگ لڑکے اور لڑکیوں کے مدرسے قایم کر دیے ہیں اور کرتے جاتے ہیں۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے تہیہ کر لیا ہے کہ ہم میں سے مرد و عورت کوئی بھی جاہل نہ رہے۔ نہایت خوشی کی بات ہے ہم کو دلی مسرت ہے۔ اور اپنی قوم سے یہ التجا ہے کہ اگر خود اپنی امنگ سے نہیں تو اپنے بھائیوں کی دیکھا دیکھی تو کچھ کریں۔

زنانہ کالج کا جلسہ۔ فیمیل ٹرینگ کالج بڑودہ کا ایک غیر معمولی جلسہ گذشتہ شنبہ کو منعقد ہوا تھا جس میں ریاست کی معزز خواتین نے شرکت فرما کر اسکی رونق دوبالا کر دی۔ ولی عہد صاحب کی رانی صاحبہ

اس جلسہ کی صدر تھیں۔ اسکول اور کالج کی کارروائی کا معائنہ کیا گیا۔

حب الوطنی کی ایک عجیب مثال۔ ٹرکی کی زندہ اور غیرتمند عورتیں عثمانی بیڑے کی امداد میں بڑی فراخ حوصلگی سے چندہ دے رہی ہیں۔ یہ خبریں اکثر پڑھنے میں آتی ہیں کہ فلاں بیگم نے اپنے زیورات انجمن معاون بحریہ کو دیدیے۔ فلاں بیگم نے اپنے بیش قیمت کپڑے فروخت کرکے اُن کی قیمت سے عثمانی بیڑے کی امداد کی۔ لیکن ایک عجیب و غریب و رتازہ مثال چندہ دینے کی اخباروں میں نظر سے گذری کہ ایک تُرک خاتون نے جو بہت مفلس تھی اور مالی چندہ نہیں دے سکتی تھی۔ اُسنے سوچا کہ میں اس سعادت سے کیوں محروم رہوں اُسنے یہ ترکیب سوچی کہ اپنے سر کے گھونگروالے سیاہ بال جو اسکی زینت تھے اور بہت پیارے تھے کاٹکر انجمن بحریہ کے پاس بھیجدیے کہ اسکو فروخت کرکے اسکی قیمت چندہ میں شامل کیجائے انجمن مذکور نے اس غیور خاتون کا نہایت دلی شکریہ ادا کیا اور اس حب الوطنی کی ملک میں دھوم مچ گئی۔

مادر مہربان کی تحریر۔ شہنشاہ بیگم الگزنڈرا نے ذیل کی تحریر بنگال کی ہندو مسلمان خاتونوں کے نام روانہ کی ہے اُس ہمدردی کے جواب میں جو انہوں نے شہنشاہ ایڈورڈ کی وفات کے متعلق اظہار کیا تھا۔

بکنگھم پلیس۔

لیڈی منٹو نے میری سخت مصیبت میں چند در چند پیغامات اظہار ہمدردی کے پہنچائے تھے جو اس قدر ہیں کہ اگر میں فرداً فرداً اُن کا جواب لکھوں تو ناممکن ہے۔ امید ہے کہ میری ہندوستانی بہنیں اسکو قبول کریں گی۔ سلطنت کے جملہ اطراف سے اس قسم کی دلسوزی کے پیغامات نے میرے دل پر خاص اثر کیا ہے آنجہانی روشن ضمیری اور دانائی سے اپنی رعایا کے ساتھ کمال حقہ محبت رکھتے تھے ان الفاظ سے میں خاص طور پر متاثر ہوئی ہوں کہ تم نے میری مشکلات میں حصہ لیا۔ تمہارا خیال میری جانب ایسے وقت میں ایک اچھا دلاسا ہے آنجہانی ایڈورڈ ہفتم رعیت کو ایک نظر سے دیکھتے تھے اور رعایا کی بہبودی و بہتری کی طرف خاص توجہ رکھتے تھے تم نے جو پیغام بھیجا ہے وہ تسلی کا ذریعہ ہے۔

الگزنڈرا

ہمارے کرم فرما سید اکبر حسین صاحب جج کا خط۔ خاتون کے کسی پچھلے نمبر میں ہمنے لکھا تھا کہ سید اکبر حسین صاحب ہمیں پردہ کا مخالف خیال کرتے ہیں" اسکے جواب میں سید صاحب موصوف نے مندرجہ ذیل خط ہم کو بھیجا ہے:

جناب من۔

امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہو۔ مدت سے ملاقات نہیں ہوئی۔ مشتاق ہوں زندگی ہے تو ملونگا سنا ہے کہ رسالہ خاتون میں میری کچھ شکایت چھپی ہے کہ یہی حضرت بتان ہند کو روکے ہوئے ہیں اور ترقی اسلام نہیں ہوتی۔ اگر درحقیقت تمام زنان ہند میری ایسی مطیع ہیں تو میں گویا سلیمان یا راجہ اندر ہوں۔ مگر شیخ صاحب میں یقین دلاتا ہوں کہ مجھپر بہتان عظیم ہے۔ میں مخالفت نہیں کرتا زمانہ بدل گیا۔ جب میاں کی تعلیم دوسری ہے تو بی بی کو پردہ میں بیٹھکر الم نشرح پڑھنا بالکل بیجا ہے۔ میرے اشعار پر نہ جائیے۔ میں شراب کی تعریف کرتا ہوں تو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ ایک کاپی رسالہ خاتون مذکور کی فوراً بھیجدیجیے۔ فقط ۲۱۔ اکتوبر

افسوس کہ ابتک جج صاحب کی خدمت میں وہ کاپی خاتون کی نہ پہنچی۔ ہم نے یہ نہیں لکھا تھا کہ وہ تعلیم نسواں میں رکاوٹ ڈالتے ہیں۔ بلکہ انکے بعض اشعار اور خیالات سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ہمکو پردہ کا مخالف خیال کرتے ہیں۔ لیکن اس خط سے انکے خیالات کا اظہار ہوگیا۔

گزشتہ نمبر خاتون میں سچی رفاقت کے عنوان سے مس ر بیگم کے نام سے جو مضمون چھپا ہے وہ رابعہ سلطان بیگم اہلیہ مسٹر تہنیت علیخاں صاحب سکرٹری جٹھولی اسٹیٹ کا لکھا ہوا ہے۔ چونکہ وہ شادی سے قبل کا لکھا ہوا مضمون تھا اسلیے غلطی سے مس چھپ گیا۔

نمائش الہ آباد۔ اس نمائش میں زنانہ درجہ کے متعلق ایک پردہ کلب کا بھی انتظام کیا گیا ہے جو عالیجناب مسز بلی پوور صاحبہ کی حسن کوشش کا نتیجہ ہے۔ اس کلب میں داخل ہونیکے لیے جو مستورات

براہ راست گورنمنٹ ہاؤس نینی تال پتہ سے درخواست کرینگی انہیں مسز ممدوحہ تقاریب عمومی کے ساتھ شرکت کی دعوت دینگی۔ اس کلب میں تمام ضروری سامان آسایش کے علاوہ پردہ کا نہایت قابل اطمینان انتظام کیا گیا ہی۔ پردہ نشین مستورات کو مطلق پس و پیش نہ کرنا چاہیے۔

پرتگال میں ایک عظیم الشان انقلاب۔ سلطنت پرتگال جو یورپ میں ایک مشہور سلطنت ہی اور جسکے کچھ مقبوضات ہندوستان میں بھی ہیں۔ وہاں کی رعایا بہت عرصہ سے اس جوڑ توڑ میں تھی کہ جمہوری سلطنت قائم کرے۔ وہاں پارلیمنٹری حکومت تھی اور خود رعایا کے منتخب کیے ہوے ممبر اسکے قانون بناتے تھے۔ مگر باوجود اسکے ان لوگوں نے شاہی خاندان کو ملک کے لیے بوجھ سمجھ رکھا تھا۔ اسی زمانہ میں شاہی حکم سے ایک ڈاکٹر جو ملک میں بہت ہر دلعزیز تھا قتل کر دیا گیا۔ اس پر رعایا نے بغاوت کر دی۔ بحری فوج اور کسی قدر بری فوج بھی باغیوں کے ساتھ ہو گئی تھی۔ انہوں نے شاہی طرفداروں کو شکست دی۔

بادشاہ اور بادشاہ بیگم دونوں نے بھاگ کر لندن میں پناہ لی۔ اور رعایا نے بدیں تین دن کے اندر جمہوری سلطنت قائم کر لی۔ امید نہیں کہ اب بادشاہ پرتگال کو پھر بادشاہی نصیب ہو کیونکہ جمہوریت کی بنیاد بہت پختہ معلوم ہوتی ہی۔

رجسٹرڈ نمبر اے ۲۰۱

خاتون

جلد ۶ | بابت ماہ نومبر ۱۹۱۰ء | نمبر ۱۱

اڈیٹر شیخ محمد عبداللہ بی۔اے۔ ایل۔ایل۔بی۔ سکرٹری تعلیم نسواں سکشن

فہرست مضامین

محمد عبدالسلام پرنٹر کے اہتمام سے

مطبع فیض عام علی گڑھ میں طبع ہوا

یکم دسمبر ۱۹۱۰ء

شیخ عبداللہ بی۔اے پبلشر نے علی گڈھ سے شائع کیا

خاتون

۱۔ یہ رسالہ ۴۰ صفحے کا علی گڈھ سے ہر ماہ میں شائع ہوتا ہی اور اس کی سالانہ قیمت (ایک روپیہ ۱۲ آنے) اور ششماہی عہ/۱۴ ہے۔

۲۔ اس رسالہ کا صرف ایک مقصد ہی یعنی مستورات میں تعلیم پھیلانا اور پڑھی لکھی مستورات میں علمی مذاق پیدا کرنا۔

۳۔ مستورات میں تعلیم پھیلانا کوئی آسان بات نہیں ہی اور جبتک مرد اس طرف متوجہ ہونگے مطلق کامیابی کی امید نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ اس خیال اور ضرورت کے لحاظ سے اس رسالے کے ذریعے مستورات کی تعلیم کی اشد ضرورت اور بے بہا فوائد اور مستورات کی جہالت سے جو نقصانات ہورہے ہیں اس کی طرف مردوں کو ہمیشہ متوجہ کرتے رہینگے۔

۴۔ ہمارا رسالہ اس بات کی بہت کوشش کریگا کہ مستورات کے لیے عمدہ اور اعلیٰ لٹریچر پیدا کیا جائے جس سے ہماری مستورات کے خیالات اور مذاق درست ہوں اور عمدہ تصنیفات کے پڑھنے کی اُن کو ضرورت محسوس ہو تاکہ وہ اپنی اولاد کو اس لطف سے محروم رکھنا جو علم سے انسان کو حاصل ہوتا ہی معیوب تصور کرنے لگیں۔

۵۔ ہم بہت کوشش کرینگے کہ علمی مضامین جہانتک ممکن ہو سلیس اور بامحاورہ اُردو زبان میں لکھے جائیں۔

۶۔ اس رسالے کی مدد کرنے کے لیے اسکو خریدنا گویا اپنی آپ مدد کرنا ہی اگر اس کی آمدنی سے کچھ بچے گا تو اس سے غریب اور یتیم لڑکیوں کو وظائف دیکر استانیوں کی خدمت کے لیے تیار کیا جائے گا۔

۷۔ تمام خط وکتابت و ترسیل زر بنام اڈیٹر خاتون علی گڈھ ہونی چاہیے۔

خاتون

ترقی تعلیم واشاعت اسلام

مندرجہ بالا عنوان پر نفیس دلہن صاحبہ نے یہ نہایت عالمانہ مضمون لکھ کر بھیجا ہے جسے ہم ہدیہ ناظرین کرتے ہیں بعض متعصب اور دشمن اسلام عیسائی یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام تعلیم کا مخالف ہی۔ لیکن اس اعتراض میں جس قدر تعصب اور عداوت ہی اُسی قدر جہالت اور اسلام سے بے خبری بھی شامل ہی اسلام ہمیشہ سے علوم کی ترقی کا حامی رہا ہی۔ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں حکم دیا کہ قل رب زدنی علما یعنی اے نبی تو دعا مانگ کہ اے رب میرے علم کو بڑھا۔ آنحضرت روحی فداہ نے علم کی جس قدر زبردست الفاظ میں تعریف کی ہی دنیا میں آجتک کسی نے نہ کی ہوگی۔ آپ نے فرمایا ہی کہ "عالم کی روشنائی شہیدوں کے خون سے زیادہ قیمتی ہی" پھر فرمایا ہی کہ "علما دوش بدوش انبیاء کے ہیں"

ایک مرتبہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کو آپنے حکم دیا کہ تم لوگ جب کہیں جنت پاؤ تو اس میں چر لیا کرو۔ لوگوں نے پوچھا کہ یا رسول اللہ کیسی جنت۔ آپنے فرمایا کہ جب کہیں عالم کو دیکھو تو اُس کی

صحبت سے فیض حاصل کیا کرو۔

اسی قسم کی بیسیوں حدیثیں علم کی فضیلت میں وارد ہوئی ہیں۔ یہی وجہ ہو کہ سرورِ کائنات نے اپنی امت کے مردوں اور عورتوں پر علم کو فرض عین کر دیا۔ اور فرمایا کہ طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم و مسلمۃ یعنی علم کی تحصیل ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہو"

عملاً بھی حضور نے علمی ترقی کی بنیاد ڈالی۔ یعنی جس وقت آپ کو باری تعالیٰ کی طرف سے نبوت عطا ہوئی اُس وقت تمام عرب میں صرف دس یا بارہ آدمی ایسے تھے جو پڑھ لکھ سکتے تھے۔ حضور کی یہ خواہش تھی کہ ان لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد زیادہ ہو۔ چنانچہ بدر کی لڑائی میں چند کافر ایسے گرفتار ہوئے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ آپ نے اُن کا فدیہ یہ مقرر فرمایا کہ ہر ایک کافر ایک ایک مسلمان کو پڑھنا لکھنا سکھا دے اور آزاد ہو جائے۔

زمانہ گزشتہ سے مغرب اور مشرق کے حکما، اس بات پر متفق تھے کہ عورتوں کو پڑھانا لکھانا نہ چاہیے لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مردوں اور عورتوں دونوں کو علم کی مجلس میں برابر کی جگہ دی اور دونوں پر علم کی تحصیل فرض کر دی۔ ازواج مطہرات میں سے حضرت حفصہؓ جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بیٹی تھیں پڑھنا اور لکھنا جانتی تھیں۔ حضرت عائشہؓ گو کہ پڑھی لکھی نہ تھیں۔ کیونکہ اس زمانہ میں ہر شخص کا پڑھنا لکھنا بہت دشوار تھا مگر علوم حدیث و قرآن و تفسیر میں خود مسلمان مردوں میں انکے پاسکے بہت کم لوگ تھے۔

الغرض اسلام اور علم کی ترقی دونوں لازم و ملزوم چیزیں ہیں۔ علم مسلمانوں کے فرائض اولین میں سے ہو اور انہوں نے اپنے ہزار سالہ عروج کے زمانہ میں جو علمی ترقی کر دکھائی ہو وہ اس بات پر دلیل کامل ہو۔

نفیس دلہن صاحبہ نے اس مضمون میں حضرت عمرؓ کی علمی کوششوں کو بیان کیا ہو اور دکھلایا ہو کہ وہ علم کے کس قدر حامی تھے۔ یہی حال تمام علما، و خلفا، اور بادشاہان اسلام کا رہا ہو۔ علم دنیا کیلیے ایسا ہی ہو جیسے انسان کے جسم کیلیے روح۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں۔

خاتم ملک سلیمان ہست علم جملہ عالم صورت وجان ہست علم

ہ شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں۔

بنی آدم از علم یابد کمال نہ از حشمت و جاہ و مال و منال

چو شمع از پئے علم باید گداخت کہ بے علم نتواں خدا را شناخت

اڈیٹر

ہم کو ہمیشہ اپنی قومی تاریخ غور سے دیکھنی چاہیے تاکہ مقدس اشخاص کی روشنی جو خدا کی قدرت مجسم تھے ہم پر پڑتی رہے۔ یاد رکھنے کی بات ہے کہ جو قوم اپنی اصل تاریخ بھول گئی وہ پھر کسی طرح نہیں اُبھر سکتی۔ سید اکبر حسین صاحب نے کیا خوب کہا ہے۔

قوم کی تاریخ سے جو بے خبر ہو جائیگا رفتہ رفتہ آدمیت سے وہ خر ہو جائیگا

میں آج کے مضمون میں تاریخ اسلام کا ایک چھوٹا سا حصہ بعنوان بالا ناظرات خاتون کی خدمت میں پیش کرتی ہوں۔ وھو ہذا۔

مذہب کی چھان بین اور تعلیم وتلقین پر خلافت فاروقی کا بڑا احسان ہے اس لیئے فاروق اعظم نے تعلیم کو بہت ترقی دی۔ اپنی تمام قلمرو میں ابتدائی مدارس قائم کر دیئے جن میں قرآن مجید اخلاقی نظم۔ امثال عرب اور علوم مروجہ کی تعلیم بخوبی ہوتی تھی۔ چاروں طرف علماے صحابہ حدیث وفقہ کی تعلیم پر متعین تھے۔ مدرسوں اور طالب علموں کو معقول تنخواہیں دی جاتی تھیں۔

آپ بزور شمشیر مذہب پھیلانے کے سخت مخالف تھے اور قرآن مجید کی آیۃ لا اکراہ فی الدین پر بلا تاویل عمل فرماتے تھے۔ خود آپ کا غلام جب باوجود ہدایت وترغیب کے مسلمان نہ ہوا تو آپنے لا اکراہ فی الدین کہکر اُسے چھوڑ دیا۔

فوج کشی کے موقع پر ہر سپاہی اور افسروں کو یہ تاکید ہوتی تھی کہ اول لوگوں کو بسہولت دین کے اصول وعقائد سمجھانا اور جبر وتعدی نہ کرنا۔ اسی لیے ہر فوج کا افسر صاحب علم وفقیہ ہوتا تھا۔ اگر تلوار کے زور سے مسلمان کرنا مقصود ہوتا تو علما وفقہا کی کیا ضرورت تھی اُسے تو

ہر سپاہی کر سکتا تھا۔ مسلمانوں کو ہمیشہ یہ ہدایت ہوتی تھی کہ غیر قوموں کو اسلام کا اچھا نمونہ دکھائیں تاکہ لوگ خود بخود اسلام کی طرف کھنچے چلے آئیں۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کے عہد میں اسلام بکثرت شائع ہوا۔

آپ نے اہل اسلام کو ایسے سانچے میں ڈھالا تھا کہ وہ اصلی نمونہ دین اسلام کا بن گئے تھے آپکے وقت کا ہر مسلمان سچائی۔ زہد و تقویٰ۔ پاکیزگی۔ سادگی۔ اخلاق۔ جوش اور دینداری کی تصویر مجسم تھا۔ مسلمانوں کے یہ ستودہ و حمیدہ اوصاف۔ دین کی صفائی و سچائی وہ کام کرسکتے جو تلوار سے ہونا مشکل تھا۔ بقول کارلائل "اگر کسی کا دین تلوار کے زور سے پھیل سکے تو ہم بخوشی اجازت دیتے ہیں کہ پھیلائے"۔ ہمارا اسلام شمشیر کے زور پر نہیں بڑھا بلکہ فاروقی تدابیر کا زور اب بھی اُسے تھامے ہوئے ہے۔

جارج رومیوں کا سفیر امین الامۃ حضرت ابوعبیدہ بن الجراح کے تقدس اور ان کی فوج کے مسلمانوں کے عمدہ اخلاق سے متاثر ہو کر مسلمان ہو گیا۔ اور اپنی ساری قوم اور تمام خاندان کو چھوڑ دیا۔ شطا بلاد مصر کا مشہور رئیس مسلمانوں کے حالات ہی سن کر دو ہزار آدمیوں کے ساتھ اسلام لایا۔ نیز یزدجرد کی فوج میں چار ہزار آدمی دیار دیلم کے تھے جو قادسیہ کی جنگ میں مسلمان ہو گئے۔ حضرت سعد نے اُن کو کوفہ میں بسا کر تنخواہیں مقرر کیں۔

مدارس میں لکھنا بھی سکھایا جاتا تھا۔ تمام اضلاع میں احکام فاروقی پہنچ گئے تھے کہ سب لوگ اپنے بچوں کو گھوڑے کی سواری اور لکھنا پڑھنا سکھائیں۔ ابو عامر سلیمہ اپنی نسبت خود بیان فرماتے ہیں کہ جب میں مدرسے بھیجا گیا تو اُستاد نے مجھے لکھنے کو کہا۔ میں میم نہیں بنا سکتا تھا تو وہ مجھے یوں بتاتے تھے کہ گول بناؤ جیسے گائے کی آنکھ ہوتی ہے"۔

فاروق اعظم نے تعلیم قرآن کو تمام زمانے میں رائج کر دیا تھا۔ چنانچہ حضور کی زندگی ہی میں ناظرہ پڑھنے والے تو شمار میں نہیں آسکتے تھے۔ حافظوں کی تعداد بھی ہزاروں تک پہنچ گئی تھی۔

سید القرار ابی بن کعب جن کی قرأت اور عمدگی حفظ کی مدح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بارہا فرمائی تھی۔ تعلیم قرآن کے لیے مہتمم مقرر ہوئے تھے۔ معاذ بن جبل۔ عبادہ بن صامت۔ ابو ایوب۔ ابو درداء نے بھی پورا قرآن پاک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے سامنے حفظ کر لیا تھا۔ انسے بھی تعلیم قرآن میں بہت مدد ملتی تھی۔ یہانتک کہ کلام مجید کا نقطہ نقطہ زبان زد خاص و عام ہوگیا۔

آپنے جب افسران فوج کو لکھا کہ "حفاظ قرآن کو تعلیم کے لیے میرے پاس بھیجدو" تو سعد بن وقاص نے جواب دیا کہ آپ تکلیف نہ فرمائیں میری فوج میں تین سو حافظ موجود ہیں۔ جنھوں نے حضرت جبریل علیہ السلام کو اپنی آنکھوں سے قرآن لاتے ہوئے دیکھا تھا انھیں کے سامنے دنیا کے ہر گوشہ میں ہماری مقدس کتاب پہنچ گئی۔ جناب فاروق اعظم کی دقیقہ رس طبیعت سے یہ امر بعید تھا کہ وہ بیخ اسلام کی طرف سے غفلت کرتے۔ ہر جگہ یہ حکم تاکیدی پہنچ گیا تھا کہ تعلموا اعراب القران کما تعلمون حفظہ یعنی قرآن کے اعراب کی ایسی ہی حفاظت رکھو جیسے اُسکے الفاظ کی رکھتے ہو۔

دوسرا حکم تحفظ قران کی بابت یہ جاری کیا کہ تعلموا الفرائض واللحن والسنن کما تعلموا القرآن یعنی قرآن کے فرائض و سنن و لحن کو اُتنا ہی محفوظ رکھنا جتنا قرآن کی حفاظت رکھتے ہو۔

تعلیم قرآن کے ساتھ ہی علم ادب و عربیت کی تعلیم بھی فرض عین کر دی تھی تاکہ لوگ خود اعراب کی غلطیاں درست کریں۔ حدیث کی تحقیق میں نہایت باریک بینی و احتیاط سے کام لیا۔ خاص خاص صحابہ آپکے عہد میں حدیث موںھ سے نکال سکتے تھے۔ عوام کی مجال نہ تھی کہ از روے حدیث کوئی روایت بیان کرسکتے۔ اس سے آپ کی اعلیٰ درجہ کی دانشمندی و نکتہ سنجی ظاہر ہوتی ہے۔

ابو درداء اور عبادہ بن صامت کو شام، معقل بن یسار۔ عبداللہ بن مغفل اور

عمران بن حصین کو بصرہ۔ عبداللہ بن مسعود وغیرہ کو کوفہ بھیجکر لوگوں کو لکھدیا تھا کہ ان کی احادیث سے متجاوز نہ ہونا۔ قرآن و حدیث کے بعد فقہ کی طرف بڑے شد و مد سے متوجہ ہوئے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ علی الاطلاق امت کے افقہ ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہ صورت تھی کہ جو آپ کو کرتے دیکھتے تھے اُس کی تقلید کیا کرتے تھے۔ فرض و واجب کی توضیح تھی نہ ارکان و آداب کی تشریح غیر ضروری اور غیر موجود چیز کی نسبت سوال ہی بے معنی سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے حضور کے زمانہ میں فقہ کی ضرورت ہی کم پڑی۔ بعد میں جب فتوحات کو ترقی ہوئی اور نئے نئے معاملات پیش آئے تو مجمل احکام کی تشریح لازم ہوئی۔ اسی ضرورت سے صحابہ کو اجتہاد کرنا پڑا۔ چار آدمی مجتہدوں میں اول ہیں۔

حضرت عمرؓ۔ حضرت علیؓ۔ عبداللہ بن مسعودؓ۔ عبداللہ ابن عباس

حضرت عمرؓ باوجود احتیاط کے مسائل فقہ کے اجتہاد میں بلند پایہ رکھتے تھے آنحضرت صلعم نے خود فرمایا ہے کہ عمرؓ بڑا افقیہ ہے مسائل کی تحقیق میں اُس کی طرف رجوع کیا کرو فاروق اعظم ہمیشہ عالم و فقیہوں کو افسر بناتے تھے یہی وجہ ہے کہ آپ کے ملکی و فوجی افسروں کی فہرست میں حضرت ابو عبیدہ۔ معاذ بن جبل۔ ابو موسیٰ اشعری۔ سلمان فارسی وغیرہم کے نام نامی نظر آتے ہیں۔

راقمہ
نفیس دلہن
از کوٹھی بنادیبی
علی گڈھ

کتب بینی
نمبر ۲

کتاب ہم کو مختلف زبانوں میں مختلف باتیں بتاتی ہے۔ بچپن کے زمانہ میں ہم کو عمدہ اخلاق اور تربیت کی باتیں سکھاتی ہے۔ زمانہ شباب میں ہم کو وہ اچھی راہ اور نیکی کی باتیں بتلاتی ہے۔ بڑھاپے اور بیکاری کے وقت میں ہم کتاب سے اپنے دل کو بہلاتے ہیں۔ فکر و تردد کے وقت میں ہمارا اطمینان کرتی ہے۔ رنج و فکر کی حالت میں ہمارے دل و دماغ کو دوسری طرف متوجہ کرتی ہے۔ اور ہمارا غم غلط کرتی ہے۔ اور بہت سی ایسی باتیں نکلینگی کہ ہم اگر خیال کریں تو ہم کو ہر وقت مدد دینے کے واسطے تیار رہتی ہے جس سے ہم اطمینان حاصل کر سکتے ہیں۔

میرا حافظہ اس وقت کام نہیں دیتا کہ خدا جانے میں نے کس کتاب یا رسالہ میں ایک عورت کے قلم سے ایک کم سن لڑکے کا قصہ لکھا ہوا دیکھا ہے۔ لکھتی ہے کہ

اتفاقاً ایک روز میں ایک کتب فروش کی دوکان پر جا نکلی۔ مجھے ایک کتاب کی ضرورت بھی تھی۔ میں وہ دریافت کرنے لگی۔

ایک کم عمر لڑکا آیا اور اس کتب فروش کی دوکان پر آکر اس کے کتب خانہ میں داخل ہوا اور ایک کتاب اُٹھاکر بڑے ذوق و شوق سے دیکھنے لگا۔ دوکاندار نے جب یہ دیکھا تو اُس لڑکے کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ میاں لڑکے تم روز آتے ہو اور کتابوں کو دیکھ کر چلے جاتے ہو اور کبھی کوئی کتاب خریدتے تک نہیں۔ بس اب یہاں کتب بینی کو معاف رکھیے گا۔ اور کتابوں کو خراب نہ کیجیے گا۔

یہ سُنکر لڑکا بہت رنجیدہ ہوا اور کتاب کو پٹک کر خاموش یہ کہتا ہوا چلا گیا

کہ کاش مجکو پڑہنا نہ آتا تو کیوں اس کمبخت کتب فروشں کی اتنی باتیں سنتا پھر کہتی ہے کہ

چاہیئے تھا کہ اس لڑکے کو علم سے شوق جاتا رہتا اور وہ رفتہ رفتہ اپنی تعلیم کو چھوڑ دیتا۔ نہیں یہ نہیں کیا بلکہ اُسکے دل میں اور وقعت پیدا ہوگئی۔ اور وہ بڑے اشتیاق سے پڑہتا رہا۔ ایک زمانہ کے بعد وہ لڑکا اپنے زمانہ میں اپنے سامنے کسی کو دم نہیں مارنے دیتا تھا اور اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔

اب ہم کو کس قدر آسانی سے کتابیں دستیاب ہوسکتی ہیں۔ ایک پہلا زمانہ تھا کہ ایک کتاب اگر کسی نے تصنیف کی تو وہ اُسی کے پاس رہ سکتی تھی۔ اگر کوئی بہت ہی علم کا شوقین ہوا اور اسکو علم سے بہت ہی دلچسپی ہوئی تو وہ اُس کی ایک نقل بڑی مدت میں کرسکتا تھا تب اسکو اپنے پاس رکھکر فائدہ اُٹھا سکتا تھا۔

بہرحال شاید ہی ایک کتاب کی دو چار نقلیں ہوا کرتی تھیں بلکہ بہت سی قلمی کتابیں آپکے دیکھنے میں ایسی آئیں گی کہ ابتک وہ ایک ہی اصل ہیں نہ وہ چھپی اور نہ کسی نے نقل کی۔ میں نے پُرانی کتابیں جنکا بڑی دقت سے سنہ کا پتہ چلتا ہے دیکھی ہیں اور وہ ابتک بڑے بڑے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ اصل سے اور کتب خانوں میں ان کتابوں کی نقلیں ہوکر جایا کرتی ہیں اور اصل بڑی حفاظت سے رکھی جاتی ہیں۔ بلکہ عام لوگوں کو اصل کتاب بھی مطالعہ کیلیے نہیں دی جاتی ہے۔ اُس کی نقل سے لوگ فائدہ اُٹھاتے ہیں۔

اس کی کیا وجہ تھی کہ وہ کتابیں ہم کو آسانی سے میسر نہیں آسکتی تھیں۔ وجہ یہ تھی کہ نہ تو اُس زمانہ میں اتنی ترقی علم کی تھی اور نہ ایسی کلیں اور آلات موجود تھے کہ جنکے ذریعہ سے بہت جلد اور کثرت کے ساتھ طبع ہوتیں۔

دیکھیے اب کس قدر آسانی کا زمانہ آگیا ہے کہ آپ ایک کتاب یا مضمون نثر یا نظم میں لکھیں

اور چند گھنٹے کے بعد اُسکو پبلک کے سامنے پیش کر دیجیے۔

آپ نے اپنے جسم کو بڑھانے کے لیے بہت سی باتیں ایجاد کی ہیں کہیں سینڈو سسٹم ہے کہیں ڈنڈ اور مگدر ہلاتے ہیں۔

لوگ مگدر ہلاتے ہیں تاکہ کلائی میں طاقت آئے اور بنائے ڈنڈ لگاتے ہیں تاکہ چھاتی بڑھ جائے۔ علی ہٰذالقیاس دوسری انگریزی ورزشیں۔

اسی طرح آپ اپنے دماغ کو اگر طاقتور اور قوی اور زبردست بنانا چاہتے ہیں تو آپ بڑے بڑے لوگوں کے مضامین دیکھا کریں اور اُن کی تصانیف سے آپ فائدہ اُٹھائیں اور اُن کے خیالات سے آپ مستفید ہوں۔

خاکسار

محمودالحق سہارنپوری

قوم کی خدمت میں اپیل

قطعہ

غنیمت ہیں اگلے زمانے کے لوگ — نہیں اُن میں مطلق تن آسانیاں
نہیں تھکتے محنت سے ہرگز کبھی — جو درپیش آجائیں دشواریاں
کوئی سیکھے اُنسے اخوت کا ڈھنگ — کوئی سیکھ لے ان سے دانائیاں
انہیں کے ہی دم سے زمانہ میں فیض — جہاں میں ہیں ان کی جہاں بانیاں
دماغ ان کا روشن ہے دل ہے قوی — یہ ممکن نہیں ہوں بدعنوانیاں
خیالات ان کے وسیع و رفیع — زبردست ان کی خوش اخلاقیاں
بزرگوں کی برکت ہے اے رابعہ — کہ ہر سمت ہیں نغمہ پردازیاں

چند روز تک متعدد اخبارات میں مولوی مشتاق حسین صاحب وقارالملک بہادر کے عہد

سکرٹری کالج سے بوجہ اسکے کہ اُن کی صحت جسمانی اچھی نہیں ہے علیحدہ ہونے کے متعلق خبریں شائع ہوتی رہیں۔ منجملہ اُن کے ایک یہ بھی افواہ تھی کہ آنریبل آفتاب احمد خاں صاحب اور نواب وقار الملک بہادر سے کسی کالج کے معاملہ میں کسی قدر شکر رنجی ہوگئی تھی اور یہی وجہ نواب صاحب موصوف کی دل شکنی اور علیحدگی کی بیان کی جاتی تھی۔ لیکن اس غلطی کا دفعیہ خود نواب صاحب موصوف کی اُس تحریر سے جو روزانہ پیسہ اخبار اور دوسرے اخباروں میں شائع ہوئی تھی بخوبی ہوگیا۔

اُس تحریر کا منشا یہ ہے کہ نواب صاحب اپنی صحت جسمانی کے صحیح نہ ہونے کی وجہ سے اس خدمت سے سبکدوش ہونا چاہتے تھے۔ دوسری وجہ انگریزی کی عدم واقفیت کی بھی ظاہر کی گئی ہے۔ اور نیز انگریزی کی عدم واقفیت سے جو جو دقتیں عائد ہوتی رہی ہیں۔ اُن کا بھی اعادہ کیا ہے۔

مگر نواب مزمل اللہ خاں صاحب بہادر رئیس بھیکم پور جائنٹ سکرٹری کالج نے جن کی لیاقت وقابلیت کا اعتراف خود نواب صاحب موصوف نے کیا ہے۔ سردست نواب صاحب موصوف کو علیحدگی سے باز رکھا ہے اور وہ ذمہ داریاں جن کی وجہ سے نواب صاحب کو تکلیف وزحمت کا سامنا ہوتا تھا اپنے اوپر گوارا فرمائی ہیں۔

خدا کا شکر ہے کہ نواب مزمل اللہ خاں صاحب بہادر رئیس بھیکم پور کی اس قابل قدر کوشش سے کالج کو جو خدانخواستہ ایک اعلیٰ درجہ کے بیدار مغز اور تجربہ کار سرپرست سے محروم ہوجانے والا تھا اپنی موجودہ حالت پر قائم رکھا۔ قوم کو تہ دل سے نواب مزمل اللہ خاں صاحب بہادر کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔

اسکے بعد میں اجازت چاہتی ہوں کہ مجھے بھی اسکا حق عطا فرمایا جائے کہ آیندہ سکرٹری کالج کے متعلق اپنی ناچیز رائے پیش کرنے کی عزت حاصل کروں۔ اور اسی ضمن میں یہ بھی ظاہر کرنا چاہتی ہوں کہ نواب وقار الملک بہادر کا وجود کالج کے لیے کس قدر مغتنم اور نعمت غیر مترقبہ ہے

لیکن اس سے پہلے کہ میں اپنی ناچیز رائے کا اظہار کروں مجھے اس قدر عرض کر دینے کی زیادہ ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ عہدۂ سکرٹری کالج کے لیے کس دل و دماغ اور تجربہ کار اور مادۂ انتظامی رکھنے والے افراد کی ضرورت ہے۔

لہٰذا اسکے متعلق میری یہ رائے ہے کہ دنیا میں بہت سی باتیں انسان کسبی طور سے حاصل کرتا ہے اور بہت سی باتیں اُسکو فطرت سے عطا ہوتی ہیں جس میں کسب کو کوئی مداخلت نہیں ہے۔ دل و دماغ اور خوش انتظامی اور انتظام کا سلیقہ حاصل کرنے سے حاصل نہیں ہوتا تاوقتیکہ قدرت کی جانب سے عطا نہ ہو۔

ایں سعادت بزور بازو نیست   تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

انگریزی۔ عربی۔ فارسی۔ یا دیگر علوم میں محنت کرنے سے دسترس حاصل ہو سکتی ہے لیکن ہر ذی علم۔ ہر ڈگری یافتہ صحیح دماغ اور صاحب رائے نہیں ہو سکتا۔ اور دماغ ہی ایسی چیز ہے جس کے ذریعہ سے دنیا میں اہم سے اہم اور پیچیدہ سے پیچیدہ معاملات طے ہو سکتے اور سُلجھ سکتے ہیں۔

کالج کے بانی مبانی آنریبل ڈاکٹر سر سید احمد خاں صاحب بہادر کے۔ سی۔ ایس آئی۔ کی طرف جب نظر ڈالی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس قابلیت اور لیاقت کے آدمی سیکڑوں ہزاروں بلکہ اس سے بھی زیادہ موجود ہیں جو گوشۂ گمنامی اور کس مپرسی میں پڑے ہوئے ہیں جنکے نام تک سے بھی کوئی واقف نہیں۔ پھر وہ کونسی چیز تھی جسنے سر سید کو مشہور اور شہرۂ آفاق کر دیا۔ یہی دل و دماغ تھا جسکو انسان کسی محنت اور کسب سے حاصل کرنے میں مجبور رہے۔

کالج کا عہدۂ سکرٹری کوئی معمولی بات نہیں ہے ایسے اہم اور دشوار کاموں کا بیڑا اُٹھانا کسی معمولی دل و دماغ کے آدمی کا کام نہیں ہے۔ جب تک وہ بہمہ صفات موصوف نہ ہو۔ سب سے پہلے تو دل و دماغ کی ضرورت ہے۔ اسکے بعد تجربہ کاری۔ جفاکشی۔ صبر و استقلال۔ قومی

سچی ہمدردی کی ضرورت ہے اور یہ سب اوصاف سر سید مرحوم میں باحسن الوجوہ موجود تھے۔ ابتدا ابتدا میں جو رکاوٹیں کالج کے متعلق سر سید کے سدِ راہ ہوئیں۔ اُن کو اُنکا ہی دل خوب جانتا ہے۔ یا وہ لوگ خوب واقف ہیں جو اُنکے رفیق طریقت تھے۔ قوم نے کافر کہا گالیاں دیں۔ کُفر کے فتوے لگائے۔ مدتوں اخباروں میں مخالفت رہی لیکن اُس خدا کے بندے نے سب کے کہنے کو دامن شکریہ میں رکھ لیا۔ اور اُن کی پیشانی پر بل تک نہیں آیا اور اپنے کرنے کا کام کیے گئے۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ وہی علی گڈھ کالج آج آفتاب نصف النہار سے زیادہ عروج اور ترقی پر ہے۔ یہ باتیں بغیر جانسوزی اور استقلال اور ہمت کے حاصل نہیں ہوسکتیں شعر

سونا کیا حرام تو قسمت جگائی ہے — جب خاک ہوگئے ہیں تو اکسیر پائی ہے

اس تمام سمع خراشی کا نتیجہ یہ ہے کہ عہدہ سکرٹری کالج کے لیے سر سید جیسے دل و دماغ کے آدمی کی ضرورت تھی اور سر سید کے بعد اُن لوگوں کی ضرورت ہے جنھوں نے سر سید ہی کا سا دل و دماغ۔ استقلال اور ہمت۔ تجربہ پایا ہو۔ اور مدتوں سر سید کی آنکھیں دیکھی ہوں۔ سر سید ہی کا سا خیال ہو۔

چنانچہ سر سید کے انتقال کے بعد ایسا ہی ہوا یعنی نواب محسن الملک بہادر سر سید کے جانشین قرار پائے اور اُنہوں نے اپنی زندگی میں نمایاں ترقی کی۔ یہاں تک کہ دم واپسیں تک وہ اپنی خدمت سے سبکدوش نہیں ہوئے۔

کالج کے عہدہ سکرٹری کے لیے جب تک کہ ملسکیں ایسے ہی افراد کی ضرورت ہے جنھوں نے سر سید کی آنکھیں دیکھی ہوں اور اُنکا ہی سا دل و دماغ پایا ہو۔ اور اُسی شمع کے پروانے اور اُسی چمن کے پھول ہوں۔ بقول مولانا حالی ؎

مجھے تنہا نہ سمجھیں اہل لاہور — تصور میں میرے ایک انجمن ہے
سمجھتے ہو کہ ہوں کس باغ کا پھول — جہاں ہر گُل بجائے خود چمن ہے

نواب محسن الملک بہادر کے بعد نواب وقار الملک بہادر ہی سکرٹری کالج کے لیے موزوں تھے اور سرسید کی سی قریب قریب تمام خوبیاں اُن کی ذات بابرکات میں پائی جاتی ہیں - میری ناقص رائے میں ہندوستان کے مسلمانوں کی عموماً اور علی گڈھ کالج کی خصوصاً بڑی بدنصیبی سمجھنا چاہیے . اگر خدانخواستہ نواب وقار الملک بہادر اپنی زندگی میں اپنے عہدہ سے علیحدہ ہو جائیں -

میں بہی خواہان اور ہمدردان قوم اور ٹرسٹیان کالج سے نہایت ادب کے ساتھ ملتجی ہوں کہ نواب وقار الملک کی علیحدگی قوم کی بدنصیبی سے تعبیر کرنا چاہیے - میں امید کرتی ہوں کہ سب متفق ہو کر اس میں کوشش فرمائینگے کہ نواب صاحب بھی اپنے جانشین کی طرح دم واپسیں تک کالج کی بہبودی اور درستی میں مصروفیت ظاہر فرما کر اجر عظیم اور ثواب دارین حاصل فرمائینگے -

نواب صاحب کی لیاقت اور تجربہ کاری اور بڑی بڑی ذمہ داریوں کی خدمت پر ممتاز رہنے کے متعلق مجھے اس سے زیادہ شرح و بسط کے ساتھ لکھنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی کیونکہ اُس سے سب اعلیٰ و ادنیٰ واقف اور ماہر ہیں - سرکار عظمت مدار اور گورنمنٹ نظام میں جن بڑی بڑی خدمتوں کو آپ نے خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے اسکو کون نہیں جانتا قطع نظر اسکے یہ کتنی بڑی بات ہے کہ نواب وقار الملک بہادر خود ایک رئیس اور ذی ثروت آدمی ہیں - اور اس خدمت کی انجام دہی کے لیے دل و دماغ اور تجربہ ذاتی کے سوائے فارغ البالی کی سخت ضرورت ہے جو خدا کے فضل سے نواب صاحب موصوف میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے -

ان تمام وجوہات کے ہوتے ہوئے علی گڈھ کالج کے سکرٹری کے لیے نواب صاحب کی موجودگی میں کسی دوسرے کا انتخاب بے ضرورت ہے - اور نواب صاحب موصوف بھی جن ذمہ داریوں کی وجہ سے عہدہ سکرٹری سے سبکدوش ہونا چاہتے تھے اُن ذمہ داریونکو

جبکہ نواب مزمل اللہ خاں صاحب جائنٹ سکرٹری کالج نے اپنے اوپر گوارا فرما لیا ہے تو نواب صاحب موصوف کو بھی وہ عذر باقی نہیں رہا۔

اب رہی یہ بات کہ آیندہ عہدہ سکرٹری کے لیے کون صاحب زیادہ موزوں ہیں جن جن اصحاب کا نام لیا گیا ہے ان کی لیاقت اور قابلیت میں بھی کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اسلیے کہ وہ سب صاحب لایق اور ذی علم اور تجربہ کار ہیں۔ لیکن بالفعل ان میں سے کسی کے انتخاب کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں آیندہ وقت کے لیے جس کی نسبت اہل رائے اپنی رائے پیش کریں کوئی مناسب انتخاب ہو سکتا ہے۔ لیکن ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے اور خدا کرے کہ بہت دنوں تک وہ وقت نہ آئے کہ جس سے ہمارے کان اس صدا کے آشنا ہوں کہ نواب وقار الملک بہادر اب علی گڈہ کالج کے سکرٹری نہیں ہیں۔ مجھے اُن معزز اصحاب کی قابلیت سے ہرگز انکار نہیں ہے۔ لیکن اس قدر ضرور عرض کرنا چاہتی ہوں۔ شعر

نے ہر کہ گنج داشت زپرویز گوی برد نے ہر کہ باغ ساخت بہ ضواں برابر است

اُن صاحبوں کا تجربہ نواب وقار الملک بہادر کے تجربے کے مقابلہ میں ہر طرح سے کم ہے اب آخر میں میں یہ بھی عرض کرنا چاہتی ہوں کہ جو کچھ مینے عرض کیا ہے یہ میری ذاتی رائے ہے عام اس سے کہ صحیح ہو یا غلط۔ ہر شخص کو ایسے معاملہ میں نیک نیتی اور ایمان داری سے اپنی رائے پیش کرنے کا حق حاصل ہے۔ نہ میں مولوی مشتاق حسین صاحب کی طرفدار نہ اور کسی دوسرے کی مخالف۔

میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے قومی خدمتوں کو اپنا فخر سمجھتی رہی ہوں گو مجھ سے کیا ہو سکتا ہے اور میں کیا کر سکتی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ کسی قومی مضرت کے کام میں یہ غیر ممکن ہے کہ میں خاموش رہوں اور اپنی ناچیز رائے کا اظہار نہ کروں۔

نواب محسن الملک بہادر مرحوم کے زمانۂ حیات میں اکثر تعلیم کے متعلق میری خط و کتابت

جاری رہی ہے۔ جسکا جواب اُنھوں نے اپنی عنایت سے ہمیشہ تشفی بخش مرحمت فرمایا۔ جسکا اثر اس وقت تک میرے دل پر ہے۔ اور ہمیشہ قایم رہیگا۔ گو نواب وقارالملک بہادر کی خدمت میں اس وقت تک مجھے خط وکتابت کے پیش کرنے کی عزت حاصل نہیں ہوئی ہے لیکن مجھے جس قدر کہ نواب صاحب موصوف کے متعلق علم تھا۔ بے کم وکاست بلا رد رعایت نیک نیتی کے ساتھ اظہار کر دیا ہے۔

میں اپنی سمع خراشی کی معافی چاہتی ہوں اور علی گڈہ کالج کی بہتری اور بہبودی اور نواب وقارالملک بہادر کی صحت جسمانی اور ترقی عمر کی دعا کرتی ہوں۔ ع

این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

رابعہ سلطان بیگم
از جٹپول اسٹیٹ

گردش زمانہ

ہمیں تو ہستی ہے جیتے جی یہ گردش دوراں
نہ جانے کیا گذرتی ہوگی مُردوں پر مزاروں میں

گردش زمانہ بقول ایک فاضل مصنف کے یعنی کہنے کو تو دو لفظ اور ایک بات ہے لیکن جس قدر دلخراش اور قیامت خیز انقلاب اسکے آنے سے اس دنیا پر وارد ہوتے ہیں اُنکے لحاظ سے اسے کوئی ایسا نام دینا چاہیے تھا جسے کہتے وقت آنکھوں میں آنسو بھر آتے اور سُنتے وقت دل تڑپ اُٹھتا۔

دنیا میں ایکساں حالت بسر کرنے والے انسان خواہ غریب ہوں خواہ امیر۔ مفلس ہوں خواہ تونگر۔ حاکم ہوں خواہ محکوم گردش زمانہ کے نام سے واقف نہیں لیکن وہ انسان جسنے اپنی آنکھوں سے اپنی حالت کو بدلتے اور گردش زمانہ کو بلائے ناگہاں کی طرح سر پر

نازل ہوتے دیکھا ہی اس کی تعبیر پوری طرح بیان کرسکتا ہی۔

لسکے حال کو اُس یتیم بچے سے دریافت کرو جس نے آرام میں پرورش پائی اور آسایش میں عمر کا ایک مختصر سا حصہ کاٹا اور خوشی کی گود میں کھیل کر بڑا ہوا ماں جان نثار کرتی تھی باپ شکل دیکھکر جیتا تھا۔ رشتے دار عزیز پیروں تلے آنکھیں بچھاتے تھے کہ یکایک گردش زمانہ مرض طاعون کی صورت میں نمودار ہوئی۔ صبح کو باپ بیمار ہوا۔ رات کو ماں دوسرے دن دونوں خدا کے گھر پہنچنے کی تیاری کر رہے تھے بستر کے پاس پہنچا تو ماں کا دم نکل چکا تھا۔ دوسرے کمرے میں گھبرا کر روتا ہوا آیا تو باپ کو جاں بلب پایا۔ آہ آنکھوں کی پُتلیاں تک پھر چکی تھیں لیکن لخت جگر کو دیکھکر دل نہ رہ سکا بے اختیار زبان سے یہ شعر نکلا اور غمخوار دیرینہ کا خاتمہ ہوگیا۔

نہ کرنا تم میرے مرنے کا ماتم چین سے رہنا بہت نازک طبیعت ہو تمھیں سمجھائے جاتے ہیں

بچے نے خوشی اور آسایش کے سوا کبھی تکلیف کو خواب میں بھی نہ دیکھا تھا گردش زمانہ کے اثر کو دیکھکر دیوانہ سا ہوگیا لیکن جب ہوش ٹھکانے ہوئے تو یہ دیکھ کر بالکل عقل ماری گئی۔ کہ وہی عزیز جو پیروں تلے آنکھیں بچھاتے اور جہاں پسینہ گرتا خون بہانے کو تیار رہتے گردش زمانہ کے اثر سے ایسے ہو گئے ہیں کہ بُلانا پیار کرنا تو رہا درکنار بات کا جواب تک دینے میں تکلف کر رہے ہیں۔

ہم ایسے ہو گئے اللہ اکبر اے تیری قدرت ہمارا نام سُنکر ہاتھ وہ کانوں پہ دھرتے ہیں

اس کی کیفیت اُس بدنصیب بی بی سے پوچھو جسنے عمر کا ایک خاصہ حصہ شوہر کے سایہ میں کاٹا۔ دنیا کی نعمت گھر میں موجود تھی اور جہان کی ساری خوشیاں خداوند کریم نے اسکے حصے میں کردی تھیں اور وہ بدنصیب سمجھتی تھی کہ مجھ سا دنیا میں کوئی نہیں ہی لیکن ہائے اس گردش زمانہ کا ستیاناس ہو یہ زبان حال سے کہہ رہی تھی۔

ذرا تو فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہی تیری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

شوہر ایک لمبی بیماری میں مبتلا ہوئے۔ کاروبار سب بند ہو گیا۔ جو کچھ جمع پونجی تھی وہ بیماری میں لگنے لگی یہانتک کہ نہ دولت رہی نہ دولت والا رہا۔ اب اگر اس کی کوئی ذرا حالت پوچھے تو سوائے اسکے اور کیا سُن سکتا ہے کہ ؎

اے گردش زماں ترا خانہ خراب ہو رہتے ہیں ہم عذاب میں دن بھر تمام رات

یہ تو معمولی درجہ کے لوگوں کا ذکر ہے لیکن گردش زمانہ کے بے رحم ہاتھ تکمرانوں اور ملک کے والیوں پر بھی اپنا وار کاری طریقے سے کرنے میں کچھ کوتاہی نہیں کرتے بلکہ نسبتاً ان پر زیادہ تباہی لاتے ہیں۔

گردش زمانہ کے بے رحم اور دلخراش حملوں کو تاریخ ہند کے صفحات میں دیکھا جائے تو سینکڑوں تاجداروں کے خون سے اس کے ہاتھ رنگین نظر آئینگے۔ اسی نے ہمایوں کو کوہستانوں میں دربدر پھرایا اسی نے شاہ جہاں کو زنداں میں قید کیا۔ اور اسی نے داراشکوہ کے گلے پر اپنا تیز خنجر اس بے رحمی سے پھیرا جس کی چمک دیکھکر دنیا کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ اسی کمبخت کی آمد کا نتیجہ تھا کہ ابوظفر بہادر شاہ تاجدار دہلی اپنی تخت گاہ سے قیدی ہوا اور باغی سمجھ کر پابجولاں رنگون کو روانہ ہوا۔ جہاں قید خانے میں خاندان مغلیہ کے آخری چراغ کو گردش زمانہ کے بے رحم تھپیڑوں نے ایسے ایسے جھونکے دیئے کہ گُل ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور آخر یہ کہتا ہوا جاں بحق تسلیم ہوا ؎

ہوش و حواس تاب و تواں داغ جا چکے اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا

یہ تو گردش زمانہ کی اُن پُرکاریوں کا ذکر تھا جو وہ حضرت انسان کو اپنا آماجگاہ بنا کر اُس کی جان پر کرتی ہے۔ لیکن سچ پوچھو تو بے جان اور بے زبان اشیاء بھی اسکے پنجے سے محفوظ نہیں۔

ایک پھولے پھلے چمن کی طرف نگاہ کرو ہر رنگ کے پھول اور پتوں سے آراستہ نظر آئیگا۔ ہرے ہرے پتے۔ سرخ زرد سفید پھول اسکے لیے سامان آرایش ہونگے

جن سے وہ دلہن کی طرح سجا سجایا نظر آئیگا لیکن ہائے رو سیاہ ہو اس گردش زمانے کا اس کے بے رحم ہاتھوں سے وہ بھی محفوظ نہیں یہ وہاں بھی خزاں کی صورت میں جا پہنچی اور تھوڑے سے ہی عرصہ میں اس کی ایسی کایا پلٹ کر دی کہ جسے دیکھکر چشم عبرت کُھلی کی کُھلی رہجائے اور بے اختیار یہ شعر پڑھنے کو جی چاہے -

الٰہی فصل گل پر بھی خزاں کا حکم جاری ہے
چمن میں پھول پیدا کر تو نافرمان پیدا کر

رقیمہ

بنت حفیظ اللہ امرتسر

کعبہ

جون نمبر خاتون میں اس مضمون کا نصف حصہ چھپ چکا ہی۔ اسی سلسلہ کا باقی حصہ اب درج کیا جاتا ہے ستمبر نمبر میں اسی عنوان سے سہروردیہ صاحبہ کا جو مضمون درج کیا گیا ہے۔ وہ اس سے بالکل جداگانہ مضمون ہے -

اڈیٹر

کعبہ کو کئی وجہ سے بیت المقدس وغیرہ معابد اور مساجد پر تفضیل ہے -

اول یہ کہ سب سے پہلے یہی گھر واسطے عبادت کے بنایا گیا چنانچہ ان اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ سے واضح ہی یعنی اول گھر کہ بنایا گیا ہی واسطے آدمیوں کے تاکہ اُسکی زیارت کریں اور اپنا معبد گردانیں وہ گھر ہی کہ مکہ میں واقع ہی -

دوسرے یہ کہ یہودی بیت المقدس کو حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام سے نسبت دیتے ہیں اور یہ بیت بنایا ہوا حضرت ابرہیم خلیل علیہ السلام کا ہی اور درجہ حضرت خلیل کا کثرت مناقب اور رفعت مراتب میں حضرت سلیمان اور داؤد علیہما السلام سے

ارفع ہے۔ پس بنا بھی ان کی نفضل ہے۔

تیسرے یہ کہ ایسا مبارک مقام ہے کہ کبھی طائف اور عاکف اور زائرناظر سے خالی ہیں رہتا۔ تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ زمین کروی الشکل ہے۔ پس جو وقت اور آن زمین پر فرض کریں۔ ایک قوم کی صبح ہوئی ایک قوم کی ظہر۔ ایک کی عصر ایک کی مغرب۔ اور ایک کی عشا۔ پس کعبہ کسی وقت توجہ نمازیوں سے خالی نہیں رہتا۔

چوتھے اس گھر میں ایسی نشانیاں موجود ہیں کہ ہرگز اور کہیں نہیں۔ بعض اس میں سے وہ ہیں کہ خاص کعبہ معظم سے علاقہ رکھتی ہیں۔ اور بعض وہ ہیں کہ برکت کعبہ سے حرم میں ظاہر ہیں۔ پس قسم پہلی دو طرح پر ہے ایک تو وہ کہ خواص و عوام پر ظاہر ہے۔ اور دوسری وہ کہ ارباب وحی ملک علام اور صحاب کشف اور الہام پر ظاہر ہے۔ قسم اول کی چند باتیں بیان کرتی ہوں۔

اول یہ کہ خار اور درخت اُس مکان کا نہیں کاٹتے۔ اور صید وہاں کا نہیں پکڑتے اور حرمت اس گھر کی بایں مرتبہ ہے کہ ہرگز پانی کا سیل حل سے حرم میں نہیں آتا۔ تاکہ خاک غیر حرم اُس میں نہ ملے۔ چنانچہ حضرت ابن عباس اور امام شافعی کے نزدیک خاک اور سنگ حرم شریف حل میں لیجانا مکروہ ہے۔

دوسری یہ کہ پرندہ کسی قسم کا اُس پر نہیں بیٹھتا مگر شاذ و نادر۔ روایت صحیح ہے کہ جب کوئی طائر بیمار ہوتا ہے تو بالہام الٰہی اس گھر سے پناہ پکڑتا ہے اور اُس دار الشفا سے دوا پاتا ہے۔ حتیٰ کہ صحت یاب ہو جاتا ہے۔

تیسری یہ کہ جب اُڑنے والے جانور صفیں باندھ کر مکہ معظمہ میں اُڑتے ہوئے آتے ہیں تو بیت الحرام کے مقابل آکر صف چھوڑ کر داہنے بائیں ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ بات بارہا تجربہ ہو چکی ہے۔

چوتھی یہ کہ جب کسی جبّار گردن کش اور متکبر بے حیا نے اُس مکان کا قصد کیا تو

صدمہ صولت جباری اور سطوت ہیبت قہاری حضرت باری نے گردن تجبر اور تکبر اُس کی توڑ دی چنانچہ قصہ ابرہہ اسپر دلیل ہے۔

پانچویں یہ کہ جو سخت اور سنگین دل خیرہ چشم تیرہ روزگار اس کی زیارت سے مشرف ہوا البتہ دل اُسکا نرم ہو گیا۔ اور دیدۂ دل سے اشکبار ہوا۔ بلکہ ایک جماعت نے قساوت قلبیہ سے انکار بھی کیا تھا اور بعد مشاہدہ کے مقر ہوئی۔ خاصہ یہ ہے کہ جو شخص وہاں گیا یا تو ہنسا یا رویا۔

چھٹی یہ کہ ہرگز کسی وقت زائرین سے خالی نہیں رہتا بلکہ سلف کے لوگوں نے مدتوں اسکا انتظار کیا تاکہ خلوت میں اپنا راز دل عرض کریں لیکن خالی نہ پایا۔ اگر انسان نہیں ملا تو سانپ ہی ملا کہ طواف میں مشغول تھا۔

ساتویں یہ کہ خاک کعبہ رشک آب حیات ہے اور ازالۂ امراض کی دوا۔

آٹھویں یہ کہ جانور تیز چنگال جانور ضعیف حال سے بلا تکلف ملتے ہیں۔ برہ اور گرگ ایک چشمہ سے پانی پیتے ہیں۔

نویں یہ کہ جو کوئی جانور شکاری حل میں کسی شکار پر ارادہ کرے اور وہ صید حرم میں بھاگ آئے تو شکاری واپس جاتا ہے۔ تفسیر حدادی میں لکھا ہے کہ ایک آیات بینات سے یہ ہے کہ جانور زمین حرم سے پناہ پکڑتے ہیں۔ اور اگر کوئی اُنسے تعرض کرتا ہے تو حرم مکرم میں آکر استغاثہ کرتے ہیں اور اپنی داد کو پہنچ جاتے ہیں۔

دسویں یہ کہ آب زمزم سے استشفاء امراض احادیث صحیحہ میں وارد ہے۔ گرسنہ سیر ہوتا ہے اور تشنہ سیراب۔ وہب ابن منبہ کہتا ہے کہ کتب سابقہ میں زمزم کی بہت تعریف لکھی ہے طعام طعیم و شفاے سقیم۔

گیارہویں یہ کہ ہر سال لاکھوں آدمی ستر ستر سنگریزے ایک موضع پر ڈالتے ہیں اور وہ موضع سیل آب و ہبوب ریاح بھی نہیں ہے مگر دوسرے برس اُس قدر

نہیں ملتے۔ تفسیر کبیر میں لکھا ہی کہ جسکا حج مقبول ہوا۔ جمرات[1] اُسکے آسمان پر اُٹھائے جاتے ہیں۔

بارھویں یہ ہی کہ رکن یمانی پر دو فرشتے معین ہیں کہ حاجیوں کی دعا کے امین کہیں

تیرھویں یہ کہ مقام ملتزم پہ کہ یہاں در اور حجر کا نام ہی جو کوئی دعا کرے مقبول ہی اور اس اجابت دعا کے عجائبات ہیں منجملہ اسکے یہ ہی کہ عبداللہ ابن زبیر نے حکومت حجاز اور بنی مصعب ابن زبیر نے تولیت عراق اور عبدالملک نے بادشاہی شام اور عراقین اور خراسان کی دعا مانگی قبول ہوئی۔

چودھویں تحت المیزاب محل اجابت دعا ہی۔ چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے منقول ہی کہ اُنھوں نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ میں بہشت پر کھڑا تھا۔ صحابہ نے جب تجسس کی تو معلوم ہوا کہ تحت المیزاب پر استادہ تھے۔ اور عبداللہ ابن عباس اور عطا ابن ابی رجاج سے بھی اسی طرح کی حکایات منقول ہیں۔

پندرھویں مابین رکن اور مقام کے تا حجر اور زمزم ننانوے پیغمبر مدفون ہیں۔ بروایت ابن حمزہ اور بعضے تین سو بھی بیان کرتے ہیں۔ اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام بھی مابین میزاب اور باب غربی کے مدفون ہیں۔

سولھویں ہر روز بہشت کی خوشبو مکہ معظمہ میں نازل ہوتی ہی جسکا مشام زکام عشق اور غل سے پاک ہی اُسکو استشمام نصیب ہے۔

سترھویں ایک نماز اُس مکان میں لاکھ نماز کے برابر ہی۔ روایت ہی حسن بصری سے کہ ایک روزہ وہاں رکھنا برابر لاکھ روز دن کے ہی۔ اور ایک درم للہ وہاں دینا برابر لاکھ درم کے ہی۔ اور حاکم نے ابن عباس سے نقل کیا ہی کہ ہر ایک نیکی وہاں کی لاکھ نیکی کے برابر ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہی کہ حج مقبول کے واسطے نہیں ہے مگر بہشت۔

[1] جمرہ یعنی کنکر۔

اٹھارہویں. قبلہ ہی تمام عالم کا فی لو وجی ھکہ شطرہ

انیسویں یہ ہی کہ ستر ہزار فرشتے کعبے کو اپنے بازوؤں سے صاف کرتے ہیں اور طائفین اور عاکفین کے لیے استغفار میں مشغول رہتے ہیں۔

بیسویں یہ کہ حق تعالیٰ ہر روز اس بیت پر ایکسو بیس بار نظر رحمت کی کرتا ہی ساٹھ واسطے طائفین کے اور چالیس واسطے مصلین کے اور بیس واسطے ناظرین کے۔ حدیث شریف میں آیا ہی کہ النظر الی الکعبہ عبادۃ

اکیسویں ابن مردویہ اور اصبہانی اور دیلمی جابر ابن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ قیامت کے دن کعبہ کو دلہن بنا کے فرشتے میدان میں لائینگے اثنا سے راہ میں میری قبر پر گزرے گا اور کہے گا السلام علیک یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور میں جواب دونگا وعلیکم السلام یا بیت اللہ میری امت نے تیرے ساتھ کیا سلوک کیا اور تو کیا سلوک کریگا۔ وہ جواب دیگا کہ یارسول اللہ تیری امت سے جسنے میری زیارت کی ہی میں اسکا شفیع ہوں اس کی طرف سے آپ خاطر جمع رکھیے۔ اور جو یہاں نہیں پہنچ سکا اُسکے واسطے آپ شفیع کافی ہیں۔ بالجملہ شرح فضائل اور محامد میں اس بیت کی قوت عاقلہ دنگ ہی۔ اور طوطی ناطقہ کی نغمہ سرائی بند۔

اہل عرفان آیتہ ان اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ مبارکا کیوں تاویل کرتے ہیں کہ پہلا گھر جو انسان کے مکہ میں واسطے منظوریت کے بنایا گیا خانۂ دل ہی۔ جیسا کعبۂ معظم قبلۂ عالمیاں ہی اسی طرح دل مبارک محل ایمان ہی۔ خانۂ گل زیارت گاہ ہے آدمیوں کا۔ اور خانۂ دل منظور نظر ہی رب عالمین کا۔ بیت ظاہر واسطہ ہی ہدایت انام کا۔ اور بیت باطن دریسہ ہی معرفت ملک علام کا۔

اور جو یہ ارشاد ہوا ہی فیہ آیات بینات مقام ابراھیم اس سے یہ مراد ہی کہ خانہ دل میں دلالتیں واضح ہیں کہ عقلا اسکو وحدانیت حق پر دلیل گردانتے ہیں اور انہیں

آیات سے ایک مقام ابراہیم ہے۔ پس محمد حکیم علی ترمذی فرماتے ہیں کہ مقام ابراہیم یہی ہے کہ نفس فرزند اور مال اپنا راہ رضائے ذوالجلال میں بذل کیا۔ پس جس شخص نے کہ نظر اس موضع پر نہ ڈالی اور زیور صفا سے آراستہ نہ ہوا اُسکا سفر و سعی سب باطل ہے۔

حضرت شبلی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ مقام ابراہیم خُلّت ہے جو کہ مقام خُلت میں پہنچا سب سے بے خوف ہوا۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب کسی شخص نے باوصف ادب قدم اپنا مقام نیاز و خدمت میں رکھا آفات صوری و معنوی سے محفوظ رہا۔

جبکہ سالک نے قدم صدق محبت کے رستہ میں رکھا تو دونوں جہان کے فتنہ و تکلیف سے بے خوف ہوا۔

کشف المحجوب میں مرقوم ہے کہ حرم کو اس واسطے حرم کہتے ہیں کہ اس میں مقام ابراہیم اور محل امن ہے۔ ابراہیم کے دو مقام ہیں ایک تن دوسرا دل۔ پس جو شخص قصد تن کا کرے افعال حج ادا کرے۔ اور جو کوئی عزم دل کا کرے آرام طلبی اور مداخلت کی خواہش نہ کرے۔ اور اغیار کو اپنے دل میں جگہ نہ دے۔ پس مقام خُلت پر پہنچ گیا۔ اور اس مقام کا داخل ہونا موجب امن ہے۔

معمار باوقار یعنی حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام کو جب حکم کعبہ بنانے کا ہوا تو پہلے آپ نے یہ دعا فرمائی رب اجعل هذا بلداً امناً یعنی اے میرے پروردگار بنا دے تو اس صحرای لق و دق کو اس میں سوائے چند خانہ داروں کے اور کوئی نہیں رہتا ہے۔ ایک شہر آباد۔ تاکہ فائدہ اسکے بنانے کا حاصل ہو اسواسطے کہ اگر اسکے قریب کوئی شہر آباد نہ ہوگا تو طواف اسکا کون کریگا اور اعتکاف میں کون بیٹھے گا اور نماز کون پڑھے گا لیکن باامن ہو اسواسطے کہ ورود آفات سے شہر ویران ہو جاتا ہے۔

قطع نظر اسکے قافلے حاجیوں کے جو دور دراز سے آئینگے پہنچ نہ سکینگے۔ اور یہ صحرا

نہ قابل زراعت ہے نہ قابل گیاہ کہ اس میں مویشی اور آدمی بسر کرسکیں۔ اسواسطے اس مکان میں امن وافر چاہیے تاکہ تجار ہر طرف سے غلہ وغیرہ اجناس یہاں لادیں اور فروخت کریں یہاں کے رہنے والوں پر روزی فراخ ہو۔ اور جو آدمی اس جگہ واسطے تحصیل ثواب دینی و فوائد دنیوی کے آئیں خوف سے امین رہیں ورنہ اجتماع ممکن نہ ہوگا۔ بایں سبب کہ صورت خوف میں انسان گریز کرتا ہے اور دفع ضرر کو نفع حاصل کرنے پر مقدم جانتا ہے۔ اگر کوئی کہے کہ امن تو ہر مقام میں واجب ہے وجہ تخصیص اس کی کیا ہے۔ تو جواب یہ ہے کہ ہر چند امن ہر جگہ تمام روئے زمین میں شرعاً واجب ہے اور تعرض بلا سبب جانی ہو یا مالی جائز نہیں۔ لیکن اس مکان کو خصوصیت ہے دوسرے مقام کو یہ خصوصیت نہیں ہے کیونکہ یہ قلعہ خاص بادشاہی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ قلعہ سلطان کو بہ نسبت اور ممالک کے تخصیص ہوتی ہے۔ لہذا شکار کرنا وہاں حرام ہے۔

نزدیک امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے اگر کوئی شخص مرتکب کسی گناہ کا حرم محترم میں داخل ہو تو تعرض کرنا جائز نہیں ہے بلکہ اسکوتنگ کرنا چاہیے کہ وہاں سے نکلجائے بعد اُسکے اسپر سزائے شرع جاری کیجائے۔

دوسری دعا یہ کی وارزق اھلہ من الثمرات یعنی اور دے اس شہر کے باشندوں کو طرح طرح کے میووں سے تاکہ باعث تکلیف دوسرے شہر میں نہ چلے جائیں۔

پس مجیب الدعوات نے اول دعا اس طرح قبول فرمائی کہ ہرگز کسی ظالم غریب آزار کا اُس مکان جلیل الشان میں دسترس ہوا۔ اگر کسی نے قصد کیا تو فی الفور ہلاکت نصیب ہوئی۔ چنانچہ قصہ اصحاب فیل اور حکایت متصرف ملعون نائب یزید اسپر دو گواہ ہیں۔ اور دوسری دعا اس طرح بھی قبول ہوئی کہ مصر وہند وسندھ اور فارس و بصرہ کے رہنے والوں کے دل اس طرف ایسے مائل ہوئے کہ طرح طرح کے غلے و میووں کے جہاز بھر کر وہاں لاتے ہیں یہی سبب ہے کہ اس شہر میں ہمیشہ ہر ایک مقام کے تحائف و فوائد دستیاب ہوتے ہیں"

رقیمہ
ح - خ از کلکتہ

جاپان

دوسرا باب

جاپان کے لڑکے اور لڑکیاں

دنیا کے کسی ملک میں بچوں کا ایسا خوش گوار بچپن نہیں ہوتا جیسا کہ جاپان میں ہوتا ہے جاپان میں والدین اپنے بچوں کے عاشق زار ہوتے ہیں اور اپنی اولاد کے ساتھ بے انتہا اُنس ومحبت کرتے ہیں۔ بچے بھی ہمیشہ بہت خوش اطوار ہوتے ہیں۔ اگرچہ ایسا کہدینا بادی النظر میں ایک بڑی بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ بالکل سچ ہے اس میں سرِ مو مبالغہ نہیں۔

جاپان کے لڑکوں اور لڑکیوں کے عادات واطوار نہایت پسندیدہ ہوتے ہیں اور وہ عمر رسیدہ مردوں اور عورتوں کی طرح بہت خاموشی کے ساتھ بلا کسی شور وفساد کے چپ چاپ زندگی بسر کرتے ہیں۔ ابتدا ہی سے ان کی تعلیم وتربیت شروع ہوجاتی ہے جیسے ہی وہ کسی بات کے سمجھنے کے قابل ہوجاتے ہیں۔ جاپان کے شیر خوار نونہالوں کو اپنے جذبات کو دبانا اور طبیعت کو قابو میں رکھنا سکھایا جاتا ہے۔ اگر اس کی ننھی سی جان کو کسی قسم کی تکلیف واذیت ہو اور رنج پہنچے تو اسکو رونے چیخنے چلانے اور موٗنھ بنانے کی مطلقاً اجازت نہیں کیونکہ یہ حرکات دوسرے لوگوں کو ناگوار معلوم ہوسکتے ہیں۔ اگر کسی موقع پر اسکا ننھا سا دل باغ باغ ہوجائے اور اُسے انتہا درجہ کی خوشی حاصل ہو تو اسکو قہقہہ مار کر ہنسنے یا فرطِ شادمانی سے بیخود ہوکر ایسی ہی کوئی حرکت کرنے کی اجازت نہیں۔ کیونکہ یہ ایک قسم کا گنوارپن ہے۔

اسلیے جاپان کے لڑکے اور لڑکیاں بہت خاموش، بہت سلیم الطبع، بہت بے شر

بہت حلیم، بہت شائستہ، بہت مہذب اور بہت مودب ہوتی ہیں۔ جوں جوں ان کی عمر بڑھتی جاتی ہے۔ ان کی یہ تمام عادتیں بھی راسخ ہوتی جاتی ہیں۔ ان کو ہر بات اور ہر چیز کے لیے ہر کس وناکس کی ادب آمیز مسکراہٹ کے ساتھ تواضع کرنے کی عادت ہوتی ہے۔

کمسنی کے زمانہ میں مدرسے جانے کے پہلے ان کے لیے کھیل کود کی کثرت ہوتی ہے۔ خواہ قصبات ہوں یا بڑے بڑے شہر ہر جگہ گلیاں اور راستے ان کے کھیل کود کے میدان ہوتے ہیں۔ ان مقامات میں یہ گیند بلا کھیلتے ہیں پتنگ اڑاتے ہیں، انواع واقسام کے کھیل کود میں مشغول رہتے ہیں۔

تقریباً ہر چھوٹی لڑکی اپنے شیر خوار بھائی یا بہن کو اپنی پیٹھ پر لادے رہتی ہے۔ جاپان میں بچوں کو گود میں لیے رہنے کا قاعدہ نہیں ہے۔ البتہ بڑے بڑے دولتمندوں کے ہاں کی اتائیں اور دائیاں بچوں کو گود میں لیتی ہیں۔

عموماً بچہ اپنی ماں یا بہن کے کندھے سے ایک شال کے ذریعے بندھا ہوا ہوتا ہے اور یہ شال گویا اس ننھی سی جان کا پلنگ اور جھولا ہوتا ہے۔ چھوٹی لڑکیوں کا ان کے کھیل کود میں ان بچوں سے کوئی ہرج نہیں ہوتا۔ وہ ادہر ادھر برابر دوڑتی ہیں۔ گیند بلا کھیلتی ہیں۔ اپنی ہجولیوں کے ساتھ دوڑ دھوپ کرتی ہیں اور بچہ ان کے کندھوں پر ادھر ادھر جھولتا رہتا ہے۔ اس کا ننھا سا سر ہچکولے کھاتا رہتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اب بچہ لڑھکنے لگے گا۔ لیکن وہ خود تو نہایت مطمئن ہوتا ہے اور کبھی اپنی چھوٹی چھوٹی سیاہ تیز آنکھوں سے اپنے بھائی بہنوں کے کھیل کود کو دیکھتا رہتا ہے یا چپ چاپ بڑے مزے سے سوتا رہتا ہے۔

لڑکیوں اور لڑکوں دونوں کے لباس کی وضع وشکل ایک سی ہوتی ہے۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ بچوں کا لباس بالکل ان کے والدین کے لباس کی طرح ہوتا ہے۔ جاپان میں

بچوں کا کوئی خاص لباس نہیں ہوتا۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہی کہ پہننے والوں کے قد و قامت اور جسامت کا اس میں لحاظ رکھا جاتا ہے۔

لباس کا خاص جزو ایک ڈھیلا ڈھالا سایہ ہوتا ہے جسے کی **مونو** کہتے ہیں۔ بالائی کی مونو کے نیچے ایک اندرونی کی مونو بھی ہوتا ہے۔ یہ تمام لباس بیچ سے جسم پر کسا ہوا ہوتا ہے۔ اس کام کے لیے ایک بڑا پٹکا استعمال کیا جاتا ہی جسکو **اوبی** کہتے ہیں۔ اوبی جاپانی عورتوں کی آرایش و زیبایش اور اُن کی شان و شوکت کی نمایش کا سامان ہوتا ہی۔

اگر کسی لڑکی کے والدین دولتمند ہیں تو اسکا پٹکا بڑے ہی زرق برق کا نہایت چمکدار ریشمی یا بیش قیمت زربفت یا بہت اعلیٰ مشجر کا ہوتا ہے۔ اگر کسی لڑکی کے والدین غریب ہیں تو وہ جہانتک اُن کے امکان میں ہوتا ہی اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ اپنی لڑکی کے واسطے اپنی حیثیت سے بڑھ چڑھ کر ہی کوئی خوبصورت پٹکا مہیا کریں۔

اوبی کے بعد ایک جاپانی لڑکی کے لیے اس کے سیاہ بالوں کو زینت دینے والے زیورات مایہ نازش ہوتے ہیں۔ بالوں میں اٹکانے کی عمدہ عمدہ سوئیاں جنکے سرے کچھوے کی ہڈی یا مونگا یا کوئی چمکدار چیز لگی ہوئی ہوتی ہی۔ اور جڑاؤ کنگھیاں جو بے انتہا خوبصورت ہوتی ہیں۔ یہی ان کے زیورات ہیں۔

لڑکوں کا پٹکا یعنی "اوبی" لڑکیوں کے پٹکے سے زیادہ کارآمد ہوتا ہے اور اس میں نمایش و طمطراق اور اظہار شان و شکوہ کا ایسا خیال بھی نہیں رکھا جاتا۔ جب تک لڑکے بہت کمسن ہوتے ہیں ان کے لباس کا رنگ زرد ہوتا ہی۔ پانچ برس کی عمر سے لڑکوں کو ہاکاما پہنایا جاتا ہی اور اس وقت سے ان کی شان بھی بڑھجاتی ہی

ہاکاما ایک قسم کا پائجامہ ہوتا ہی جو ریشمی کپڑے سے بنایا جاتا ہی۔ جاپانی مرد اسکو اندرونی کی **مونو** کے عوض اپنی بالائی پوشاک کے نیچے پہنتے ہیں۔ پانچ برس کی عمر

میں ہر لڑکا مندر میں لیجایا جاتا ہے۔ تاکہ وہ بخیر و خوبی اس عمر تک پہنچنے پر دیوتاؤں کا شکر بجالاتا ہے۔

جب کوئی لڑکا پہلے پہل ہاکاما پہن کر گھر سے مندر کو روانہ ہوتا ہے اور اکڑ اکڑ کر چلتا ہوا رستہ میں اپنے کی مونو کے نیچے اپنی نئی پوشش کی سرسراہٹ سنتا ہے تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ وہ اس وقت اپنے آپ کو ایک بڑا آدمی سمجھنے لگتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ اس کا لڑکپن جو کل تک اس کے ساتھ تھا اب اس سے رخصت ہو چکا ہے۔

پیروں میں ایک قسم کے دبیز سفید رنگ کے جراب پہنے جاتے ہیں جنکو ٹیابی کہتے ہیں۔ پاتابوں کی نسبت یہ زیادہ تر دستانوں سے مشابہ ہوتے ہیں۔ کیونکہ انگلیوں کے لیے بھی ان میں الگ الگ خانے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ ٹیابی سے دو قسم کے کام لیے جاتے ہیں۔ گھر کے باہر یہ پاتابوں کا کام دیتے ہیں اور گھر کے اندر ان سے سلیپروں کا کام لیا جاتا ہے۔

جاپان میں گھر کے اندر جوتہ پہننے کا رواج نہیں ہے۔ جب کوئی جاپانی باہر نکلتا ہے تو وہ لکڑی کے اونچے اونچے کھڑاؤں پہن لیتا ہے اور جب گھر پہنچتا ہے تو وہ ان کھڑاؤں کو باہر دروازے ہی پر چھوڑ دیتا ہے۔ غرض گھر میں داخل ہونے کے وقت وہ صرف ٹیابی پہنے ہوتا ہے۔ اسکے اسباب بعد میں بیان ہونگے۔

جاپانی لباس میں جیب نہیں ہوتی۔ اگر کوئی چیز ساتھ رکھنے کی ہوتی ہے تو اُسے یا تو پٹکے میں اُڑس لیا جاتا ہے۔ یا کی مونو کی آستینوں میں ڈال لیا جاتا ہے۔ کی مونو کی آستینیں عموماً بڑی لمبی لمبی ہوتی ہیں۔ اس قسم کی چیزیں جو جیب میں رکھی جاتی ہیں وہ ان آستینوں میں بڑی آسانی سے سما جاتی ہیں۔

عمدہ عمدہ **کی مونو** اور قیمتی **اوبی** متمول جاپانیوں ہی کو نصیب ہوتے ہیں۔

غریبوں کو یہ میسر نہیں ہو سکتے۔ اسلیے ان کا لباس بہت سادہ ہوتا ہے۔

جاپان کے قلیوں اور مزدوروں کا جسم گرمی کے موسم میں قریب قریب ننگا رہتا ہے۔ اس زمانے میں وہ صرف ایک معمولی سوتی کپڑے کی چڈھی پہنے رہتے ہیں لیکن جہاں کہیں کوتوالی کا کوئی جوان نظر آجاتا ہی تو فوراً نیلے رنگ کا سوتی کوٹ اپنے جسم پر ڈال لیتے ہیں۔ کیونکہ پولیس کو ان مزدوروں کے لباس پر نگرانی رکھنے کا سخت حکم ہے۔

ان مزدوروں کی بیویاں سوت کے کی مونو پہنتی ہیں۔ جاپان میں ایک مزدور اپنی بیوی سمیت صرف پینتالیس سن خرچ کرکے اپنے سر سے پاؤں تک قلی کی حیثیت سے ایک بہت اچھا لباس پہن سکتا ہی۔ پینتالیس سن کے ہمارے ہاں ایک روپیہ ساڑھے چھ آنے (عہ) ہوتے ہیں۔ کیونکہ ایک سن آدھ آنہ کا ہوتا ہی۔

سید خورشید علی
حیدرآباد دکن

مصری ماتم

ایک عیسائی لڑکی جو بیروت (ملک شام) کے مدرسۂ نسواں (دبر دسیانیہ) میں تعلیم پاتی ہو قاہرہ (مصر) میں آئی اور وہاں کچھ دنوں قیام کرکے مصر کی مسلمان عورت کی ماتم کی کیفیت نیز اُس کی جہالت کی حالت اور یہ کہ اس کی تعلیم میں کس قدر دشواریاں حائل ہیں ایک خط میں بتفصیل اُس نے اپنی ایک ہمسبق لڑکی کو لکھا۔ مصر کے رسالہ الهدایہ نے اس خط کو شائع کیا ہو ہم اسکا ترجمہ خاتون کے لیے کرتے ہیں۔

مترجم

میری پیاری بہن!

(اشتیاق وطن اور شوق ملاقات کے بعد لکھتی ہے) یہاں کی مسلمان عورتوں میں بعض توہمات ایسے شائع ہیں جنکی بُرائی کی وجہ سے آسمان اور زمین لرزتے ہیں۔ منجملہ اسکے ایک توہم پرستی یہ ہے کہ یہاں آسیب کا چرچا بہت ہے۔ اکثر عورتوں پر بھوت سوار ہوجاتا ہے۔ یہاں کے بھوتوں میں زار سب سے زیادہ مشہور ہے۔ وہ جب کسی عورت پر آجاتا ہے تو متعدی مرض کی طرح گھر کی دوسری عورتیں بھی اس سے نہیں بچتیں۔ گھر بھر میں ایک آفت اور مصیبت آجاتی ہے۔

اس مصیبت میں اگرچہ مصر کی دونوں جماعت (مسلمان[1] اور قبطی) شامل ہیں لیکن مسلمانوں میں قبطیوں سے بھی زیادہ یہ مرض عام ہے۔

میں نے ایک قبطی عورت سے سنا وہ بیان کرتی تھی کہ میرے دادا خواجہ شکراللہ کے یہاں ایک لونڈی تھی۔ ایک دن وہ آکر کہنے لگی کہ مجھ پر آج زار آگیا ہے۔ زار کے آنے کی علامت یہ مشہور ہے کہ جسپر وہ آتا ہے اسکا بدن بے حس ہوجاتا ہے۔ اگر سوئی وغیرہ اُس کے بدن میں چبھوئی جائے تو اُسکو کچھ تکلیف نہیں ہوتی۔ چنانچہ اسکے بدن میں سوئیاں چبھوئی گئیں۔ اُس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ لیکن میرے دادا اس قسم کے فریب کو خوب سمجھتے تھے اُنھوں نے چاقو لیکر جابجا سے اسکا چمڑہ کاٹنا شروع کیا۔ بالآخر وہ چلا اُٹھی کہ اب زار چلاگیا اور میں اچھی ہوگئی۔ اُس دن سے پھر کبھی اُسپر زار نہ آیا۔

ایک مسلمان خاتون نے بھی اپنی ایک حبشی لونڈی کا اسی طرح کا علاج کیا تھا جس سے وہ ہمیشہ کے لیے آسیب سے محفوظ ہوگئی۔

ایک دوسری مسلمان بی بی کا قصہ مشہور ہے کہ اُن پر زار آیا کرتا تھا۔ اسکے شوہر نے کہا کہ یا تو میری ہوکے رہ یا زار کی۔ اگر اسی طرح زار آیا کریگا تو میں تجکو چھوڑ دوں گا۔

[1] ملک مصر کی مردم شماری ایک کروڑ گیارہ لاکھ ہے جسمیں سے سات لاکھ قبطی اور ایک لاکھ اجنبی اور باقی مسلمان ہیں۔ مترجم

وہ بی بی طلاق کے خوف سے اس خلش سے ہمیشہ کے لیے اچھی ہوگئیں۔

میں نے سنا ہے کہ زار جب کسی پر آتا ہے تو اسکا نظارہ بڑا دلچسپ ہوتا ہے لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں اسکا تماشہ نہیں دیکھ سکی۔ کم تعلیم یافتہ گھرانوں میں اسکا عمل دخل بہت ہے۔ عورتیں اپنے فریب اور مکاری سے اپنے گھر کے مردوں کو انگلیوں پر نچاتی ہیں۔

میں نے یہاں آکر مسلمان عورتوں کے عجیب و غریب ماتم کا تماشا دیکھا جو اس سے بھی زیادہ جہالت اور حماقت آمیز ہے میں مناسب سمجھتی ہوں کہ اس کی دلچسپ کیفیت تم کو بھی سناؤں۔

اسی محلہ کی ایک شریف گھرانے کی ایک نوجوان لڑکی قضا کر گئی۔ ایک بیٹا تین برس کا چھوڑا۔ میں یہ تو نہیں کہونگی کہ اسکے شوہر کے لیے۔ لیکن ہاں اس کی ماں کے لیے اس نوجوان لڑکی کا ماتم بہت سخت تھا۔ میں نے جب اس کی مصیبت زدہ ماں کو روتا ہوا دیکھا تو مجکو انجلینا یاد آگئیں جو مدرسہ آنسہ میں ہماری استانی تھیں کیونکہ اُن کی اور ان بیوی کی شکل میں بہت مناسبت ہے۔ سن بھی قریب قریب وہی ہے۔

ماتم کی محفل چالیسویں تک ہر جمعرات کو ہوتی ہے۔ اس دن ظہر کے بعد سے رشتہ دار عورتوں کی سواریاں آنی شروع ہوتی ہیں اور شام تک آتی رہتی ہیں۔ میں انکے گھر ایک خاتون کے وسیلہ سے ماتم کے دن ظہر سے پہلے ہی تقریباً دس بجے پہنچ گئی۔ مکان کا صحن وسیع تھا۔ در و دیوار کے نقش و نگار سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ نہایت امیر اور دولتمند گھر ہے۔ لیکن آرایش کے سامان اُلٹ دیے گئے تھے۔ نہایت قیمتی فرش بھی اُلٹے پڑے تھے۔

بیگمات جو آتی تھیں وہ کرسیوں اور مونڈھوں پر نہیں بیٹھتی تھیں۔ بلکہ اُنھیں اُلٹے فرشوں پر بیٹھ جاتی تھیں۔ بڑے بڑے آئینوں پر سیاہ پردے پڑے ہوئے تھے۔

اور تصویروں کے چوکھٹوں پر بھی اسی طرح کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ جو عورتیں باہر سے آتی تھیں اُن کو میں نہایت غور سے دیکھتی تھی وہ سب کی سب اپنے زیورات اور آرایش کی چیزوں سے نہایت آراستہ پیراستہ ہوکر آتی تھیں۔ بعضوں کی بھوؤں پر سیاہ وسمہ اور رخساروں پر سرخ گلگونہ بھی ہوتا تھا۔ اگر اُن کے لباسوں میں ایک سیاہ چادر نہ ہوتی تو میں یہ خیال کرتی کہ یہ کسی کی شادی کی مجلس میں آرہی ہیں نہ کہ سوگ کی محفل میں۔

ان عورتوں کے صرف چہرے نظر آتے تھے اور جسم سیاہ چادر میں چھپا ہوتا تھا ہاتھوں میں سیاہ رومال، سر پر سربند بندھا ہوا۔ جسکو یہاں شلحہ کہتے ہیں۔ ان باریک شلحوں میں سے کان اور گلے کے زیورات نظر آتے تھے۔

یہ عورتیں صف بصف اسی اُلٹے فرش پر بیٹھ گئیں۔ خادماؤں نے قہوہ کی پیالیاں پیش کیں جنکو پینا تھا پی لیا۔

مرحومہ کی ماں ایک کونے میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ گھر کی اور عورتیں بھی انکے آس پاس تھیں۔ جب بہت سا حصہ عورتوں کا آچکا تو اس بوڑھی عورت نے ماتم شروع کیا۔

وہ پہلے کھڑی ہوئی۔ ایک کاہی رنگ کی چادر اوڑھے ہوئی تھی۔ سیاہ اون کا باریک سربند تھا جو سر پر سیاہ ریشم کی ڈوری سے بندھا ہوا تھا۔ اسکے گردن میں ایک سیاہ رومال تھا جسکے کنارے سرخ تھے۔ اس رومال کے دونوں کنارے دونوں ہاتھوں سے تھامے۔ اور اُچکنا اور اُچھلنا شروع کیا۔ جو نہایت وحشیانہ فعل معلوم ہوتا تھا۔ اس اُچھلنے میں وہ اس رومال کو کبھی دائیں طرف کھینچتی تھی اور کبھی بائیں طرف۔ کبھی چھوڑ کر موںھ اور سر کو پیٹتی تھی۔

یہانتک کہ تھک جاتی تھی۔ پھر پانچ منٹ بیٹھ کر ذرا دم لے لیتی تھی اور اسکے بعد پھر

پھر اُٹھ کر وہی حرکت کرتی تھی۔

اسکے گھر کی دوسری عورتیں اور اُس کی خادمائیں وغیرہ بھی اسی قسم کا سا سیاہ لباس پہنے ہوئی تھیں۔ اور وہ بھی اسکے ساتھ جو کچھ وہ کرتی تھی۔ کرتی جاتی تھیں۔

مجھ سے اس جگہ ایک بیوی نے بیان کیا کہ یہاں ماتم میں یہ بھی دستور ہے کہ عورتیں اپنے مونھ کو نیل سے سیاہ رنگ لیتی ہیں۔ لیکن یہ میری خوش قسمتی تھی کہ اس ماتم میں اس قسم کی ناگوار صورتیں میں نے نہیں دیکھیں۔

مرحومہ کی ماں یہ سب حرکتیں چُپ چاپ نہیں کرتی تھی بلکہ وہ اس قدر شور اور نوحہ کرتی تھی کہ زمین سر پر اُٹھا رکھی تھی۔ اس نوحہ میں اپنی بیٹی کے اوصاف۔ اخلاق حُسن و جمال وغیرہ کی بھی مدح کرتی تھی۔ مثلاً وہ یوں کہتی تھی۔

ہائے میری پیاری بیٹی۔ ہائے چھوٹے بچے کی ماں۔ تو ماں باپ کے دل کو زخمی کر گئی۔ ننھے کو یتیم چھوڑ گئی۔ اس کی بہار بھی نہ دیکھی۔ اے غیرتمند بیٹی۔ تجھسے سب راضی تھے۔ تیری نرم دلی کی۔ تیری خوش مذاقی کی دنیا میں تعریف ہے وغیرہ وغیرہ۔

جب اس قسم کی بہت کچھ باتیں بیان کر چکی اور تھک گئی تو ایک خاتون نے اسکے دامن کو پکڑ کر اُسے بٹھلا دیا۔ اُسکے بجائے اُس کی بڑی بیٹی نے اس کی قائم مقامی شروع کی۔ مونھ پر دوہتڑ مارنے شروع کیے اور اس قدر زور شور سے چلانا شروع کیا کہ مجھے ڈر ہوا کہ کہیں اسکا حلق نہ پھٹ جائے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اسکے چہرے سے خون ٹپک جاتا ہے آخر تھک کر وہ بھی بیٹھی۔

پھر تین عورتیں سیاہ جامہ پہنے ہوئے آئیں۔ اُنھوں نے نہایت دردناک راگ میں مرحومہ کے اوصاف گانے شروع کیے۔ اسکا اثر مجلس پر اس قدر ہوا کہ ہر طرف سے رونے اور سسکنے کی آواز آنے لگی تمام عورتوں کے آنسو جاری ہوگئے۔

یہ ماتم کا راگ گانے والی عورتیں بعض وقت اُچھل کر گھوم جاتی تھیں جسے میں ایک قسم کا ناچ کہونگی۔ جب یہ بھی اپنا کام ختم کر چکیں تو دوسری نوحہ گر کھڑی ہوئیں۔ اُنھوں نے بھی تھوڑی دیر نوحہ خوانی کی۔

بعد ازاں ان نوحہ گروں نے اپنے ہاتھوں میں ڈفلے لیے (جنکو مصر میں بندر کہتے ہیں) اُن کو بجاکر غمناک گانا شروع کیا۔ ان ڈفلوں میں جھانجھ بھی لگے تھے جس سے فی الجملہ ایک خوشگوار آواز آتی تھی۔ تمام مہمان عورتیں اس وقت کھڑی ہوگئیں۔ اور اپنے مونھ پر ہلکے ہلکے طمانچے مارنے شروع کیے۔ بعض بعض نے ان میں سے اُچھلنا شروع کیا۔ ننگے قدم زمین سے بالشتوں اونچے ہوجاتے تھے۔ لیکن ان سب باتوں کے ساتھ ان کی آنکھوں میں آنسو کا ایک قطرہ بھی نہ دیکھ کر مجھے تعجب ہوتا تھا اور میں دل میں کہتی تھی کہ یا اللہ یہ عجیب سوگ ہے۔

آخر میں یہ منظر دیکھتے دیکھتے گھبراگئی اور میں نے اپنی ساتھی سے کہا کہ خدا کے لیے اب یہاں سے چلو۔ چنانچہ اسی حالت میں ان کو چھوڑ کر ہم چلے آئے۔ یہی محفل سوگ چالیسویں تک ہر جمعرات کو ہوتی ہے۔

مجھ سے ایک عورت نے یہ بھی بیان کیا کہ صعید (ملک مصر) کے گانوں میں جب کوئی میت ہوجاتی ہے تو وہاں کی عورتیں باہر نکلتی ہیں۔ بستی کی گلیوں اور سڑکوں پر جھنڈ باندھکر سینہ کوبی کرتی مونھ پیٹتی ہوئی پھرتی ہیں۔ آگے آگے ایک نوحہ گر عورت ہوتی ہے جو تالیاں بجاکر نوحہ پڑھتی جاتی ہے۔ اور پیچھے سے عورتیں "یا ہبّو[1] یا ہبو" زور زور سے چلاتی جاتی ہیں۔

پیاری بہن! یہ ہے مصر کے مسلمان عورتوں کی کیفیت جسکا ایک شمہ میں نے تم کو بتایا میں اس بُری اور وحشیانہ رسموں کا اتنا خیال نہیں کرتی کیونکہ جہالت کا لازمہ یہی ہے۔

---

[1] یا ہبو ایک سریانی لفظ ہے جسکے معنی ہیں کہ ہم اللہ کے اس فعل سے خوش نہیں ہیں۔

البتہ میں اس امر میں زیادہ غور کرتی ہوں کہ مسلمان عورت کی یہ جہالت کس طرح دور ہو۔

مسلمان عورت کا یہ فرض ہے کہ وہ تعلیم حاصل کرے۔ جب تعلیم حاصل کرے گی تو وہ اپنے گھر انے کو نہیں بلکہ تمام امت کو اس قسم کی جہالت کی ہیمو ادر توہم پرستیوں سے نجات دلا سکے گی۔

لیکن پھر میں خیال کرتی ہوں کہ اس کی تعلیم کیونکر ہو تاکہ وہ ان مضر رسومات کے گرداب اور نہایت پست اخلاقی حالت سے ترقی کر کے صحیح عورت کہلانے کی مستحق ہو۔

سب سے پہلی تدبیر یہ سمجھ میں آتی ہے کہ مسلمان عورتوں میں تعلیم عام کی جائے اور وہ پڑھنے کے لیے مجبور کی جائیں۔ لیکن جب ذرا زیادہ غور کرتی ہوں تو یہ امر ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ نہ تو اسکو مسلمانوں کی قوم کر سکتی ہے نہ حکومت۔

حکومت تو اس لیے نہیں کر سکتی کہ اس کے پاس اتنا فضول روپیہ کہاں ہے کہ اس کام میں خرچ کرے۔ اور مسلمانوں کی قوم اس لیے نہیں کر سکتی کہ ان میں استطاعت کم ہے۔ اور جو دولتمند ہیں وہ اپنی دولت کو اپنے ذاتی آرام و راحت کے لیے خرچ کرتے ہیں۔ غیروں کے نفع کا اُن کو اتنا خیال نہیں۔

اچھا میں فرض کیے لیتی ہوں کہ سرمایہ بھی مہیا ہو گیا۔ لیکن بڑا مشکل سوال استانیوں کا ہے کہ وہ کہاں ملیں گی۔ مسلمان عورت کی تعلیم کے لیے سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ مسلمان استانیاں ہوں جو اسکو پڑھائیں۔ بغیر مسلمان استانیوں کے اس کی تعلیم ناممکن ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام مسلمان اس بات کو گوارا نہ کرینگے کہ وہ اپنی لڑکیوں کو یورپین یا دوسری قوم کی استانیوں کے سپرد کر دیں۔ تعلیم عام اُسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ وہ عوام الناس کی منشا کے مطابق ہو۔ اور یہ جب ہی ممکن ہے کہ جب اُستانیاں مسلمان ہوں۔ کیونکہ مسلمان دوسری

قوم کی اُستانیوں کو پسند نہیں کرتے۔

خواہ اس معاملہ میں وہ غلطی پر ہوں یا راستی پر لیکن یہ امر نہایت خطرناک ہے کہ قوم کی بیٹیاں دوسروں کے ہاتھوں میں دیدی جائیں۔

یہاں کے مدرسۂ سنیہ کی حالت جو معلمات کی تعلیم کے لیے ہے میں نے دریافت کی تو مجھے معلوم ہوا کہ اس میں جس قدر لڑکیاں تعلیم کے لیے داخل ہوتی ہیں۔ ان میں سے صرف دس فیصدی اُستانیاں بنکر نکلتی ہیں۔ اور باقی اکثر تعلیم پوری کرنے سے پہلے ہی نکاح کی بیڑیوں میں جکڑ دی جاتی ہیں۔ کیونکہ مصری نوجوان تعلیم یافتہ عورت تلاش کرتا ہے۔ اس لیے اس مدرسے میں جو لڑکیاں تعلیم کے لیے آتی ہیں انکے واسطے چاروں طرف سے پیغام آنے شروع ہوجاتے ہیں۔ اور اکثر تعلیم پوری کرنے سے پہلے ہی اُن کا نکاح ہوجاتا ہے۔ اس لیے اس مدرسہ کو بجاے اُستانی گر کے اگر میں عروس گر کہوں تو زیادہ موزوں ہے۔

جو دس فیصدی اُستانی بننے کے لیے باقی رہ جاتی ہیں۔ اکثر وہ ہوتی ہیں جو رَدّی ہوتی ہیں اور اُن کے جسمانی و ذہنی قویٰ کمزور ہوتے ہیں۔

ہاسے بیچاری مسلمان عورت! اس کے لیے تعلیم کا کوئی وسیلہ نہیں۔ نہ تو اسکو حکومت تعلیم دلاتی ہے نہ قوم اور نہ اُستانی ملتی ہے۔

عورت خاندان کی روح ہے اور اسی سے جسمانی۔ اخلاقی۔ ذہنی اور طبعی قوتوں کا پیوند ہے اگر عورت جاہل ہے تو خاندان جاہل ہے۔

اچھا اب میں فرض کرتی ہوں کہ مسلمان مرد مسلمان عورت کو پڑھائے۔ یعنی باپ بیٹی کو۔ بھائی بہن کو۔ شوہر بی بی کو۔ لیکن یہ بھی ہر جگہ ممکن نہیں ہے۔ بعض گھرانوں میں ہو بھی جائے تو بھی قوم کا زیادہ حصہ جاہل رہیگا۔ کیونکہ مردوں کو اپنے دنیاوی کاروبار سے اتنی فرصت کہاں ملتی ہے کہ وہ گھر میں بیٹھ کر مُلاگیری کریں اور یہ دردسری اُٹھائیں۔

ہائی مسکین مسلمان عورت! اس طریقہ سے بھی تیری تعلیم نہیں ہوسکتی۔

ہاں ایک صورت اور میری سمجھ میں آئی ہے۔ بڈھے علما،

لیکن یہ بھی ممکن نہیں۔ اسلیئے کہ جس طرح ہمارے یہاں پادری ہر گھر میں مذہبی تعلیم اور اخلاقی اور دینی مسائل کے سکھانے کے لیے بے تردد چلا جاتا ہے مسلمانوں کے یہاں بوجہ پردے کے ایسا نہیں ہوسکتا۔ بڈھے علما، ہر گھر میں جاکر عورتوں کو مسئلے مسائل نہیں سکھلا سکتے۔

پیاری بہن! میں یہ نہیں جانتی کہ مسلمانوں کے یہاں مذہبی لحاظ سے یہ جائز ہے یا نہیں لیکن میرا دل یہ کہتا ہے کہ یہ بہت بڑی غفلت ہے کہ عورتیں علما سے دینی مسائل نہ سیکھیں اور مذہبی تعلیم نہ حاصل کریں۔

ہم نے مان لیا کہ علما خود گھروں میں نہیں جاسکتے تو کیا مسلمان لڑکیوں اور عورتوں کو مسجدوں میں بھی جاکر مذہبی وعظ وتلقین سننا نہیں چاہیے۔ مسجد میں نہ جانے دیں تو کوئی ایسی جگہ بنائیں جہاں محلہ کی عورتیں جمع ہوں اور دوسرے تیسرے مذہبی پیشوا اُن کو مذہبی مسائل بتائے اور اخلاقی ور وحانی وعظ وپند کرے۔

میں نے ایک دن ایک جمعہ مسجد میں دیکھا کہ عورتیں مسجد کے ایک بالکل الگ حصہ میں ہیں اور خطیب مردوں کے مجمع میں وعظ کہہ رہا ہے۔ غریب عورتوں تک وہ آواز بھی نہیں پہنچتی تھی۔

خدا رحم کرے ان بیکس عورتوں پر۔ کیا ان کو مذہبی واقفیت۔ اخلاقی اور روحانی تعلیم کی ضرورت نہیں ہے۔ یا صرف مرد ہی اس وعظ وتلقین کے حقدار ہیں۔

بیکس مسلمان عورت کے لیے مذہبی تعلیم کا دروازہ بھی بند ہے۔

مسلمانوں کے مذہبی حکم کی رو سے مردوں اور عورتوں کا باہم میل جول ٹھیک نہیں ہے۔ نہ عورتوں کی محفل میں مرد شریک ہوتے ہیں نہ مردوں کی محفل میں عورتیں جاتی ہیں۔ لیکن مجھے یہ یقین ہے کہ اگر مسلمان مرد اس وحشیانہ جہالت کو اچھی طرح دیکھیں جو یہاں کی عورتیں شادی

اور ماتم کی رسموں میں کرتی ہیں اور زار کی مضحکہ انگیز اور پُر فریب توہم پرستی پر غور کریں تو اُن کو تسلیم کرنا پڑیگا کہ تبادلۂ خیالات کی عورتوں کو بیحد ضرورت ہی اور بالخصوص مذہبی علمار کے وعظ و پند و نصائح انکے لیے نہایت مفید ہیں تاکہ اس قسم کی جہالت اور وحشت میں وہ گرفتار نہ ہیں۔ ادیب سے وہ ادب کی باتیں سیکھیں گی اور طبیب صحت جسمانی کے قواعد و حفظ ماتقدم کے اصول بتائے گا۔

عورت کی طبیعت میں ایک فطرتی غیرت موجود ہی کہ وہ اپنے آپ کو ایسی حالت میں رکھنا چاہتی ہی کہ اسکے کسی کام پر کسیکو نکتہ چینی کا موقع نہ ملے۔ پس اگر تبادلۂ خیالات کا اسکو موقع دیا جائے تو وہ بہت جلد بُری اور نکتہ چینی کے قابل باتوں کو چھوڑ دیگی اور اچھی باتوں کو اختیار کریگی۔ اور یہی قومی ترقی کی جڑ ہی۔ اور یہی بات مسلمانوں کے تمدن میں مفقود ہی۔ اور اسکا تمام نقصان مسلمان عورت کو اُٹھانا پڑا ہی۔ بہن! ذرا دیکھو کہ کس طرح ہماری بیکس بہن مسلمان عورت پر چاروں طرف سے تعلیم کا دروازہ بند کر دیا گیا ہی۔

مترجمہ
ا۔ ج

ایک سوال کا جواب

پیاری سلمہ۔ تمہارا خط آیا۔ تیزی شوخی شرارت بات بات پر ضد حرف حرف پر اعتراض بندی کی چندی۔ غرضکہ تمہاری تمام حرکتیں یاد آگئیں۔ ابھی تک تم نے اپنی وضع کو نہیں چھوڑا۔ میں سمجھتی تھی کہ ہماری مدرسہ کی زندگی اور موجودہ زندگی میں فرق آجائیگا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ لوگ کہتے ہیں کہ حالات کا اثر طبیعت پر پڑتا ہی اور اس سے مزاج میں تبدیلی ہوتی ہی یا بالفاظ دیگر جو باتیں ہم پہلے نہ جانتے تھے وہ جان جاتے ہیں جن باتوں کا تجربہ نہیں ہوتا وہ پیش آکر ہم کو بتاتی ہیں کہ تمہارے خیالات ابھی بہت زیادہ اصلاح کے حاجتمند ہیں جن باتوں کو تم اچھا سمجھتے تھے وہ اچھی نہیں۔

اور جن معاملات کو تم برائی کی طرف نسبت دیتے تھے وہ نفس الامر میں برے نہیں۔

مگر پیاری سلمہ۔ تمہارے خط نے ان تمام واقعات کو منقلب کر دیا اور سمجھا دیا کہ بعض انسان ایسے بھی ہیں جنکو تجربہ سے عقل نہیں آتی۔ تم پوچھتی ہو السلامۃ فی الوحدۃ کا کیا مطلب ہے۔ مجھے بڑی ہنسی آتی ہے جب میں تمہارے سوال پر غور کرتی ہوں اور اُس مطلب کو ذہن نشین کرتی ہوں جو سوال کرتے وقت تمہارے دل میں تھا۔ چونکہ تم نے سوال کا صرف ایک ہی موضوع رکھا ہے اسلیے جواب میں بھی اسکا لحاظ رکھا جائیگا۔

تمہارا مطلب مسئلہ ازدواج پر بحث کرنا ہے۔ جسکا ضمنی طور پر اپنے خط میں تم نے اشارہ بھی کیا ہے اول میں وہ فقرے نکھتی ہوں جو تم نے لکھے ہیں بعدہ جواب دونگی۔

بزرگ کہتے ہیں "ہیچ آفت نرسد گوشۂ تنہائی را" جو کیفیت تنہائی میں نصیب ہوتی ہے وہ کسی بات میں نہیں السلامۃ فی الوحدۃ اسی میں سلامتی ہے کہ انسان ترک علائق کرے۔ آج بچوں کی پریشانی ہے کل خاوند کی بےعنوانی سے نالاں ہے مفلسی الگ ستاتی ہے مصیبت پر مصیبت یہ کہ خاوند سے ناچاقی ہوئے پر سو دُرے اُنھوں نے سمجھ لیا الرجال قوامون علی اهل بیته حدیث ہے فرمان رسول ہے یوں بھی ماننا فرض ہے کوئی مرے یا جیے۔ بہن میرے نزدیک تو ان معاملات سے بہتر ہے کہ نہ اس قصے میں پھنسے نہ یہ قضیے ہوں۔

سلمہ تم نے اپنے خیال کو ظاہر کر دیا اور بادی النظر میں جو کچھ تم نے لکھا ہے سچ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن شاید تم نے یہ نہ سمجھا ہوگا کہ یہ اُصول تمہارا تمہارے مذہب سے کسی قدر علیحدہ ہے اہا میں بھولتی ہوں تم نے مذہبی طور سے سوال نہیں کیا ہے۔

اچھا سنو السلامۃ فی الوحدۃ سے وحدۃ جسمی مراد نہیں بلکہ اسکا یہ مطلب ہے کہ کثرت سے لوگوں کو اپنے معاملات میں شریک نہ کیا کرو۔ فرقہ نسوانی کا قاعدہ ہے کہ اپنے دُکھ کو دنیا کے سامنے روتی پھرتی ہیں۔ چونکہ اس سے ہر قسم کا نقصان متصور ہے اور اہل فہم کے نزدیک یہ بات بہتر نہیں

اسلئے بتایا گیا کہ السلامۃ فی الوحدہ ۔ دوسرا تازیانہ نصیحت یہ ہے کہ کثرت سے معاملات میں غلط ملط
نہ رکھو تعاملو کالاغیار پر عمل کرو۔ ورنہ نقصان اُٹھاؤ گے۔

اسی طرح اور بہت سی توجیہات پیدا ہوسکتی ہیں جنکا لکھنا طول امل ہے۔ غرضکہ جو مطلب تمہارے
ذہن میں ہے وہ اسکے مفہوم سے کوسوں دور ہے۔

سلمہ! تم نے اپنی تحریر میں سب سے بڑی غلطی یہ کی ہے کہ تم نے اپنے دعوے کے اثبات میں تمام
اقوال اور مثالیں غیر مسلم طبقہ کی دی ہیں۔ اگرچہ تمہارا سوال مذہبی سوال نہیں تاہم یہ نہایت بُری
بات ہے کہ اپنے بزرگوں اور فلاسفروں کے ہوتے ہوئے ہم دوسرے لوگوں سے مطالب اخذ کریں
تم جانتی ہو کہ ہر شخص اپنے مطلب کی تمثیل اور اقوال تلاش کرلیتا ہے دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ وہ اقوال
اُن لوگوں کی زبان سے نکلے ہوئے ہیں جنکو دنیا تسلیم کرے یا اسکے خلاف جس طور سے تم نے
اپنے دعوے کے ثبوت میں مثالیں دی ہیں۔ میں بھی دے سکتی ہوں۔ لیکن میں غیر مسلم طبقہ کے
علماء کو پیش نہ کروں گی۔ حالانکہ میری فیور میں بہت سے یورپین فلاسفر ہیں۔ ہمیں ڈاروِن اور
بیکن کے کلیوں کو اُسوقت دیکھنا چاہیے جب کوئی مثال اسلامی طبقہ کی ہاتھ نہ آئے۔

میں شہنشاہ بحر و بر فخر دوعالم روحی فداہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مثال میں پیش
کرتی ہوں جنھیں بہت زیادہ وحدت سے کثرت کی طرف منتقل ہو کر فائدے محسوس ہوئے۔
زمانہ وحی کی کیفیت معلوم کرنے سے سمجھ میں آتا ہے کہ آپ کس قدر اپنی پیش آمدہ حالت سے
اندیشناک ہوگئے تھے (بروایت بخاری) آپنے اندیشہ ظاہر کیا کہ میں ہلاک نہ ہوجاؤں۔
لیکن بی بی خدیجہ نے اطمینان دلایا کہ خدا آپ جیسے لوگوں کو ہلاک نہیں کرتا۔ جو مساکینوں کو
کھانا دیتے ہیں اور ضرورت مندوں کی ضرورت رفع کرتے ہیں۔ بیشک آپ رسول تھے اور
بار رسالت آپ پر ڈالا جانے والا تھا لیکن گھبراہٹ کی حالت میں تسکین دینے والا وجود
بی بی صاحبہ ہی کا تھا۔

جنگ یرموک میں مفرورین کو یہ کہکر کہ اگر تم بھاگوگے تو ہم جو تمہاری ناموس ہیں کیا کرینگے

اور کہاں جائینگے) جنگ پر آمادہ کرنا ان کی خاتونوں ہی کا کام تھا۔

جس طرح مرد کی زندگی بلا عورت کے مشکل سے گزرتی ہے اسی طرح عورت کی زندگی بلا مرد کے ادھوری اور ناقص رہ جاتی ہے۔ مذہب اور ایزاد نسل کے فائدہ سے قطع نظر کرکے بھی جب تم غور کروگی تو تم کو ہویدا ہو جائیگا کہ عورت کا بہتر رفیق مرد ہے جس سے اُسکے تمام غم غلط ہو جاتے ہیں۔ اسکی تمام خوبیاں اُسوقت تک زنگ آلود ہیں جب تک وہ شوہر دار نہ ہو جائے۔ رہا مذہب اور اُس سے قطع نظر کرنا۔ تو بہن ہم سے تو ہو نہیں سکتا۔ تم اسے اچھا سمجھو تو سمجھو۔ میرے خیال میں تو خواہ کوئی فرقہ کیوں نہو بلا اصول مذہب اختیار کیے ہوئے ترقی نہیں کرسکتا۔ میں سچ کہتی ہوں کہ جب تک عورتوں کو مسئلہ تعلیم مذہبی پر خاص طور سے توجہ نہ دلائی جائیگی ہرگز کامیابی نہ ہوگی۔ اسلیے کہ جس طور سے عورت بلحاظ مزاج کے مردوں کی نسبت ضعیف دل تلون مزاج اور کمزور طبع ہے اسی طرح خیالات اور مذہب کی بنا پر وہ کمزور بنائی گئی ہے۔ لوگ معاملات جہانداری میں عورتوں کی مثالیں پیش کرکے اُن کی اس کمزوری طبع کے دھبہ کو مٹانا چاہتے ہیں۔ لیکن کوئی نہ کوئی ایسی خرابی معاملات میں مضمر ہوتی ہے کہ زیادہ روشنی ڈالتے ہوئے جی گھبراتا ہے۔

عورات من حیث العورات تدبیر سے اس قدر واقف نہیں ہیں جسقدر مرد۔ بلکہ اگر واقعیت کا خیال کیا جائے۔ تو اس صفت کا اُن میں پتہ بھی نہ ملے گا۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ تمام حکمران فرقہ عورات اصول وضوابط کے مطابق خود فیصلہ کرتی تھیں۔

قیصرۂ ہند کا تدبر مشہور ہے لیکن وہاں بھی کونسل (احتیاج غیر) کا وجود ہے۔ اگر تمہاری مذہبی تعلیم مکمل ہوتی تو آج یہ سوال تم ہرگز نہ کرتیں جو مذہب کے کاٹنے میں ہے کیا عقل کی کسوٹی پر بھی سچا نہیں اُتر سکتا۔ لیکن جہاں تمہارے اعتراضات کا ایک حصہ لاطائل ہے۔ وہاں ایک حصہ صحیح بھی ضرور ہے جسکو شمار نہ کرنا سخت ناانصافی ہوگی۔

میاں بیوی کی زندگی عمدہ طور سے اتفاق سے بسر ہوتی ہے اور اتفاق جبھی ہو سکتا ہے کہ وہ دونوں رنگ مزاج و خیالات میں متحد ہوں بصورت دیگر اخلاص محال ہے۔ زمانہ کا رنگ سبق دے

رہا ہے۔ حالات پیش آمدہ سے لوگ سمجھتے جاتے ہیں کہ کس بات میں ہماری بھلائی ہے۔ بچپن کی شادی نارضامندی کی شادی کے نتائج سے واقفیت ہوتی جاتی ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ اصلاح پسند لوگوں کو بیدین کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ وہ لوگ دیندار سمجھے جانے کے علاوہ ہردلعزیز ہوتے جاتے ہیں۔

بچپن کی شادی کی نسبت سرسری طور سے دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسم سخت نقصان دہ ہے لطف یہ کہ اگر کبھی تمہاری گفتگو کسی بڑی بوڑھی سے (جو جاہلیت عرب کے سے خیالات رکھتی ہو) ہوجائے اور اسکے سامنے تم یہ تجویز پیش کرو تو وہ کس زور شور سے تمہاری تردید کرتی ہے۔ صوبہ بہار میں ابھی تک مسلمانوں میں پرانے طریق رائج ہیں۔ گو تا منڈا الم علم جنکے نام بھی مجھے معلوم نہیں۔ سنتے ہیں کہ آیندہ سال کانفرنس کا اجلاس صوبہ بہار میں ہوگا۔ دیکھیے کیا اثر ہوتا ہے

غرض کوئی کچھ کیوں نہ کہے۔ میں تو زور سے کہونگی کہ طریقہ ازدواج اور مناکحت بیشک ترمیم طلب ہے۔ اور جب تک اس پاک تعلیم رسول کا اصل نشا **ایجاب و قبول** قلبی طور پر پورا نہ کیا جائیگا یہی خرابیاں آئے دن پڑتی رہیں گی۔

اسکے متعلق لیڈران قوم سے میں تم دونوں اپیل کرسکتے ہیں جسکا علاج کرنا اُن کا فرض ہے ورنہ اندیشہ ہے کہ کہیں آیندہ نسلوں میں مذہبی طور پر بوجہ **عدم ایجاب و قبول حقیقی** خرابیاں نہ پیدا ہوجائیں۔

اب دیکھنا ہے کہ کون بدنامیوں اور سب وشتم کی بوچھار قبول کرکے اس مروجہ ایجاب وقبول کے خلاف میرے ہم آہنگ ہوکر تائید ثانی کرتا ہے۔

رقیمہ
تمہاری عائشہ

بقلم مقبول احمد نظامی سیوہاروی

بچپن کی نسبت کا ایک عبرتناک نظارہ

اُن کی نظروں میں میرے دل کی حقیقت کیا ہے
ایک مٹی کا کھلونا تھا گرا ٹوٹ گیا

شاید رفیق گھر میں کبھی خوش رہتا ہوگا۔ عباسہ ہمیشہ اس بات کی آرزومند رہی کہ وہ رفیق کو خوش رکھے۔ وہ چاہتی تھی کہ رفیق اسکے ساتھ اچھا سلوک کرے۔ رفیق اُسکے دردِ دل کو دیکھے۔ اس کی دلی تکلیفوں پر خیال کرے۔ مگر یہ غیر ممکن تھا۔ رفیق بہت بدمزاج ہے اور اسکے ساتھ سنگدل بھی ہے۔ ہفتے گزر جاتے ہیں مگر وہ ستم نصیب عباسہ کو اپنی شکل نہیں دکھاتا۔ جب کبھی گھر میں آیا بھی تو بالکل خاموش۔ وہ اکثر اس بات کی تحریک کراتا تھا کہ عباسہ سے قطع تعلق کر لیا جائے۔ مگر اسکا سبب نہیں کھلتا تھا کہ کیوں۔

وہ عباسہ جو صرف ایک رفیق کی خوشی پر اپنی دلی آرزوؤں کو وابستہ کر چکی تھی۔ وہ عباسہ جو رفیق کو غمگین دیکھ کر خود بھی ملول ہو جاتی تھی کیا وہی رفیق ہے۔ جو اسکے ساتھ ایسا سلوک کرنے پر آمادہ ہے۔ مگر اس نااتفاقی کا بڑا سبب یہ ہے۔ رفیق اور عباسہ آپس میں خالہ زاد بھائی بہن تھے۔ رفیق کی والدہ عباسہ کو بہت عزیز سمجھتی تھیں۔ عباسہ بھی اپنے والدین کی صرف ایک ہی لڑکی تھی۔ بچپن میں دونوں ایک دوسرے کو دل سے چاہتے تھے۔ وہ تباہ کرنے والی رسم جسکا رواج ہندوستان میں کثرت سے ہے۔ یعنی رفیق اور عباسہ آپس میں ایک دوسرے کو منسوب کر دیے گئے۔ بچپن کی منگنی جبکہ دونوں اسکے معنی بھی اچھی طرح نہ سمجھتے تھے۔ زندگی میں انقلاب پیدا کرنیکے لیے کافی ہوگی۔

یہ منگنی کس کے دل سے ہوئی؟ رفیق اور عباسہ کے والدین کے دل سے۔ اگر ہمیں کچھ شبہ نہیں۔ رفیق اسوقت اس سے خوش ضرور تھا۔ جب اسکے کانوں میں یہ خبر پہنچی کہ آج عباسہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کی ہوگئی (منگنی جسکو نکاح سے کم کہنا بیجا نہوگا) دونوں ایک دوسرے کو منسوب ہوگئے تو اس خیال کے لانے سے رفیق بہت خوش ہوتا تھا۔

یہ ضرور ہی کہ وہ اسوقت تجربہ کار تھا۔ مگر ہاں وہ یہ جانتا کہ آج سے۔ اسکے اور عباسہ کے درمیان ایک نیا رشتہ قایم ہوگیا۔ جیسے اُس وقت اسے کوئی مخالفت نہ تھی۔

قبل اسکے کہ عباسہ کی مصیبت لکھی جائے۔ تھوڑا سا حال رفیق کا لکھنا بیجا نہ ہوگا۔

یہ تو ظاہر بات تھی کہ رفیق اور عباسہ دونوں ایک دوسرے کو دل سے پسند کرتے تھے۔ مگر بچپن کا زمانہ نکلنے کے بعد رفیق ایک اسکول میں تعلیم پانے لگا اور عباسہ پرائیویٹ طور پر تعلیم حاصل کرنے لگی۔ مگر رسم کے مطابق عباسہ اور رفیق میں پردہ قائم ہوگیا۔ وہ میل جول بالکل جاتا رہا۔ جو بچپن کی آزاد زندگی میں دونوں کو حاصل تھا۔

عباسہ اگر غور سے دیکھا جائے تو ایک خوبصورت لڑکی ہی۔ وہ حُسن جو ہندوستانی ناکتخدا لڑکی کے لیے چاہیے اس میں پورے طور سے موجود ہی۔ رفیق بھی ایک حسین لڑکا ہی۔ تعلیم حاصل کرنیکے بعد رفیق ایک معزز گورنمنٹ عہدہ پر کان پور میں ممتاز ہوگیا۔ اسکی عمر اسوقت بائیس سال کی ہی۔ عباسہ کو اُنیسواں سال ہی۔ تعلیم پانے کے بعد رفیق ایک فیشن ایبل نوجوان بنگیا۔ اسکے خیالات میں بہت بڑا انقلاب ہوگیا۔ بدنصیب عباسہ کی قسمت کی طرح رفیق کے خیالات بالکل پلٹ گئے۔ وہ عباسہ سے بھی زیادہ خوبصورت لڑکی کو پسند کرنے لگا۔

مگر یہ راز رفیق کے دل میں پوشیدہ تھا۔ کاش رفیق مونھ کھول کر صاف کہدیتا۔ لیکن ہونے والی بات پوری ہوکر رہی۔ دونوں جانب سے شادی کے انتظام ہونے لگے۔ مگر رفیق اب رفیق نہیں رہا۔ وہ تو آزاد جنٹلمین ہوگیا۔ رفیق کے خیالات بدلنے کے لیے کان پور کے ایک مشہور خاندان کی لڑکی مل گئی۔ یہ رشتہ اسکے ایک دوست کی مدد سے پورا قایم ہوگیا۔

اب اس نے ارادہ کیا کہ عباسہ کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کردے وہ یقینی جانتا تھا اسکے والدین اسکے انکار کو نہ چلنے دینگے۔ کیونکہ اُنہیں رفیق کے لیے عباسہ سے زیادہ اچھی اور کون لڑکی ہوسکتی تھی۔ مگر پھر بھی رفیق نے اپنی ماں کو اس مضمون کا خط لکھا۔ کہ "میں اسوقت تک شادی کرنا نہیں چاہتا جب تک کہ خود اخراجات برداشت نہ کرسکوں"

چونکہ رفیق کو اسکے والدین آزاد خیال سمجھتے تھے۔ اسکا یہ کہنا بھی اسی پر محمول کیا گیا۔ رفیق کے والدین بہت متمول آدمی ہیں۔ اُنہیں روپے پیسے کی مطلق پرواہ نہیں ہے۔ اس نے صرف بہلانے کے طریق پر یہ الفاظ لکھے تھے۔ اس معاملہ میں رفیق ضرور قصوروار ہے کیونکہ جب وہ عباسہ کی نسبت ایسے خیالات رکھتا تھا تو صاف طور پر ظاہر کر دیتا۔ ممکن ہے کہ کل حالات کے انکشاف پر بدنصیب عباسہ ایسے موذی کے چنگل سے آزاد ہو جاتی۔ وہ یقینی جانتا تھا کہ عباسہ ساری عمر اس مصیبت کو برداشت کریگی پھر اس معاملہ میں رفیق قصوروار نہیں تو کون ہے۔ لیکن رفیق نے صرف اس وجہ سے اپنے پورے خیالات ظاہر نہیں کیے کہ جب وہ اپنے اس قسم کے خیالات عباسہ کی نسبت ظاہر کریگا تو وہ اپنے والدین کی ساری دولت سے عمر بھر کو محروم ہو جائیگا وہ یقیناً جانتا تھا کہ اسکے والدین اس معاملہ میں عباسہ کی جانب داری کرینگے۔ بہرحال کچھ ہو اُس نے بالکل خودغرضی سے کام لیا۔ ممکن تھا کہ اسکے خیالات ظاہر ہونے پر۔ عباسہ آج تکلیف میں نہ ہوتی۔ عباسہ کی شادی کو تیسرا مہینہ ہے۔ مگر شادی کے بعد سے اسکو ایک دن بھی چین نہیں نصیب ہوا۔ وہ رفیق کے ساتھ اسوقت کانپور میں ہے۔

رفیق اس دھن میں ہے کہ کسی طرح دوسری لڑکی سے شادی کرلے۔ مگر عباسہ کی موجودگی میں اسکو یہ غیر ممکن معلوم ہوتا تھا۔ کیونکہ وہ اپنے والدین کے مزاج سے بہت ڈرتا تھا۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ عباسہ یہاں سے چلی جائے۔ تو میں ایک خوشگوار زندگی بسر کروں۔ مگر وہ مجبور ہے کہ عباسہ کو زبردستی نہیں بھیج سکتا۔ بس وہ اس خوف سے ابھی تک مجبور رہا کہ اگر میں عباسہ کے ساتھ سختی کرونگا تو والدین کی دولت سے ساری عمر کو محروم ہو جاؤنگا۔ لیکن اسکے دل سے یہ بھی خیال نکلنا ناممکن ہے کہ حسینہ کے ساتھ شادی نہ کرے۔ کُل کانپور میں ابھی تک یہ مشہور ہے کہ رفیق نا کتخدا ہے۔

اسکا مشتہر کرنے والا رفیق ہی ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ شادی کا اعلان ہونے پر یعنی عباسہ کی موجودگی میں حسینہ کی شادی اسکے ساتھ نہ ہوگی۔ حسینہ بھی کسی غریب والدین کی لڑکی نہیں ہے۔

مگر ہمیں نہیں معلوم کہ وہ کس مزاج کی ہو۔

رفیق نے حسینہ کے والدین پر یہ بھی ظاہر کر دیا تھا کہ اسکے والدین اس شادی میں شریک نہونگے مگر اس کی اصلی وجہ نہیں بتلائی کہ کیوں۔

حسینہ کے والدین کو بظاہر رفیق میں کوئی برائی نہیں معلوم ہوئی. کیونکہ وہ ایک امیر اور تعلیم یافتہ لڑکا اور پھر چار سو کا ملازم۔ لیکن وہ رفیق کے خیالات سے بالکل بے خبر تھے۔ وہ سب طرح اچھا ہی۔ مگر عادت کا بہت خراب ہی متلون مزاج بھی ہے۔ رفیق نے حسینہ کے والدین کو بہت بڑی چال دی۔ یقیناً وہ کل حالات معلوم ہونے پر حسینہ کی شادی رفیق کے ساتھ نہ کرتے۔

متلون مزاج رفیق اسی خلجان میں مبتلا ہی کہ جس طرح بھی ہو خوبصورت حسینہ سے شادی کرے۔ اگر کسی کو عباسہ کی موجودگی کا علم ہوگیا تو شادی میں رخنہ پڑجائیگا۔ ایک رات جبکہ رفیق شادی کا کل انتظام ٹھیک کر چکا تھا اپنے ملازمین کو اس بات کی ہدایت کر کے کہ وہ عباسہ پر اس شادی کا اعلان ابھی نہ کریں۔ حسینہ کے مکان پر چند احباب کے ساتھ چلدیا۔

(باقی آیندہ

بنت رشیدالدین

اڈیٹوریل

نہایت رنج و قلق اور دلی افسوس کے ساتھ یہ اطلاع درج کی جاتی ہی کہ جناب شمس العلما خان بہادر مولانا محمد ذکاء اللہ صاحب دہلوی کا ۸۔ نومبر کی صبح کو انتقال ہوگیا۔

ان کا انتقال اگرچہ عمر طبعی کی حد تک پہنچکر تقریباً ۸۰ سال کی عمر میں ہوا ہی لیکن پھر بھی ان کی موت کا ماتم سخت ہی اسلیے کہ ان کا علم جوان تھا۔ اور قلمی خدمت ملک اور قوم کی وہ آخر تک کرتے رہے مرحوم کی علمی خدمتیں بے نظیر ہیں۔ اور صیغہ تعلیم نسواں کے وہ بہت بڑے حامی و سرپرست تھے

مرحوم بارہ برس کے سن میں دہلی کالج کے صیغہ اورنٹیل میں داخل ہوئے تھے۔ جہاں آپ نے چھ سال تک تعلیم حاصل کی۔ مولانا نہایت ذہین اور طباع ابتدا ہی سے تھے۔ اسلیے اکثر تعلیمی انعامات وغیرہ حاصل کیا کرتے تھے۔ ۱۸۵۱ء میں دہلی کالج میں علوم ریاضیہ کے مدرس مقرر ہوئے۔ کچھ عرصہ آگرہ کالج میں بھی اردو لٹریچر کی تعلیم دیتے رہے۔ ۱۸۵۵ء میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس مقرر ہوئے اور گیارہ سال تک اس عہدہ پر مامور رہے۔ اسی عرصہ میں تعلیم نسواں کے متعلق خدمات انجام دینے کے صلے میں گورنمنٹ سے خلعت بھی حاصل کیا۔

۱۸۶۹ء میں نارمل اسکول دہلی کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ تین برس بعد اورنٹیل کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ مگر فوراً ہی الہ آباد کے ایم سی کالج کے پروفیسر ورنیکولر سائنس و لٹریچر مقرر ہوکر چلے گئے اور یہاں ۱۸۸۷ء تک رہے۔ پنشن لینے کے بعد چند روز علی گڑھ کالج میں آکر قیام کیا اور طلبہ کو رڑکی کالج کے داخلے کے لیے تیار کرتے تھے۔ اسکے بعد دہلی جاکر خانہ نشین ہوگئے۔ مولانا کا تعلق علیگڑھ کالج سے اور سرسید کی دوسری تحریکوں سے بہت قدیم سے تھا۔ آپ کالج کی ابتدائی کمیٹی "خزانۃ البضاعۃ" کے بھی ممبر تھے۔ اور ۱۸۸۹ء سے (یعنی ٹرسٹیز ل کے پاس ہونے کے زمانہ سے) برابر ٹرسٹی چلے آتے تھے۔ مرحوم نے علم کی مختلف شاخوں میں بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ اُردو کے بہت سے اخبارات و رسائل آپکے رشحات قلم سے سیراب ہوتے تھے۔ آپ مختلف علوم و فنون میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ آپ کی مستقل تصانیف کی تعداد ڈیڑھ سو سے کم نہ ہوگی جنکی تخمینی تفصیل حسب ذیل ہے۔

علوم ریاضیہ ۸۷، تاریخ و جغرافیہ ۱۸، ادب ۱۶، طبیعیات و ہیئت ۹، اخلاق ۶، سیاست مدن ۵ یقین ہے کہ یہ علمی خدمت آپ کا نام ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔

ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد بہ علم ثبت ست بر جریدۂ عالم دوام شاں

افسوس ہے کہ مولانا کی وفات سے ملک و ملت کے درمیان سے ایک یگانہ و قابل فخر فرد اُٹھ گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ خدا مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور آپکے فرزندان و دیگر پس ماندگاں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

ریویو

اولڈبای کے نام سے ایک ماہواری رسالہ بنارس سے جناب ابو حامد عترت حسین صاحب بی اے اولڈ بائی علیگڈھ کالج کی اڈیٹری میں ماہ ستمبر ۱۹۱۰ء سے جاری ہوا ہی۔ ہم اس نئے رسالہ کا نہایت خوشی سے خیر مقدم کرتے ہیں۔ امید ہی کہ جن حضرات کو اس پرچہ کے نکالنے کا خیال پیدا ہوا ہی وہ اسکو اولڈ بوائز ایم اے او کالج کی حیثیت اور قابلیت کے معیار کے مطابق بنانے کی کوشش فرمائینگے

ایم اے او کالج کے اولڈ بوائز کی ایک بڑی جماعت اسوقت ہندوستان کے ہر حصہ میں موجود ہی اور مسلمانان ہند میں یہی جماعت معزز اور سر برآوردہ خیال کی جاتی ہی۔ اگر کوئی رسالہ ان کے نام سے موسوم کیا جائے تو اس میں کوئی نہ کوئی ایسی خصوصیت ہونی چاہیے جس سے وہ دوسرے رسالوں سے ممتاز رہے۔

اس وقت بدقسمتی سے ہمارے اولڈ بوائز میں دو فریق پیدا ہو گئے ہیں۔ ہمیں امید ہی کہ یہ رسالہ ان دو فریقوں میں سے کسی ایک کا بھی بننا پسند نہ کریگا اور اگر ایسا کریگا تو اولڈ بوائے کا نام اسکے لیے کسی حالت میں موزوں و مناسب نہیں رہیگا۔

اس رسالہ کا مقصد بہت اعلیٰ درجہ کا ہے۔ جن بزرگوں نے اسکو جاری کیا ہی ان کی قابلیت کے ہم معترف ہیں۔ پہلے نمبر میں تین مضامین خاص طور پر اولڈ بوائز کی دلچسپی کے قابل ہیں۔ ایک مسٹر راماں شنکر صاحب کا اور دوسرا مسٹر محمد امین صاحب کا۔ اور تیسرا مسٹر شوکت علی صاحب کا۔

ان مضامین کو پڑھ کر کالج کا زمانہ پھر یاد آجاتا ہی۔ اپنے کالج سے محبت تازہ رکھنے کے لیے اولڈ بوائے بہترین ذریعہ بن سکتا ہی اور ہمیں امید ہے کہ یہ ایسا ہی ثابت ہوگا۔

اس سے قبل بھی دو مختلف شکلوں میں کالج اور اولڈ بوائز کے درمیان رشتہ مضبوط رکھنے کے لیے دو رسالے جاری کیے گئے۔ بہت عرصہ تک مفید کام انجام دے کر اُن کا خاتمہ ہوگیا ہے۔

امید ہے کہ یہ اسکا نیا جانشین ہماری امیدوں کو استقلال کے ساتھ پورا کریگا۔ چھپائی لکھائی

حجم ۳۶ صفحے : قیمت رسالہ میں درج نہیں ہے لیکن شاید سے ۱/ سالانہ ہے۔

میڈم کاما

ہندوستان کی مشہور و متمول پارسی خاتون میڈم کاما پیرس میں رہتی ہے۔ امسال جب مصر کے آزادی پسند مسلمانوں نے حزب الوطنی کا جلسہ مقام برسلز میں کیا تو میڈم کاما نے تعلیم نسواں کی ضرورت پر اس جلسہ میں ایک پرمغز تقریر انگریزی زبان میں کی جو نہایت توجہ کے ساتھ سنی گئی اور بہت پسند کی گئی۔

میڈم موصوف تقریر کرتے وقت اپنا دیسی لباس پہنے ہوئی تھیں اُنھوں نے اہل مصر کو یہ بھی نصیحت کی کہ وہ غیر ملکی عورتوں سے ہرگز شادیاں نہ کریں۔ کیونکہ مصری امرا میں اب اسکا شوق پیدا ہو گیا ہے۔ حالانکہ ملکی اور قومی ترقی کے لیے انہیں بچوں کی ضرورت ہے جو خالص ملکی خون سے پیدا ہوں۔

عورتوں کی موت۔ ہندوستان کی مردم شماری میں جو ۱۹۰۱ء میں آج سے دس برس پہلے ہوئی تھی تقریباً پندرہ کروڑ مرد اور چودہ کروڑ عورتیں ہیں۔ یعنی مردوں کی تعداد قریب ایک کروڑ کے زیادہ تھی۔ یہ درصل ہندوستان کی ایک بدنصیبی ہے کیونکہ فطرتاً کم سے کم دونوں فرقوں کی تعداد برابر ہونی چاہیے۔

علاوہ اس ایک کروڑ کی کمی کے تقریباً اسی قدر عورتیں بیوہ ہیں اس سے اور بھی یہ مصیبت بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ ہندوستان میں بیوہ عورتیں بھی بمنزلہ مُردہ عورتوں کے ہیں جن سے کوئی شادی نہیں کر سکتا۔

اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ عورتیں کم قدر سمجھی جاتی ہیں۔ اسیلیے ان کی صحت اور تندرستی کا چنداں خیال نہیں کیا جاتا۔ اور وہ مرتی جاتی ہیں۔ چنانچہ آجکل بنگال کے اخبارات لکھ رہے ہیں کہ وہاں مردوں کی بہ نسبت عورتیں زیادہ مر رہی ہیں۔ اور یہ افسوسناک حالت خصوصاً پندرہ سے چالیس سال کی عمر تک کی عورتوں کی ہے۔ یہی نہیں کہ وہ خاص امراض نسوانی میں مرتی ہیں بلکہ دق۔ ملیریا وغیرہ امراض سے بھی انہیں کو زیادہ نقصان پہنچتا ہے۔

اسیسے ہر ہی خواہ بنی نوع انسان کا فرض ہے کہ وہ عورتوں کی جسمانی صحت کی ترقی میں کوشش کرے۔ ورنہ ملکی آبادی دن بدن زوال پذیر ہوتی جائے گی۔

نمایش

اب نمایش کا زمانہ قریب آگیا ہے جن خواتین یا اصحاب کو اشیاء واسطے نمایش کے بھیجنی ہوں اُن کو بلا تکلف یا براہ راست ناگپور یا میرے پاس بھیجنا چاہییں۔ ناگپور بنام ایچ۔ ایم ملک صاحب لوکل سکرٹری کے نام بھیجنی چاہییں اور زیادہ مناسب یہی ہے کہ براہ راست تمام اشیاء ناگپور بھیجی جائیں تاکہ علیگڈھ میں اُن کو کھولنے اور دوبارہ بند کرنے میں اشیاء خراب نہ ہوں۔

ناگپور کی کمیٹی نے بڑی مستعدی سے کام کیا ہے اور امید ہے کہ نمایش میں کامیابی ہوگی۔ تمغے اور سارٹیفکٹ حسب معمول دیے جائینگے۔

رجسٹرڈ نمبر ایل ۲۰۱

خاتون

نمبر ۱۲	بابت ماہ دسمبر سنہ ۱۹۱۱ع	جلد ٦

اڈیٹر شیخ محمد عبداللہ بی اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ سکرٹری تعلیم نسواں سکشن

فہرست مضامین

محمد عبدالسلام پرنٹر کے اہتمام سے

مطبع فیض عام علی گڑھ میں چھپا

۲۰ دسمبر سنہ ۱۹۱۱ع

شیخ عبداللہ بی اے پبلشر نے علی گڑھ سے شائع کیا

خاتون

۱۔ یہ رسالہ ۴۰ صفحے کا علی گڑھ سے ہر ماہ میں شائع ہوتا ہے اور اس کی سالانہ قیمت [illegible]
اور ششماہی ۱۲/ ہے۔

۲۔ اس رسالہ کا صرف ایک مقصد ہے یعنی مستورات میں تعلیم پھیلانا اور پڑھی لکھی مستورات
میں علمی مذاق پیدا کرنا۔

۳۔ مستورات میں تعلیم پھیلانا کوئی آسان بات نہیں ہے اور جب تک مرد اس طرف متوجہ [illegible]
مطلق کامیابی کی امید نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ اس خیال اور ضرورت کے لحاظ سے [illegible]
ذریعہ سے مستورات کی تعلیم کی اشد ضرورت اور بے بہا فوائد اور مستورات کی جہالت سے
جو نقصانات ہو رہے ہیں اس کی طرف مردوں کو ہمیشہ متوجہ کرتے رہیں گے۔

۴۔ ہمارا رسالہ اس بات کی بہت کوشش کریگا کہ مستورات کے لیے عمدہ اور اعلیٰ لٹریچر پیدا [illegible]
جس سے ہماری مستورات کے خیالات اور مذاق درست ہوں اور عمدہ تصنیفات کے
پڑھنے کی ان کو ضرورت محسوس ہو تاکہ وہ اپنی اولاد کو اس سچے لطف سے محروم [illegible]
علم سے انسان کو حاصل ہوتا ہے معیوب تصور کرنے لگیں۔

۵۔ ہم بہت کوشش کرینگے کہ علمی مضامین جہانتک ممکن ہو سلیس اور بامحاورہ [illegible]
لکھے جائیں۔

۶۔ اس رسالہ کی مدد کرنے کے لیے اسکو خریدنا گویا اپنی آپ مدد کرنا ہے اگر اس کی آمدنی
کچھ بچیگا تو اس سے غریب اور یتیم لڑکیوں کو وظائف دیکر [illegible] کی [illegible]
تیار کیا جائیگا۔

۷۔ تمام خط و کتابت و ترسیل زر بنام اڈیٹر خاتون علی گڑھ ہونی چاہیے۔

خاتون

سیاروں کی کانفرنس

یہ خبر نہایت وثوق کے ساتھ گشت لگا رہی تھی کہ ۸ شوال کو سات سیارے بقول منجمین ایک برج میں جمع ہونگے۔ جس سے مخلوق خدا پر طرح طرح کی مصیبتیں نازل ہوں گی۔ اور اُن سات سیاروں کا تعلق دنیا کے سات حصوں سے ہوگا۔ اُن کے اثرات بھی مختلف ہونگے۔

یا بالفاظ دیگر یوں کہنا چاہیے کہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس سے پہلے ہی سیاروں کی کانفرنس بصدارت مسٹر آفتاب منعقد ہوگی۔ جس کے سکرٹری آنریبل قمر۔ جائنٹ سکرٹری پروفیسر مریخ و معزز ممبران خان بہادر عطارد۔ زہرہ۔ مشتری۔ ذنب مقرر ہونگے خدا کا شکر ہے کہ ۸۔ شوال کا دن بخیر و خوبی گزر گیا۔ اور کوئی آفت بندگان خدا پر نازل نہیں ہوئی۔ لیکن آنریبل سکرٹری صاحب نے شاید اپنے رشتہ دار نجومیوں کو کانفرنس کی رپورٹ بھیجی ہے۔

سخت افسوس کی بات تو یہ ہے کہ اس روشن زمانہ میں بھی نا تعلیم یافتہ مستورات و عالم نما۔ جاہل۔ تاریک خیال۔ اوہام پرست مرد بھی ایسے ہی وہموں میں مبتلا ہیں۔ اسمیں شک نہیں کہ جس بات کا ہمیں علم نہیں اُسکو سراسر غلط کہنا حماقت اور جہالت ہے۔ لیکن جس خیالی۔ وہمی۔ بات کو تجربہ۔ مشاہدہ۔ تحقیق علم باطل کردے۔ پھر بھی اسکو یقین جاننا۔ غلطی و خلاف دانشمندی ہے۔

حکماے سابقین کی تحقیقات جسپر ہمارے نجوم کی بنیاد ہے اس زمانہ میں بالکل غلط ثابت ہو گئی۔ جس سے نجوم کی اصلیت و حقیقت کُھل گئی اور ایک بہت بڑا حصہ نجوم کا تباہ ہو گیا مثلاً قدما کے خیال میں زمین مرکز عالم تھی۔ اور تمام سیارات و افلاک اس کے گرد گردش کرتے تھے۔ قمر فلک اول کا مالک تھا۔ آفتاب کو سیارہ تصور کرتے تھے۔ مگر اب نئی تحقیقات سے زمین جو مرکز عالم تھی۔ آفتاب کے گرد گردش کر رہی ہے۔ قمر جو فلک اول کا مالک تھا۔ زمین کا بلا گرداں ہے۔ آفتاب اب سیارہ نہیں رہا۔ نظام شمسی کا مالک اب آفتاب ہے جس کے گرد سب سیارے اور ہماری زمین بھی دورہ کر رہے ہیں۔

اس سے پُرانی باتوں کی ہنسی یا بزرگوں کا مضحکہ مقصود نہیں بلکہ ہم ان بزرگوں کی دل سے قدر کرتے ہیں جنھوں نے اُس زمانے میں باوجود ناکامی آلات کے بہت کچھ باتیں معلوم کر لیں تھیں۔ حکماے متقدمین نے صرف سات سیاروں کا پتہ لگایا تھا اور اسی پر نجوم کی بنیاد رکھی۔

اب اس روشن علمی زمانے میں بھی ہمارے منجموں کی محدود نظر انہیں سات سیاروں پر ہے۔ اور انہیں کے سعد و نحس کے قائل ہیں۔ انہیں وہ پونے دو سو کے قریب جدید سیارے معلوم نہیں جو نظام شمسی میں داخل ہیں۔

حیرت ہے کہ جب زحل۔ مشتری وغیرہ دور دراز سیاروں کا اثر اس قدر ہم پر ہوتا ہے تو اُن جدید سیاروں کے اثر سے ہم کیوں متاثر نہیں ہوتے جو اُن سے بھی زیادہ ہم سے

قریب ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ اُن کا بھی نیک و بد اثر ہم پر ہوتا ہے مگر ہمیں اس کی خبر نہیں ہوتی تو گویا یہ بات بلاشبہ مسلم ہو گئی کہ ہمارا مروجہ نجوم ناقص۔ ادھورا۔ فضول غلط ہے اور واقعی اسی طرح ہے)

اب برج کی حقیقت سنیئے! آسمان پر ستارے جہاں نزدیک ہوتے تھے اُسی کو یونانیوں نے فرضی شکلیں عورت۔ مچھلی۔ بچھو وغیرہ کی مقرر کرکے برج اسکا نام رکھا۔ اُن کا خیال تھا کہ برج کے سب ستارے ایک ہی سطح پر ہوتے ہیں اور اُن میں اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا کہ ہماری آنکھیں دیکھتی ہیں۔ حالانکہ حقیقت میں نہ برج کے سب ستارے ایک سطح پر ہیں نہ وہ ایسے قریب ہیں جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں۔ برج کے ہر ایک ستارے میں کروڑوں میل کا فاصلہ ہے۔ چونکہ وہ ہم سے بہت فاصلہ پر ہیں اسلیے بہت چھوٹے چھوٹے اور قریب نظر آتے ہیں۔ (جس کی ہزاروں مثالیں موجود ہیں)

جب برج حقیقتاً کوئی چیز نہیں تو پھر اُس میں سیاروں کا آنا جانا کیسا۔ ہم نے تھوڑی دیر کے لیے مانا کہ برج بھی ہیں۔ سیارے اُس میں آتے جاتے بھی ہیں تو ان باتوں کو انسان کی قسمتوں سے کیا تعلق۔

ہمیں سیاروں کی بابت صرف اتنا علم ہے کہ وہ خدا کی پیدا کردہ مخلوق ہیں۔ جو اندھیری رات میں گول چمکتے دکھائی دیتے ہیں۔ کوئی ہماری زمین سے بڑا ہے کوئی چھوٹا اُن کا جسم کسی ایسی ہی چیز سے بنا ہے جیسی ہماری زمین۔

خیال کرنا چاہیے کہ زمین جس پر ہم دن رات رہتے ہیں اُسکا ہماری قسمتوں پر کونسا نیک و بد اثر ہو رہا ہے۔ جو دوسرے سیاروں کا ہم پر اثر ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ بعض تاثیرات ہماری زمین میں ضرور ہیں جیسے کشش وغیرہ۔ ممکن ہے بلکہ یقیناً ایسے اثرات خدا نے دوسرے سیاروں کو بھی دیے ہوں۔ لیکن انسان کی خوش قسمتی۔ بیاہ۔ شادی قحط وبا۔ افلاس۔ غربت جینے مرنے کا تعلق سیاروں کی ذات سے سمجھنا محض اوہام پرستی ہے

فرض کیا کہ انسان کی قسمت. زمانہ کا انقلاب سب سیاروں کے ہاتھ میں ہے اور
جب وہ ایک خاص برج میں آتے ہیں تو ایک خاص اثر انسانوں پر ہوگا۔ مثلاً جب فلاں فلاں
ستاروں کا قران ہوگا تو وبائی مرض پھیلے گا۔ طوفان اُٹھینگے۔ قحط سالی ہوگی وغیرہ
چاہیے تو تھا کہ اس خیال کے مطابق ساری دنیا میں ایک ہی اثر ہو۔ لیکن یہ کیا بات ہے
کہ اہل بمبئی تو طاعون سے پریشان ہیں۔ حیدرآبادی مطمئن (خدا ہمیشہ اطمینان نصیب کرے)
گنگا میں سخت طوفان ہے۔ ڈیرہ غازی خاں دریائے سندھ کی نذر ہوگیا۔ موسیٰ ندی
خشک پڑی ہے۔ مدراس میں کمی بارش کے سبب قحط سالی ہے۔ اور ہمارا شہر حیدرآباد۔ سرسبز
شاداب۔ مالامال (خدا ہمیشہ ایسا ہی رکھے)

دوسرے شہروں کا کیا ذکر ایک ہی شہر ایک ہی محلہ بلکہ ایک ہی گھر میں محمود خوش ہے
احمد غمگین۔ جمیلہ بچے کے غم میں نالاں ہے۔ زبیدہ نومولود کی خوشی میں مشغول۔ ایک گھر
سے جنازہ نکل رہا ہے۔ دوسرے گھر پر برات کھڑی ہے۔ کوئی ہنستے ہیں کوئی روتے ہیں
پس اس سے صاف ظاہر ہے کہ انسانی قسمتوں کا ستاروں سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر ہوتا
تو سب پر یکساں ہونا چاہیے تھا۔ یہ نہیں کہ ایک گھر میں دو حالتیں ہوں۔

مثلاً جب آفتاب صبح کو طلوع ہوتا ہے۔ سب جگہ ایکساں روشنی ہوتی ہے۔ شام کو
جب آفتاب چھپ جاتا ہے چاروں طرف تاریکی چھا جاتی ہے۔ آفتاب کی حرارت کا اثر انسان
جانور۔ جمادات۔ نباتات سب کو ایکساں محسوس ہو رہا ہے۔ مختلف ہواؤں کے چلنے
میں بھی آفتاب کی حرارت کا بہت کچھ دخل ہے۔ تاریکی۔ روشنی۔ بارش۔ بادل۔ حرارت
ہوا وغیرہ میں آفتاب کا اثر مسلم ہے۔ اور یہ علمی فیض ہے کہ جو تمام مخلوق خدا اور ہر شہر اور
ہر گوشے کے لیے ایکساں ہے اور رہے گا۔ یہ نہیں کہ مسٹر آفتاب ایک برج میں تشریف
لا کر ایک کے لیے خوشی اور دوسرے کے لیے رنج کا باعث ہوں۔ جیسا کہ سیاروں کے
قران سے ہو رہا ہے۔

اگر سعد و نحس کا بھی اثر آفتاب میں ہوتا تو لازمی تھا کہ سب پر یکساں ہوتا۔ جیسے کہ آفتاب کے دوسرے اثرات ہیں۔ جنکا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

اس جگہ ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ آیا جانوروں میں۔ نباتات۔ جمادات پر بھی ستاروں کے سعد و نحس کا اثر ہے۔ یا صرف حضرت انسان کی ہی قسمتوں پر ہوتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سورج کی روشنی۔ حرارت۔ صرف انسان کے لیے ہی نہیں۔ بلکہ سب مخلوق پر یکساں برابر ہے۔ جب بارش ہوتی ہے انسان کے ساتھ جانور۔ درخت پہاڑ وغیرہ بھی سیراب ہوتے ہیں۔ اس اصول سے چاہیے تھا کہ آفتاب کے سعد و نحس کا اثر اُن پر بھی ضرور ہوتا۔ لیکن یہ اس سے محفوظ ہیں۔

اس کی کیا وجہ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جانوروں۔ نباتات۔ جمادات۔ اور بعض قومیں جنھیں ستاروں کے سعد و نحس کی خبر نہیں۔ اور نہ ان میں ردّ بلا کے لیے کوئی نجومی وغیرہ ہیں۔ پھر بھی اُن پر ستاروں کے اثر سے کوئی مصیبت نہیں آتی۔ اور نہ وہ ستاروں کے برج میں آنے سے متاثر ہوتے ہیں۔

غرضکہ ایسی ہزاروں مثالیں مشاہدات۔ تجربات موجود ہیں۔ جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ستاروں کا کوئی اثر ہماری قسمتوں اور ہوا۔ بارش۔ قحط پر نہیں ہو سکتا۔ اس جگہ پر ایک اور بات کا ذکر کرنا بھی میں ضروری سمجھتی ہوں۔ جس سے نجوم کی حقیقت اور نجومیوں کی گپوں کا حال بخوبی معلوم ہو جائیگا۔

ابھی حال میں ایک اشتہار جسکو زمانہ حال کے ایک مشہور منجم نے مخلوق خدا کے فائدہ کے لیے چھپوایا ہے میری نظر سے گزرا۔ صاحب موصوف (منجم) بہت سی بے سروپا باتوں کے بعد تحریر فرماتے ہیں کہ ۲۸۔ شوال کو سات سیارے جو ایک برج میں جمع ہوئے ہیں اُن کا اثر حضرت نوحؑ کے نصف طوفان کی برابر ہوگا۔ اور قرآن ہفت سیارگاں سے اختتام عالم موجودہ و جدید عالم لازمی ہے گویا (نجومی صاحب) قیامت کی پیشین گوئی

کرتے ہیں۔ نیز یہ بھی فرماتے ہیں کہ ان ہفت سیارگاں کے اجتماع کا اثر کہیں بارہ سال میں کہیں سات سال میں کہیں سال دوم میں۔ کہیں سال اول میں ظاہر ہوگا۔

ارباب دانش انصاف فرمائیں کہ اس سے زیادہ بے بنیاد پیشینگوئی اور کیا ہوسکتی ہی۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ زمانہ ہمیشہ ایک چال پر نہیں رہتا۔ آج کچھ ہی کل کچھ ہے۔ جو آج زندہ ہیں کل اُن کی زندگی کی امید نہیں۔ روزانہ سیکڑوں بندگان خدا مرتے ہیں اور سیکڑوں پیدا ہوتے ہیں۔ زمانہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا رہتا ہی۔ نیرنگی اور انقلاب زمانے کے لیے ضروری ہیں۔

بارہ سال یا سات سال میں انقلاب ہونا یا بندگان خدا کا مرنا۔ جینا۔ شادی۔ غمی قحط۔ طوفان۔ لازمی ہیں۔ ایسی پیشین گوئی کہ سیاروں کے قران کا اثر بارہ سال یا سات سال بعد ظاہر ہوگا۔ اٹکل پچو۔ وہمی۔ لغو باتوں سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔ اگر فی الواقع کوئی اثر قران میں ہوتا تو چاہیے تھا کہ عین قران کے روز کوئی ایک خاص مصیبت سارے زمانے پر نازل ہوتی۔

مثلاً جب سورج گرہن ہوتا ہی تو چاروں طرف اندھیرا چھا جاتا ہی ستارے نکل آتے ہیں پھر کوئی دم میں صفائی ہوجاتی ہی۔ یہ ہی اثر سورج گرہن کا جو وقت مقررہ پر چاروں طرف یکساں ظاہر ہوتا ہی۔ یہ نہیں کہ سورج گرہن کے دس بارہ سال بعد جو آفت یا مصیبت مخلوق خدا پر نازل ہو۔ اسکو ہم سورج گرہن کی طرف منسوب کریں۔

نجوم درحقیقت کوئی علم نہیں۔ اور نہ اس کی بنیاد۔ مشاہدات۔ تجربات پر ہے۔ بلکہ صرف چند اٹکل پچو خیالی وہمی باتوں کا مجموعہ ہے۔ نجوم کے ساتھ لفظ علم ملانے سے علم کی حقارت ہوتی ہی۔ دنیا میں ہر علم کی ترقی ہوتی آئی ہی۔ کمسٹری۔ ہیئت۔ ریاضی وغیرہ کی بنیاد اگلے لوگوں نے ہی رکھی تھی۔ جسکو ترقی دیکر زمانۂ حال کے دانشمندوں نے معراج کمال پر پہنچادیا ہے۔

لیکن نجوم بجائے ترقی کے جوں جوں زمانے میں علم وعقل کی روشنی پھیل رہی ہے معدوم ہو رہا ہے۔ اس لیے کہ تحقیقات سے ثابت ہوگیا ہے کہ نجوم ایک محض خیالی وہمی۔ بے بنیاد بات ہے۔ اگر اس کی کچھ بھی اصلیت ہوتی تو وہ لوگ جو اپنی ساری عمر ستاروں کی چال ڈھال معلوم کرنے اور آسمانی تحقیقات میں گزار دیتے ہیں جنھوں نے ہزاروں آلات۔ دوربین ایجاد کرکے ایسی ایسی حیرت انگیز باتیں معلوم کی ہیں جو ہمارے نجومیوں کے عقل میں بھی نہیں آسکتیں۔ ضرور اس مفید اور لاثانی علم (بقول منجمین) میں ترقی کرکے غیب کی خبر دینے والے ہوتے۔

مختصر یہ کہ نجومیوں کی پیشینگوئی سے زیادہ بے بنیاد۔ فضول۔ بیہودہ لغو باتیں دوسری کوئی نہیں ہوسکتیں۔ ہاں سیاروں کی پیشینگوئی اگر اس طرح کریں کہ فلاں تاریخ فلاں وقت کو فلاں ستیارہ اس جگہ اور اس موقع پر ہوگا۔ تو اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ یہ ایک سچی پیشینگوئی ہے۔ جسکا تجربہ مشاہدہ کیا گیا ہے اور یہ علم ریاضی کے اصول پر مبنی ہے۔ لیکن اگر کہا جائے کہ جب فلاں سیارہ فلاں جگہ پر ہوگا تو فلاں آفت انسانوں پر آئے گی۔ محض لغویت ہے۔

مضمون بہت طویل ہوگیا اور لکھنے کی بہت ساری باتیں رہگئیں۔ افسوس ہے کہ طوالت مضمون کے خیال سے بہت سی قابل تحریر باتیں نظرانداز کرنی پڑیں بمصداق۔

قصہ مطلب طویل و دفتر تحریر تنگ — خود بخود کوئی سمجھ جائے کہ کیا کہنے کو ہے

جو کچھ لکھا گیا اگر غور سے دیکھا جائے تو بہت ہے۔ خاتمہ پر میں اتنا بتا دینا بھی ضروری سمجھتی ہوں کہ نجوم کو مذہب اسلام سے کیا تعلق ہے۔ کیونکہ زمانہ حال کے منجمین نے نجوم کو مذہب اسلام کا ایک جزو قرار دیا ہے۔ اور بہت سی من گھڑت حدیثیں اور اقوال ائمہ اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ نجوم کو مذہب اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔

اس سے تو کسی کو انکار نہیں ہو سکتا (ہمارے نجومیوں کو بھی) کہ مذہب اسلام کا اصلی رکن یا مقصد توحید ہے۔ توحید کی تعریف یہی ہے کہ خدا ایک ہے اور کل مخلوقات اور ان کی قسمتوں کا مالک و مختار ہے۔ جو چاہے کریگا جو چاہے کرسکتا ہے۔ اُس میں کسی کو دخل نہیں اور کسی کام میں کوئی اُسکا شریک نہیں ہو سکتا۔ جب یہ بات مسلم ہوگئی تو پھر انسانوں کی قسمتوں اور دیگر دنیوی باتوں کو ستاروں کی طرف منسوب کرنا اور انہیں ہر فعل کا مختار سمجھنا بلاشبہ شرک ہے۔ اور ستاروں کی پرستش کرنے والے مشرک۔

تعجب ہے کہ ہمارے نجومی زبان سے تو وحدہ لاشریک کہتے ہیں اور پھر خدا کے کاموں میں خدا کی پیدا کردہ مخلوق ستاروں کو بھی شریک کرتے ہیں۔ انسان کی قسمت تو اسی روز سے شروع ہو جاتی ہے جس روز وہ پیدا ہوتا ہے۔ ستاروں کو اس سے کوئی واسطہ یا تعلق نہیں۔

مختصر یہ کہ نجوم کو اسلام سے کوئی واسطہ نہیں بلکہ نجوم سراسر اسلام کے خلاف ہے اب یہاں پر نجوم کی بابت چند حدیثیں لکھی جاتی ہیں۔ جن سے معلوم ہو جائیگا کہ ہمارے پیشوا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا ارشاد فرماتے ہیں۔

(۱) لا تاتوا الکھان۔ غیب کی خبر دینے والے جھوٹے ہیں اُن کے پاس مت جاؤ۔

(۲) من اقتبس علما من النجوم اقتبس شعبة من السحر، جو علم نجوم حاصل کرتا ہے وہ جادو اور دھوکا بازی سیکھتا ہے۔

(۳) المنجم کاھن والکاھن ساحر والساحر کافر، منجم کاہن ہے، اور کاہن ساحر ہے اور ساحر کافر ہے،

(۴) واللہ ماجعل اللہ فی نجم حیات احد ولا رزقه ولا موته وانما یفترون علی اللہ الکذب ویتعللون بالنجوم۔ ستاروں میں اثر کسی کو جلانے یا مار ڈالنے یا

رزق دینے کا نہیں ہے۔ اور جو لوگ ایسا نجوم سے خیال کرتے ہیں وہ جھوٹے ہیں۔

(۵)، لو کنت اعلم الغیب لاستکثرت من الخیر وما مسنی السوء۔ اگر غیب کا حال معلوم کر لینا میرے اختیار میں ہوتا تو میں (آنحضرت) بہت سی بہتری کی باتیں جمع کر لیتا۔ اور مجکو کوئی برائی نہیں پہنچتی۔

(۶)، ما ادری، ما یفعل بی، مجکو نہیں معلوم کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔

خاتمہ پر میں معزز ناظرین سے سمع خراشی کی معافی چاہتی ہوں۔ اور متوقع ہوں کہ اگر یہ میرا ناچیز مضمون قابل تردید ہو تو براہ کرم اُس سے مجکو مطلع فرمایا جائے۔ میں غایت درجہ مشکور ہوں گی۔ وما علینا الا البلاغ۔

خاکسار

رابعہ سلطان بیگم

از چھپول اسٹیٹ

نمونیا

اس موذی مرض کے متعلق ایک مختصر مگر مفید مضمون ۳۔ اگست سنہ ۱۹۱۱ء کے ہفتہ وار "ٹیمس آف انڈیا" میں کسی ولایتی طبی رسالے سے نقل کیا گیا تھا۔ جسکا ترجمہ ہمارے ملک کی خواتین کے فائدے کی غرض سے ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

نمونیا کی وجہ سے جو نقصانات ہوتے ہیں اسکا باعث زیادہ تر یہ ہے کہ بعض ضروری اصول پر کاربند ہونے کی پرواہ نہیں کی جاتی۔ اگر نمونیا کے مریض کی دیکھ بھال عین مناسب فطرتی طریقہ سے کی جائے تو اسکا صحت یاب ہو جانا لازمی ہے۔ ضروری اشیائ جو زندگی کی بقا کے لیے درکار ہوتی ہیں وہ مہیا رہیں اور بیمار کو بالکل قدرت کے حوالے کر دیا جائے تو خود قدرتی طور پر بیماری کا دفعیہ ہو جاتا ہے۔

نمونیا کی حالت میں جسم کو سب سے زیادہ ہوا. پانی غذا اور کافی آرام کے معقول مقدار کی ضرورت ہوتی ہے۔ سب سے بڑی چیز جو نمونیا والے کو موت کا شکار بناتی ہے وہ تنگ و تاریک حجرہ ہے۔ جس میں صاف اور تازہ ہوا کثرت سے نہ میسر آسکتی ہو۔

دوسری غلطی یہ ہے کہ خالص تازہ پانی بیمار کو دیگر مرض کے جراثیم دور کرنے میں گردوں کی مدد نہیں کی جاتی۔ ضرورت سے زیادہ کھلا دینا یا بے وقت اور بے قاعدگی کے ساتھ غذا دینا یا بدپرہیزی کرانا بیمار کی تمام قوت کو سلب کر دیتا ہے۔ اس کی ساری طاقت اس بے وقت کی ناموافق غذا کو ہضم کرنے کی کوشش میں صرف ہو جاتی ہے اور بیماری کے مقابلہ کرنے کا اسکو موقعہ نہیں ملتا۔ یخنی یا شوربہ نمونیا والے کے لیے کوئی مفید غذا نہیں ہیں۔ ان سے کوئی خاص طاقت نہیں پیدا ہوتی بلکہ خود گردوں پر ان کی بدولت زیادہ بار پڑ جاتا ہے۔

شکر بہت مقوی اور نہایت کارآمد غذا ہے۔ اسکے کھانے کے بعد کسی قسم کا فضلہ اس میں سے نہیں نکلتا۔ یہ جزو بدن ہو جاتی ہے اور صرف پانی اور کاربانک ڈائی اکسائڈ کے کچھ اجزا بچ رہتے ہیں۔ انڈے اور دودھ نمونیا کے بیمار کے بہت مناسب حال ہیں۔ خوف و دہشت زدگی۔ فکر اور تھکاوٹ بہت برُے نتائج پیدا کرتے ہیں۔ بیمار کو ہمیشہ بالکل سیدھا رہنا چاہیے۔ ورنہ دل روانی خون کے فعل سے عاجز آجاتا ہے نمونیا کی بیماری میں صرف ایسی دواؤں کی ضرورت ہے جو دل کی اسکا کام انجام دینے میں مددگار رہوں اور بیمار کو سکون کی حالت میں رکھیں۔

دنیا میں کوئی ایسی متعدی بیماری نہیں ہے جو نمونیا کی طرح خود بیمار کی جسمانی قابلیت سے قدرتی طور پر متاثر ہوتی ہو۔ نمونیا کا علاج گویا خود ہمارے جسم میں موجود ہے۔ جب کوئی آدمی نمونیا سے علیل ہوتا ہے تو اس کی جسمانی قوت کا بیماری کے ساتھ خوب مقابلہ ہوتا ہے۔

ایسے وقت اگر بیمار کی پرداخت عین قانون قدرت کے مطابق کی گئی تو پھر پانچ روز یا زیادہ سے زیادہ دس روز میں پورا افاقہ ہو جائے گا۔ فقط

سید خورشید علی
حیدرآباد۔ دکن

کرشمۂ فطرت

اس دلچسپ مضمون کا سلسلہ پہلے کچھ عرصہ تک خاتون میں جاری رہکر درمیان میں بند ہو گیا تھا اب ہمارے مہربان پروفیسر نے اس سلسلہ کو ہماری درخواست پر پھر جاری کیا ہے۔ امید ہے کہ کچھ دنوں تک یہ دلچسپ سلسلہ چلا جائے گا۔ اور پروفیسر کا قلمی فیض خاتون کے صفحات پر جلوہ گر رہے گا۔

اڈیٹر

اُن براعظموں میں جنکو ہم پُرانی دنیا کہتے ہیں تہذیب یافتہ قومیں اتنے عرصہ دراز سے رہتی چلی آئی ہیں کہ انہوں نے اپنے اپنے زمانے میں اُن ملکوں کی قدرتی ہیئت کو بہت کچھ بدل ڈالا ہے۔ مثال کے طور پر ایک ہندوستان کو ہی لیجیے۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ اب سے دو ہزار برس پہلے ہندوستان کی یہی صورت تھی جو اب ہے۔ حضرت انسان جہاں کہیں پہنچتے ہیں وہاں کی قدرتی ہیئت کو بگاڑے بغیر نہیں چھوڑتے۔ دریائے گنگا جب صحیح سالم سمندر تک پہنچتا ہوگا تو اسکے ارد گرد کے ملک کی اور ہی کیفیت ہوگی اب کہیں اسکے متبرک پانی کو متعدد نہروں میں بانٹ دیا ہے۔ کہیں بند باندھ کر اسکا رُخ پھیر دیا ہے کہیں پُشتے اور قلعے بنا کر اصلی راستے سے اسکو پرے ہٹا دیا ہے۔ غرض کہ اپنی طرف سے تو اس کی صورت بدلنے میں کچھ کمی کی نہیں ہے۔ اسلیے اب گنگا جل میں نہ وہ پہلی سی تاثیر ہے۔ اور نہ اُس میں اشنان کرنے سے پہلے کی طرح پاپ دُھلتے ہیں۔

اور اسی سبب سے ہندوستان میں پاپ بڑھتا ہی جاتا ہے۔

نئی دنیا کی خاص کر اسکے جنوبی حصے کی جہاں مہذب انسان کو پہنچے ہوئے نسبتاً کم زمانہ گزرا ہی ابھی تک بہت کچھ اصلی اور قدرتی ہیئت بدستور رہی۔

جنوبی امریکہ کے ملک برازیل کا ایک دریا امیزان ہی جو پانی کی مقدار کے لحاظ سے دنیا میں سب سے بڑا دریا ہی۔ اسکا طول تین ہزار میل ہی۔ اس میں تقریباً دو سو دریا آکر ملتے ہیں۔ سمندر کے قریب اسکا عرض دو سو میل ہی۔ سمندر کا پانی بے حد نمکین ہوتا ہے۔ مگر جس جگہ وہ دریا آکر گرتا ہی۔ وہاں سو میل تک سمندر کا پانی میٹھا ہو جاتا ہے۔ خیال کرنے سے خدا کی شان نظر آتی ہے کہ کیا کچھ پانی آتا ہوگا جو سو میل تک سمندر کے پانی کو میٹھا بنا دیتا ہے۔ پھر خیال کرو کہ اتنے پانی کی مقدار ہر لحظہ آتی رہتی ہے اور معلوم نہیں کتنے ہزار برس سے ایک لمحہ کو نہیں رکی ہے۔ دل میں تصور کرو کہ وہاں کیا کیفیت ہوگی کتنی عجیب بات ہے کہ گویا وہاں کا سمندر میٹھے پانی کا ہے۔ یہ قدرت کے کرشموں کا فقط ایک شمہ ہے۔

اب حضرت انسان وہاں پہنچے ہیں۔ رفتہ رفتہ دیکھیے کیا کیا کرتے ہیں۔ کہیں اس میں سے نہریں نکالیں گے۔ کہیں بند باندھیں گے۔ کہیں پشتے اور قلعے بنائیں گے غرض اس خدا کی شان یاد دلانے والی کیفیت کو بگاڑ کر چھوڑیں گے۔

نئی دنیا خاص کر اسکا جنوبی حصہ جیسا میں نے پہلے بیان کیا ابھی تک قدرت کے عجائبات کا مخزن ہی۔ اس کے ارد گرد ہزارہا چھوٹے بڑے جزیرے ہیں۔ اور آئے دن نئے نئے دریافت ہوتے جاتے ہیں۔ جن میں سے بہت سے ابتک بالکل غیر آباد ہیں۔ دیکھنا یہ ہی کہ یہ جزیرے کہاں سے آگئے۔ سمندر کی تہ میں سے چھوٹی چھوٹی چٹانیں نکل پڑی ہیں۔ یا ریت مٹی کی ٹوکریاں ڈال کر سمندر کی اتنی جگہ کو خشک کر دیا ہی یا کسی زلزلے کے صدمے سے تہ کا حصہ باہر نکل آیا ہے۔ نہیں ان میں سے ایک بھی سبب نہیں۔ خدا کی

شان اور قدرت کا یہ ایک اور نمونہ ہے۔

صانع قدرت نے ان کو ایسے معماروں سے بنوایا ہے جن کی حیثیت کو دیکھ کر کبھی یقین نہیں آتا کہ یہ کام ان ناچیزوں کا ہے۔ یہ سنگین کام بنانے والے معمار پانی کے کیڑے ہیں جنکو مونگے کے کیڑے کہتے ہیں۔ سمندر کی تہ سے یہ ناچیز معمار جن کی تعداد حد شمار سے باہر ہے اپنا کام شروع کرتے ہیں۔ سمندر کی تہ کی لیسدار مٹی لاتے رہتے ہیں اور تہہ پر تہہ چڑھاتے رہتے ہیں۔

تہیں اس مضبوطی سے ایک دوسرے پر قائم ہوجاتی ہیں کہ سمندر کی زبردست موجیں ان کو نہیں اکھاڑ سکتیں۔ یہ کیڑے سالہا سال تک اسی کام میں لگے رہتے ہیں جو مرتے جاتے ہیں وہ اسی میں دفن بھی ہوتے جاتے ہیں۔ گویا اسکو وہ اپنے خون جگر سے تعمیر کرتے ہیں۔

یہانتک کہ ہوتے ہوتے ان کی عمارت سطح سمندر کے قریب آجاتی ہے تب ان معماروں کا کام ختم ہوجاتا ہے۔ پھر وہ کسی اور عمارت کی بنا ڈالتے ہیں۔ کیونکہ سمندر کی سطح سے باہر یہ زندہ نہیں رہ سکتے۔

اب کسی زلزلے یا سمندر کے اُتار سے یہ عمارت پانی سے باہر نکل آتی ہے۔ ادھر سے گزرنے والے جہازوں کو یکایک ایک نیا جزیرہ نظر پڑجاتا ہے۔ بعض اوقات جہاز اس سے ٹکرا کر ٹوٹ ہی جاتے ہیں۔ کیونکہ کس کو گمان ہوسکتا ہے کہ جہاز کے راستے میں جہاں پہلے کچھ رکاوٹ نہ تھی یکایک ایک زمین پیدا ہوجائے گی۔ سمندر کی موجوں سے کوڑا کرکٹ سبھی گھونگے وغیرہ اس پر پڑے رہتے ہیں اور سورج کی گرمی اسکو خشک کرتی رہتی ہے۔ کچھ عرصے میں اس کی سطح معمولی زمین کی سی ہوجاتی ہے۔

حضرت انسان جو ہمیشہ پرائے مال کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں جہاں کہیں اسکو دیکھ پاتے ہیں جھٹ قبضہ کر بیٹھتے ہیں۔ بڑی بڑی عمارتیں بناتے ہیں

اور فخر سے اکڑ اکڑ کر چلتے ہیں۔ اسکو بھول جاتے ہیں کہ

آہستہ خرام بلکہ مخرام زیر قدمت ہزار جان است

اس جزیرے پر جو لکھو کھا جانداروں کا مقبرہ ہے بالکل صادق آتا ہے۔

خلیجی رو بھی نئی دنیا کے عجائبات میں سے ہے۔ نئی دنیا شمال سے جنوب تک پھیلی ہوئی ہے۔ شمالی اور جنوبی حصے نہایت سرد اور وسطی نہایت گرم ہیں۔ وہاں کے وسطی سمندر کے حصے کو "گرے بین سی" کہتے ہیں۔ اسکا ایک حصہ دور تک خشکی میں چلا گیا ہے جسکا نام خلیج میکسیکو ہے۔

ہونے کو تو گرم ملک اور گرم سمندر پرانی دنیا میں بھی ہیں مگر نئی دنیا کے گرم حصے کی قدرتی شناخت ایک خاص قسم کی ہے۔ جس سے ایک عجیب قدرتی کرشمہ ظاہر ہوتا ہے گرمی کی زیادتی سے پانی بھی گرم ہو جاتا ہے۔ اس میں حرکت پیدا ہوتی ہے۔ اور اس سمندر کے پانی میں تلاطم مچ جاتا ہے۔

یہ پانی اس خلیج میں جا گھستا ہے اور چونکہ پانی کی گرمی اور حرکت باقی رہتی ہے وہ اس خلیج کے کناروں سے بہت زور سے ٹکر کھاتا ہے۔ اس ٹکر سے اس کی حرکت میں اور بھی تیزی بڑھ جاتی ہے۔ تو وہ شمالی کناروں سے ٹکراتا ہوا پھر باہر نکل آتا ہے۔ ان ٹکروں سے پانی کی حرکت میں تیزی تو بڑھ ہی گئی ہے اور جب وہ دوبارہ باہر آیا اور وہاں اس کی حرکت کے روکنے کے لیے کوئی چیز ہی نہیں۔ رُخ اسکا شمالی جانب ہوتا ہے اسلیے وہ تیزی کے ساتھ شمال کی طرف روانہ ہوتا ہے۔

اضلاع متحدہ امریکہ کے ساحل کے متوازی چلتے چلتے اس رَو کی ایک شمالی ٹھنڈی رَو سے ٹکر ہوتی ہے جس سے اس رَو کی دو شاخیں ہو جاتی ہیں۔ ایک تو امریکہ کے انتہائے شمال تک چلی جاتی ہے۔ اور چونکہ یہ گرم پانی کی رَو ہے۔ شمالی ملکوں کو جو نہایت سرد ہیں گرمی پہنچاتی ہے۔ وہ شمالی ٹھنڈی رَو نیچے نیچے آکر وسطی گرم ملکوں کو

ٹھنڈا کرتی ہے۔

گرم رَو کی دوسری شاخ کا رُخ یورپ کی جانب ہو جاتا ہے۔ اسی مسئلہ کے سبب وہ انگلستان کے مغربی و شمالی کناروں سے آ کر ٹکراتی ہے اور اُن کو گرمی پہنچاتی ہے۔ وہاں سے روانہ ہوکر "سویڈن ناروے" کو گرم کرتی ہے۔

وسط امریکہ کے سمندر میں اس رَو کے پانی کو کیا کچھ حرکت پہنچی تھی کہ اسی زور کے سبب سے ہزارہا میل چلی آتی ہے اور پھر بھی طاقت باقی رہتی ہے۔ اگر یہ گرم رَو نہ ہوتو انگریزوں کے ملک میں ناقابل برداشت سردی رہے۔ کہاں انگلستان اور کہاں امریکہ مگر خدا کی شان کس طرح گرمی پہنچائی ہے۔

انگلستان کی سیدھ میں جو اور ملک ہیں، ہاں انگلستان کا سا ہی موسم بموجب قاعدے کے رہنا چاہیے۔ مگر وہاں اس رَو کا گزر نہیں ہے۔ اس لیے نسبتاً سردی زیادہ سخت ہوتی ہے۔ خود انگلستان ہی میں مغربی حصے مشرقی حصوں کی نسبت زیادہ گرم ہیں۔ اسی رَو کی بدولت۔

راقم

صغیر علی۔ از اندور ہلکر کالج

جاپان

تیسرا باب

جاپان کے لڑکے اور لڑکیاں

جب جاپان کے لڑکے اور لڑکیاں مدرسے جاتے ہیں تو وہ نہایت ادب کے ساتھ اپنے اُستاد کے سامنے سر جھکاتے ہیں اور ایک عجیب بھنبھناہٹ کی آواز

پیدا کرتے ہوئے سانس اوپر چڑھاتے ہیں۔ یہ بہت بڑے ادب و تعلیم کی علامت ہے
اُستاد اس کے جواب میں کسی قدر سر جھکا دیتا ہے۔ اس کے بعد بچے اپنی جگہ بیٹھ جاتے
ہیں اور اپنا اپنا سبق پڑھنے لگتے ہیں۔

ان کی کتابیں ہمارے لیے عجیب و غریب تماشا ہیں۔ صرف ان کتابوں کے الفاظ
کی شکلیں ہی بڑی بڑی نہیں ہوتیں بلکہ ان کی سطریں بھی اوپر کی جانب سے نیچے کی طرف
جاتی ہیں۔ اُردو کتابوں کی طرح ان کا پہلا ورق دائیں جانب سے شروع ہوتا ہے اور بائیں
جانب یہ ختم ہوتی ہیں۔

جاپانی تحریر دائیں جانب سے پڑھی جاتی ہے انگریزی قاعدہ کے مطابق بائیں
جانب سے نہیں پڑھی جاتی۔ اس کے سوا سطریں صفحہ پر سیدھی نہیں لکھی جاتیں بلکہ
اوپر سے نیچے اُترتی ہیں۔ غرض جاپانی کتاب ہمارے واسطے پہلے پہل تو بڑے
ہی اُلجھن اور تماشہ کی چیز ہے۔

جب تحریر کے سبق شروع ہوتے ہیں تو بچے قلم نہیں استعمال کرتے ہیں بلکہ
قلم کا کام برش سے لیا جاتا ہے۔ برش کو سیاہی میں ڈبوتے جاتے ہیں اور اُسی سے
ایک کے نیچے ایک حرف لکھنا شروع کرتے ہیں۔ اگر کسی لفافے پر پتہ لکھنے کی ضرورت
پڑتی ہے تو وہ اسکو اُلٹا لیتے ہیں۔ ملک کے نام سے پتے کا لکھنا شروع ہوتا ہے اور مکتوب الیہ
کے نام پر ختم کیا جاتا ہے۔ مثلاً

انگلستان۔ لندن کنسنگٹن گارڈنز۔ براون جان مسٹر۔

جاپان کے بچوں کو گھر پر بھی اتنی ہی تعلیم دی جاتی ہے جتنی مدرسے میں ان کی
تربیت ہوتی ہے۔ مدرسے میں ان بچوں کو حساب، جغرافیہ، تاریخ وغیرہ کی اسی طرح تعلیم
دیجاتی ہے جس طرح اور ممالک میں قاعدہ ہے۔ مگر ان کو نیک اطوار۔ عمدہ اخلاق اور اعلیٰ
خصائل گھر پر ان کے والدین سکھاتے ہیں۔ جاپان میں دوسروں کے ساتھ برتاؤ کرنے کے

طریقے سیکھنا کوئی آسان امر نہیں ہے۔

ہم لوگ سمجھ سکتے ہیں کہ اس قسم کے برتاؤ سے صرف نیک دلی اور خلق و مروت کا اظہار مقصود ہوتا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ اس سے مقررہ آداب اور پیچیدہ مروجہ قوانین کی پابندی ملحوظ ہوتی ہے۔

سلام وغیرہ کے قواعد مقرر ہیں کہ کس کو کتنی دفعہ کس طریقہ سے سلام کرنا چاہیے بزرگوں۔ برابر والوں اور اپنے سے چھوٹوں کو سلام کرنے کے مختلف طریقے ہیں۔ مختلف درجہ اور مرتبہ کے آدمیوں کے کام کرنے کا طرز بھی جداگانہ ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کسی لڑکی کے صرف چائے کی پیالی پیش کرنے کے طرز سے اجنبی مہمان اس کا رتبہ بآسانی معلوم کر لیتا ہے۔ بالکل ابتدائی زمانے سے بچوں کو ان تمام آداب و مراسم سے خوب واقف کرایا جاتا ہے اور ان کو اتنا عادی بنا دیا جاتا ہے کہ پھر کبھی ان سے کسی قسم کی غلطی سرزد نہیں ہونے پاتی۔

جاپان کے نہایت خورد سال بچوں تک کو جن کی شیرخوارگی کا زمانہ ابھی ختم ہونے نہیں پاتا۔ یہ تمام باتیں سکھائی جاتی ہیں کہ کس طرح چلنا چاہیے۔ کیونکر قدم اُٹھانے چاہییں کس طریقہ سے سلام کرنا چاہیے۔ اپنے بزرگوں کے سامنے کس طرح دوزانو ہو کر اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اپنی ننھی پیشانی زمین کو لگانی چاہیے۔ اور کس طرح پھر کھڑا ہونا چاہیے بچے یہ سب کچھ نہایت خوش اسلوبی سے ادا کرتے ہیں جو بے انتہا بھلا معلوم ہوتا ہے اور اپنی "کی مونو" میں ان تمام حرکتوں سے کسی قسم کی بے ترتیبی نہیں پیدا ہونے دیتے۔ لباس میں ایک شکن تک نہیں پڑنے پاتی۔

خورد سال بچوں کو نہایت احتیاط سے یہ بھی سکھایا جاتا ہے کہ مہمانوں کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیے۔ کمرے میں کس طرح داخل ہونا چاہیے۔ کشتی یا پیالے کو کس طرح اُٹھانا چاہیے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کس پسندیدہ ڈھنگ اور نزاکت کی شان

سے چاے کی پیالی یا کسی کھانے کی رکابی کو پیش کرنا چاہیے ۔

ایک مصنف بعض ضروری اشیار کو خریدنے کی غرض سے کسی جاپانی دُکان میں جانے کا واقعہ یوں بیان کرتا ہو کہ "دُکان کا مالک ۔ مالکہ اور ان کے تمام بچے اولاً اس کے سامنے جُھک گئے ۔ ایک دو سال کا ننھا سا بچہ بھی تھا جو اپنی بہن کی پیٹھ پر سو رہا تھا ۔ اسکو بھی جگایا گیا اور جنبی خریدار کا مجرا بجالانے کی اُس سے خواہش کی گئی ۔ صغیر السن بچہ بلا کسی گھبراہٹ یا چمکنے اور چیخنے چلانے یا رونے کے بیدار ہوا اور جگائے جانے کی وجہ فوراً معلوم کرلی ۔ زمین پر چھوڑے جانے کے ساتھ ہی اُسنے حسب قاعدہ سلام کرنا شروع کیا اور اپنی ننھی پیشانی زمین پر رکھدی ۔ ان تمام آداب کے بجالانے میں اس سے کوئی بے قاعدگی سرزد نہیں ہوئی ۔ اس نے تمام حرکتیں بالکل اپنے بزرگوں کی طرح انجام دیں ۔ اسکے بعد اُسے پھر پیٹھ پر شال میں لپیٹ دیا گیا اور پھر لحظہ بھر میں وہ سو چکا تھا ۔

پھولوں اور شیشہ آلات وغیرہ کو سلیقے سے جانے اور آراستگی کے ساتھ ترتیب دینے کا فن جاپانی لڑکیوں کی خانگی تعلیم کا خاص اور نہایت اہم جزو ہوتا ہے جاپان کے کمروں میں ہر چیز نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ ٹھکانے سے رکھی ہوئی ہوتی ہے ۔

کمرے کی سجاوٹ اور سامان کی ترتیب میں بڑی ہی ہوشیاری اور خبرداری سے کام لیا جاتا ہے ۔ اسباب کے جانے میں اسکے باہمی تناسب کا بہت کچھ لحاظ رکھا جاتا ہے پھولوں کے ایک گچھے کو کسی عمدہ چینی کے گلدان میں جانا بڑے غور و فکر کی بات ہے بچوں کو نہایت پسندیدہ طرز پر بہت دلفریب صورت میں گلدستہ بنانے اور پھولوں کو جانے کی خاص طور پر تعلیم دی جاتی ہے ۔

جاپان کے اکثر مکانات میں اس قسم کی بہت سی کتابیں موجود ہوتی ہیں جن میں

ہنرمندی کے ساتھ مکان سجانے اور آراستہ کرنے کے اصول و قوانین اور نقشے وغیرہ درج ہوتے ہیں۔ جاپان میں ایسی کتابوں کا بہت رواج ہے۔

جاپان میں عام طور پر ہر کس و ناکس کا حسن اور نفاست کی جانب رجحان ہوتا ہے اس قسم کا مذاق تمام جاپانیوں میں پایا جاتا ہے ایک غریب ترین مفلوک الحال جاپانی بھی اس جذبے سے خالی نہیں ہوتا۔ ایک بڑا مشہور مصور کہتا ہے۔

جاپان کی طبعی ہنرمندی اور فطری کاری گری و سلیقہ شعاری کی خصوصیت کا عجیب ترین تجربہ مجھے اس طرح ہوا کہ ایک دفعہ میرے ہاں بہت سی آرائش کی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ اور میں ان کو ترتیب سے دیواروں پر جمانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ میرا نوعمر ملازم جو ایک جاپانی لڑکا تھا وہ بھی اس وقت کمرے میں موجود تھا۔ مشغولیت کے عالم میں جب کبھی میری نگاہ اس لڑکے پر پڑی تو صاف اس کے بشرہ سے ناپسندیدگی کی علامتیں ظاہر ہوتی تھیں۔

تھوڑے عرصہ کے بعد جب میں نے یہ دیکھا کہ اس کی ناپسندیدگی کے آثار اور بڑھنے لگے تو میں نے اس سے اس کی ناخوشی کی وجہ پوچھی اسپر اس لڑکے نے نہایت صاف دلی سے بے تکلف کہا کہ مجھے آپ کی ترتیب دینے کی طرز مطلقاً پسند نہیں۔

میں نے کہا کہ تم نے مجھ سے پہلے ہی ایسا کیوں نہ کہدیا۔ اُس نے جواب دیا کہ "آپ انگلستان کے جامع الکمال مصور ہیں اس لیے میں نے دخل دینا مناسب نہ جانا۔"

الغرض میں نے اسکو خود اسی کے مذاق کے مطابق کمرہ سجا دینے پر آمادہ کیا اور میں سچ کہتا ہوں کہ مجھے بہت عجیب اور قابل یادگار سبق ملا۔

تقریباً دو گھنٹے اس لڑکے نے لگائے جن میں اُس نے ان سب چیزوں کو ہٹایا بھی۔ جمایا بھی اور درست بھی کیا۔ جب وہ اس کام سے فارغ ہوچکا تو ایک نہایت خوب صورت اور دلفریب منظر تھا۔ دیوار ایک تصویر بنی ہوئی تھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہر چیز ٹھیک اپنے مقام پر رکھی ہوئی ہے اگر ایک کو بھی اس کی جگہ سے ہٹا دیا جائے تو پورے نقشے میں برہمی پیدا ہوکر بے ترتیبی واقع ہوجائے گی۔

میں نے جائز اطاعت اور فروتنی کے ساتھ اس سبق کو قبول کیا اور ہمیشہ سے زیادہ اس بات کا قائل ہوگیا کہ جاپانی بالکل اپنے دعوے میں سچے ہیں۔ واقعی وہ غضب کے باکمال ہوتے ہیں۔ ان کے قدرتی طور پر صناع ہونے میں کوئی شک نہیں"

سید خورشید علی
حیدرآباد۔ دکن

بچپن کی نسبت کا عبرتناک نظارہ

(بسلسلۂ سابق)

کس طرح فریاد کرتے ہیں بتا دو قاعدہ
اے اسیرانِ قفس میں نوگرفتار وں میں ہوں

ستم دیدہ عباسہ ابھی تک بالکل بے خبر ہے۔ اسکے دل میں بھول کر بھی نہ آتا تھا کہ رفیق دوسری شادی کرلے گا۔ وہ بالکل نہیں جانتی تھی کہ رفیق اسکو کس لیے ناپسند کرتا ہی۔ بس وہ یہی سمجھتی تھی کہ رفیق کے پہلو میں دل ہی اس قسم کا ہے۔ عباسہ کو اپنی ایک راز دار ملازمہ کے ذریعے کل کیفیت معلوم ہوگئی۔ مگر اُس نے

یقین نہیں کیا۔ کیونکہ وہ اکثر اس قسم کی خبریں سنا کرتی تھی۔ اس کی سمجھ میں بالکل نہیں آیا کہ رفیق دوسری شادی کرتا ہے۔

ظاہرا تو عباسہ غلط سمجھنے لگی لیکن اسکے دل کو ایک کھٹکا سا ضرور ہوگیا۔ وہ اپنے کمرے میں بہت بے چینی کے ساتھ ٹہلنے لگی اور اس راز کے معلوم کرنے کی کوشش کی۔ مگر جب اسکو یقین ہوگیا کہ یہ سچ ہے تو وہ سکتے میں ہوگئی۔

آہ اس کے بعد مظلوم عباسہ کا کیا حال ہوا۔ دنیا اس کی نظروں میں اندھیری ہوگئی وہ رات اس کی بہت بے چینی کے ساتھ کٹی۔ صبح کو وہ اپنے کمرے میں ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی دونوں کہنیاں میز پر ٹکی ہوئی تھیں۔ دونوں ہاتھوں سے چکراتے سر کو تھامے تھی۔ اور اپنی آئندہ زندگی پر غور کر رہی تھی۔ مگر کچھ نہیں سوجھتا تھا کہ کہاں پناہ لے۔

دفعتاً کمرے کے کواڑ کھلے اور رفیق کمرے میں داخل ہوگیا۔ غریب عباسہ کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ رفیق اسکے کمرے میں آئیگا۔ اور پھر اس حالت میں جبکہ رات ہی اس کی دوسری شادی بھی ہوگئی۔

اس نے نظر جو اٹھائی تو رفیق کو اپنے پیچھے کھڑا پایا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی کہ واقعی یہ رفیق ہے یا میری نظر غلطی کرتی ہے۔ مگر جب اسکو یقین ہوگیا کہ یہ رفیق ہی ہے تو وہ ایک اضطراری حالت میں کھڑی ہوگئی اور معمولی سلام علیک کے بعد پھر وہ اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔ رفیق بھی ایک قریب کی کرسی پر بیٹھ گیا لیکن بالکل خاموش غریب عباسہ۔ اسکے بلدار تیور۔ بگڑی ہوئی پیشانی دیکھ کر دل ہی دل میں ہول کھانے لگی۔ رفیق کی صورت دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ مگر اس نے بہت صبر سے کام لیا۔ اور دل میں خیال کرنے لگی۔

کیا یہ وہی رفیق ہیں جنکے ساتھ میری زندگی کی کل امیدیں وابستہ کر دی گئیں

میں اُن کو چاہتی ہوں. مگر ان کی نظروں میں میری بالکل عزت نہیں۔

عباسہ ابھی تک انہیں دلی پیچ تاب میں مبتلا تھی کہ رفیق نے اس خاموشی کے قفل کو اس طرح توڑا۔ عباسہ تم دیکھتی ہو کہ میں کس قسم کی زندگی گزار رہا ہوں۔ تم جانتی ہو کہ میں آج تم سے کیا کہنا چاہتا ہوں۔ خدا کے لیے عباسہ تم مجھ پر رحم کرو میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اسکو غور سے سُنو۔ اور مجھے رائے دو کہ میں کیا کروں۔

عباسہ ان حیرت ناک کلمات کے سُننے کی تاب نہ لاسکی۔ فوراً اسکے دل میں یہ خیال گیا کہ رات کی شادی کا کچھ حال کہیں گے۔ نئی بیگم کو یہاں رکھنا چاہتے ہونگے میں کہدوں کہ میں سُننا نہیں چاہتی مگر اُس نے پھر خیال کیا کہ نہیں مجھے سُن لینا چاہیے۔ میں بھی تو دیکھوں کہ یہ کیا کہنا چاہتے ہیں. اُس نے یہ سوچ کر اس طرح کہا۔

عباسہ۔ اگر آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں تو فرمائیے۔

رفیق۔ تم میری حالت دیکھتی ہو کہ میں کس طرح اپنی زندگی کے دن کاٹ رہا ہوں۔

عباسہ۔ ہاں میں دیکھتی ہوں کہ آپ بالکل خاموشی کے ساتھ اپنی زندگی کے دن گزارتے ہیں۔

رفیق۔ نہیں نہیں میرا یہ مطلب یہ نہ تھا۔ میں پوچھتا ہوں کہ تم میری حالت کس طرح کی دیکھتی ہو۔

عباسہ۔ میں دیکھتی ہوں کہ آپ ضرورت سے زیادہ فکرمند رہتے ہیں۔

رفیق۔ پھر کبھی تم نے اس کی وجہ دریافت کرنے کی بھی کوشش کی۔

عباسہ۔ میں یہ اُس وقت پر دریافت کر سکتی تھی۔ جب آپ اسکو پسند کرتے۔

رفیق۔ عباسہ۔ آج میں تم سے اپنا راز جسکو عرصہ سے پوشیدہ کیے ہوئے ہوں کہنا چاہتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ تم اسکو سُنکر رنج کروگی۔ مگر میں امید کرتا ہوں کہ تم اسکو ظاہر کرنے کی کوشش نہ کروگی۔ تمہیں یاد ہوگا کہ میں شادی کرنے سے

انکار کرتا تھا۔

عباسہ۔ ہاں مجھے یاد ہے۔

رفیق۔ اچھا تو پھر یہ شادی کس کے دل سے ہوئی۔

عباسہ۔ مجھے نہیں معلوم۔

رفیق۔ کیا تمہیں نہیں معلوم؟ سنو ابا جان اور اماں جان کے دل سے۔

عباسہ سنو اور غور سے سنو۔ میں تمہاری بچپن سے قدر کرتا تھا۔ میرے دل میں اس وقت تک کسی قسم کا خیال نہ تھا۔ مگر ہاں اماں جان اور ابا جان نے اپنے مطلب کے موافق اس کے معانی نکال لیے۔

لیکن مجھے اس وقت تک کچھ اعتراض بھی نہ تھا۔ میں قسمیہ کہہ رہا ہوں کہ میں اس وقت جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ بالکل سچ ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میں تمہارے ساتھ شادی کرکے تمہیں اس قسم کی تکلیف دوں۔ میں نے انکار کیا۔ مگر میرا کہنا بالکل نہیں چلا۔

اس لیے میں نے رات کو ایک دوسری عورت سے نکاح کر لیا ہے۔ اور اب میں اسکو یہاں رکھنا چاہتا ہوں۔ کیا تم اس بات کو پسند کرو گی کہ میں یہاں رکھوں میں یقین کرتا ہوں کہ تم اجازت دیدو گی۔

یہ وہ الفاظ تھے کہ بدنصیب عباسہ اس کے سننے کی تاب نہ لاسکی۔ اسکا دماغ اس کی عقل تھوڑی دیر کے لیے بالکل بیکار ہو گئی۔ رفیق بے چینی کے ساتھ جواب کا انتظار کرنے لگا۔ اور غم نصیب عباسہ سکتے میں تھی کہ کیا جواب دے۔ اسے بالکل امید نہ تھی کہ رفیق کے ہاتھوں آج اس کی قسمت کا فیصلہ ہو جائے گا۔

وہ رفیق جسے وہ ابھی تک اپنا سمجھے ہوئے تھی آج غیر کا ہو گیا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کمرے پر نظر کرتی تھی مگر اس کی نظروں میں بالکل تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اُسنے

رفیق کی صورت کئی مرتبہ نظر اٹھا کر دیکھی۔ مگر رفیق کی نظریں میز پر گڑی ہوئی تھیں۔ دبا ... لئے۔ اسوقت بہت استقلال کے ساتھ کام لیا۔ اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ سے دھڑکتے دل کو سنبھالا۔ اور دوسرے ہاتھ سے چکرا ئے ہوئے سر کو تھامکر اس طرح کہنا شروع کیا۔

رفیق تم کیا کہہ رہے ہو۔ آہ تم بہت تنگ دل ہو۔ بے وفا بھی ہو۔ تم نے میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ تم نے اپنے یہ خیالات جو آج ظاہر کیے۔ شادی کے قبل ظاہر کیے ہوتے۔ تو آج تمہارے ہاتھوں اس طرح میری قسمت کا فیصلہ نہ ہوتا۔ میں ابتک یہ سمجھی ہوئی تھی کہ تم میرے ہی ہو۔ مگر نہیں تم آج سے دوسری کے ہوگئے اسکو تم مبارک رہو۔

آہ! تم نے میری زندگی میں ایک داغ لگا دیا۔ میری زندگی میں اس سے بڑھ کر اور کوئی بات نہ ہوگی۔ میری بڑی ذلت ہوئی۔ مجھے اب سب ذلیل نظروں سے دیکھیں گے۔ ہر ایک کی زبان پر ہوگا کہ میاں نے چھوڑ دیا۔ میں کہیں کی نہیں رہی۔ وہ کون ہیں جسکے ہاتھوں آج میں۔ اس طرح سے برباد ہوگئی۔ میں تمہارا مطلب سمجھ گئی۔ تم اسکو یہاں رکھو۔ میں بہت خوشی سے چلی جاؤں گی۔

تم یہ نہ سمجھنا کہ میں اس کی موجودگی کی برداشت کی تاب نہ لاسکی۔ نہیں بخدا۔ میں اس کی تابعدار ہوکر بھی رہ سکتی تھی۔ مگر اُس وقت پر جبکہ تمہاری نظروں میں میری قدر ہوتی۔ اگر تم اُسے پسند کرتے تھے شادی کر لیتے۔ مگر آہ تم نے میرے ساتھ بالکل بے رحمی سے کام لیا۔ تم نے میری بڑی توہین کی۔ میں جانتی ہوں کہ تم مجھے اب یہاں رکھنا بھی نہیں چاہتے۔ میں تمہیں اس تکلیف سے بچائے دیتی ہوں۔ میں تمہیں چاہتی ہوں اور دل سے چاہتی ہوں۔ مگر تم بہت متلون مزاج ہو۔ شادی مبارک ہو۔ یہ کہتے ہی کہتے عباسہ کا دل بھر آیا۔ رونے لگی۔

رفیق اسکے جواب میں کچھ کہنا چاہتا تھا مگر عباسہ فوراً کمرے میں چلی گئی۔ اور دروازہ بند کرلیا۔

عباسہ اپنی آیندہ زندگی پر غور کرنے لگی۔ وہ سوچتی تھی کہ کیوں میری زندگی میں اتنا بڑا انقلاب ہوگیا۔ وہ اس طرح اپنے دل سے باتیں کرنے لگی۔

ہائے میں بہت بدنصیب ہوں۔ کاشکے میں ایسی ذلت سہنے کے لیے پیدا ہی نہ ہوئی ہوتی۔ وہ رفیق جو میری زندگی کا مالک کردیا گیا۔ میرے ساتھ اس طرح پیش آئے۔ وہ یقیناً مجھے یہاں سے ٹالنا چاہتا ہے۔ کیا غضب ہے اے پاک خدا مجھ پر رحم کر۔ غم نصیب عباسہ کیا تو اسی دن کے لیے دنیا میں آئی تھی۔ مگر رفیق بھی قصوروار نہیں ہے۔ میری قسمت ہی بُری تھی۔

آہ اس رسم نے تباہ کردیا۔ اسوقت جبکہ دونوں کم عمر تھے۔ اس طرح قسمت پھوڑ دی جائے۔ یہ بیوقوفی نہیں تو اور کیا ہے۔ میں یہ تو نہ کہونگی کہ دانستہ والدین نے میرے ساتھ بُرائی کی۔ نہیں رسم کی پابندی کی گئی۔ کہ گھر کا لڑکا ہوتے لڑکی باہر نہ نکالی جائے۔ پیدا ہونے کے دن ہی نسبت کردی گئی۔ پھر چاہے کچھ ہی ہو۔ رفیق اچھا رہا وہ نئی بیگم کے ساتھ زندگی ہنسی خوشی سے بسر کرے گا لیکن میں برباد ہوگئی۔ کہیں کی نہ رہی۔

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو میری سنو۔ جو گوش نصیحت نیوش ہے

وہ دن تو عباسہ کا اسی مصیبت میں کٹ گیا۔ مگر اس نے پختہ ارادہ کرلیا تھا کہ اب میں اس گھر میں نہیں رہوں گی۔ وہ فوراً شام کی ٹرین سے اپنے والدین کے یہاں آگئی۔

اس کے پیارے والدین اس کی اس حالت کو دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ اس کی اماں جان خیال کرنے لگیں۔ کہ عباسہ رفیق سے ناراض ہو کر چلی آئی ہے

عباسہ اپنی ماں کی گود میں جا گر گر پڑی اور رو رو کر بیان کرنے لگی۔
اماں جان پیاری اماں جان رفیق نے پرسوں دوسری شادی کر لی۔ وہ مجھے اپنے پاس رکھنا نہیں چاہتے تھے۔ پیاری اماں جان عباسہ بہت بدنصیب ہے۔ وہ عباسہ جسے آپ عزیز رکھتی تھیں۔ آج رفیق کے ہاتھوں ذلت اُٹھا کر آئی ہے۔ پیاری اماں جان بتائیے تو میں کیا کروں۔

آہ یہ سین بھی کیسا دردناک تھا۔ عباسہ رو رو کر اپنی حالت کا اظہار کر رہی تھی اور بیچاری ماں سکتے کے عالم میں تھی۔ جس بات کا شان گمان بھی نہ تھا وہ سُننے میں آ رہی ہے۔ بہت صبر کیا اور اس طرح سمجھانے لگی۔

جان من صبر کر۔ وہ پاک قادر مطلق تجھ پر رحم کرے گا۔ رفیق بے حیا ہے۔ کمینہ ہے وہ ایک شریف دل کی قدر نہیں کر سکتا تھا۔ تیری قدر کے لیے تیرے پیارے ماں باپ موجود ہیں۔ اُنہیں اُن جیسی مبارک ہو۔ پیاری عباسہ صبر کرو۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔

عباسہ کو ان تسلی آمیز الفاظ سے بہت مدد ملی۔ وہ رنج جو تین دن سے ابر غم کی طرح اُس پر چھایا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے ہلکا ہو گیا۔ سچ ہے۔ ماں باپ جیسی پیاری چیز دنیا میں کوئی نہیں ہے۔

ناظرین آپ جانتے ہیں ستم دیدہ عباسہ اس مصیبت میں کیوں ہے۔ اگر اسکے والدین اس کی آیندہ زندگی کا کچھ بھی خیال کرتے تو یہ روز بد دیکھنا کیوں نصیب ہوتا۔

اے ہندوستان کی رسموں۔ تمھارے ہاتھوں سیکڑوں خاندان تباہ ہوتے جاتے ہیں۔ مگر خدا نہ کرے جو تمھارے اُٹھانے کا نام لیا جائے۔ اگر بچپن سے رفیق و عباسہ ایک دوسرے کو منسوب نہ کر دیے جاتے تو غالباً آج عباسہ ایک خوشگوار

زندگی بسر کرتی۔

اکثر شہروں میں اور اکثر خاندانوں میں اب بھی اس بات کا کثرت سے ساتھ رواج ہے کہ پیدا ہونے کے دن سے ہی وہ مضبوط رسی ان کے گلے میں ڈالدی جاتی ہے جسکا ٹوٹنا عمر بھر کو ناممکن سمجھا جاتا ہے۔ رفیق اب اپنی نئی بیگم کے ساتھ ایک خوشگوار زندگی بسر کر رہا ہے۔ مظلوم عباسہ ساری عمر اپنی قسمت کو روئے گی۔

رفیق پھر بھی اچھا رہا۔ عورتوں ہی کی ہر طرح پر مصیبت ہے۔ سچ ہے قسمت کے بھید اسی کو کہتے ہیں

خاکسار

بنت رشیدالدین

مصری مسلمان عورت

مندرجہ ذیل تقریر مصر کے نہایت روشن خیال اور مشہور عالم شیخ عبد العزیز نے دار التمثیل عربی میں چند مہینے ہوئے کی تھی۔ اس تقریر کو سننے کے لیے بہت بڑا مجمع اکٹھا ہوا تھا۔ جس کی تعداد پانچ ہزار سے زیادہ تھی۔ اور یہ تعداد اس لحاظ سے کہ بڑے بڑے علما، امرا، اور تعلیم یافتہ اصحاب کی تھی نہایت اہمیت رکھتی ہے۔ تعلیم یافتہ خواتین اور بڑے گھروں کی بیگمات بھی کثرت سے تھیں۔

اس تقریر کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ میں فاضل مقرر نے عورتوں کے طبعی فرائض بیان کیے ہیں اور اُن کی تعلیم و تربیت کے متعلق ہدایات کی ہیں۔ دوسرے حصے میں عورتوں کے متعلق مردوں کے فرائض بیان کیے ہیں۔ ہم اس موقع پر صرف پہلے حصے کا ترجمہ کرتے ہیں۔

یہ تقریر اگرچہ صرف مصر کی مسلمان عورتوں کو پیش نظر رکھکر کی گئی ہے۔ لیکن علی العموم مسلمان عورت اور خاصکر ہندوستان کی مسلمان مستورات کے لیے بھی یہ وہی حیثیت رکھتی ہے جو مصری عورت کے لیے ہے۔ کیونکہ مصر اور ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت بہت سی باتوں میں یکساں ہے۔ اور تعلیم نسواں کا مسئلہ تو ان دونوں ملکوں میں قریب قریب ایک ہی ہے۔

مترجم

حضرات !!

میں نے مصری مسلمانوں کی حالت پر بہت کچھ غور کیا ہے۔ ان کی پستی۔ تنزل اور اخلاقی خرابیوں پر نہایت فائر نگاہ ڈالی ہے۔ نیز اس بات کو بھی میں بہت سوچتا رہا ہوں کہ ان امور کے اسباب کیا ہیں۔ اب آپ توجہ سے سُنیں کہ میں کن نتائج پر پہنچا ہوں۔

مرد اس لیے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ دنیاوی زندگی کے دشوار سفر کے مشکلات کو حل کرے۔ جفاکشی۔ سفر۔ طلب رزق۔ جستجو اور کوشش۔ حقوق کی نگہداشت۔ کمزور بچوں اور عورتوں کی پرورش کا سامان مہیا کرنا یہ سب مرد کے فرائض میں سے ہیں۔ اسلیے انسانی تمدن میں فطرتاً مرد ہی ان تمام تکالیف شاقہ کا ذمہ دار قرار پایا ہے مصر میں میں دیکھتا ہوں کہ اکثر نوتعلیم یافتہ جنٹلمین گھر سے اُس وقت باہر نکلتے ہیں جبکہ گھنٹوں وہ آئینے کے سامنے کنگھی کرنے اور مانگ نکالنے میں گزار دیتے ہیں۔ کالر نکٹائی کی درستی میں بہت سا وقت ان کا صرف ہوجاتا ہے۔ کوٹ۔ پتلون اور بوٹ کی صفائی میں ان کی توجہ زیادہ مصروف رہتی ہے۔ چہرے پر صیقل کرنے کے لیے صابون کا بڑا خرچ رہتا ہے۔

یہ اُن نوجوانوں کا حال ہے جن سے یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ زندگی کے دشوار گزار مراحل کو جفاکشی سے طے کریں گے۔ اور انسانی تمدن کو ترقی دینے میں محنت شاقہ برداشت کرینگے۔ تاکہ وہ دنیا میں اپنے فرائض منصبی کو بجا لانے والے اور نیکنام مشہور ہوں۔

چونکہ ابھی میں مردوں کے متعلق زیادہ کہنا نہیں چاہتا اس لیے اپنے اصل مقصد یعنی مصری عورت کی حالت کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جو میری آج کی بحث کا خاص موضوع ہے۔ میں اسکے متعلق کوئی فلسفی بحث نہ کرونگا اور نہ اسکے تمام تمدنی حقوق مجھے بیان کرنے ہیں بلکہ اس وقت صرف اس کے تمدنی امراض اور ان کا علاج بیان کرنا مدنظر ہے۔

یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ عورتوں کے طبعی حالات مردوں سے بالکل الگ ہیں۔ اور یہی طبعی حالات اس اختلاف کا باعث ہیں جو دنیا کے تمدن میں مردوں اور عورتوں میں پایا جاتا ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ ہر ایک فریق اپنے اپنے طبعی فرائض سے غافل ہوکر ایک دوسرے کی حد میں قدم رکھتا ہے۔ جس سے فطرتی تمدن کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔

مشرقی نوجوان اپنے مردانہ فرائض سے غفلت اختیار کرکے کنگھی کرنے اور مانگ نکالنے میں اپنا وقت صرف کرتا ہے۔ چہرے کی صیقل اور ڈاڑھی کی صفائی سے وہ اپنے آپ کو ایسا بناتا ہے کہ اگر اسکے مونھ پر مونچھیں نہ ہوتیں تو اس کو عروس کہنا بے جا نہ ہوتا۔

اور برخلاف اسکے مغربی یا امریکن عورت اپنے طبعی فرائض کو چھوڑ کر مردانہ اخلاق و عادات اپنے اندر پیدا کرتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو اس قابل بنانے کی کوشش کرتی ہے کہ زندگی کے دشوار مراحل میں وہ مردوں کے دوش بدوش چلے۔ اگر اسکا لباس مردوں سے مختلف نہ ہوتا یا اسکے چہرے پر مونچھیں رہتیں تو یقیناً دیکھنے والا اسکو بھی مرد سمجھتا۔

لیکن یہ دونوں باتیں افراط و تفریط ہیں۔ اور تمدن کی طبعی حالت کے بالکل مخالف ہیں۔ اسلیے ہم واضح طور پر بیان کیے دیتے ہیں کہ نظام عالم میں عورت کے

طبعی فرائض کیا ہیں۔
عورت حاملہ ہوتی ہے۔ پھر ولادت کا زمانہ آتا ہے۔ پھر بچوں کی پرورش کرتی ہے۔
یہ عورت کے طبعی اور فطرتی فرائض ہیں جو قدرت نے مقرر کیے ہیں۔ اور دنیا میں کوئی اس کی صداقت سے انکار نہیں کر سکتا۔
نو مہینے تک بچہ اس کے شکم میں رہتا ہے۔ اس زمانے میں طرح طرح کے امراض و تکالیف میں وہ مسکین مبتلا رہتی ہے۔ کھانے سے بیزار۔ بات چیت سے نفرت۔ کانوں کو تمام آوازیں ناگوار معلوم ہوتی ہیں۔ سوتی ہے تو گویا کانٹوں پر سوئی ہوئی ہے خواہ اسکا فرش قالین ہی کیوں نہ ہو۔
ان تمام تکالیف جھیلنے کے بعد اب ولادت کا زمانہ آتا ہے جسکو نہایت تکلیف اور مصیبت کا زمانہ کہنا چاہیے۔ پھر ایک کمزور اور ناتوان بچہ پیدا ہوا۔ ابھی ان تکالیف سے وہ سنبھلنے بھی نہ پائی تھی کہ اس ننھی سی جان کے پرورش کا بوجھ اس پر پڑا۔ قدرت نے اس کی جان میں ایسا محبت کا پیالہ اُنڈیل دیا کہ اب اسکو اپنے دُکھ سُکھ کی کچھ بھی خبر نہیں رہی اور وہ ہمہ تن اس کمزور بچے کی پرورش میں منہمک ہوگئی۔
اس نے آرام چھوڑا۔ نیند چھوڑی۔ اور بچے کو ہر قسم کی راحت پہنچانے کے لیے آمادہ ہوگئی۔ بلا کسی اجر کے۔ بلا کسی امید کے۔ بلا کسی شکریہ کی خواہش کے اپنی جان۔ اپنا تن۔ اپنا من اور اپنا دھن سب کچھ اس نوزائیدہ بچے پر اس نے لگانا شروع کیا۔
ابھی ان تکالیف کا خاتمہ بھی نہ ہونے پایا تھا کہ دوسرا سلسلہ پھر شروع ہوا۔ یعنی پھر وہ حاملہ ہوئی۔ پھر بچہ پیدا ہوا۔ اور پھر اس کی پرورش شروع ہوئی۔

یہی عورت کی طبعی حالت اس کی زندگی کے بیش قیمت اور کارآمد حصے میں ہے۔
اسی طرح کے مدوجزر میں وہ گرفتار رہتی ہے۔ اور یہ وہ بات ہے کہ جو بالکل بدیہی ہے۔ اور اس سے
کوئی انکار نہیں کرسکتا۔

عورت کی اس فطرتی حالت سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسکا درجہ نظام عالم کیا ہے
یعنی یہ کہ اس کی زندگی منزلی (خانگی) زندگی ہے۔ نہ کہ خارجی۔ وہ اپنے فرائض کو گھر میں
رہکر ادا کرسکتی ہے بہ نسبت اس کے کہ تجارت گاہوں۔ پولیٹکل اور تمدنی جولانگاہوں میں
جاکر زندگی کی کشمکش میں حصہ لے۔

عورت کے ان طبعی فرائض کی حالت شریعت اسلامیہ کے سامنے روشن تھی۔ چنانچہ
اس نے یہ قرار دیا کہ عورت کا خرچ اس وقت تک اسکے باپ کے ذمہ ہے جب تک کہ
وہ کنواری ہے اور نکاح ہو جانے کے بعد اسکا نان و نفقہ شوہر پر واجب کر دیا۔ خواہ
وہ کتنی ہی بڑی مالدار کیوں نہ ہو۔ کیونکہ شریعت اسلامیہ کا منشا یہ ہے کہ عورت اپنے طبعی
فرائض کے ادا کرنے کے لیے بالکل آزاد چھوڑی جائے۔

برخلاف اسکے مغربی لڑکی جب تک کمانے کے قابل نہیں ہوتی اس وقت تک اسکا
باپ اسکے اخراجات برداشت کرتا ہے۔ اور جب وہ کمانے کے قابل ہو جاتی ہے تو
اپنے لیے اور بعض وقت بوڑھے ماں باپ کے لیے بھی وہی کماتی ہے۔ اس لیے
مجبوراً اسکو منزلی زندگی چھوڑکر باہر قدم رکھنا پڑتا ہے۔ کارخانوں۔ بازاروں۔ دوکانوں
وغیرہ میں وہ مردوں کے دوش بدوش کام کرتی ہے۔ جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مردوں کے
سے شوق اور انہیں جیسے خیالات اسکے اندر پیدا ہو جاتے ہیں۔ تدبیر منزل کی طرف اسکا
دھیان بھی نہیں جاتا۔ وہ زیادہ تر انہیں کھیلوں اور مشاغل کی خواہاں رہتی ہے جنکے مرد ہتے
ہیں۔ سیر و تفریح کرتی ہے۔ ناول اور افسانے پڑھتی ہے۔ کلبوں میں مردوں کے ساتھ ہر قسم کے
مردانہ کھیلوں میں شریک رہتی ہے۔

ایک اور خرابی ہوتی ہے کہ وہ زندگی کے ہر شاہراہ میں مردوں کے ساتھ ہے محرم اور اجنبیوں ہر قسم کے مردوں کے اسکا سابقہ پڑتا ہے۔ بازاروں میں۔ گلیوں میں تفریح گاہوں میں۔ وادیوں میں، پہاڑوں کی چوٹیوں پر۔ مجمع میں اور تنہائی میں، جس سے بہت سے فساد پیدا ہوتے ہیں۔ اور تمدن کا شیرازہ درہم برہم ہو جاتا ہے۔

لیکن مسلمان عورت فطرتی عورت ہے وہ اپنے فطرتی فرائض کو ادا کرتی ہے اور اس کی پاک شریعت اسکے سامان زندگی کی کفیل ہے۔

اب مسلمان عورت سے لوگ کس بات کے خواہشمند ہیں کہ جس سے وہ اپنی حالت درست کرے۔ کیا جغرافیہ یا تاریخ پڑھ کر۔ یا جامیٹری اور انگریزی زبان کی تعلیم سے ؟ جن لوگوں نے اسکے لیے ایسا نصاب مقرر کیا ہے وہ حقیقت میں جاہل اور نادان ہیں۔ وہ واقف ہی نہیں کہ عورت کو کس قسم کی تعلیم کی ضرورت ہے۔ وہ فخر کرتے ہیں کہ ہمارے مدرسے سے اس سال اس قدر مسلمان لڑکیاں جغرافیہ اور تاریخ میں پاس ہوئیں۔ اتنی لڑکیوں نے انگریزی زبان میں کامیابی حاصل کی۔ مگر اس سے حاصل! ایسے لوگ امت اسلامیہ پر درصل ایک وبال ڈال رہے ہیں۔

کئی سال لڑکیاں ان مدارس میں گزارتی ہیں اور جب وہاں سے نکلتی ہیں تو نہ خانہ داری سے واقف ہوتی ہیں نہ تربیت اولاد سے۔ نہ اُن میں اچھی ماں بننے کی قابیت ہوتی ہے نہ گھر کی مالکہ۔ زیادہ تر ناول کی خواہاں رہتی ہیں اور افسانے اور قصے خاصکر عشقیہ پڑھتی ہیں۔ ہاں ان میں سے مستثنٰی بھی ہوتی ہیں۔ لیکن صرف چند۔

اس لیے یہ مدارس ہمارے مرض کا بالکل علاج نہیں ہیں۔ ہمیں ضرورت ہے کہ ہماری لڑکیاں نیک اور پاک دامن مائیں اور گھر کی اچھی مالکہ اور روح رواں بنیں۔ اس کے لیے ہم کو چاہیے کہ ہم ان کو اس قسم کی تعلیم دیں جو اس مقصد کی رہنما ہو۔ یعنی (۱) حفظان صحت (۲) خانہ داری (۳) تربیت اولاد۔

عورت کے لیے حفظان صحت کا جاننا نہایت ضروری ہے۔ تاکہ اپنی صحت اور بچوں کی تندرستی۔ کھانا اور مکان وغیرہ کا خیال رکھ سکے۔ بہت سے جزی امراض جو اکثر ہوتے رہتے ہیں اسکا علاج بھی اسکو جاننا چاہیے۔ پانی اور ہوا کی صفائی وغیرہ کا بھی علم ضروری ہے۔

خانہ داری کے لیے کھانا پکانا۔ سینا۔ کشیدہ کاری وغیرہ عورت کے لیے نہایت ضروری ہیں تاکہ وہ اپنے گھر کی چیزوں کو خود تیار کر سکے یا خادماؤں سے تیار کرا سکے۔ کیونکہ اگر وہ نہیں جانتی ہوگی تو وہ دوسروں سے بھی اس کام کو نہیں لے سکتی ہے۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ آدمی ہمیشہ امیر ہی رہے۔ اس لیے امیر اور غریب ہر قسم کی عورتوں کو خانہ داری کی یکساں تعلیم ہونی چاہیے۔ تاکہ وہ اپنے گھر کی ہر ایک شئے خود تیار کر سکیں۔

میں جغرافیہ اور تاریخ کی تعلیم کا مخالف نہیں ہوں۔ بلکہ عورتوں کی ابتدائی تعلیم میں اسکا کچھ حصہ مفید ہوگا۔ لیکن غیر زبانوں کی تعلیم کو عورتوں کے لیے میں بالکل پسند نہیں کرتا۔ اس لیے کہ اس سے وقت ضائع ہوگا۔ اسکا بچپن کا زمانہ اس قدر تھوڑا اور بیش قیمت ہے کہ اس میں اس قسم کی غیر ضروری چیز پڑھانے کی بالکل گنجائش نہیں ہے۔

ان سب تعلیم کے ساتھ اسکو تہذیب لیکن خالص اسلامی تہذیب۔ تزکیہ نفس اور اخلاقی تعلیم کا دینا ضروری ہے۔

صحیح تہذیب سے مراد یہ نہیں ہے کہ بہت گویائی اور دلکش انداز اس میں پیدا ہو یا اسکا دماغ مختلف مسائل سے بھر دیا جائے۔ بلکہ صحیح تہذیب کے یہ معنی ہیں کہ اس میں دب سعادتمندی اور خوش اخلاقی اور اس کی عقل میں وزن اور متانت پیدا ہو تاکہ وہ اپنے

قوائے عقلی اور جسمانی کو بہترین طریقہ سے استعمال کرسکے۔

صحیح تہذیب ہم دو طریقوں سے حاصل کرسکتے ہیں۔ ایک تو مذہبی کتابوں کو پڑھا کر کیونکہ شریعت اسلامی کی اخلاقی اور روحانی تعلیم ایسی بلند پایہ ہے کہ جس سے انسان میں ہر قسم کی شرافت۔ ادب۔ متانت بدرجۂ کمال پیدا ہوتی ہے۔ اسکے لیے ضرورت ہے کہ ہم عورتوں کے واسطے مذہبی کتابیں نہایت سلیس اور آسان عبارت میں عمدہ ترتیب کے ساتھ لکھیں۔ اور گذشتہ سلف صالحین کے پاک نمونے اور مثالیں انکو دکھلائیں۔ جن سے انکے روحانی قوائے میں بالیدگی اور نشو ونما پیدا ہو۔ اور وہ صحیح اسلامی تہذیب اور ادب کا نمونہ بن جائیں۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ گھر کے مرد اپنے عادات اور اطوار کو ٹھیک اور درست کریں۔ کیونکہ میں نے جہانتک دیکھا ہے اسی گھر کے بچوں کے اخلاق خراب ہوتے ہیں جس گھر کے مردوں کے عادات بگڑ جاتے ہیں۔ مردوں کو عمدہ نمونے انکے سامنے پیش کرنا چاہیے۔ کیونکہ عملی زندگی کا بچوں پر بڑا اثر ہوتا ہے۔

مترجم

ا - ج

شاہ ایڈورڈ ہفتم کی یاد

ایم پاولی فرانس کے ایک نامور عہدہ دار ہیں۔ فرانس میں جو بادشاہ سیاحت یا سیر کی غرض سے آتے ہیں ان کی خدمت گزاری اور دیکھ بھال کے لیے حکومت فرانس ایم پاؤلی ہی کو متعین کرتی ہے۔

اس سلسلے میں وہ کئی برس سے ہیں اور اکثر شاہان یورپ کی خدمت میں حاضر باشی کا شرف پا چکے ہیں۔ شاہ ایڈورڈ ہفتم کی خدمت میں ان کو خصوصیت اسلیے حاصل ہے کہ

انھاانی ہرسال فرانس جاتے رہتے تھے۔ اور مہینوں قیام فرماکر واپس انگلستان تشریف لاتے تھے۔ اس طرح ایم پاؤلی کو حضور کی عادات وخصائل جانچنے کا زیادہ موقع ملتا رہا اور انھوں نے اپنے خیالات ایک اڈیٹر کے اصرار سے شائع بھی کر دیے۔ انہیں کے مضمون سے جو نہایت دلچسپ بھی ہے کچھ قصہ ترجمہ کرکے ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔

جب یہ مضمون میں نے لکھا ہے تو شاہ ایڈورڈ زندہ تھے اور مجھے یہ افسوس ناک خیال نہ آیا تھا کہ تھوڑے ہی دن بعد اُن کا تذکرہ مرنے والوں کے ذیل میں فعل ماضی کے ساتھ کیا جائیگا۔ مجھے افسوس ہے کہ اس مضمون کے چھپنے کی اجازت بھی زبانی حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا۔ تھوڑے دن ہوئے جب وہ ایک دن کے واسطے پیرس تشریف لائے۔ لیکن مجھے شرف باریابی حاصل نہ ہوسکا۔ مجبوراً اس مضمون کے شائع کرنے کے لیے میں نے تحریری اجازت مانگی۔ جو اُنھوں نے اپنی نیک نہادی سے منظور فرمائی۔ اور یہ بھی لکھا کہ میں بڑی خوشی سے تمھارا مضمون پڑھونگا اور اگر ضرورت ہوئی تو تصحیح بھی بروقت ملاقات کرونگا۔ مگر افسوس کہ اب وہ کبھی فرانس تشریف نہیں لائیں گے۔ جسکا نہ صرف مجکو بلکہ سارے فرانس کو رنج ہے۔ کیونکہ فرانس والوں سے شاہ ایڈورڈ کو بڑی یگانگت اور محبت تھی۔ ساری دنیا کو بے شبہ ان کی موت سے سخت ملال ہوا لیکن غالباً فرانس والوں کے برابر کسی غیر قوم کو نہ ہوا ہوگا۔

درحقیقت شاہ ایڈورڈ نے اپنی خوش مزاجی و بے تکلفی و نیک نہادی سے تمام اہالیان فرانس کو اپنا گرویدہ کر لیا تھا۔ مجھے ۱۸۷۴ء کا وہ واقعہ جب میں نے اُن کو پہلے پہل دیکھا تھا کل کی سی بات معلوم ہوتی ہے۔

میں اسٹیشن پر قصبہ نائیس کے کھڑا ہوا پیرس ایکسپریس کا انتظار کر رہا تھا کہ آنے والوں میں سے ایک لمبے خوبصورت شخص پر میری نگاہ پڑی جو مجمع میں سے بالکل دھکا پیل کرتا ہوا آرہا تھا

میں اس کی خوش پوشاکی اور خوش وضعی کی دل میں مزے سے رہا تھا کہ اسٹیشن ماسٹر میرے پاس آیا اور اسی شخص کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا تم انہیں جانتے ہو کون ہیں؟ میں نے جواب دیا کہ نہیں۔ تب اس نے بتایا کہ یہی شاہزادہ ویلز ہیں اور یہ اسی بے تکلفی کے ساتھ نایس میں آتے جاتے ہیں۔ یہاں کا بچہ بچہ انہیں جانتا ہے۔ اور سب کو ان سے بڑی محبت ہے۔

نمبر ۲

شاہ ایڈورڈ کی تخت نشینی سے قبل مجھے ان کی خدمت میں نیاز حاصل تھا۔ اگرچہ میں باضابطہ ان کی خدمت میں مقرر نہیں کیا گیا تھا۔ اور وہ خود بھی ایام ولیعہدی میں نہیں چاہتے تھے کہ کوئی مقرر ہو۔ انہیں اس بات سے چڑ تھی کہ لوگ ان کی دیکھ بھال اور خبرگیری کریں۔ چنانچہ پولیس بھی ان کی خبرگیری کے لیے ایسی خفیہ طور پر رکھی جاتی تھی کہ آپ کو خود اس کی اطلاع نہ ہوتی تھی۔ جہانتک مجھے یاد ہے فرانس میں شاہ ایڈورڈ پر صرف ایک دفعہ حملہ کیا گیا ہے۔ لیکن شکر ہے کہ قاتل کا وار خالی گیا اور وہ محفوظ رہے۔

یہ بات لکھنے کے قابل ہے کہ شاہزادگی کے زمانے میں وہ اپنی والدہ حضور ملکہ معظمہ کی بے حد عظمت کرتے تھے اور ہمیشہ ملکہ معظمہ کی تصویر اپنے لکھنے کی میز پر رکھتے تھے۔ ان ہی کی عطیہ ایک لکڑی بھی اُن کے پاس تھی۔ مشہور ہے کہ یہ لکڑی اس درخت کی شاخ سے بنائی گئی تھی۔ جس کے نیچے شاہ چارلس دوم نے مفروری کے زمانہ میں پناہ لی تھی۔ سر پر ملکہ معظمہ نے ایک نہایت خوب صورت دیوی کی مورت جڑوائی تھی جو گنگا کے کنارے سے دستیاب ہوئی تھی۔ اس لکڑی کو شاہ ایڈورڈ نہایت عزیز رکھتے تھے اور اگرچہ اُن کے پاس صدہا قسم کی چھڑیاں بینتیں وغیرہ تھیں مگر اس سے زیادہ کوئی معزز نہ تھی۔

میں یہاں اس صدمہ کا ذکر کرنا فضول سمجھتا ہوں جو شاہ ایڈورڈ کو حضور ملکہ کے انتقال

سے پہنچا۔ ان کی موت کے بعد تخت نشین ہوکر انہیں اپنی پچھلی آزادی کو خیر باد کہنا پڑا۔
وہ بار بار فرانس آنا بھی چھوٹ گیا اور وہ بہت سی نئی پابندیوں میں گھر گئے۔ پیرانہ سالی
نے بھی کچھ نہ کچھ اثر کیا۔ اور اگرچہ حضور نہایت مضبوط اور تندرست تھے اور محنت کرنے
میں بھی کسی سے کم نہ تھے۔ تاہم باقتضائے سن ان کی چال میں آہستگی اور جوش میں اعتدال
آگیا۔ لیکن اسکے ساتھ ہی ان کی خوش مزاجی اور نیک دلی میں اضافہ ہوگیا تھا۔ اور اسی لیے
اپنے عہد حکومت میں بے شبہ وہ ایام ولیعہدی سے بھی زیادہ ہر دل عزیز ہوئے
اس مختصر عہد میں مجھے ان کی خدمت میں رہنے کا زیادہ موقع ملا۔ اور ان کی عادات و
خصائل نے جو اثر میرے دل پر کیا انہیں کو اس وقت مضمون کی صورت میں پبلک کے
سامنے پیش کرتا ہوں۔ اور پھر اس بات پر افسوس کرتا ہوں کہ خود میرا ممدوح دنیا میں موجود
نہیں جو اس مضمون کو پڑھتا اور ایک غیر قوم کے شخص کی زبانی اپنی باتیں سنکر
خوش ہوتا۔

نمبر ۳

حضور بادشاہ کی عادت تھی کہ سفر میں وہ ہر شئے کو پہلے سے تیار اور درست
دیکھنا چاہتے تھے۔ اس قسم کی باقاعدگی اور سلیقہ پسندی حضور کو ملکہ معظمہ صاحبہ سے ورثہ
میں ملی تھی۔ وہ اپنے سفر کے متعلق ذرا ذرا سی بات کا خیال رکھتے تھے۔ اور جہاں
جانا ہوتا تھا وہاں دو مہینے پہلے سے اطلاع دیتے تھے۔ ساتھ ہی ایم فر حضوری اغو
بھیجدیے جاتے تھے تاکہ وہ حضور کے سفر کا انتظام کر رکھیں۔ ایم فر ایک نہایت
ہوشیار اور مستعد سبوس (باشندۂ سوئیزرلینڈ) شخص ہیں۔ حضور کا تفصیلی پروگرام
وہی مرتب کرتے تھے۔ اور ریلوں کا کرایہ قیام کا انتظام بل وغیرہ چکانا سب انہیں کے
ذمہ تھا۔

اس معاملہ میں وہ اتنے سخت منتظم واقع ہوئے تھے کہ معمولی معمولی رقموں پر

ہوٹل والوں سے لڑنے جھگڑنے سے بھی پرہیز کرتے تھے اور اکثر جس بات پر اڑ گئے اسکو منوا کے چھوڑا۔

سفر میں حضور بادشاہ کے ہمراہ گنتی کے چند ملازم ہوتے تھے۔ دو مصاحب اور ایک حکیم شاہی اور ایک پوسٹ ماسٹر۔ ان چاروں کو تو اعلیٰ عہدہ دار تصور کرنا چاہیے۔ باقی موٹربان۔ دربان وغیرہ کئی ہوتے تھے۔ کیونکہ حضور کے ہمراہ کم از کم تین موٹر کار رہا کرتی تھیں۔

حضور کا سفر ہمیشہ خاص اپنی ریل گاڑیوں میں ہوا کرتا تھا۔ یہ گاڑیاں تعداد میں صرف تین تھیں اور انٹرنیشنل کار کمپنی کے ہاں بنی تھیں۔ وہ نہایت آرام دہ اور خوبصورت تھیں لیکن سادگی کا حضور ایڈورڈ ہفتم کو اتنا خیال تھا کہ کبھی ان کو شوخ رنگ یا فوق البھڑک بنانے کی کوشش آپنے نہیں کی۔

حضور جب فرانس کی بندرگاہ پر آتے تو یہ گاڑیاں تیار ملتیں۔ وہیں میں پیشوائی کے لیے حاضر ہوتا اور سب سے پہلے میں ہی حضور سے مصافحہ کی عزت حاصل کرتا تھا۔ اسٹیشن پر اگر کوئی واقف کار نظر پڑتا تھا تو شاہ ایڈورڈ ہفتم اس سے بے تکلفی کے ساتھ ایک دو بات کرتے اور اکثر سلام میں سبقت فرماتے تھے۔ ان کا متبسم چہرہ اور خلق و تواضع کے ساتھ لوگوں سے ہاتھ ملانا ملنے والوں کو کبھی نہ بھولے گا۔ واقعی وہ فرانس والوں سے بالکل اپنایت برتتے تھے اور یہاں آکر جو وقت گزارتے تھے شاد و خرم رہ کر گزارتے تھے۔

حضور پیرس پہنچکر ہمیشہ ہوٹل برسٹل میں فروکش ہوتے تھے۔ اور وہاں آتے ہی تمام بڑے بڑے اخبارات منگواتے تھے اور سب سے پہلے تھیٹروں کے متعلق جو کالم ہوتا تھا اسکو پڑھتے تھے۔ انھیں فرانسیسی تماشا گاہوں سے حیرت انگیز واقفیت تھی۔ پیرس کا کوئی نامی ایکٹرس اور مشہور مطرب ایسا نہ تھا جسے وہ نہ جانتے ہوں۔

تھیٹر ڈس ورائٹیز ان کی پسندیدہ تماشا گاہ تھی۔ وہاں ہوٹل میں آتے ہی اُنکے لیے

دو درجہ مخصوص کر لیے جاتے اور ہوٹل کا منیجر ایک آرام کرسی بھی وہاں بھیج دیا کرتا تھا کیونکہ شاہ ایڈورڈ کو ہمارے تھیٹروں کی نشستیں پسند نہ تھیں اور وہ بے آرام بیٹھ کر نہ چاہتے تھے کہ تماشہ کا لطف آدھا رہ جائے۔

ڈس ورائٹیز میں آخری تماشہ جو شاہ ایڈورڈ نے دیکھا وہ "لی راسے" (یعنی شاہی خاندانوں کے متعلق) تھا۔ اس میں بادشاہوں کی حرکتوں کا بڑے دلچسپ طریق سے خاکہ اُڑایا گیا تھا اور خود شاہ ایڈورڈ کا بھی تھوڑا سا ذکر مذکور تھا۔ جب اس رات بادشاہ کے آنے کی اطلاع ہوئی تو تھیٹر کے منیجر بہت گھبرائے کہ کہیں بادشاہ سلامت اس تماشہ سے کبیدہ نہ ہو جائیں۔ اگرچہ شاہ ایڈورڈ کا ذکر ہجویہ نہیں آیا تھا۔ پھر بھی اسکو انھوں نے اس تماشہ میں سے قطعاً اڑا دینا چاہا۔ شاہ ایڈورڈ کو بھی یہ خبر لگ گئی اُنھوں نے کہا کہ ہرگز کمی بیشی نہ کی جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور جب اُن کا ذکر آیا تو سب سے پہلے حاضرین میں وہی قہقہہ مار کے ہنسے جس سے پیرس والے بھی بہت خوش ہوئے۔

نمبر ۴

تخت نشین ہونے کے بعد شاہ ایڈورڈ نے پیرس کی سوسائٹی میں ملنا ذرا کم کر دیا تھا لیکن وہ اپنے ذاتی دوستوں کو نہ بھولے تھے اور ہمیشہ اثنائے قیام میں اُن سے ملتے جُلتے رہتے تھے۔ مجھے سب سے زیادہ تعجب جس بات کا ہے وہ حضور بادشاہ کی مستعدی اور پابندی اوقات تھی۔ اگرچہ بی آرٹز میں وہ آرام لینے آتے تھے مگر ہمیشہ ۷ بجے صبح اُٹھتے تھے غسل کرتے تھے اور تھوڑا سا گرم دودھ پیتے تھے۔ اس کے بعد لباس پہننے کا وقت تھا بادشاہ سلامت ہمیشہ لباس خود پہنا کرتے تھے۔ توشک خانہ کا داروغہ صرف اس بات پر مامور تھا کہ جس سوٹ کا حضور اشارہ کریں لاکر رکھدے۔ دس بجے حاضری سے فارغ ہوکر لکھنے کی میز پر بیٹھ جاتے تھے۔ اور دو گھنٹے تک مسلسل کام کرتے تھے۔ لندن سے سرکاری ڈاک کے روزانہ جو تین پلندے پہنچتے تھے۔ حضور سب خطوط کو کھول کر خود پڑھتے تھے

خود دستخط کرتے تھے۔ وزیرِ اعظم کو اپنے ہاتھ سے خط لکھتے تھے اور جن پر نوٹ کرنے ہوتے اُن پر نوٹ کر کے اپنے مصاحبوں کے حوالے کر دیتے تھے۔ حضور بادشاہ کم از کم ایک گھنٹہ اپنے پرائیویٹ خط و کتابت میں صرف کرتے تھے۔ پھر سیر کا وقت مقرر تھا جسکی واپسی پر لنچ شروع ہو جاتا تھا۔

رات کا کھانا جس پر حضور اکثر اپنے دوستوں کو بھی مدعو فرماتے تھے سوا آٹھ بجے مقرر تھا۔ اس وقت بھی کھانا بہت سادہ ہوتا تھا اور حضور کے ساتھ دس آدمیوں سے زیادہ کبھی نہ ہوتے تھے۔ وہ کھانا کھاتے وقت اپنے ملازمین کے سوا اور کسی کو بھی رکھنا نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ ہوٹلوں میں بھی کمرے تک ہوٹل کا نوکر کھانا لا لا کے حضوری خدمتگار ہوفز کو دیتا جاتا تھا اور ہوفز میز پر لا کے چُن دیتا تھا۔

میں نے یہ بات بھی خیال سے دیکھی کہ شاہ ایڈورڈ کھانے میں زیادہ دیر نہیں لگاتے تھے وہ رات کے کھانے سے زیادہ سے زیادہ پون گھنٹہ میں فارغ ہو جاتے تھے۔

سگرٹوں کا حضور کو بہت شوق تھا۔ اُن کا سگار کیس روز بھرا جاتا تھا اور رات تک خالی ہو جاتا تھا۔ ان کی گھڑی کی زنجیر میں ایک چھوٹا سا دیا سلائی کا بکس لٹکا رہتا تھا جس پر شاہی نشان یعنی تاج بنا ہوا تھا۔ ایک دن میں نے اس کی خوب صورتی کی تعریف کی جس پر اُنھوں نے زنجیر سے نکال کر فرمایا کہ "ایم پاؤلی اب اسے تم ہی اپنے پاس بطور نشانی کے رکھو۔ تم نے اسکو لیا تو مجھے خوشی ہوگی" اور انھوں نے ازراہ عنایت خسروی خود میری چین میں لٹکا دیا۔ جس کے بعد سے وہ آج تک میرے پاس موجود ہے۔

جب کام کرنے کے بعد حضور سیر کرنے کے لیے باہر تشریف لیجاتے تو دوسری موٹر میں انگریزی پولیس کا مہتمم اور میں ہمراہ ہوتے تھے۔ شاہ ایڈورڈ کو چھوٹے چھوٹے گانوں میں ٹھہرنے کا اور وہاں کے غریب بچوں کے کھیل دیکھنے کا بہت شوق تھا اور وہ کبھی بغیر ان غریب کسانوں کو کچھ تحفہ دیے تشریف نہ لاتے تھے۔

بی آرٹز میں انکے آنے کی خبر سنتے ہی سینکڑوں فقیر محتاج لوگ وہاں آن پہنچتے میں اس خیال سے کہ حضور کو یہ لوگ دق نہ کریں سب کو وہاں سے نکلوا دیتا تھا۔ دو اندھے فقیروں کو ہبستہ میں کچھ نہیں کہتا تھا کیونکہ وہ بہت ہی غریب تھے۔ اور ہر طرح امداد کے مستحق تھے۔ جاڑا ہو یا برسات وہ دونوں بلاناغہ اپنی اپنی جگہ پر آن کر جم جاتے تھے اور جوں ہی بادشاہ سلامت کا کُتّا انہیں دیکھ کر بھونکتا وہ سمجھ لیتے کہ بادشاہ آرہے ہیں۔ چنانچہ اپنے پیالے آگے بڑھا دیتے تھے اور بابا آنکھیں بڑی نعمت ہیں کی صدا بلند کرتے۔ شاہ ایڈورڈ خود انکے پاس جاتے اور باری باری دونوں کے پیالوں میں ایک معتدبہ رقم ڈال دیتے تھے۔ اور جاتے وقت "اب کل" کا خوشگوار وعدہ بھی ضرور فرماتے تھے۔

ایک دن اتفاق سے ایک اندھا اپنی جگہ پر نہ تھا۔ حضور ان دونوں کے دیکھنے کے اتنے عادی ہوگئے تھے کہ انہیں خیال ہوا کہ ان میں سے ایک کہیں نہ کہیں گر گرا پڑا ہوگا۔ اسکا حضور کو افسوس ہوا۔ لیکن دوسرے دن وہ اندھا اپنی جگہ پر موجود تھا۔ بادشاہ نے اُس سے سوال کیا کہ کل تم کہاں تھے کیا بیمار ہوگئے تھے۔ اندھے نے کہا نہیں حضور بیمار تو نہیں ہوا تھا۔

بادشاہ۔ تو شاید تم دیر میں وقت کے بعد پہنچے؟

بیچارے اندھے فقیر کی سمجھ میں کوئی جواب نہیں آیا۔ آخر ذرا تامل کر کے اُسے صاف صاف کہنا پڑا کہ "حضور میں تو دیر میں نہیں آیا تھا۔ حضور ہی وقت سے پہلے تشریف لے گئے۔"

بادشاہ۔ "اوہو۔ بھئی خدا کے لیے معاف کر دینا" اور وہ بڑی دیر تک ہنستے رہے۔

حضور بادشاہ غریب غربا سے ملکر روز باتیں کر کے نہایت خوش ہوتے تھے اور سب لوگ بھی انہیں باتوں سے ان کی پرستش کرتے تھے۔ درحقیقت جو اُن سے ایک دفعہ ملا پھر ان کی شفقت و مہربانی کو نہ بھولا۔ ان کی سادگی اور خوش مزاجی نے نہ صرف

سوسائٹی کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ بلکہ عوام کے دل میں بھی جگہ کرلی تھی۔ فرانس کے جھونپڑوں میں بہت لوگ کہتے تھے کہ "یہ بھی کتنا نیک آدمی ہے" اور سیاسی ایوانوں میں لوگ سوچتے تھے کہ "یہ بھی کیسا باعظمت بادشاہ ہے"

رقیمہ
سید ضیاد حسین

اڈیٹوریل

عورتوں کے انتخاب کا حق ۔ روس کا رسالہ عالم نسواں جسکے اڈیٹر اسمعیل بک ایک نہایت مشہور روسی مسلمان لیڈر ہیں لکھتا ہے کہ یہاں یہ مسئلہ ۱۹۰۸ء سے پیش تھا کہ روسی عورتوں کو جب حق انتخاب مل گیا تو مسلمان عورتوں کو بھی اپنے مذہب کی رو سے یہ حق مل سکتا ہے یا نہیں اور وہ شرعاً اس سے فائدہ اُٹھا سکتی ہیں یا نہیں۔ یہ مسئلہ ڈیوما میں چھیڑا گیا تھا اور عرصہ تک اخبارات میں اس کی بحث رہی۔ بعض ناواقف کہتے تھے کہ مسلمان عورت اس سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتی اور اس طرح وہ ہماری نصف قوت کو کم کرنے کی کوشش میں تھے لیکن شیخ الاسلام سے جب دریافت کیا گیا تو انھوں نے نہایت صفائی کے ساتھ جواب دیا کہ انتخاب میں عورتوں اور مردوں کا حق اسلامی شرع کی رو سے یکساں ہے۔

مصر میں اس دو سال کے عرصہ میں دو یونی ورسٹی بنائی گئی ہیں۔ ایک تو مصری یونیورسٹی جسکے لیے مصطفےٰ کامل پاشا مرحوم نے کوشش شروع کی تھی۔ اب اس یونیورسٹی کا افتتاح ہوگیا۔ اس یونیورسٹی میں خود مسلمانوں کا مقرر کردہ نصاب پڑھایا جائیگا۔ اس میں عورتوں کو بھی فراموش نہیں کیا گیا ہے۔ انکے لیے بھی ایک شاخ رکھی گئی ہے۔ اور مختلف علوم وفنون کی ڈگری حاصل کرنے کا انکے لیے انتظام کیا گیا ہے۔

دوسری ازہری یونی ورسٹی ہے جامع ازہر مصر کا نہایت مشہور اسلامی مدرسہ ہے جو ایک ہزار سال سے قائم ہے اس میں دنیا کے مختلف حصے کے دس بارہ ہزار طالب پڑھتے ہیں۔ اب اس مدرسہ کی اصلاح کرکے اسکو صرف علوم اسلامیہ کی یونیورسٹی بنا دیا ہے اور باقاعدہ اسکا کام شروع کر دیا گیا ہے ہمارے مصری بھائیوں کی اس علمی ترقی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہم سے بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔

ایک غیر معروف اسلامی سلطنت

افریقہ کا علاقہ نائجیریا (جو برٹش اثر میں داخل ہے) تقریباً پانچ لاکھ مربع میل ہے اور مختلف تخمینوں کے بموجب اس کی آبادی کا اندازہ ڈھائی کروڑ سے لیکر چار کروڑ تک ہے۔ اگر اس کی تقسیم کی جائے تو دو جدا جدا حصے ہو سکتے ہیں۔ ایک تو سواحلی اور بزرگ علاقہ ہے۔ جسکا ایک ثلث بالکل قدیم مذہب کا پیرو ہے۔ اور دوسرا اندرونی حصہ ہے۔ جسپر مسلمان سلطان و سردار حکمراں ہیں۔ اور جن میں اکثر فلاحوں کی مشہور و معروف نسل سے ہیں۔ جن قطعات ملک پر فلاحوں کی نسل حکمراں ہے وہ سلطنت سکرٹر کے نام سے مشہور ہے اور کبھی کبھی اُسے سلطنت سکرٹر گندوبھی کہتے ہیں۔ اس اسلامی سلطنت کی کل مردم شماری ڈیڑھ کروڑ سے دو کروڑ تک قیاس کی جاتی ہے ملک دو قسم کے باشندوں سے آباد ہے۔ بڑا حصہ سکرٹر کہلاتا ہے اور چھوٹا حصہ گندو ہے۔ سکرٹر پر فلاح نسل کا سردار سلطان سکرٹر حکمراں ہے۔ جسکا دار السلطنت مقام ورنو میں (سلطنت کی شمال کے سرحد کے قریب) ہے۔ چھوٹی قوم پر سلطان گندو حکومت کرتا ہے۔ لیکن مہمات عظیمہ میں اسکو ہمیشہ اپنے عمزاد برادر اور سردار سکرٹر کی ہدایات لینی پڑتی ہیں۔ سکرٹر فریق کی سلطنت بہت سے صوبوں میں منقسم ہے۔ اور امیران صوبوں کے حاکم ہیں۔ اسی طرح گندو بھی کئی صوبوں میں منقسم ہے۔ ان سب صوبوں کے امیر بہت کچھ تو خود مختار ہیں۔ لیکن سلطان سکرٹر کے اس سے زیادہ اثر میں ہیں۔ جس قدر مصر پر قبضہ برطانیہ سے قبل مصر کے خدیو سلطان المعظم کے مطیع تھے۔ ان امرا کی صرف تخت نشینی ہی سلطان سکرٹر کے

قبضہ میں نہیں ہے بلکہ وہ مہمات عظیمہ میں بارہا حاکمانہ طور پر مداخلت کیا کرتا ہے اور جزوی معاملات میں دخل دیتا رہتا ہے ۔

نمایش صوبجات متحدہ

نمایش صوبجات متحدہ الہ آباد کا افتتاح یکم دسمبر سنہ ۱۹۱۰ء روز پنجشنبہ کو ہز آنر سر جان ہیوٹ کے دست مبارک سے ہوا ۔ رسم افتتاح میں کئی ہزار معزز صاحب شریک تھے ۔ منیجنگ کمیٹی کی جانب سے آنریبل مسٹر جسٹس رچرڈز نے ایڈریس پڑھا ۔ جو ایک نہایت خوب صورت صندوقچہ میں رکھ کر ہز آنر کی خدمت میں پیش کیا گیا ۔ ہز آنر نے اپنی افتتاحی تقریر میں ابتدا سے اسوقت تک اس نمایش کی تاریخ بیان کی ۔ اور گورنمنٹ کی طرف سے کل کارکنان اور معاونین کا شکریہ ادا کیا ۔ سر جان نے حاضرین کو ایک شاہی پیغام بھی پہنچایا ۔ ہز آنر نے فرمایا کہ "کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ مجھے اس نمایش کا حال ہز مجسٹی سے عرض کرنے کی عزت حاصل ہوئی تھی ۔ اور حضور ممدوح نے مجھے حکم دیا تھا کہ ہز مجسٹی اور حضور ملکہ معظمہ کی جانب سے یہ پیغام پہنچا دوں کہ ہز مجسٹیز نمایش کی کامیابی کے متمنی ہیں اور امید کرتے ہیں کہ اس سے اس صوبہ کے باشندوں کو مادی فوائد حاصل ہونگے" ۔

سر جان نے آگے چل کر اس عام مسرت کا اظہار کیا جو حضور ملک معظم و ملکہ معظمہ کی ہندوستان میں قدم رنجہ فرمانے کی خبر سے رعایا کو حاصل ہوئی ہے ۔ نمایش کے متعلق ہز آنر نے یہ بھی فرمایا کہ "ابتدا میں جتنا خیال تھا نمایش اس سے زیادہ وسیع ہے ۔ میں کمیٹی انتظامیہ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ اس نے اس بات کا لحاظ رکھا کہ نمایش افتتاح کے لیے آج تیار ہو جائے ۔ گو بلاشبہ تمام نمونے ہنوز اپنی اپنی جگہ نہیں پہنچے ۔ لیکن مجھے شبہ ہے کہ کوئی اور نمایش افتتاح کے وقت اتنی بھی تیار ہو گئی ہو گی جتنی کہ آج ہماری نمایش ہے ۔ اس نتیجہ کے لیے آپ کی کمیٹی اور خاص کر مسٹر جی آر مرسے سکرٹری نمایش ذمہ دار ہیں ۔

سلطان المعظم کی نیک دلی

انڈیا نوپل کے اخبار الوطن نے لکھا ہو کہ "فوجی قواعد کے زمانہ میں ایک روز سلطان المعظم نے یہاں (اڈریانوپل) کی جامع مسجد میں نماز پڑھی۔ افسران نے یہ انتظام کرنا چاہا کہ جلالت مآب کے نماز پڑھنے کے وقت معمولی نمازی مسجد میں داخل نہ ہونے پائیں لیکن جلالت مآب نے ایسا نہ ہونے دیا۔ اور جب صفیں جماعت کے لیے کھڑی ہوئیں تو لوگوں نے ازراہ احترام جلالت مآب سے کچھ فاصلہ پر کھڑا ہونا چاہا مگر سلطان المعظم نے نمازیوں کو اپنے قریب کر لیا۔ اور بالکل عام مسلمانوں کی طرح نماز ادا کی اور فرمایا "یعنی میں نہیں چاہتا کہ رب العالمین کے حضور میں بھی مسلمانوں پر کوئی امتیاز حاصل کروں بلکہ جس طرح وہ نماز پڑھیں گے میں بھی پڑھونگا"

ایک واقعہ یہ بھی بیان ہوا ہو کہ جب جلالت مآب مسجد سے برآمد ہو رہے تھے تو کچھ لوگوں کی فریاد کی آواز اُنکے کان میں آئی۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ قیدی ہیں اور رہائی کی درخواست کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ "اگر کسی جرم کی پاداش میں قید ہوئے ہیں تو میں اُن کو رہا نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ حقوق العباد میں مداخلت کرنی ہو۔ ہاں اگر کسی قرضہ کی علت [illegible] میں قید ہیں تو انکے ذمہ کا قرضہ میں اپنی جانب سے ادا کر سکتا ہوں"

انگریزی [illegible] اُستانیاں۔ انگلستان اور امریکہ میں تعلیم یافتہ عورتوں کی اس قدر کثرت ہو کہ اب یہ دشو[illegible] اری لاحق ہو رہی ہو کہ انکے لیے کام کہاں سے پیدا کیا جائے۔ بہت سے پیشے جنکے صرف مرد گزشتہ زمانے سے ٹھیکہ دار بنے ہوئے تھے۔ رفتہ رفتہ اب عورتوں نے انسے چھین لیئے۔ ڈاک خا[illegible] انے۔ ریلوے کے دفاتر۔ کارخانے۔ دُکانیں اور مختلف زندگی کے شعبے ان سے بھرے پڑ[illegible] ے ہیں اور وہ مردوں کے برابر کی شریک ہوگئی ہیں۔ طبابت اور تعا[illegible]

محکمہ جات میں بھی ان کی تعداد کم نہیں ہے۔ یہانتک کہ پہلے جس طرح انہوں نے مردوں کو ہٹا کر اپنی جگہ بنائی، اب خود ان کا ایک طبقہ دوسرے کو ہٹانے کی کوشش میں سرگرم ہے۔ ایسی حالت میں مدبران ملک بالخصوص اس طرف متوجہ ہیں کہ انکے لیے معاش کا کوئی نیا میدان نکالا جائے۔

لارڈ کرزن بہادر نے جو ہندوستان میں آج سے پانچ سال پہلے وائسرائے تھے۔ اکسفورڈ میں مارگریٹ ہال کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا کہ عورتوں کو چاہیے کہ اخبار نویسی۔ ادب اور نقشہ نویسی کی طرف توجہ کریں۔ کیونکہ یہ شعبے انکے لیے خاص موزوں ہیں۔ علاوہ بریں نوآبادیوں میں تعلیم گاہوں کی افسر گھرانوں کی منتظم اور دولتمندوں کی سکرٹری رہکر بھی وہ اپنی معاش کا سامان کرسکتی ہیں۔ ہندوستان صدیوں کی نیند سے آہستہ آہستہ بیدار ہورہا ہے۔ وہاں کے زنانخانوں میں آزادی کی تحریک پائی جاتی ہے۔ وہاں بھی انگریزی اُستانیوں کی کھپت ہوسکتی ہے۔ اسلیے انگریزی اُستانیوں کو ہندوستان کی طرف خصوصیت کے ساتھ توجہ کرنی چاہیے۔

ہندو مسلمانوں کا فساد۔ نہایت سخت افسوس ہے کہ کلکتہ میں ہندو مسلمانوں کے درمیان سخت فساد ہوا۔ کئی جانیں ضائع ہوگئیں۔ اور مالی نقصان کی تعداد لاکھوں تک پہنچی ہے۔ اس فساد کی بنیاد یہ ہے کہ مارواڑی لوگ کلکتہ کی مشہور مسجد زکریا میں امسال قربانی روکنا چاہتے ہیں اور مسلمان کہتے ہیں کہ ہماری یہ مذہبی رسم مدتوں سے یہاں پر ہوتی چلی آتی ہے۔ ہم اس ہندوستان کیونکر باز رہ سکتے ہیں۔ اس بنا پر لڑائی ہوئی۔ سرکار نے انتظام کیلیے فوج منگائی فرمانا بلیا ہے۔

لیڈیز کانفرنس کی صدارت۔ بڑے دن کے موقع پر اس دفعہ الہ آباد میں لیڈیز کانفرنس بلائی جانے والی تھی۔ اور ہمیں ہر ہائنس بیگم صاحبہ بھوپال کی صدارت کی افواہ گرم تھی۔ کرس منعقد ہوئی۔

مسٹر جی ا

محکمہ جات میں بھی ان کی تعداد کم نہیں ہے۔ یہانتک کہ پہلے جس طرح انہوں نے مردوں کو ہٹا کر اپنی جگہ بنائی، اب خود ان کا ایک طبقہ دوسرے کو ہٹانے کی کوشش میں سرگرم ہے۔ ایسی حالت میں مدبران ملک بالخصوص اس طرف متوجہ ہیں کہ انکے لیے معاش کا کوئی نیا میدان نکالا جائے۔

لارڈ کرزن بہادر نے جو ہندوستان میں آج سے پانچ سال پہلے وائسرائے تھے۔ آکسفورڈ میں مارگریٹ ہال کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا کہ عورتوں کو چاہیے کہ اخبار نویسی۔ ادب اور نقشہ نویسی کی طرف توجہ کریں۔ کیونکہ یہ شعبے انکے لیے خاص موزوں ہیں۔ علاوہ برین نوآبادیوں میں تعلیم گاہوں کی افسر گھرانوں کی منتظم اور دولتمندوں کی سکرٹری رہکر بھی وہ اپنی معاشس کا سامان کرسکتی ہیں۔ ہندوستان صدیوں کی نیند سے آہستہ آہستہ بیدار ہورہا ہے۔ وہاں کے زنانخانوں میں آزادی کی تحریک پائی جاتی ہے۔ وہاں بھی انگریزی استانیوں کی کھپت ہوسکتی ہے۔ اسلیے انگریزی استانیوں کو ہندوستان کی طرف خصوصیت کے ساتھ توجہ کرنی چاہیے۔

ہندو مسلمانوں کا فساد۔ نہایت سخت افسوس ہے کہ کلکتہ میں ہندو مسلمانوں کے درمیان سخت فساد ہوا۔ کئی جانیں ضائع ہوگئیں۔ اور مالی نقصان کی تعداد لاکھوں تک پہنچی ہے۔ اس فساد کی بنیاد یہ ہے کہ مارواڑی لوگ کلکتہ کی مشہور مسجد زکریا میں امسال قربانی روکنا چاہتے ہیں اور مسلمان کہتے ہیں کہ ہماری یہ مذہبی رسم مدتوں سے یہاں پر ہوتی چلی آتی ہے۔ ہم اس کیونکر باز رہ سکتے ہیں۔ اس بنا پر لڑائی ہوئی۔ سرکار نے انتظام کیلیے فوج منگائی ہے۔

لیڈیز کانفرنس کی صدارت۔ بڑے دن کے موقع پر اس دفعہ الہ آباد میں لیڈیز کانفرنس منعقد کی جانے والی تھی۔ اور ہزہائنس بیگم صاحبہ بھوپال کی صدارت کی افواہ گرم تھی۔

مدرسۂ نسوان اعزہ۔ حیدرآباد میں حضور نظام خلد اللہ ملکہ کی توجہ سے عورتوں کی تعلیم کے لیے عرصہ سے ایک مدرسہ اعزہ کے نام سے بصرف کثیر جاری ہی جہاں میٹرکیولیشن کے درجہ تک تعلیم دیجاتی ہی۔ اور اس کی استانیاں معقول تنخواہوں کی یوروپین یوروشین اور دیسی خواتین ہیں۔ اس کی ہیڈ مس ایوانس ہیں جو نہایت اعلیٰ درجہ کا تعلیمی تجربہ رکھتی ہیں [illegible] ذیقعدہ کو اس مدرسہ کا سالانہ جلسہ تقسیم انعامات کے لیے بصدارت لیڈی بیلی صاحبہ بشیر باغ میں منعقد کیا گیا۔

مس ایوانس نے مدرسہ کی سالانہ رپورٹ سنائی۔ ۱۰۵ لڑکیاں اس مدرسہ میں تعلیم پاتی ہیں۔ گزشتہ سال یہ تعداد ۷۰ تھی جس سے معلوم ہوتا ہی کہ مدرسہ ترقی کر رہا ہی لیڈی بیلی صاحبہ نے خاتمہ پر ایک نصیحت آمیز تقریر فرمائی اور جلسہ بخیر و خوبی برخاست ہوا۔

واردات قتل۔ کالی کٹ کے قریب ایک جگہ ہی کو لنگد۔ وہاں ایک ظالم نے اپنی بیوی اور دو برس کی معصوم بچی کو چھری سے ذبح کر ڈالا۔ اور اب روپوش ہی۔ پولیس والے تلاش میں ہیں۔ وجہ قتل اس وقت تک معلوم نہیں ہوئی۔

ولی عہد جرمنی۔ شاہزادہ ولیم ولی عہد جرمنی ایشیا کی سیاحت کو نکلے ہیں۔ اور مصر پہنچ چکے ہیں۔ اُن کے سفر میں ہندوستان۔ چین اور جاپان بھی شامل ہوں گے۔ آپ کی بیوی بھی ہمراہ ہیں۔ وہ علاوہ نہایت خوبصورت ہونے کے دربار جرمنی میں اس قدر ہر دل عزیز ہیں کہ آج تک شاہی خاندان کی کوئی بہو نہ ہوئی ہوگی۔ ہندوستان کے بعض شہروں میں ممکن ہے کہ شاہزادی صاحبہ موصوفہ کو زنانہ جلسوں اور پردہ پارٹیوں میں مدعو کیا جائے۔

نیپال کی شہزادی۔ مہاراجہ دیب شمشیر جنگ سابق وزیر اعظم نیپال کی صاحبزادی رانی بھوبن صاحبہ اپنی خوشدامن صاحبہ اور شوہر صاحب کے ہمراہ لیڈی منٹو سے ملنے تھوڑے دن ہوئے کلکتے آئی تھیں۔ وہ نہ صرف انگریزی میں خوب اچھی طرح بات چیت کر سکتی ہیں بلکہ انگریزی طرز معاشرت اور نئے طور طریق کو بھی پسند کرتی ہیں۔

آپ نے لیڈی منٹو سے لیڈی ڈفرن کی رفاہی کاموں کی بڑی تعریف کی اور کہا کہ ہندوستان کی عورتوں کے لیے جو کچھ انھوں نے کیا اُس سے بذات خود میں نے بھی بہت فائدہ اُٹھایا۔ اس کاموں کو اور تحریکوں کو جو تقویت آپ سے (یعنی لیڈی منٹو سے) پہنچی میں اس کی بھی دلی شکر گزار ہوں۔ کیونکہ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ اس نئی تعلیم کے اثر سے میں جانور سے آدمی ہو گئی۔"

اس کے بعد رانی صاحبہ نے حضور ملکہ کی خدمت میں لیڈی منٹو کے توسل سے یہ عرض کرنے کی خواہش کی کہ دربار تاجپوشی پر جو لندن میں ماہ جون ۱۹۱۱ء منعقد ہونے والا ہے اپنی اس ناچیز کو بھی یاد فرمائیں۔ تاکہ منجملہ اور عقیدت مندان با اختصاص کے یہ کنیز بھی قدم بوسی سے سرافراز ہو۔"

آخر میں رانی صاحبہ نے منٹوز سنگ ایسوسی ایشن کے لیے دس ہزار کے نوٹ دیے۔ جسے لیڈی منٹو نے رسمی شکریہ ادا کرنے کے بعد خوشی سے منظور فرمایا۔